توضیح القرآن

آسان تفسیرِ قرآن

جلدِ دوم

سُوْرَةُ الْبَقَرَة : آیت نمبر ۱۴۲ تا اختتام

پارہ سَیَقُوْل - تِلْكَ الرُّسُل : رکوع نمبر ۸

از

مُفتی محمد تقی عثمانی

مکتبہ معارف القرآن کراچی
(Quranic Studies Publishers)
Karachi - Pakistan

۲

آسان تفسیرِ قرآن

جلدِ دوم

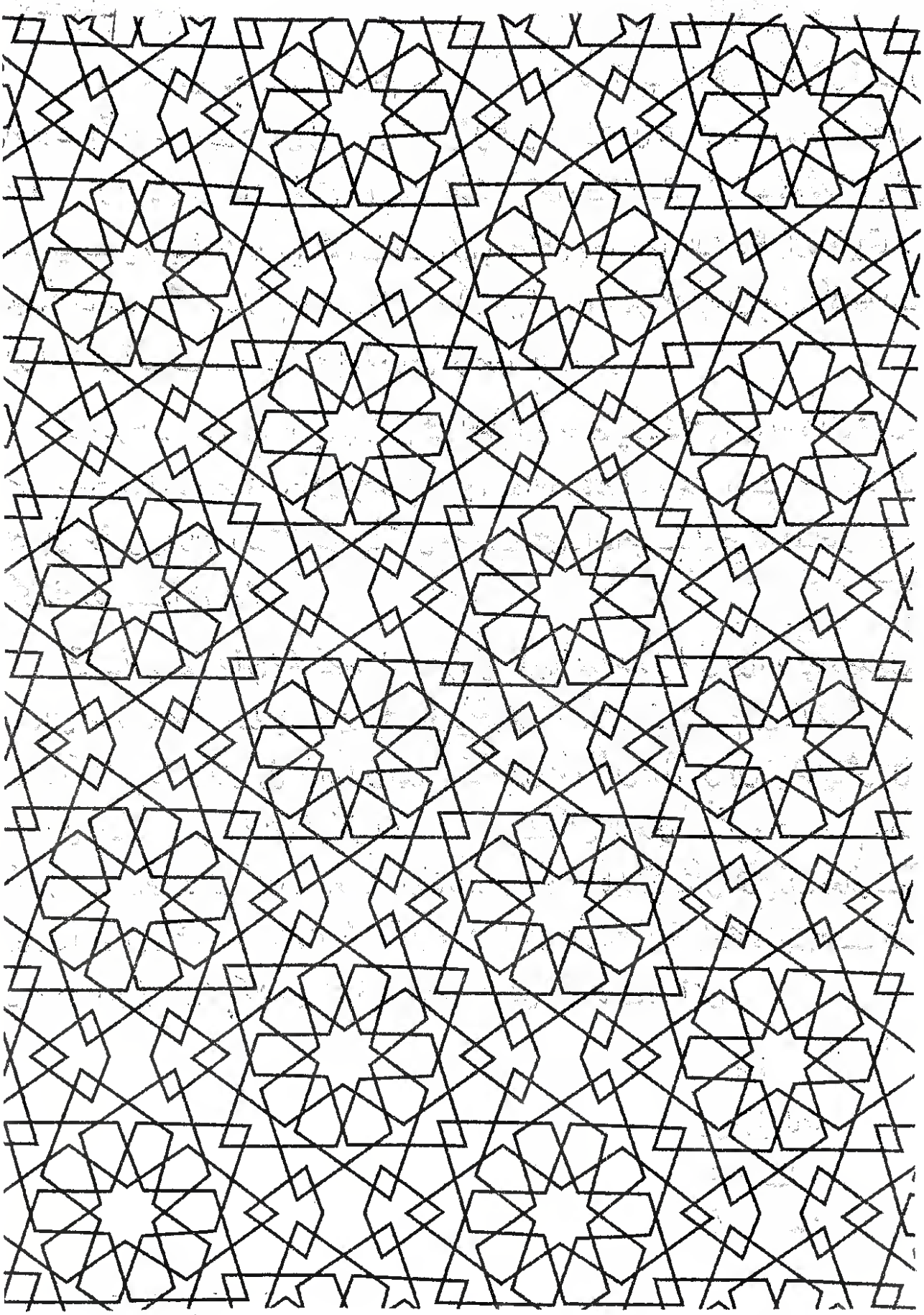

توضیح القرآن

آسان تفسیرِ قرآن

جلدِ دوم

سُوْرَۃُ الْبَقَرَۃ : آیت نمبر ۱۴۲ تا اختتام

پارہ سَیَقُوْل - تِلْكَ الرُّسُل : رکوع نمبر ۸

اَز

مُفتی مُحمّد تقی عُثمانی

مکتبہ معارف القرآن کراچی

(Quranic Studies Publishers)

Karachi, Pakistan.

جملہ حقوقِ طباعت بحق مکتبہ معارف القرآن کراچی محفوظ ہیں

عرضِ ناشر: الحمد للہ اگرچہ مکتبہ معارف القرآن کراچی نے "آسان تفسیر قرآن" کی تصحیح وطباعت میں ہر ممکن احتیاط سے کام لیا ہے، لیکن کبھی کبھی کتابت، طباعت اور جلد سازی میں سہواً غلطی ہو جاتی ہے۔
اگر کسی صاحب کو ایسی کسی غلطی کا علم ہو تو براہ کرم مطلع فرما کر ممنون فرمائیں۔

نوٹ:

اس تفسیر کے تمام دروس (Audio Recordings)

www.muftitaqiusmani.com

پر "درسِ قرآنِ کریم" کے سیکشن "درسِ قرآن کریم: اسٹوڈیو ریکارڈنگ" کے تحت موجود ہیں۔

دروسِ تفسیر QR CODE

اس تفسیر سے متعلق آراء وتجاویز کے لیے اس ای میل ایڈریس پر رابطہ کیجئے: (asantafseerequran@gmail.com)

باہتمام

ڈاکٹر مفتی محمد حسان اشرف عثمانی

طباعت : ربیع الثانی ۱۴۴۵ھ - نومبر ۲۰۲۳ء

فون : 92-21-35031565, 351123130
0312-2592838

ای میل : info@mmqpk.com
mm.q@live.com

ویب سائٹ : www.mmqpk.com
www.maktabamaarifulquran.com

مکتبہ معارف القرآن کراچی
(Quranic Studies Publishers)
maktabamaarifulquran.com
احاطہ جامعہ دارالعلوم کراچی، کورنگی انڈسٹریل ایریا، کراچی، پاکستان - 75180

فیس بک سے خریداری کے لئے scan کریں

ONLINE SHARIAH
www.SHARIAH.com
آن لائن خریداری کے لئے تشریف لائیں۔

ملنے کے پتے

- مکتبہ دارالعلوم، کراچی
- ادارۃ المعارف، کراچی
- بیت المعارف، کراچی
- دار الاشاعت، کراچی
- فخر الدین کانچ والا، کراچی
- بیت القرآن، کراچی
- مکتبہ عمر فاروق، کراچی
- مکتبۃ القرآن، کراچی
- ادارۂ اسلامیات کراچی، لاہور
- مکتبہ رحمانیہ، لاہور
- مکتبہ سید احمد شہید، لاہور
- الفلاح پبلشرز، لاہور
- مکتبہ عائشہ، لاہور
- مکتبۃ البشیر، پشاور
- دار الاخلاص، پشاور
- بیت العلم، پشاور
- مکتبہ اصلاح وتبلیغ، حیدر آباد
- بیت القرآن، حیدر آباد
- دار السلام، اسلام آباد
- مسٹر بکس، اسلام آباد
- مکتبہ صفدریہ، راولپنڈی
- اسلامی کتاب گھر، راولپنڈی
- مکتبہ عثمانیہ، راولپنڈی
- مکتبہ رشیدیہ، راولپنڈی
- قرآن مجید محل، راولپنڈی
- اسلامی کتاب گھر، فیصل آباد
- مکتبہ اسلامیہ، فیصل آباد
- ادارۂ تالیفاتِ اشرفیہ ملتان
- مکتبہ احیاء العلوم، کرک
- مکتبہ عباسیہ، تیمر گرہ
- مکتبہ احرار، مردان
- مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ
- تاج بک ایجنسی، منگورہ
- برکی کتب خانہ، ڈیرہ اسماعیل خان
- مکتبہ محمدیہ، لکی مروت (درہ پیزو)
- عثمان دینی کتب خانہ، مانسہرہ

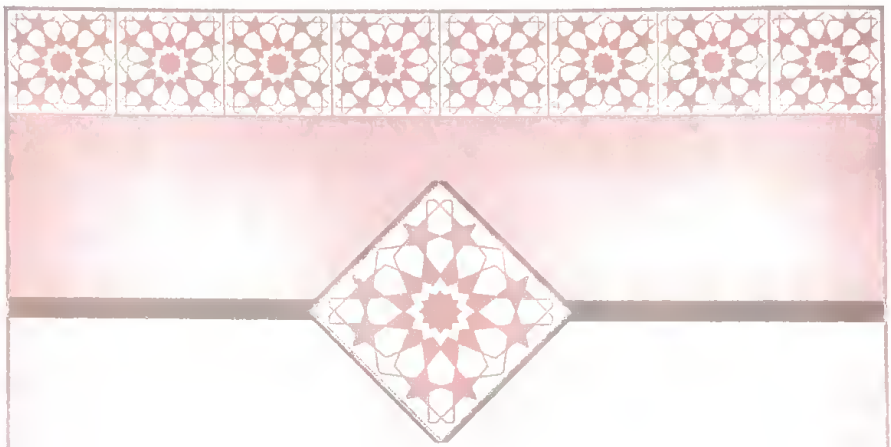

فہرستِ مضامین

جلدِ دوم

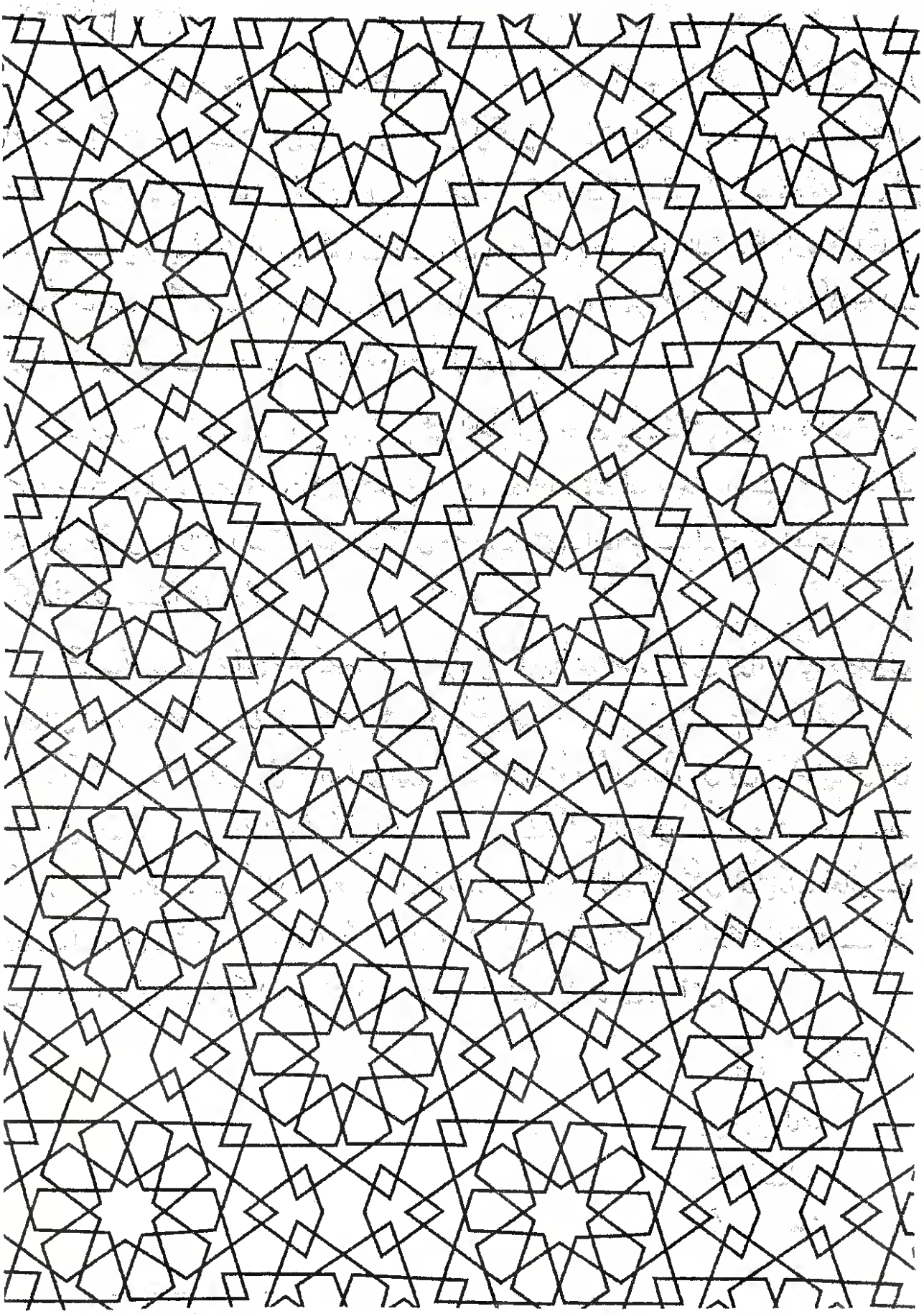

اجمالی فہرست

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ نمبر
۱	پارہ سَیَقُوْلُ	۲۷
۲	اسلام کا نظامِ قصاص: احکام، فوائد اور حکمتیں	۱۱۰
۳	روزوں کی فرضیت، مقصد اور احکام	۱۲۳
۴	زوجین کے رشتے کو بیان کرتا ایک بلیغ جملہ اور متعدّد اصول	۱۳۹
۵	اللہ تعالیٰ کی مقرّر کردہ حدود کی ضرورت و اہمیت	۱۴۶
۶	ناجائز طریقے سے مال کھانے کی ممانعت پر مشتمل اُصولی ہدایات	۱۵۰
۷	تجارت و ملازمت کو اللہ کا فضل قرار دینے کی حکمتیں	۱۸۷
۸	انفاق کا مفہوم اور اس کے مصارف	۲۲۰
۹	باہمی ازدواجی تعلقات سے متعلق ایک بلیغ قرآنی تشبیہ	۲۴۹
۱۰	طلاق کے معاملہ میں دیگر مذاہب کی اِفراط وتفریط اور اسلام کا عادلانہ نظام	۲۶۷
۱۱	بنی اسرائیل کا عمالقہ سے جہاد اور اس میں ہمارے لیے اسباق	۳۲۴

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ نمبر
۱۲	پارہ تِلْكَ الرُّسُلُ	۳۳۶
۱۳	آیت الکرسی: بُت پرستوں کے عقیدے کی نفی میں توحید کی ایک عظیم الشان آیت	۳۴۴
۱۴	انفاق فی سبیل اللہ کی فضیلت، قبولیت کی شرائط اور قبولیت سے مانع امور	۳۷۸
۱۵	صدقہ کے آداب و احکام اور چند اہم مسائل	۳۹۲
۱۶	سود کی حرمت اور خرابیوں سے متعلق چند اہم مباحث	۴۱۲
۱۷	ادھار خرید و فروخت اور ادھار کے معاملات سے متعلق مسائل	۴۳۶
۱۸	سورۂ بقرہ کی آخری دو آیتوں کی اہمیت و عظمت	۴۵۴

فہرستِ مضامین

مضمون	صفحہ
آیت نمبر ۱۴۲ تا ۱۵۲	۲۷
گذشتہ آیات سے ربط اور پیشِ نظر رکوع کا مضمون	۳۰
بیت اللہ کو قبلہ بنانے کے لیے آپ ﷺ کا اشتیاق	۳۰
مشرق ہو یا مغرب وہ اللہ ہی کی ملکیت ہے	۳۲
عبادت کے لیے ایک خاص سمت متعین کرنے کی حکمت	۳۲
تحویلِ قبلہ کا حکم دینے کی حکمت	۳۳
امتِ محمدیہ؛ ایک معتدل امت	۳۴
امتِ محمدیہ کے معتدل امّت ہونے کا مطلب	۳۴
تمام انسانوں کے لیے گواہ بننے والی اُمّت	۳۶
قبلے کی تبدیلی کے حکم کے ذریعے اہلِ ایمان کی آزمائش	۳۷
حدیثِ رسول کے وحیِ الٰہی اور واجبُ الاتباع ہونے کی دلیل	۳۸
تحویلِ قبلہ کا حکم؛ ایک مشکل حکم	۳۹
تحویلِ قبلہ سے پہلے والی نمازوں کا حکم	۴۰
قبلے کے حوالے سے آپ ﷺ کی طبعی خواہش	۴۰

مضمون	صفحہ
مسجدِ حرام کی طرف رُخ کرنے کا حکم دینے کی حکمت	۴۱
ضد اور عناد کی وجہ سے تبدیلیٔ قبلہ کے حکم سے رُوگردانی	۴۳
گمراہ قوموں کی خواہشات کی پیروی کی ممانعت	۴۳
عناد اور ہٹ دھرمی کے سبب حق کا انکار	۴۴
بحث مباحثہ کے بجائے نیک کام میں لگنے کا حکم	۴۵
قبلہ کا حکم بار بار دہرانے کی حکمت	۴۶
حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دو دعائیں اور ان کی قبولیت	۴۷
انسان کی زندگی کو سنوارنے کا بہترین دستورُ العمل	۴۹
شکرگزاری؛ اللہ تعالیٰ کو یاد کرنے کا آسان طریقہ	۴۹
اللہ تعالیٰ سے محبت کرنے والوں کے لیے بڑی خوشخبری	۵۰
آیت نمبر ۱۵۳ تا ۱۵۷	۵۱
اللہ تعالیٰ کی رضا پر راضی رہنے کا حکم	۵۲

مضمون	صفحہ
اللہ تعالیٰ سے مدد حاصل کرنے کے لیے دو اہم چیزیں	۵۲
صبر کا معنی ومفہوم اور اس کی اقسام	۵۳
صبر کی تینوں اقسام پر عمل کے مواقع	۵۴
اطاعتِ الٰہی پر صبر سے مدد لینے کا مطلب	۵۵
نماز کی پابندی سے دین پر چلنا آسان ہوتا ہے	۵۵
کسی حاجت کو پورا کرنے کے لیے سب سے اہم وظیفہ	۵۶
صبر کرنے والوں کے لیے بے حساب اجر کا وعدہ	۵۷
شہادت ایک اعلیٰ مرتبہ اور عظیم نعمت	۵۸
اخروی زندگی کے دو درجے اور شہداء کی حیاتِ برزخی کی تفصیل	۵۸
انبیائے کرام علیہم السلام کی اعلیٰ درجے کی حیاتِ برزخی	۶۰
صدموں کے مواقع پر ایک مومن کا صحیح طرزِ عمل	۶۱
اللہ تعالیٰ کی طرف سے آزمائش کی شکلیں	۶۲
آزمائشوں پر صبر کا مظاہرہ کرنے والوں کے لیے خوشخبری	۶۴
مصیبت میں غم کا اظہار صبر کے منافی نہیں	۶۴
مصائب پر صبر کا حقیقی مفہوم	۶۵
اِنَّا لِلّٰہِ.... تسلیم ورضا کا خوبصورت جملہ	۶۵

مضمون	صفحہ
دنیا کی تکالیف بلندیٔ درجات کا ذریعہ	۶۶
صبر کرنے والوں کے لیے خصوصی عنایتیں اور انعامات	۶۷
ہر چھوٹی بڑی تکلیف پر اِنَّا لِلّٰہِ... کہنے کی عادت بنائیں!	۶۸
آیت نمبر ۱۵۸ تا ۱۶۲	۶۹
آیاتِ مبارکہ کا ماقبل سے ربط	۷۰
صفا ومروہ اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ہیں	۷۱
حج وعمرہ میں صفا ومروہ کی سعی کا حکم	۷۱
صفا ومروہ کے درمیان سعی واجب ہے	۷۲
دوبارہ حج یا عمرہ کرنا باعثِ خیر وبرکت	۷۳
اللہ تعالیٰ کے ہاں خیر اور بھلائی کے کاموں کی قدردانی	۷۳
کفار کی تکلیفوں کے مقابلے میں مسلمانوں کے لیے تسلی کا پہلو	۷۴
حق بات کو چھپانے والے اہلِ کتاب کی سزا	۷۵
روشن دلیلوں اور ہدایت کو چھپانے کی ایک اور تشریح	۷۶
مسلمانوں کو ستانے والے مشرکین کی سزا	۷۷
آیت نمبر ۱۶۳ تا ۱۶۷	۷۷
اسلام کی روح، یعنی عقیدۂ توحید اور اس کے دلائل	۷۹
آسمان وزمین کا محیّر العقول اور زبردست نظام	۸۰

مضمون	صفحہ
سمندروں پر تیرتی کشتیوں کو چلانے والا کون ہے؟	۸۲
کون دریاؤں کی موجوں سے اٹھاتا ہے سحاب!	۸۳
ہواؤں کی گردش اللہ کی نشانیوں میں سے ایک بڑی نشانی	۸۴
مشرکین کی اپنے بتوں سے اور اہلِ ایمان کی اپنے خدا سے محبت	۸۵
خدائی کے کاموں میں کسی کو شریک سمجھنا بھی شرک ہے	۸۵
کفار بھی تکلیف کے وقت اللہ ہی کو پکارتے ہیں	۸۶
قیامت کے دن گمراہ لوگ ایک دوسرے کو ذمے دار ٹھہرائیں گے	۸۷
کفار کی دنیا میں واپس لوٹنے کی حسرت و آرزو	۸۸
آیت نمبر ۱۶۸ تا ۱۷۶	۸۹
کسی حلال چیز کو حرام قرار دینا بھی شرک کا شعبہ ہے	۹۱
شیطان کا انسان کو برائی پر اُبھارنا اور اس کی صورتیں	۹۲
حق سے اعراض کے لیے باپ دادا کی پیروی کا بہانہ	۹۳
اہلِ علم سے رہنمائی لینا مذموم پیروی میں داخل نہیں	۹۴
دینی مسائل و معاملات میں اہلِ علم کی تقلید	۹۵

مضمون	صفحہ
دعوتِ حق کو قبول نہ کرنے والے کافروں کی مثال	۹۵
حلال و پاکیزہ چیزیں کھانے کا حکم اور حرام چیزوں سے بچنے کی تاکید	۹۶
مجبوری کی حالت میں حرام کھانے کی شرائط	۹۸
حرام اجزاء سے بنی دوا کے استعمال کا حکم اور شرائط	۹۹
اللہ تعالیٰ کی آیتوں کو بیچنے اور چھپانے والوں کا اخروی انجام	۱۰۰
گناہ گار مسلمان کو جہنم میں پاک کرنے کے لیے ڈالا جائے گا	۱۰۱
اپنا انجام معلوم ہونے کے باوجود کفار کی دیدہ دلیری	۱۰۲
آیت نمبر ۱۷۷	۱۰۳
بحث مباحثے سے بچنے اور ایمان و عمل کی تلقین	۱۰۳
مسلمانوں اور کفار کو نیکی کے مختلف شعبوں کی طرف دعوت	۱۰۵
پیشہ ور بھکاریوں کو بھیک دینا جائز نہیں	۱۰۶
زکوٰۃ کے علاوہ نفلی صدقات ادا کرنے والے لوگ	۱۰۷
ایفائے عہد اور صبر کرنے والوں کی تعریف	۱۰۷
''صدق'' کا معنیٰ و مفہوم اور اس کی حقیقت	۱۰۸
صدق و اخلاص کے حصول کا آسان طریقہ	۱۰۹

مضمون	صفحہ
آیت نمبر ۱۷۸ تا ۱۷۹	۱۱۰
اسلام کا نظامِ قصاص: احکام، فوائد اور حکمتیں	۱۱۰
• انسانی زندگی سے متعلق مختلف پہلوؤں کا بیان	۱۱۰
• قاتل سے قصاص لینا شرعاً فرض ہے	۱۱۱
• جاہلیت میں نظامِ قصاص کے طریقوں کی اصلاح	۱۱۲
• قصاص کے بدلے میں دیت لینے کا حکم	۱۱۳
• خوں بہا کے حکم کے آداب اور اس کی حکمت	۱۱۴
• قصاص کے بجائے خوں بہا لینے کی حکمت اور اس کے فوائد	۱۱۴
• خوں بہا لینے کے بعد کوئی زیادتی جائز نہیں	۱۱۵
• قصاص کے عادلانہ حکم پر عقل پرستوں کے اعتراض	۱۱۵
• مختصر جملے میں حکمِ قصاص کی حکمت کا انتہائی جامع بیان	۱۱۶
• خود قصاص لینے کا کسی کو اختیار حاصل نہیں	۱۱۷
وصیت سے متعلق شرعی احکام	۱۱۸
مرنے والے کی وصیت میں تبدیلی کرنا جائز نہیں	۱۲۰
کسی حکم پر عمل کروانے کے لیے قرآنِ کریم کا خاص اسلوب	۱۲۱

مضمون	صفحہ
خیر خواہی کی وجہ سے وصیت میں تبدیلی کی صورت	۱۲۱
آیت نمبر ۱۸۳ تا ۱۸۷	۱۲۳
روزوں کی فرضیت، مقصد اور احکام	۱۲۳
• روزوں کی فرضیت کا حکم اور ایک تسلّی کا جملہ	۱۲۵
• روزوں کی فرضیت کی حکمت اور اصلی مقصود	۱۲۵
• روزہ؛ تقویٰ پیدا کرنے کا بہترین ذریعہ	۱۲۶
• نفسانی خواہشات کے آگے ہتھیار ڈال دینے کی غلطی	۱۲۷
• روزوں کا مختصر دورانیہ اور اس میں آسانیاں	۱۲۸
• بیماری کی حالت میں فرض روزہ چھوڑنے کی گنجائش	۱۲۸
• سفر کی حالت میں روزہ چھوڑنے کا حکم	۱۲۹
• چھوڑے ہوئے روزوں کی قضا میں سہولت	۱۲۹
• تدریجی احکام کی ایک مثال؛ روزوں کا فدیہ	۱۳۰
• روزہ چھوڑنے کی سہولت کے باوجود روزہ رکھنا بہتر ہے	۱۳۱
• رمضان المبارک میں قرآنِ کریم نازل کرنے کا مطلب	۱۳۱
• کلامِ باری تعالیٰ کے نزول کے لیے رمضان کا انتخاب	۱۳۳
• قرآنِ کریم بنی نوعِ انسان کے لیے سرچشمۂ ہدایت	۱۳۳

مضمون	صفحہ
• فدیہ کے سابقہ حکم کی منسوخی اور مسافر و مریض کے لیے سہولت	۱۳۴
• دین سراسر آسانی پر مشتمل ہے	۱۳۵
• تکبیراتِ عید کی طرف ایک لطیف اشارہ	۱۳۶
• اللہ تعالیٰ انسان کے قریب ہیں	۱۳۷
• روزوں سے متعلق بعض سابقہ احکام میں تبدیلی	۱۳۸
زوجین کے رشتے کو بیان کرتا ایک بلیغ جملہ اور متعدّد اصول	۱۳۹
• پہلا اصول: ایک دوسرے کے عیوب کی پردہ پوشی	۱۳۹
• دوسرا اصول: ایک دوسرے کے لیے زینت کا ذریعہ	۱۴۰
• تیسرا اصول: ایک دوسرے کے لیے عزت کا سبب	۱۴۱
• چوتھا اصول: ایک دوسرے کی حفاظت کا ذریعہ	۱۴۱
گناہ کا ارتکاب اپنی جان سے خیانت ہے	۱۴۲
باہمی تعلقات سے اولاد کی طلب بھی مقصود ہونی چاہیے	۱۴۳
سحری میں کب تک کھا پی سکتے ہیں؟	۱۴۴
اوقاتِ صلاۃ وصوم کے لیے جنتری کے استعمال میں ایک احتیاط	۱۴۵
حالتِ اعتکاف میں بیوی سے مباشرت	۱۴۶

مضمون	صفحہ
اللہ تعالیٰ کی مقرّر کردہ حدوں کی ضرورت و اہمیت	۱۴۶
• روزوں کے باب میں حدودُ اللہ کی مثال	۱۴۷
• نماز کے باب میں حدود اللہ کی مثال	۱۴۹
آیت نمبر ۱۸۸	۱۵۰
ناجائز طریقے سے مال کھانے کی ممانعت پر مشتمل اصولی ہدایات	۱۵۰
• معاملات کی اہمیت عبادات سے بھی زیادہ	۱۵۱
• دوسروں کا مال کھانے کی ممانعت کا بلیغ انداز	۱۵۲
• حلال وحرام کی تعیین کے لیے وحیِ الٰہی کی ضرورت	۱۵۳
• صاحبِ وحی کے ذریعے جائز و ناجائز معاملات کی تعلیم	۱۵۴
• حرام مال کی نحوست اور حلال کی برکات	۱۵۴
• حرام مال کے لیے جھوٹا مقدمہ کئی گناہوں کا مجموعہ	۱۵۵
• خوفِ خدا کے بغیر کوئی قانون مؤثر نہیں	۱۵۶
آیت نمبر ۱۸۹ تا ۱۹۵	۱۵۷
چاند کے گھٹنے بڑھنے کی حکمت و مصلحت	۱۵۹
اشہرِ حرم معلوم کرنے کا ذریعہ بھی چاند ہے	۱۶۰
حج سے متعلق اہلِ جاہلیت کی ایک رسم کی تردید	۱۶۱

مضمون	صفحہ
کام کو معروف طریقہ کے مطابق انجام دینا مطلوب ہے	۱۶۱
اشہرِ حُرم میں قتال جائز ہونے کی ایک صورت	۱۶۲
فتنہ انگیزی قتل سے بھی زیادہ سنگین برائی	۱۶۳
اپنے دفاع کے لیے حدودِ حرم میں قتال کی اجازت	۱۶۴
جہاد کا مقصد کسی کو اسلام پر مجبور کرنا نہیں ہوتا	۱۶۶
کفار کے لیے جزیرۂ عرب کا حکم دوسروں خطوں سے مختلف ہے	۱۶۶
جزیرۂ عرب میں کوئی کافر نہیں رہ سکتا	۱۶۷
حرمت والے مہینوں میں دفاعی مسائل کا حل	۱۶۸
ظلم کی حد تک بدلہ لینے کی اجازت اور زیادتی کی ممانعت	۱۶۹
اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنے کی ممانعت	۱۶۹
آیت نمبر ۱۹۶ تا ۲۰۳	۱۷۱
حج سے متعلق متعدّد مسائل کا بیان	۱۷۳
اِحرام کے بعد مجبوری پیش آنے کی صورتوں کے احکام	۱۷۴
سر منڈوا کر حلال ہونے کی شرائط	۱۷۴
حالتِ احرام میں بیماری یا عذر کی وجہ سے سر منڈوانے کا حکم	۱۷۶
حج کی تین اقسام اور ان کے احکام	۱۷۷
تمتُّع یا قِران میں قربانی کی استطاعت نہ ہونے کا حکم	۱۷۸
تمتُّع یا قِران کی اجازت صرف آفاقی کے لیے ہے	۱۷۸
اللہ کا خوف؛ دینی احکام پر عمل پیرا ہونے کا ذریعہ	۱۷۹
حج کے خاص مہینے اور افعالِ حج کی انجام دہی کے ایام	۱۸۰
حج کا احرام باندھنے والوں کے لیے ہدایات	۱۸۰
حج کے موقع پر جھگڑے سے بچنے کی خصوصی تلقین	۱۸۲
حجرِ اسود کا بوسہ مستحب جبکہ کسی کو تکلیف پہنچانا حرام	۱۸۲
حج کے مبارک ایام کو غنیمت سمجھیں	۱۸۲
حج میں تقویٰ کا زادِ راہ اختیار کرنے کی ہدایت	۱۸۳
حج میں کھانے پینے کا سامان ساتھ لے جانا توکّل کے منافی نہیں	۱۸۴
سفرِ حج کے دوران تجارت اور مزدوری کا حکم	۱۸۵
تجارت و ملازمت کو اللہ کا فضل قرار دینے کی حکمتیں	۱۸۷
• رزق عقل سے نہیں بلکہ رب کے فضل سے ملتا ہے	۱۸۸

مضمون	صفحہ
• تجارت و ملازمت شریعت کے مطابق کرنے کی ہدایت	۱۸۹
مزدلفہ میں اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے کی ہدایت	۱۸۹
اللہ کے ذکر میں منقول وماثور طریقے ہی اصل ہیں	۱۹۰
حج کے حوالے سے نسلی امتیاز پر مشتمل ایک رسم کی تردید	۱۹۱
انسانی مساوات کا عظیم سبق	۱۹۱
آباء و اجداد کے کارناموں پر فخر کے بجائے ذکر کا حکم	۱۹۲
آخرت سے بے فکری مومن کا شیوہ نہیں	۱۹۳
دنیا و آخرت دونوں کی بھلائی مطلوب ومقصود ہے	۱۹۴
سیاقِ قرآنی میں ''اللہ جلد حساب لینے والا ہے'' کا مفہوم	۱۹۶
منیٰ میں ایک دن کم یا زیادہ گزارنا	۱۹۷
آیت ۲۰۴ تا ۲۰۷	۱۹۸
منافقین اور مومنین مخلصین کا فرق	۱۹۹
منافقین کا فساد فی الارض والا طرزِ عمل	۲۰۰
منافقانہ روِش پر منافقین کی ہٹ دھرمی	۲۰۱
منافقین کی حالت سے حاصل شدہ اسباق	۲۰۱
منافقین کے مقابلے میں مومنینِ مخلصین کا احوال	۲۰۲
آیت نمبر ۲۰۸ تا ۲۱۲	۲۰۴

مضمون	صفحہ
اسلام میں پورے کے پورے داخل ہونے کی تلقین اور اس کی تشریح	۲۰۵
اہلِ ایمان کو اسلام میں داخل ہونے کا حکم اور اس کی تفصیل	۲۰۶
اُدۡخُلُوۡا فِی السِّلۡمِ کَآفَّۃً والی آیت کا شانِ نزول	۲۰۸
شیطان کی پیروی سے بچنے کی تلقین	۲۰۹
راہِ حق سے اعراض کرنے والوں کا انجام	۲۱۰
ایمان بالغیب اور ایمان بالمشاہدہ کا فرق	۲۱۱
حق سے رُوگردانی کرنے والے بنی اسرائیل کی مثال	۲۱۳
دنیاوی زندگی کی محبت گمراہی کا سبب	۲۱۴
مال و دولت کی فراوانی حق پر ہونے کی دلیل نہیں	۲۱۵
آیت نمبر ۲۱۳ تا ۲۱۴	۲۱۵
ابتداء میں سب انسان ایک ہی دین کے پیروکار تھے	۲۱۶
صحیح عقائد کی تعیین کے لیے انبیائے کرام علیہم السلام کی بعثت	۲۱۷
کفار کے ہاتھوں ستائے مسلمانوں کے لیے تسلّی کا مضمون	۲۱۹
آیت نمبر ۲۱۵	۲۲۰
انفاق کا مفہوم اور اس کے مصارف	۲۲۰

مضمون	صفحہ
• انفاق کا لغوی و اصطلاحی مفہوم	۲۲۱
• اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کرنے کے مصارف	۲۲۱
• مال کو صحیح مصرف میں خرچ کرنے کی تلقین	۲۲۲
• والدین پر خرچ کرنے کی تاکید اور اہمیت	۲۲۳
• رشتے داروں پر خرچ کرنے میں دوہرا ثواب	۲۲۴
• یتیم و مسکین اور مسافر کی مدد کرنے کا حکم	۲۲۵
• ہر وہ کام جس سے مخلوقِ خدا کو نفع پہنچے، صدقہ ہے	۲۲۵
آیت نمبر ۲۱۶ تا ۲۱۸	۲۲۶
جہاد کی مشروعیت اور فرضیت کی تفصیل	۲۲۷
جہاد کے حسنِ لغیرہٖ ہونے کی تفصیل	۲۲۸
زندگی کو خوشگوار بنانے کا ایک زرّیں اصول	۲۲۹
حرمت والے مہینوں میں قتال پر کفار کا اعتراض	۲۳۰
اسلام کو چھوڑنے والے کے لیے دنیا و آخرت کا نقصان	۲۳۲
آیت نمبر ۲۱۹ تا ۲۲۰	۲۳۳
شراب اور جوے کی حرمت کے تدریجی احکام	۲۳۴
صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا شراب اور جوے سے متعلق سوال	۲۳۴
خیرات کے کاموں کے لیے گانے بجانے کی محفلیں سجانا	۲۳۶
خرچ کرنے کی مقدار سے متعلق رہنمائی	۲۳۶

مضمون	صفحہ
خرچ کرنے کے معاملے میں شرعی حدود	۲۳۷
یتیموں کے اموال میں احتیاط کا حکم	۲۳۹
آیت نمبر ۲۲۱ تا ۲۲۳	۲۴۱
مشرک عورتوں سے نکاح کی ممانعت	۲۴۲
اصل معیارِ شرافت ایمان و توحید ہے	۲۴۳
مشرک مردوں سے مسلمان عورتوں کا نکاح جائز نہیں	۲۴۴
خواتین کا نکاح اولیاء ہی کے ذریعے بہتر ہونے کا اشارہ	۲۴۴
کفر کی طرف دعوت حقیقت میں آگ کی دعوت ہے	۲۴۵
نکاح میں دینداری ہی کو ترجیح دینی چاہیے	۲۴۵
حالتِ حیض میں قربت سے متعلق شرعی احکام	۲۴۶
حیض کے ایام سے متعلق دو اہم پہلو	۲۴۷
توبہ کرنے والوں سے اللہ تعالیٰ کی محبت	۲۴۸
باہمی ازدواجی تعلقات سے متعلق ایک بلیغ قرآنی تشبیہ	۲۴۹
• بیویوں کو کھیتی سے تشبیہ دینے کے چند اہم پہلو	۲۵۰
• ازدواجی تعلقات میں آزادی کے ساتھ ایک اہم قید	۲۵۲
• وَقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ کی تشریح	۲۵۳
آیت نمبر ۲۲۴ تا ۲۲۸	۲۵۴

مضمون	صفحہ
عائلی زندگی سے متعلق مضامین کی ابتداء	۲۵۵
باری تعالیٰ کے ناموں کو نیکی سے رکنے کا سبب بنانے کی ممانعت	۲۵۶
قسموں کے ذریعے حقوق اللہ اور حقوق العباد کی ادائیگی سے رکنا	۲۵۷
ماضی کے کسی واقعے سے متعلق جھوٹی قسم کھانے کا حکم	۲۵۸
ایلاء کا قانون اور اس سے متعلق شرعی احکام	۲۵۹
ایلاء میں چار ماہ گزرنے پر طلاق کا طریقِ کار	۲۶۰
مطلقہ عورتوں کی عدت کا حکم	۲۶۱
عدت کے دراز ہونے کے اندیشے سے حمل چھپانا جائز نہیں	۲۶۲
طلاقِ رجعی میں شوہر کو رجوع کا حق حاصل ہے	۲۶۳
عائلی زندگی میں آپس کے حقوق سے متعلق ایک جامع نصیحت	۲۶۳
آیت نمبر ۲۲۹ تا ۲۳۱	۲۶۵
طلاق کے معاملے میں دیگر مذاہب کی اِفراط وتفریط اور اسلام کا عادلانہ نظام	۲۶۷
• طلاق سے متعلق اسلام کا حکیمانہ نظام	۲۶۸
• دو طلاقوں کے بعد کے دو اختیار	۲۷۰
• خلع کے احکام وشرائط	۲۷۱

مضمون	صفحہ
• زیادتی شوہر کی طرف سے ہو تو طلاق پر معاوضہ لینا جائز نہیں	۲۷۲
• خلع کے فیصلے میں خاندان کی مشاورت	۲۷۳
• خلع میں پورا مہر واپس لینا مناسب نہیں	۲۷۳
• تیسری طلاق کے بعد رجوع ممکن نہیں	۲۷۴
• تین طلاقوں کے بعد واپسی کی صورت	۲۷۵
• پہلے مرد کے لیے دوبارہ حلال ہونے کے شرعی تقاضے	۲۷۶
• بیوی کو ستانے کے لیے اپنے پاس رکھنا جائز نہیں	۲۷۶
آیت نمبر ۲۳۲ تا ۲۳۳	۲۷۸
طلاق کے بعد دوبارہ پہلے شوہر سے نکاح سے منع کرنے کی ممانعت	۲۷۹
مطلقہ عورت کے اولیاء کے لیے اہم نصیحتیں	۲۸۰
بچے کو دودھ پلانے سے متعلق نزاعات کا تصفیہ	۲۸۱
بچوں کو دودھ پلانے کی زیادہ سے زیادہ مدّت	۲۸۲
دودھ پلانے والی عورت کا خرچہ شوہر پر ہونے کی صورتیں	۲۸۲
بچے کا باپ ہونے کی حیثیت سے متوسط خرچہ کا لزوم	۲۸۳
دودھ پلانے کی وجہ سے ماں یا باپ کو ستانا جائز نہیں	۲۸۳

مضمون	صفحہ
دودھ پلانے کے اخراجات ورثاء پر لازم ہونے کی صورت	۲۸۴
کمانے سے قاصر شخص کا نفقہ اور ایک اہم فقہی ضابطہ	۲۸۵
دو سال سے پہلے بچے کو دودھ چھڑوانا یا کسی دوسری عورت سے دودھ پلوانا	۲۸۵
قوانینِ الٰہیہ پر عمل کو آسان بنانے کے لیے قرآنِ کریم کا خاص انداز	۲۸۶
آیت نمبر ۲۳۴ تا ۲۳۷	۲۸۶
بیوہ کی عدّت کے احکام	۲۸۸
حاملہ عورت کی عدّت کی میعاد	۲۸۸
بیوہ عورتوں کے نکاحِ ثانی کا حکم	۲۸۹
بیوگان کے نکاح کو معیوب سمجھنا جائز نہیں	۲۹۰
دورانِ عدّت پیغامِ نکاح سے متعلق احکام و ہدایات	۲۹۰
بغیر مہر والی عورت کو خلوت سے پہلے طلاق اور تحفے کا حکم	۲۹۱
مقرّرہ مہر والی عورت کو خلوت سے پہلے طلاق اور مہر کا حکم	۲۹۳
رخصتی سے پہلے طلاق کی صورت میں مکمل مہر دینے کی ترغیب	۲۹۴
ایک دوسرے کے ساتھ فراخدلی کا برتاؤ کرنے کی تعلیم	۲۹۴
آیت نمبر ۲۳۸ تا ۲۴۲	۲۹۵

مضمون	صفحہ
نمازوں کی محافظت ونگرانی کا حکم	۲۹۶
نمازِ عصر کے اہتمام کی تاکید	۲۹۶
مومنانہ صفات کے شروع اور آخر میں نماز کا تذکرہ	۲۹۷
نماز میں ادب وتعظیم کے ساتھ کھڑے ہونے کا حکم	۲۹۹
حالتِ جنگ میں نماز کی تاکید اور طریقہ	۳۰۰
حکمِ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) درحقیقت حکمِ خداوندی	۳۰۲
مسائلِ طلاق کا تتمہ اور بیوہ کے لیے وصیت	۳۰۲
مطلقہ عورتوں کے حقوق کی ادائیگی کی تلقین	۳۰۴
آیت نمبر ۲۴۳ تا ۲۴۵	۳۰۵
جہاد فی سبیل اللہ اور انفاق فی سبیل اللہ کے مضامین	۳۰۶
موت وحیات اللہ کے ہاتھ میں ہونے کے پانچ واقعات	۳۰۷
موت سے بھاگنے والے بنی اسرائیل کے لوگوں کا واقعہ	۳۰۷
حقیقی موت کے بجائے سیاسی موت قرار دینے کی دور از کار تاویل	۳۰۹
قتال فی سبیل اللہ کا حکم اور منافقین کو تنبیہ	۳۱۰
انفاق کی ترغیب اور قرضِ حسن کا مطلب و مفہوم	۳۱۱
قرض کی واپسی میں غیر مشروط زیادتی حُسنِ قضا ہے	۳۱۲

مضمون	صفحہ
راہِ خدا میں خرچ کرنے سے مال میں کمی نہیں ہوتی	۳۱۳
آیت نمبر ۲۴۶ تا ۲۴۸	۳۱۴
بنی اسرائیل کو عمالقہ کے ساتھ جہاد کا حکم	۳۱۶
حضرت یوشع اور حضرت سموئیل علیہما السلام کی بعثت	۳۱۷
بنی اسرائیل کا جہاد کے لیے بادشاہ کی تقرری کا تقاضا	۳۱۸
طالوت کے بادشاہ مقرر ہونے کا واقعہ	۳۱۹
اسلام میں حکمرانی کا تصوّر اور حکمران کی خصوصیات	۳۲۰
طالوت کے بادشاہ مقرر ہونے پر بنی اسرائیل کا ردِّ عمل	۳۲۰
طالوت کے من جانب اللہ مقرر ہونے کی نشانی	۳۲۲
متبرک صندوق کی بنی اسرائیل کی طرف واپسی کا قضیہ	۳۲۲
سکینت کا معنی ومفہوم	۳۲۳
آیت نمبر ۲۴۹ تا ۲۵۲	۳۲۴
بنی اسرائیل کا عمالقہ سے جہاد اور اس میں ہمارے لیے اسباق	۳۲۴
• عمالقہ سے جہاد کے لیے بنی اسرائیل کا امتحان	۳۲۵
• طالوت کا اپنے لشکر سے خطاب اور آزمائش کی اطلاع	۳۲۶
• آزمائش میں پورے نہ اترنے والوں کی کم ہمتی	۳۲۷
• آزمائش میں کامیاب ہونے والوں کی ایمان افروز گفتگو	۳۲۸
• اللہ تعالیٰ سے ملنے کی امید؛ ایک اہم صفت	۳۲۹
• صبر واستقلال کی دعا پر مشتمل ایک عجیب جملہ	۳۲۹
• ہر جائز مقصد میں کامیابی کے لیے کرنے کے دو کام	۳۳۰
• داؤد علیہ السلام کے ہاتھوں جالوت کا قتل	۳۳۰
• جہاد کی مشروعیت اور اس کی حکمت	۳۳۲
• سابقہ واقعات کا بیان درحقیقت نبوّت کی دلیل ہے	۳۳۲
• طالوت وجالوت کے واقعہ سے حاصل شدہ بصائر وعبر	۳۳۴
آیت ۲۵۳ تا ۲۵۴	۳۳۶
ربطِ آیات اور جہاد وانفاق کے مضامین بیان کرنے کی وجہ	۳۳۷
نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تسلّی کا مضمون	۳۳۷
انبیائے کرام علیہم السلام میں سے بعض کو بعض پر فضیلت	۳۳۸
نبیِ برحق کی رسالت سے انکار اور اس کی وجوہات	۳۳۹
ایمان میں اختیار دینے سے مقصود آزمائش ہے	۳۴۱
قرآنِ کریم میں انفاق کا مفہوم وتصوّر	۳۴۲

مضمون	صفحہ
مال کمانے میں ہمارا اپنا کوئی کمال نہیں	۳۴۳
قیامت کے دن سے پہلے پہلے خرچ کرنے کی تلقین	۳۴۳
آیت الکرسی: بت پرستوں کے عقیدے کی نفی میں توحید کی ایک عظیم الشان آیت	۳۴۴
• آیت الکرسی کے خاص خاص فضائل	۳۴۵
• آیت الکرسی کو قرآنِ کریم کی سب سے عظیم آیت قرار دینے کی وجہ	۳۴۶
• آیت نمبر ۲۵۵ (آیت الکرسی)	۳۴۷
• اللہ تعالیٰ کی صفات ''اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ'' کا مطلب	۳۴۸
• کسی بھی انسان کو قیوم کہنا جائز نہیں	۳۴۹
• اللہ تعالیٰ اونگھ اور نیند سے پاک ذات ہے	۳۵۰
• حکمِ الٰہی کے بغیر سفارش کا اہل نہ ہونے کا مطلب اور اس کی تفصیل	۳۵۱
• باری تعالیٰ کا علم پوری کائنات کو محیط ہے	۳۵۴
• اللہ تعالیٰ کے علم کی حقیقت تک کوئی نہیں پہنچ سکتا	۳۵۵
• اللہ تعالیٰ کی کرسی کی حقیقت	۳۵۶
آیت نمبر ۲۵۶ تا ۲۵۷	۳۵۸
دین کے معاملات میں کوئی زبردستی نہیں ہے	۳۵۸
کسی بھی انسان کو اسلام لانے پر مجبور نہیں کیا جاسکتا	۳۵۹

مضمون	صفحہ
اسلام کا حق ہونا دلائل سے ثابت شدہ ہے	۳۶۱
طاغوت کے لفظ کا مفہوم اور اس کے مصداقات	۳۶۱
ایمان کا کنڈا تھامے رکھنے کی تلقین	۳۶۳
اللہ تعالیٰ ایمان والوں کا ولی ہے	۳۶۴
آیت نمبر ۲۵۸	۳۶۵
ایمان والوں کی رکھوالی اور مدد کے تین واقعات	۳۶۵
حضرت ابراہیم علیہ السلام کا نمرود کے ساتھ مباحثہ	۳۶۶
عہدہ ومنصب ملنے پر اترانا کم ظرفی کی بات ہے	۳۶۷
نمرود کی کج فہمی اور ابراہیم علیہ السلام کی مضبوط دلیل	۳۶۷
آیت نمبر ۲۵۹ تا ۲۶۰	۳۶۸
دنیا میں مُردوں کو زندہ کرنے کا مشاہدہ	۳۷۰
مذکورہ واقعہ میں شخصیت اور بستی کی تعیین	۳۷۱
برزخ کی زندگی بہت تیزی سے گزرنے والی ہے	۳۷۱
زندگی اور موت سے متعلق قدرتِ الٰہی کی نشانیوں کا مظاہرہ	۳۷۲
حضرت ابراہیم علیہ السلام کا مُردوں کے زندہ ہونے کی کیفیت دیکھنے کا سوال	۳۷۴
بعث بعد الموت کی کیفیت کا عملی مظاہرہ	۳۷۵
پرندوں کے دوڑتے ہوئے آنے میں حکمت	۳۷۶

مضمون	صفحہ
انبیائے کرام علیہم السلام کو بعض غیبی حقائق کا مشاہدہ	۳۷۶
خلافِ عادت باتوں کے منکرین کی دور از کار تاویل	۳۷۷
ماقبل سے ربط اور آئندہ آیات کے مضامین	۳۷۸
آیت نمبر ۲۶۱ تا ۲۶۶	۳۷۸
انفاق فی سبیل اللہ کی فضیلت، قبولیت کی شرائط اور قبولیت سے مانع اُمور	۳۷۸
● انفاق سے متعلق مضامین کا خلاصہ اور اس کے مصداقات	۳۸۰
● اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کرنے والوں کی فضیلت اور مثال	۳۸۱
● انفاق فی سبیل اللہ کی قبولیت کی شرائط	۳۸۲
● مالِ حرام کی صورتیں اور اسے صدقہ کرنے کا حکم	۳۸۳
● سود کی رقم صدقہ کرنے اور غریب کے لیے لینے کا حکم	۳۸۴
● صدقہ کی قبولیت سے مانع امور	۳۸۵
● صدقہ دے کر برا طرزِ عمل اپنانے سے بھلی بات بہتر ہے	۳۸۷
● صدقات کو خراب کرنے والی چیزوں سے بچنے کی تاکیدِ مزید	۳۸۸
● نام ونمود کی خاطر مال خرچ کرنے کا وبال	۳۸۸

مضمون	صفحہ
● تحفہ وہدیہ دیتے ہوئے اپنا جائزہ لینے کی ضرورت	۳۸۹
● احسان، تکلیف یا دکھاوے کے لیے صدقہ دینے کی مثال	۳۸۹
● رضائے الٰہی کے لیے مال خرچ کرنے والوں کی مثال	۳۹۰
● خلافِ شرائط مال خرچ کرنے کا نقصان	۳۹۱
آیت نمبر ۲۶۷ تا ۲۷۴	۳۹۲
صدقہ کے آداب واحکام اور چند اہم مسائل	۳۹۲
● رضائے الٰہی کے لیے مال خرچ کرنے کے مزید فضائل واحکام	۳۹۵
● اپنی ساری کمائی میں سے کچھ راہِ خدا میں خرچ کرنے کا حکم	۳۹۵
● صدقاتِ واجبہ ونافلہ؛ دونوں کی ادائیگی اپنی جگہ اہم ہے	۳۹۶
● پیداوار میں عشر یا نصفِ عشر کی ادائیگی کا حکم	۳۹۶
● پاکیزہ کمائی کا مفہوم اور اس میں سے صدقہ کرنے کا حکم	۳۹۷
● راہِ خدا میں گھٹیا چیز دینے سے بچنے کی تلقین	۳۹۸
● مال خرچ کرنے میں شیطان کا ڈراوا اور اللہ تعالیٰ کا وعدہ	۳۹۹
● خرچ کرنے پر مغفرت کے ساتھ ساتھ فضل کا وعدہ	۴۰۰

مضمون	صفحہ
• حکمت و دانائی کی خصوصی نعمت اور اس کے فوائد	۴۰۱
• صدقہ و نذر کی ہر صورت سے باری تعالیٰ واقف ہیں	۴۰۲
• صدقہ مخفی انداز میں کرنا بہتر ہے	۴۰۲
• غیر مسلموں کو نفلی صدقہ دینے کی اجازت	۴۰۴
• اصحابِ صفہ اور ان کی خودداری کی چند صفات	۴۰۵
• حاجت کے باوجود نہ مانگنا پسندیدہ ہے	۴۰۷
• معیشت کے ظاہری اسباب کو چھوڑ کر دینی کام میں لگنے کی شرائط	۴۰۷
• دوسروں کے سامنے اپنی ضرورت ظاہر نہ کرنا ہی اولیٰ ہے	۴۰۹
• کسی کو صدقہ دیتے ہوئے بتانا ضروری نہیں	۴۱۰
• اللہ کی راہ میں خرچ کرنے والوں کے لیے اجرِ عظیم کا وعدہ	۴۱۰
آیت نمبر ۲۷۵ تا ۲۸۱	۴۱۱
سود کی حرمت و حقیقت اور خرابیوں سے متعلق چند اہم مباحث	۴۱۲
۱۔ربا کی تعریف اور حقیقت	۴۱۳
۲۔آخرت میں سود خور کا انجام	۴۱۵
۳۔عذرِ گناہ بدتر از گناہ	۴۱۵
۴۔حکمت بتانے کے بجائے حاکمانہ جواب	۴۱۶
۵۔بیع اور رِبا میں فرق اور اس کی بنیادی وجہ	۴۱۷

مضمون	صفحہ
۶۔تجارتی اور صرفی قرضوں میں فرق کرنا	۴۲۰
• سود حرام ہونے سے پہلے کے معاملات کا حکم	۴۲۱
• گناہ سے توبہ کے بعد بندے کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے	۴۲۲
• ممانعت کے باوجود سود کا ارتکاب کرنے والوں کی سزا	۴۲۲
• سود کو مٹانے اور صدقات کو بڑھانے کی حقیقت	۴۲۳
• سود خور اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا بدترین ناشکرا ہے	۴۲۵
• جہنم کے بعد جنت کا تذکرہ؛ رحمتِ الٰہی کا عظیم مظہر	۴۲۷
• سابقہ سودی معاملات کو ختم کر دینے کا حکم	۴۲۹
• سود خور کے خلاف اللہ اور اس کے رسول کا اعلانِ جنگ	۴۳۰
• سود کی معمولی شرح کے جائز سمجھنے کا مغالطہ اور اس کی تردید	۴۳۰
• سود نہ چھوڑنے پر اعلانِ جنگ	۴۳۲
• مقروض مفلس کو مہلت دینے کا حکم	۴۳۲
• سود کی حرمت بیان کرنے کے بعد ناصحانہ ترغیب	۴۳۳
آیت نمبر ۲۸۲ تا ۲۸۳	۴۳۴
ادھار خرید و فروخت اور ادھار کے معاملات سے متعلق مسائل	۴۳۶
• دَین اور قرض میں فرق	۴۳۷

مضمون	صفحہ
• معاملات کو ضبطِ تحریر میں لانے کی تاکید و اہمیت	۴۳۸
• دَین کی دستاویز لکھنے والے کاتب کی صفات	۴۳۹
• ادھار کی دستاویز لکھوانے کی ذمہ داری اور اجرت کس پر ہوگی؟	۴۴۰
• جو خود نہ لکھوا سکے، اس کا ولی دستاویز لکھوائے گا	۴۴۱
• دستاویزات پر گواہ بنانے کا حکم اور گواہوں کی شرائط	۴۴۲
• گواہی میں دو عورتیں مقرر کرنے کی حکمت اور متعلقہ احکام	۴۴۳
• گواہوں کو گواہی سے انکار نہیں کرنا چاہیے	۴۴۴
• گواہوں کا تحفّظ اور موجودہ ابتر صورتحال	۴۴۴
• معاملات کی دستاویزات لکھنے والے کاتبوں کو نصیحت	۴۴۵
• خرید و فروخت کے عام معاملات میں گواہ بنانے کا مشورہ	۴۴۶
• واجبُ الاداء حق کی توثیق کے لیے رہن رکھنے کا حکم	۴۴۶
• قرض کے معاملے میں امانت کی پاسداری کی تلقین	۴۴۷
• شہادت/گواہی کو چھپانے کی ممانعت	۴۴۸
آیت نمبر ۲۸۴ تا ۲۸۶	۴۴۹
سورۂ بقرہ کے اختتامی مضامین	۴۵۰

مضمون	صفحہ
تمام صفاتِ الٰہی کی جامع دو صفات	۴۵۱
دل کے ارادوں کا محاسبہ	۴۵۲
سورۂ بقرہ کی آخری دو آیتوں کی اہمیت وعظمت اور فضائل	۴۵۴
• وحیِ الٰہی پر نبی کریم ﷺ کا ایمان اور اس کا مقام	۴۵۵
• ان چیزوں کا بیان جن پر ایمان لانا ضروری ہے	۴۵۶
• اہلِ ایمان کا تمام پیغمبروں پر بلا تفریق ایمان	۴۵۸
• مومنین کی طرف سے عملی زندگی میں ایمان کی اتباع	۴۵۸
• ''غُفْرَانَكَ رَبَّنَا'' میں چند قابلِ توجہ امور	۴۵۹
• اللہ تعالیٰ بندوں کو وسعت سے زیادہ ذمہ داری نہیں سونپتے	۴۶۱
• نیکیوں کے ''کسب'' اور گناہوں کے ''اکتساب'' میں ایک لطیف فرق	۴۶۲
• صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی صفتِ تسلیم و رضا پر اُن کے لیے خوشخبری	۴۶۴
• خطا و نسیان کا فرق اور ان پر معافی کی تلقین	۴۶۵
• وسعت سے زیادہ بوجھ نہ ڈالنے کی دعا اور ایک اشکال کا جواب	۴۶۶
• گناہوں کی مغفرت؛ رحمتِ الٰہی کا عظیم مظہر	۴۷۰

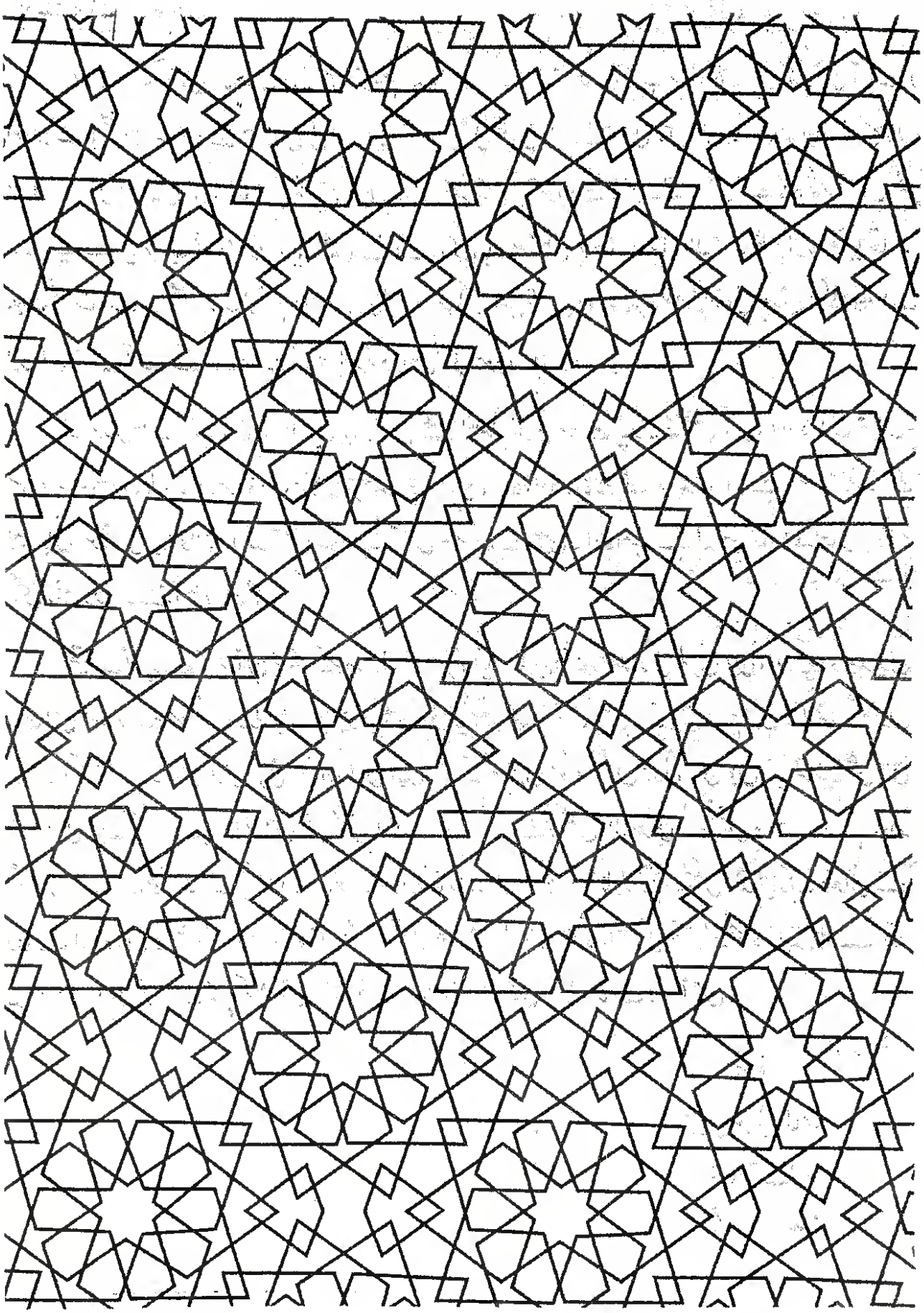

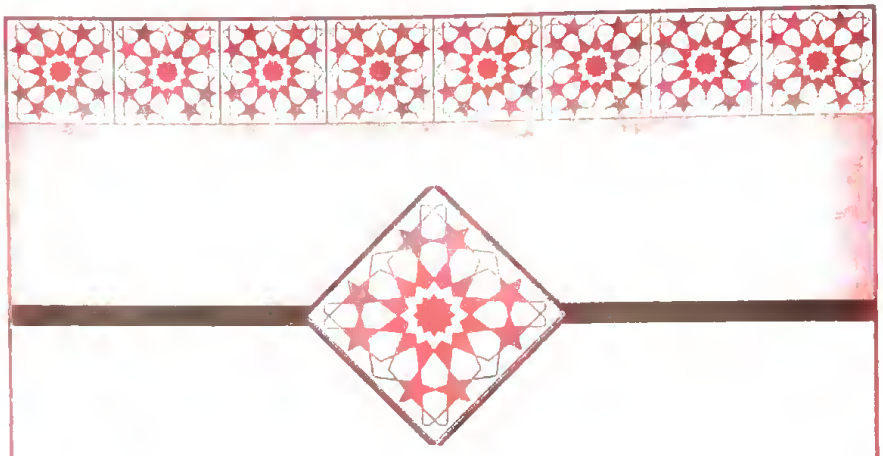

سُورَةُ البَقَرَة

آیت ۱۴۲ تا ۲۸۶

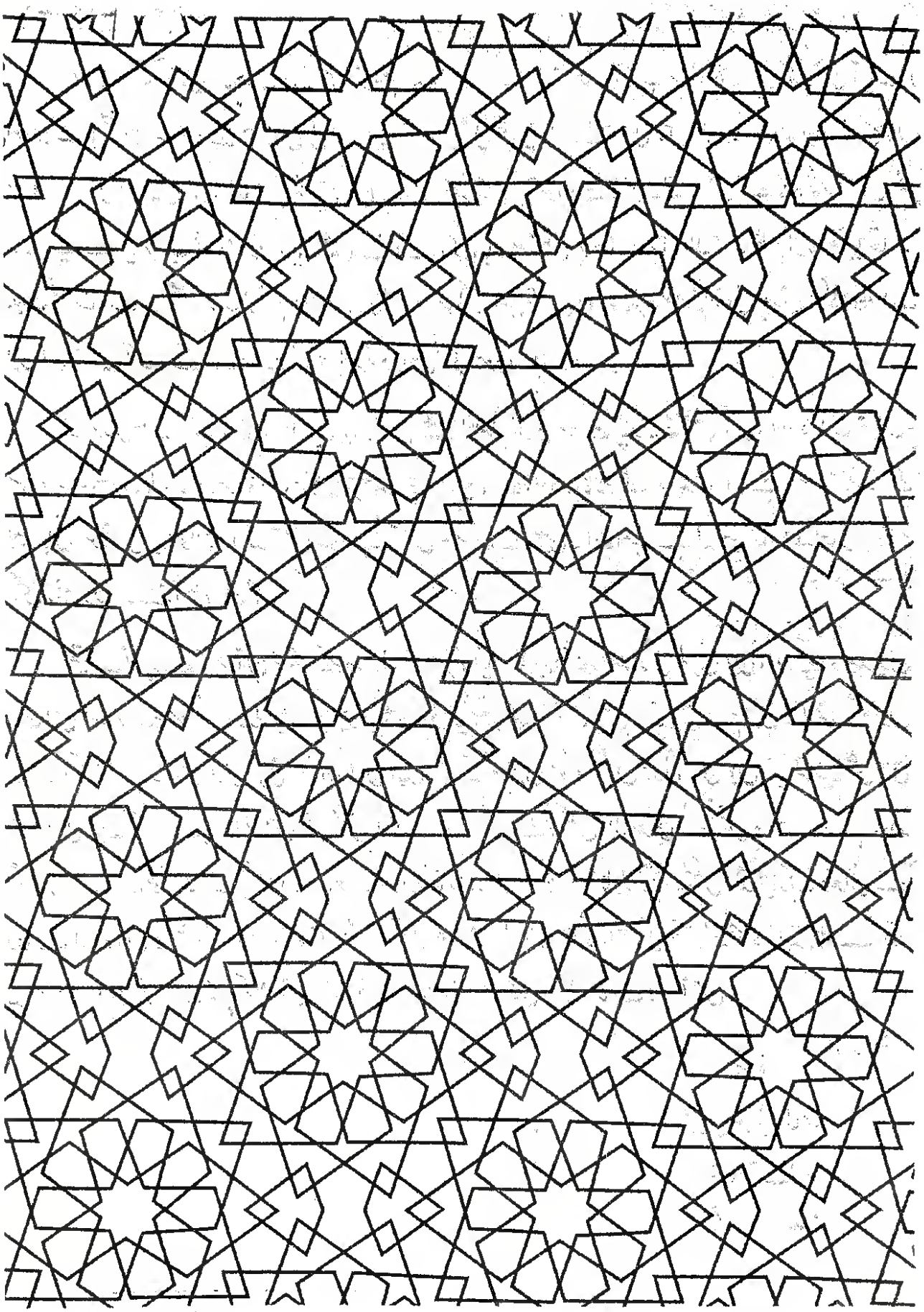

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

آیت نمبر ۱۴۲ تا ۱۵۲

الجزء ۲

سَيَقُوْلُ السُّفَهَآءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلّٰىهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِيْ كَانُوْا عَلَيْهَا ؕ
قُلْ لِّلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ؕ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۱۴۲﴾
وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ
الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ؕ وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِيْ كُنْتَ عَلَيْهَآ اِلَّا لِنَعْلَمَ
مَنْ يَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ مِمَّنْ يَّنْقَلِبُ عَلٰى عَقِبَيْهِ ؕ وَاِنْ كَانَتْ لَكَبِيْرَةً اِلَّا
عَلَى الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ ؕ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ اِيْمَانَكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ
بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۴۳﴾ قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَآءِ ۚ
فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰىهَا ۪ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ وَحَيْثُ
مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ ؕ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَيَعْلَمُوْنَ
اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۴﴾ وَلَئِنْ اَتَيْتَ
الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ بِكُلِّ اٰيَةٍ مَّا تَبِعُوْا قِبْلَتَكَ ۚ وَمَآ اَنْتَ بِتَابِعٍ
قِبْلَتَهُمْ ۚ وَمَا بَعْضُهُمْ بِتَابِعٍ قِبْلَةَ بَعْضٍ ؕ وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ مِّنْۢ
بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ اِنَّكَ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۴۵﴾ اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ
الْكِتٰبَ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ ؕ وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنْهُمْ لَيَكْتُمُوْنَ
الْحَقَّ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۴۶﴾ اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ ﴿۱۴۷﴾ ع

وقف لازم
وقف منزل

وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيْهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ ؕ اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا يَاْتِ بِكُمُ
اللّٰهُ جَمِيْعًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۴۸﴾ وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ
وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ وَاِنَّهٗ لَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ ؕ وَمَا اللّٰهُ
بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۹﴾ وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ
الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ ۙ لِئَلَّا يَكُوْنَ
لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ حُجَّةٌ ۙ اِلَّا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِيْ ۙ
وَلِاُتِمَّ نِعْمَتِيْ عَلَيْكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿۱۵۰﴾ ۙ كَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلًا
مِّنْكُمْ يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا وَيُزَكِّيْكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ
وَيُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۵۱﴾ ۚ فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوْا لِيْ وَ
لَا تَكْفُرُوْنِ ﴿۱۵۲﴾ ع

وقف النبی صلی اللہ علیہ وسلم

ع ۱۸ ۵ ۲

اب یہ بے وقوف لوگ کہیں گے کہ آخر وہ کیا چیز ہے جس نے اِن (مسلمانوں) کو اپنے اُس قبلے سے رُخ پھیرنے پر آمادہ کردیا جس کی طرف وہ منہ کرتے چلے آرہے تھے؟ آپ کہہ دیجیے کہ مشرق اور مغرب سب اللہ ہی کی ہیں، وہ جس کو چاہتا ہے سیدھی راہ کی ہدایت کر دیتا ہے۔ ﴿۱۴۲﴾ اور (مسلمانو!) اِسی طرح تو ہم نے تم کو ایک معتدل اُمت بنایا ہے تاکہ تم دوسرے لوگوں پر گواہ بنو، اور رسول تم پر گواہ بنے، اور جس قبلے پر تم پہلے کاربند تھے، اُسے ہم نے کسی اور وجہ سے نہیں، بلکہ صرف یہ دیکھنے کے لیے مقرّر کیا تھا کہ کون رسول کا حکم مانتا ہے اور کون اُلٹے پاؤں پھرجاتا ہے؟ اور اِس میں شک نہیں کہ یہ بات تھی بڑی مشکل، لیکن اُن لوگوں کے لیے (ذرا بھی مشکل نہ ہوئی) جن کو اللہ نے ہدایت دے دی تھی، اور اللہ تعالیٰ ایسا نہیں کہ تمہارے ایمان کو ضائع کردے۔ درحقیقت اللہ لوگوں پر بہت شفقت کرنے والا، بڑا مہربان ہے۔ ﴿۱۴۳﴾ (اے پیغمبر!) ہم تمہارے چہرے کو بار بار آسمان کی طرف اُٹھتے ہوئے

دیکھ رہے ہیں، چنانچہ ہم تمہارا رُخ ضرور اُس قبلے کی طرف پھیر دیں گے جو تمہیں پسند ہے۔ لو اَب اپنا رُخ مسجدِ حرام کی سمت کرلو۔ اور (آئندہ) جہاں کہیں تم ہو اپنے چہروں کا رُخ (نماز پڑھتے ہوئے) اُسی کی طرف رکھا کرو، اور جن لوگوں کو کتاب دی گئی ہے وہ خوب جانتے ہیں کہ یہی بات حق ہے جو ان کے پروردگار کی طرف سے آئی ہے، اور جو کچھ یہ کر رہے ہیں، اللہ اُس سے غافل نہیں ہے۔ ﴿۱۴۴﴾ اور جن لوگوں کو کتاب دی گئی تھی اگر تم ان کے پاس ہر قسم کی نشانیاں لے آؤ، تب بھی یہ تمہارے قبلے کی پیروی نہیں کریں گے اور نہ تم ان کے قبلے پر عمل کرنے والے ہو، نہ یہ ایک دوسرے کے قبلے پر عمل کرنے والے ہیں، اور جو علم تمہارے پاس آچکا ہے اس کے بعد اگر کہیں تم نے ان کی خواہشات کی پیروی کرلی تو اس صورت میں یقیناً تمہارا شمار ظالموں میں ہوگا۔ ﴿۱۴۵﴾ جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی ہے وہ اسے اتنی اچھی طرح پہچانتے ہیں جیسے اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں، اور یقین جانو کہ ان میں سے کچھ لوگوں نے حق کو جان بوجھ کر چھپا رکھا ہے۔ ﴿۱۴۶﴾ اور حق وہی ہے جو تمہارے پروردگار کی طرف سے آیا ہے، لہٰذا شک کرنے والوں میں ہرگز شامل نہ ہوجانا۔ ﴿۱۴۷﴾ اور ہر گروہ کی ایک سمت ہے جس کی طرف وہ رُخ کرتا ہے، لہٰذا تم نیک کاموں میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرو۔ تم جہاں بھی ہوگے، اللہ تم سب کو (اپنے پاس) لے آئے گا۔ یقیناً اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ ﴿۱۴۸﴾ اور تم جہاں سے بھی (سفر کے لیے) نکلو، اپنا منہ (نماز کے وقت) مسجدِ حرام کی طرف کرو۔ اور یقیناً یہی بات حق ہے جو تمہارے پروردگار کی طرف سے آئی ہے۔ اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اُس سے بے خبر نہیں ہے۔ ﴿۱۴۹﴾ اور جہاں سے بھی تم نکلو، اپنا منہ مسجدِ حرام کی طرف کرو، اور تم جہاں کہیں ہو، اپنے چہرے اُسی کی طرف رکھو، تاکہ لوگوں کو تمہارے خلاف حُجّت بازی کا موقع نہ ملے البتہ اُن میں جو لوگ ظلم کے خوگر ہیں، (وہ کبھی خاموش نہ ہوں گے) سو اُن کا کچھ خوف نہ رکھو، ہاں میرا خوف رکھو اور تاکہ میں تم پر اپنا اِنعام مکمل کردوں، اور تاکہ تم ہدایت حاصل کرلو۔ ﴿۱۵۰﴾ (یہ انعام ایسا ہی ہے) جیسے ہم نے تمہارے درمیان تم ہی میں سے ایک رسول بھیجا جو تمہارے سامنے ہماری آیتوں کی

تلاوت کرتا ہے، اور تمہیں پاکیزہ بناتا ہے، اور تمہیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے، اور تمہیں وہ باتیں سکھاتا ہے جو تم نہیں جانتے تھے، (۱۵۱) لہٰذا مجھے یاد کرو، میں تمہیں یاد رکھوں گا، اور میرا شکر ادا کرو، اور میری ناشکری نہ کرو۔ (۱۵۲)

گذشتہ آیات سے ربط اور پیشِ نظر رکوع کا مضمون

یہ دوسرے پارے کے پہلے دو رکوع ہیں اور ان میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے قبلے کے بارے میں ضروری احکام اور ہدایات عطا فرمانے کے ساتھ ساتھ تحویلِ قبلہ (قبلہ کی تبدیلی) سے پیدا ہونے والے بعض مسائل کا تذکرہ فرمایا ہے۔ ان آیات کا پچھلی آیات سے ربط یہ ہے کہ پہلے پارے کے آخری حصے میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے خاص طور پر حضرت ابراہیم علیہ السلام، ان کی ملّت اور ان کے دین کا ذکر فرمایا ہے اور بتایا ہے کہ چاہے وہ مکّہ مکرمہ کے بُت پرست ہوں یا یہودی اور نصرانی، وہ سب کے سب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو زبانی طور پر اپنا پیشوا مانتے تھے، پھر ان کے بارے میں یہ تفصیل بھی بیان کردی گئی کہ وہ درحقیقت توحید کے قائل تھے اور انہوں نے توحید ہی کے دین کی تبلیغ فرمائی۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خود نبی کریم سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تشریف آوری کی بھی دعا کی تھی اور آپ کے مقاصدِ بعثت لوگوں کے سامنے بیان کیے تھے۔ اب اللہ تبارک وتعالیٰ کی مشیت اور حکمت کا تقاضا یہ تھا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جو امامت کا منصب عطا کیا گیا تھا، وہ بنو اسماعیل کے خاندان میں سے نبی کریم سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو عطا کیا جائے اور اسی کا ایک حصہ یہ بھی تھا کہ وہ کعبہ جو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تعمیر فرمایا تھا، اس کی طرف لوگوں کو رُخ کرکے عبادت کرنے کا حکم دیا جائے، چنانچہ مذکورہ بالا آیاتِ مبارکہ میں بیت المقدس کے بجائے بیت اللہ کی طرف رُخ کرنے اور قبلہ تبدیل کرنے کے احکام اور ان سے پیدا شدہ مسائل کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے، ان آیات کو اسی پسِ منظر میں سمجھنا چاہیے۔

بیت اللہ کو قبلہ بنانے کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اشتیاق

پہلے یہ سمجھ لینا چاہیے کہ نبی کریم سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب مبعوث ہوئے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو نماز پڑھنے کا حکم دیا گیا، تو آپ کا معمول یہ تھا کہ جس معاملے میں آپ کو براہِ راست وحی کے ذریعے کوئی معیّن حکم نہیں دیا جاتا تھا تو اس کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بُت پرستوں کے طریقے کے مقابلے میں اپنے سے پہلے والے

اہلِ کتاب، یعنی یہودیوں اور نصرانیوں کے طریقے کو اختیار کرنا زیادہ بہتر سمجھتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ مذاہب درحقیقت ایک آسمانی کتاب پر مبنی تھے، چاہے انہوں نے اس میں بہت سی تحریفات کرڈالی ہوں، لیکن ان کی بنیاد تورات اور انجیل تھی، جو اللہ تعالیٰ کی آسمانی کتابیں تھیں۔ اس لیے جب آپ ﷺ نے یہ دیکھا کہ اہلِ کتاب اپنی عبادتوں کے دوران بیت المقدس کی طرف رُخ کرتے ہیں، تو آپ ﷺ نے بھی یہ محسوس فرمایا کہ بیت المقدس کی طرف رُخ کرنا بہتر ہوگا، لیکن چونکہ آپ ﷺ کو معلوم تھا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بیت اللہ تعمیر فرمایا تھا اور اللہ تعالیٰ نے اسے اپنا گھر قرار دیا تھا، لہٰذا ساتھ ہی آپ کے دل میں اس کی طرف رُخ کرنے کا داعیہ بھی موجود تھا۔

مکّہ مکرمہ میں آپ ﷺ عام طور سے اس طرح نمازیں پڑھا کرتے تھے کہ آپ کا رُخ بیت اللہ اور بیت المقدس دونوں کی طرف ہوجائے۔ بیت المقدس مکّہ مکرمہ میں شمال کی طرف تھا، اس لیے آپ ﷺ بیت اللہ کے جنوبی حصے کے سامنے کھڑے ہوکر شمال کی طرف رُخ کرکے نماز پڑھا کرتے تھے، تاکہ آپ کا رُخ بیت اللہ کی طرف بھی ہوجائے اور ساتھ ساتھ بیت المقدس کی طرف بھی ہوجائے۔

پھر جب آپ ﷺ مدینہ منوّرہ تشریف لے آئے، تو اس وقت یہ ممکن نہیں تھا کہ آپ بیت اللہ کا بھی رُخ کریں اور بیت المقدس کی طرف بھی رُخ کریں، کیونکہ بیت اللہ مدینہ منوّرہ کے جنوب میں واقع تھا اور بیت المقدس شمال میں، لہٰذا دونوں کی طرف بیک وقت رُخ کرنا ممکن نہیں تھا، البتہ چونکہ اس وقت آپ ﷺ نے یہ سمجھا تھا کہ بیت المقدس اہلِ کتاب کا قبلہ ہے تو جب تک کوئی معیّن حکم نہ آئے، اس وقت تک بیت المقدس ہی کی طرف رُخ کرنا چاہیے۔ اس کے علاوہ اس کے بارے میں آپ ﷺ پر وحی بھی نازل ہوئی تھی کہ فی الحال آپ بیت المقدس کی طرف رُخ کریں، جیسا کہ اسی رکوع میں آنے والی ایک آیت[1] میں آنے والا ہے کہ آپ ﷺ کو اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے بیت المقدس کی طرف رُخ کرکے نماز پڑھنے کا حکم دیا گیا تھا، چنانچہ آپ ﷺ نے بیت المقدس کی طرف رُخ کرکے نماز پڑھنی شروع کی اور بخاری شریف کی روایت کے مطابق سولہ یا سترہ مہینے[2] تک آپ ﷺ بیت المقدس کی طرف رُخ کرکے نماز پڑھتے رہے۔

---

(۱) ﴿وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِي كُنْتَ عَلَيْهَا إِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَتَّبِعُ الرَّسُولَ مِمَّنْ يَنْقَلِبُ عَلَى عَقِبَيْهِ﴾ [البقرة: ۱۴۳]

(۲) كما في صحيح البخاري (۱/۱۷) (۴۰): "صلى قبل بيت المقدس ستة عشر شهراً، أو سبعة عشر شهرا، وكان يعجبه أن تكون قبلته قبل البيت." كتاب الإيمان، باب الصلاة من الإيمان.

اس کے بعد اب اللہ تبارک وتعالیٰ کی حکمت کا تقاضا یہ تھا کہ قبلہ میں تبدیلی کی جائے اور بیت المقدس کے بجائے کعبہ کی طرف رُخ کیا جائے۔ خود نبیِ کریم سرورِ دو عالم ﷺ کی خواہش بھی یہی تھی اور آپ ﷺ کو اس بات کا انتظار بھی تھا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے یہ حکم آجائے کہ اب بیت المقدس کے بجائے بیت اللہ کو قبلہ قرار دیا جائے، چنانچہ بعض اوقات اس انتظار اور اشتیاق میں آپ ﷺ بار بار آسمان کی طرف چہرہ اٹھا کر دیکھا کرتے تھے کہ شاید اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی وحی آرہی ہو جو ہمیں قبلہ بدلنے کا حکم دے دے۔

مشرق ہو یا مغرب وہ اللہ ہی کی ملکیت ہے

اب یہاں پر شروع کی آیات میں اللہ تبارک وتعالیٰ پہلے تو یہ بیان فرمارہے ہیں کہ ہم آپ کے اشتیاق و انتظار اور آپ کی مرضی کے مطابق بیت اللہ کو قبلہ بنانے کا حکم دینے والے ہیں، لیکن اس سے پہلے آپ کو آگاہ کیا جارہا ہے کہ جب قبلہ تبدیل ہونے کا یہ واقعہ ہوگا تو یہ بے وقوف لوگ، یعنی یہودی اور نصرانی اعتراض کریں گے اور طعنے دیتے ہوئے کہیں گے کہ دیکھو! یہ عجیب قسم کا دین ہے جس میں قبلہ ہی متعین نہیں، کبھی جنوب کی طرف رُخ کرنے کا حکم دیا جاتا ہے، کبھی شمال کی طرف رُخ کرنے کا حکم دیا جاتا ہے۔

چنانچہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے پہلی آیت میں فرمایا کہ جب قبلہ کو تبدیل کرنے کا حکم آجائے گا تو اس وقت ﴿سَیَقُوْلُ السُّفَهَآءُ مِنَ النَّاسِ﴾ یہ بے وقوف لوگ یہ کہیں گے یا یہ اعتراض کریں گے کہ ﴿مَا وَلّٰىهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِیْ كَانُوْا عَلَیْهَا﴾ ''وہ کون سی چیز ہے جس نے ان (مسلمانوں) کو اپنے اس قبلے سے رُخ پھیرنے پر آمادہ کردیا جس پر وہ چلے آرہے تھے۔'' اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس کے جواب میں فرمایا: ﴿قُلْ لِّلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَ الْمَغْرِبُ﴾ ''کہہ دو مشرق ہو یا مغرب وہ اللہ ہی کی ملکیت ہے۔'' اللہ تعالیٰ کو پورا اختیار حاصل ہے، جس سمت کو چاہیں بطورِ قبلہ مقرّر فرمادیں، کسی کو وجہ دریافت کرنے کا اختیار نہیں۔

عبادت کے لیے ایک خاص سمت متعین کرنے کی حکمت

اللہ تبارک وتعالیٰ نے ﴿قُلْ لِّلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَ الْمَغْرِبُ﴾ والے اس جملے میں ایک عظیم حقیقت بیان فرمائی ہے، جس کا قبلے کے حوالے سے ذہن میں رکھنا بڑا ضروری ہے، اور دراصل اسی حقیقت کو واضح کرنے کے لیے قبلے کی تبدیلی کا حکم دیا گیا ہے۔

اس حقیقت کی تفصیل یہ ہے کہ جب کسی قبلے کی طرف رُخ کر کے عبادت کی جاتی ہے، تو عبادت اس قبلے کی نہیں کی جاتی، بلکہ عبادت تو ذاتِ باری تعالیٰ کی کرنی مقصود ہوتی ہے جو ہر جگہ موجود ہے، وہ کسی خاص سمت کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ وہ مشرق میں بھی ہے، مغرب میں بھی ہے، شمال میں بھی ہے اور جنوب میں بھی ہے، لیکن چونکہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنے کے لیے یکسوئی کی ضرورت ہے، لہٰذا یہ یکسوئی پیدا کرنے کے لیے قبلہ متعین کر دیا جاتا ہے۔

نیز مقصد یہ بھی ہے کہ ایک ہی دین کے ماننے والے اور ایک ہی رسول کے امتی جب اجتماعی عبادتیں کریں، تو ان کا رُخ کسی ایک سمت ہو، تاکہ اجتماعیت اور وحدت پیدا ہو سکے۔ ان مقاصد کے پیشِ نظر عبادت کے لیے کسی خاص سمت کو متعین کیا گیا ہے۔ یہ اس لیے نہیں کیا گیا کہ وہ سمت بذاتِ خود قابلِ تعظیم یا قابلِ عبادت ہے، عبادت تو بلاشبہ اللہ تعالیٰ ہی کی ہے۔ قبلہ کو بذاتِ خود معبود سمجھنا شرک ہے، معبود تو اللہ تعالیٰ ہی ہیں، لیکن اس کی عبادت کرنے کے لیے کسی سمت کو متعین کر دیا جاتا ہے تاکہ یکسوئی اور وحدت کے ساتھ پوری امّت اجتماعی طور پر عبادت کر سکے، ان آیات سے ایک تو یہ پہلی حقیقت بیان کرنا مقصود ہے۔

تحویلِ قبلہ کا حکم دینے کی حکمت

اللہ تبارک وتعالیٰ فرما رہے ہیں کہ ہم نے جو قبلہ بدلا ہے، اسے بدلنے کی بہت بڑی وجہ یہ ہے کہ تم پر یہ حقیقت واضح ہو جائے کہ کسی بھی سمت میں اپنا کوئی ذاتی تقدّس نہیں ہے۔ جب تمہیں بیت المقدس کی طرف رُخ کرنے کا حکم دیا گیا تھا تو اس وجہ سے نہیں کہ بیت المقدس بذاتِ خود تقدّس رکھتا تھا، بلکہ اس بنا پر کہ ہم نے حکم دیا تھا، لہٰذا ہمارے حکم کے تحت اس میں تقدّس پیدا ہو گیا تھا۔ اب ہم جو قبلہ بدل رہے ہیں وہ بھی اس حقیقت کو پوری طرح واضح کرنے کے لیے بدل رہے ہیں، اب ہمارا حکم بیت المقدس کی بجائے بیت اللہ کی طرف رُخ کرنے کا آرہا ہے، تو قبلے کے معاملے میں اب اس میں وہ تقدّس پیدا ہو گیا ہے جو کبھی بیت المقدس میں تھا۔

اللہ تعالیٰ اپنی حکمت کے مطابق جب چاہے، جس سمت کو چاہے قبلہ قرار دے سکتا ہے، ایک مومن کا سیدھا راستہ یہ ہے کہ وہ اس حقیقت کو سمجھ کر اللہ کے ہر حکم کے آگے سرِ تسلیم خم کر دے۔ آیت کے آخر میں سیدھی راہ کا جو ذکر ہے اس سے مراد اسی حقیقت کا اِدراک ہے، چنانچہ فرمایا: ﴿يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ

مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۱۴۲﴾ ''اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے سیدھے راستے کی ہدایت دے دیتا ہے،'' تو اس سیدھے راستے کی ہدایت کے لیے ہم نے تمہیں بیت اللہ کی طرف رُخ کرنے کا حکم دیا ہے۔

امتِ محمدیہ؛ ایک معتدل امت

اس کے بعد اللہ تبارک وتعالیٰ نے مسلمانوں سے خطاب کرکے ارشاد فرمایا: ﴿وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا﴾ اور اسی طرح تو ہم نے تم کو ایک معتدل امّت بنایا ہے ﴿لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ﴾ تاکہ تم دوسرے لوگوں پر گواہ بنو ﴿وَ يَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا﴾ ''اور رسول تم پر گواہ بنیں۔''

یہ اُمّتِ مسلمہ کو خطاب ہے کہ جس طرح ہم نے اس آخری زمانے میں دوسری تمام جہتوں کو چھوڑ کر کعبے کی سمت کو قبلہ بننے کا شرف عطا فرمایا اور تمہیں اسے دل وجان سے قبول کرنے کی ہدایت دی ہے، اسی طرح ہم نے تم کو دوسری امتوں کے مقابلے میں ایک خاص امتیازی فضیلت یہ عطا کی ہے کہ تمہیں سب سے زیادہ معتدل اور متوازن امّت بنایا ہے، چنانچہ اس امّت کی شریعت میں ایسے مناسب احکام رکھے گئے ہیں جو قیامِ قیامت تک انسانیت کی صحیح رہنمائی کرسکیں۔

یہ جملہ قبلہ کے احکام کے عین درمیان نازل فرمایا ہے۔ پہلے بھی قبلے کا ذکر تھا اور بعد میں بھی قبلے کا ذکر آنے والا ہے، اس کے درمیان اللہ تبارک وتعالیٰ نے اُمّتِ محمدیہ کو خطاب کرکے فرمادیا کہ ''اسی طرح تو ہم نے تم کو ایک معتدل امّت بنایا ہے۔'' یہاں ''اسی طرح'' کہنے سے اشارہ اس طرف ہے کہ جس طرح دوسری تمام سمتوں کو چھوڑ کر اللہ تبارک وتعالیٰ نے اب ہمیشہ کے لیے کعبے کو سمتِ قبلہ بنادیا، اسی طرح اب دیگر ساری امتوں کا نظام ختم کرکے اور ان کی شریعتوں کو بحیثیتِ مجموعی منسوخ کرکے اب تمہاری شریعت کو اور نبیِ کریم سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیروی کو ساری دنیا کے لیے لازم کردیا ہے اور تمہیں ایسے احکام عطا فرمائے ہیں جس کی بنا پر تم معتدل امّت کہلانے کے مستحق ہو۔

امتِ محمدیہ کے معتدل امّت ہونے کا مطلب

''وَسَط'' کے لفظی معنی عربی زبان میں بیچوں بیچ کے ہوتے ہیں، یعنی کسی بھی چیز کے عین درمیان میں جو جگہ ہوتی ہے اسے ''وَسَط'' کہا جاتا ہے نبیِ کریم سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اُمّت کو اُمّتِ وَسَط کہنے کی وجہ یہ ہے کہ اُمّتِ محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے اعتدال کی ایک ایسی صفت عطا فرمائی ہے جو کسی اور اُمّت کو

نہیں ملی، اسے دیے ہوئے احکام دوسری شریعتوں کے مقابلے میں زیادہ معتدل ہیں، ان میں کسی قسم کی کوئی کمی زیادتی یا اِفراط وتفریط نہیں ہے۔

ایک تو اس اُمّت کو جو احکام دیے گئے ہیں، وہ معتدل ہیں اور اس میں مختلف پہلوؤں کی رعایتیں بھی رکھی گئی ہیں اور دوسری طرف یہ اُمّت پچھلی دوسری اُمتوں کے مقابلے میں اس لحاظ سے بھی معتدل ہے کہ پچھلے انبیائے کرام علیہم السلام کی اُمتوں میں بعض تو وہ تھے جنہوں نے اپنے پیغمبروں کی نہ صرف تکذیب کی، بلکہ ان کی توہین بھی کی، بعض اوقات ان کو قتل کرنے تک کا ارتکاب کیا، جیسا کہ بنی اسرائیل میں ہوا۔ جبکہ بعض لوگ وہ تھے جنہوں نے اپنے پیغمبر کو حرمت و تقدّس اور تعظیم وتکریم میں اتنا بڑھایا اور اس میں اتنا مبالغہ کیا کہ انہیں خدائی کے درجے تک پہنچادیا، جیسا کہ نصاریٰ نے کیا۔

دیگر اُمتوں کے اس طرزِ عمل کے مقابلے میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے اُمّتِ محمدیہ سے فرمایا کہ ہم نے تم کو ایک ایسی معتدل امّت بنایا ہے جو نہ افراط میں مبتلا ہے نہ تفریط میں۔ تمہاری اُمّت پچھلے لوگوں کے مقابلے میں ہر اعتبار سے معتدل ہے، یعنی اعتدال کے ساتھ چلنے والی ہے۔ یہ اُمّت اپنے پیغمبر کا ضروری احترام بھی پورا کرتی ہے، اپنے پیغمبر کو دل وجان سے عزیز بھی رکھتی ہے اور اپنے پیغمبر کے احکام پر دل و جان سے عمل بھی کرتی ہے، لیکن انہیں حرمت و تقدّس میں اتنا نہیں بڑھاتی کہ خدائی کے درجے تک پہنچا دے۔ خود اسی پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے تمہیں کہہ دیا ہے کہ:

لاَ تُطْرُونِي، كَمَا أَطْرَتِ النَّصَارَى ابْنَ مَرْيَمَ.(۱)

میری تعریف میں اتنا مبالغہ نہ کرو جیسا کہ نصرانیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعریف میں مبالغہ کیا (اور انہیں خدا بنا دیا تھا۔)

اس سے پہلے جن لوگوں نے بیت المقدس کو قبلہ بنایا تھا، انہوں نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہی بنایا تھا، لیکن وہ یہ سمجھ بیٹھے کہ قبلے کی سمت میں بذاتِ خود کوئی تقدّس اور عظمت ہے، لہٰذا جب اللہ تعالیٰ کا حکم آیا کہ قبلہ بدل دو تو انہوں نے اعتراضات شروع کردیے، لیکن ہم تم سے یہ قبلہ بدلوا کر تمہارا یہ طرزِ عمل ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ تم معتدِل اُمّت ہو۔ جب حکم آئے گا تو اس وقت جس چیز کو مقدّس قرار دیا جائے گا، تم اس حکم کی تعمیل میں، اسی کو مقدّس قرار دوگے اور جب اس حکم کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے واپس لیا جائے گا اور اس کی جگہ

---

(۱) صحيح البخاري (۱٦٧/٤) (۳٤٤٥) كتاب أحاديث الأنبياء، باب قول الله ﴿وَاذْكُرْ فِي الْكِتَابِ مَرْيَمَ﴾ [مريم: ۱٦]

کوئی دوسرا حکم دیا جائے گا، تو تم اس نئے حکم کی پیروی کرو گے۔ نہ تو ان کی طرح ہوگے جو سمت کو بذاتِ خود مقدّس سمجھ بیٹھے ہیں، اور نہ ان کی طرح ہوگے جو اللہ تعالیٰ کے حکم کی نافرمانی کرتے ہوئے اللہ کے قبلے سے منہ موڑتے ہیں، اس لحاظ سے بھی تم ایک معتدل اُمّت ہو۔

نیز اس اُمّت میں ایک طرف حقوق اللہ کی ادائیگی کے لیے عبادات کے احکام ہیں تو دوسری طرف حقوق العباد یعنی بندوں کے حقوق کے بارے میں بھی تفصیلی ہدایات دی گئی ہیں، اور دونوں میں وہ توازن رکھا گیا ہے کہ ایک پر عمل کرنے سے دوسرے کے تقاضے مجروح نہ ہوں۔

تمام انسانوں کے لیے گواہ بننے والی اُمّت

اللہ تبارک و تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہ اعتدال والی اُمّت ہم نے تمہیں اس لیے بنایا ہے ﴿لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ﴾ ''تاکہ تم تمام انسانوں کے لیے گواہ بنو'' تمام انسانوں کے لیے گواہ بننے کے دو معنیٰ ہیں؛ ایک معنیٰ دنیا میں دوسرے تمام انسانوں کے سامنے گواہ بننا ہے، اور دوسرے معنیٰ آخرت میں تمام انسانوں کے سامنے گواہی دینا ہے۔

دنیا میں دوسرے تمام انسانوں کے سامنے گواہ بننے کا مطلب یہ ہے کہ یہ اُمّت دوسرے تمام انسانوں کو ہدایت کا راستہ دکھانے کے لیے اور حق کی گواہی دینے کے لیے پیدا کی گئی ہے۔ پہلے جو اُمتیں ہوتی تھیں، ان کے احکام ان کی اپنی قوم کی حد تک محدود ہوتے تھے اور اگر کوئی دعوت یا تبلیغ یا تعلیم ہوتی تو وہ محض اپنی قوم کی حد تک ہی ہوتی تھی، لیکن چونکہ نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کسی خاص قوم کے لیے نہیں، بلکہ پوری انسانیت کے لیے مبعوث ہوئے، لہٰذا آپ کی اُمّت کو بھی اس کام کے لیے مقرّر فرمایا گیا کہ وہ دوسرے تمام انسانوں تک حق کا پیغام پہنچائیں اور حق کی گواہی دیں۔ دنیا میں تو ان کی گواہی یہ ہے کہ وہ سارے انسانوں تک حق کا پیغام پہنچاتے رہیں، جیسا کہ قرآنِ کریم کی دوسری آیت سے بھی معلوم ہوتا ہے جس میں اللہ تبارک تعالیٰ نے فرمایا:

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ (۱)

تم وہ بہترین امّت ہو جو لوگوں کے فائدے کے واسطے پیدا کی گئی ہے۔

دوسری طرف آخرت میں بھی یہ امّت دوسرے لوگوں کے لیے گواہ بنے گی۔ اس کی تفصیل صحیح بخاری کی

(۱) سورۃ آلِ عمران (۳): (۱۱۰)

ایک حدیث (۱) میں بیان ہوئی ہے کہ جب پچھلے انبیاء علیہم السلام کی اُمتوں میں سے کافر لوگ صاف انکار کردیں گے کہ ہمارے پاس کوئی نبی آیا ہی نہیں تھا، تو نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمّت کے لوگ انبیائے کرام کے حق میں گواہی دیں گے کہ انہوں نے رسالت کا حق ادا کرتے ہوئے اپنی اپنی امتوں کو پوری طرح اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچادیا تھا اور اگرچہ ہم خود اس موقع پر موجود نہیں تھے، لیکن ہمارے نبیِ کریم محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم نے وحی سے باخبر ہوکر ہم کو یہ بات بتلادی تھی اور ہمیں ان کی بات پر اپنے ذاتی مشاہدے سے زیادہ بھروسہ ہے۔

دوسری طرف رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی اُمّت کی اس بات کی تصدیق فرمائیں گے، چنانچہ فرمایا گیا: ﴿وَ يَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا﴾ ''اور رسول تم پر گواہ بنیں گے۔'' رسول کے اس اُمّت کے حق میں گواہ بننے کا مطلب یہ ہے کہ نبیِ کریم سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ایک تو دنیا میں اس اُمّت کو راہِ راست دکھائیں گے، ان کی رہنمائی کریں گے اور ان کے سامنے دینِ حق کی گواہی دیں گے اور آخرت میں گواہ بننے کا مطلب یہ ہے کہ نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم آخرت میں اللہ تبارک وتعالیٰ کے سامنے اس بات کی گواہی دیں گے کہ ان لوگوں نے میری بات تسلیم کی تھی، اس پر ایمان لائے تھے اور انہوں نے اس پر عمل کرنے کی کوشش کی تھی۔

قبلے کی تبدیلی کے حکم کے ذریعے اہلِ ایمان کی آزمائش

دوسرے پارے کے شروع سے قبلہ کی بات شروع کی گئی اور پھر بیچ میں جملۂ معترضہ کے طور پر اُمّتِ محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی خصوصیات کا ذکر کیا گیا۔ اب اس کے بعد دوبارہ قبلے کا بیان شروع کرتے ہوئے فرمایا: ﴿وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِيْ كُنْتَ عَلَيْهَآ﴾ اور جس قبلے پر تم پہلے کاربند تھے اسے ہم نے کسی اور وجہ سے نہیں، ﴿اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ مِمَّنْ يَّنْقَلِبُ عَلٰى عَقِبَيْهِ﴾ ''بلکہ صرف یہ دیکھنے کے لیے مقرر کیا تھا کہ کون رسول کا حکم مانتا ہے اور کون الٹے پاؤں پھر جاتا ہے؟''

بیت اللہ کو قبلہ قرار دینے سے پہلے نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم بیت المقدس کی طرف جو رُخ کرتے تھے، وہ بھی اللہ تعالیٰ کے حکم ہی سے کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ فرمارہے ہیں کہ ہم نے تمہیں بیت المقدس کی طرف رُخ کرنے کا جو حکم دیا تھا، وہ درحقیقت اسی وجہ سے دیا تھا تاکہ یہ دیکھا جائے کہ آیا لوگ کسی خاص جہت یا کسی

---

(۱) كما في صحيح البخاري (۱۰۹/۹) (۱۰۷) كتاب الاعتصام بالكتاب والسنة، باب قوله تعالى: ﴿وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا﴾.

خاص رُخ میں ذاتی تقدّس سمجھ کر ہمیشہ اسی کو پلے باندھ لیتے ہیں یا یہ کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے حکم کی تابعداری کو اصل چیز مانتے ہوئے کسی چیز کو قبلہ قرار دیتے ہیں۔ نیز جب انہیں بیت المقدس کی طرف رُخ کرنے کا حکم دیا جارہا ہے، تو اس وقت اس کی طرف رُخ کرتے ہیں یا نہیں؟ اور جب بیت اللہ کی طرف رُخ کرنے کا حکم دیا جارہا ہے تو اس کی طرف رُخ کرتے ہیں یا نہیں؟ دیکھنا یہ تھا کہ آیا وہ اپنے ذاتی خیالات اور خواہشات کے پیچھے چلتے ہیں یا اللہ تبارک وتعالیٰ کے حکم کے مطابق عمل کرتے ہوئے اس کی پیروی کرتے ہیں؟

حدیثِ رسول کے وحیِ الٰہی اور واجبُ الاتباع ہونے کی دلیل

یہاں ایک اور نکتہ قابلِ غور ہے جس سے ایک بہت اہم بات ثابت ہوتی ہے اور وہ یہ کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہاں فرمایا: ﴿وَ مَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِیْ كُنْتَ عَلَیْهَاۤ اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ یَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ مِمَّنْ یَّنْقَلِبُ عَلٰى عَقِبَیْهِ﴾ ''اور جس قبلے پر تم پہلے کاربند تھے، اسے ہم نے کسی اور وجہ سے نہیں، بلکہ صرف یہ دیکھنے کے لیے مقرّر کیا تھا کہ کون رسول کا حکم مانتا ہے اور کون الٹے پاؤں پھر جاتا ہے؟'' اس آیت میں قبلہ سے مراد بیت المقدس ہے اور اللہ تبارک وتعالیٰ فرمارہے ہیں کہ بیت المقدس کو قبلہ ہم نے ہی مقرّر کیا تھا، لیکن پورے قرآنِ کریم میں شروع سے لے کر آخر تک کہیں بھی بیت المقدس کی طرف رُخ کرنے کا یہ حکم مذکور نہیں ہے، اس کے باوجود اللہ تعالیٰ فرمارہے ہیں کہ ''ہم نے وہ مقرّر کیا تھا'' جس سے یہ پتہ چل رہا ہے کہ وہ حکم اللہ تعالیٰ نے ہی دیا تھا۔

اب سوال یہ ہے کہ یہ حکم کہاں اور کیسے دیا گیا تھا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ درحقیقت یہ حکم نبیِ کریم ﷺ کے پاس وحی کے ذریعے آیا تھا، البتہ وہ وحی قرآنِ کریم کے اندر موجود نہیں ہے۔ نبیِ کریم ﷺ نے وحیِ الٰہی کے ذریعے زبانی طور پر یہ حکم صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو دیا اور صحابۂ کرام نے اس پر عمل کیا۔ اس سے یہ بھی پتہ چلا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نبیِ کریم ﷺ پر جو وحی نازل ہوتی تھی وہ دو قسم کی ہے:

- ایک وحی وہ ہے جو قرآنِ کریم کا حصہ بن گئی ہے، اور جسے قرآنِ کریم کے ایک حصے کے طور پر قیامت تک تلاوت کیا جاتا رہے گا، اسے ''وحیِ متلوّ'' (ایسی وحی جس کی تلاوت کی جائے) کہتے ہیں۔
- اور ایک وحی وہ ہے جو قرآنِ کریم کا حصہ تو نہیں بنی، لیکن نبیِ کریم ﷺ کو وحی کے ذریعہ کسی

بات کا حکم دیا گیا یا کوئی بات بتائی گئی پھر آپ ﷺ نے لوگوں کو اپنے الفاظ میں وہ بات بتادی، اسے ''وحیِ غیر متلُوّ'' (یعنی ایسی وحی جس کو تلاوت کے طور پر نہیں پڑھا جاتا) کہتے ہیں۔

جس طرح وحیِ متلُوّ، یعنی قرآنِ کریم کے ذریعے جو وحی نازل ہوئی ہے اس کا اتباع لازم ہے، اسی طرح اس وحی کا اتباع بھی لازم ہے جو نبیِ کریم ﷺ پر نازل ہوئی، لیکن قرآنِ کریم کا حصہ نہیں بنی۔ اس سے معلوم ہوا کہ نبیِ کریم ﷺ کے جو ارشادات ہیں، آپ ﷺ نے جو کچھ بھی تعلیم دی ہے اور جن باتوں کا حکم دیا ہے وہ سب وحیِ غیر متلُوّ کا حصہ ہے اور جس طرح قرآنِ کریم کے احکام واجبُ الاتباع ہیں، اسی طرح نبیِ کریم سرورِ دو عالم ﷺ کے احکام بھی انسان کے لیے واجبُ الاتباع ہیں۔

تحویلِ قبلہ کا حکم؛ ایک مشکل حکم

پھر آگے اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿وَ اِنْ كَانَتْ لَكَبِيْرَةً﴾ ''اور اس میں شک نہیں کہ یہ بات تھی بڑی مشکل،'' یعنی قبلہ بدلنے کا یہ حکم واقعی ایک مشکل امر تھا کیونکہ جو لوگ صدیوں سے بیت اللہ کو قبلہ مانتے آرہے تھے، ان کے لیے اچانک بیت المقدس کی طرف رُخ موڑ دینا کوئی آسان بات نہیں تھی، کیونکہ صدیوں سے دلوں پر حکمرانی کرنے والے اعتقادات کو یکا یک بدل لینا بڑا مشکل ہوتا ہے، لیکن اس کے باوجود آپ ﷺ کے متبعین صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے اس حکم پر بے چون وچرا عمل کرلیا۔

اسی طرح جب یہودی اور نصرانی بیت المقدس کی طرف رُخ کرتے چلے آرہے تھے، تو ان کا یہ معاملہ صدیوں سے تھا اور اسی کو وہ درست سمجھتے تھے، اس لیے اب ان کے لیے بھی اچانک قبلہ کی یہ تبدیلی بڑی مشکل تھی، لیکن اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ''یہ مشکل تو بہت تھی،'' ﴿اِلَّا عَلَى الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ﴾ ''لیکن ان لوگوں کے لیے مشکل نہیں تھی جنہیں اللہ نے ہدایت دے دی تھی۔'' مطلب یہ کہ جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے یہ سمجھ عطا فرمائی کہ کسی بھی چیز میں کوئی ذاتی تقدّس نہیں ہے اور اصل تقدّس اللہ تعالیٰ کے حکم کو حاصل ہے، انہیں نئے قبلے کی طرف رُخ کرنے میں ذرا بھی دِقّت پیش نہیں آئی، کیوں کہ وہ سمجھ رہے تھے کہ کسی قبلے کی طرف رُخ کرنا کوئی بُت پرستی نہیں ہے کہ اُسی رُخ کو بذاتِ خود مقدّس سمجھ کر اُسی کو چمٹے رہیں، بلکہ ہم پہلے بھی اللہ کے بندے اور اس کے تابعِ فرمان تھے اور آج بھی اسی کے حکم پر ایسا کر رہے ہیں۔

تحویلِ قبلہ سے پہلے والی نمازوں کا حکم

پھر اگلے جملے میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہ ارشاد فرمایا: ﴿وَ مَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ اِيْمَانَكُمْ﴾ ''اور اللہ تعالیٰ ایسا نہیں کہ تمہارے ایمان کو ضائع کردے۔'' اس کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ اگرچہ نئے قبلے کو اختیار کر لینا مشکل تھا، لیکن جن لوگوں نے اپنی قوتِ ایمانی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسے بے چون و چرا مان لیا، اللہ تعالیٰ ان کے اس ایمانی جذبے کو ضائع نہیں کرے گا، بلکہ انہیں اس کا عظیم ثواب عطا فرمائے گا۔

دوسرے یہ جملہ اس سوال کا جواب بھی ہے جو بعض صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے دل میں پیدا ہوا تھا،[1] اور وہ یہ کہ جو مسلمان اُس زمانے میں انتقال فرما گئے تھے جب قبلہ بیت المقدس تھا، تو کہیں ایسا تو نہیں کہ ان کی وہ نمازیں جو انہوں نے بیت المقدس کی طرف رُخ کرکے پڑھی تھیں، قبلے کی تبدیلی کے بعد ضائع اور کالعدم ہوجائیں، کیونکہ اب قبلہ بدل گیا ہے اور انہوں نے دوسرے قبلے کی طرف رُخ کرکے نمازیں پڑھی تھیں۔

اس آیتِ مبارکہ نے اس بات کا یہ جواب دیا کہ نہیں! چونکہ انہوں نے اپنے ایمانی جذبے کے تحت وہ نمازیں اللہ تعالیٰ کے حکم ہی کی تعمیل میں پڑھی تھیں، اس لیے وہ نمازیں ضائع نہیں ہوں گی۔ پھر فرمایا کہ ﴿اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۝۱۴۳﴾ ''درحقیقت اللہ لوگوں پر بہت شفقت کرنے والا بڑا مہربان ہے،'' لہٰذا وہ ان کے ثواب میں کوئی کمی نہیں کرے گا۔ اس سے یہ اصول بھی بتادیا گیا کہ کسی نئے حکم کے آنے سے پہلے جو لوگ پرانے حکم پر عمل کرتے رہے ہیں، ان کے عمل ضائع نہیں ہوں گے اور ان سے یہ باز پُرس نہیں ہوگی کہ تم نے پرانے حکم پر کیوں عمل کیا تھا۔

قبلے کے حوالے سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طبعی خواہش

اللہ تبارک وتعالیٰ نے آگے نبیِ کریم سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اِس خواہش کا تذکرہ فرمایا ہے کہ اگرچہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بیت المقدس کی طرف رُخ کرتے رہے اور سولہ سترہ مہینے اسی حالت میں گزارے، لیکن آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طبعی خواہش یہ تھی کہ قبلہ بیت اللہ کو بنادیا جائے جس کی تعمیرِ نو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

---

(۱) كما في صحيح البخاري (۱/۱۷)(٤٠): "قال زهير: حدثنا أبو إسحاق، عن البراء في حديثه هذا: أنه مات على القبلة قبل أن تحول رجال وقتلوا، فلم ندر ما نقول فيهم، فأنزل الله تعالى: ﴿وَ مَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ اِيْمَانَكُمْ﴾" كتاب الإيمان، باب الصلاة من الإيمان.

کے جدِّ امجد حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کی تھی۔ اس غرض سے کبھی کبھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم وحی کے انتظار میں اپنی نگاہیں آسمان کی طرف اٹھاتے تھے کہ شاید کوئی وحی آرہی ہو جس کے ذریعے قبلے کی تبدیلی کا حکم آجائے۔

باری تعالیٰ نے اس بات کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ ﴿قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَآءِ﴾ ''اے پیغمبر! ہم تمہارے چہرے کو بار بار آسمان کی طرف اٹھتے ہوئے دیکھ رہے ہیں،'' یعنی اس انتظار میں اور اس اشتیاق میں آپ چہرہ آسمان کی طرف اٹھا رہے ہیں کہ قبلے کی تبدیلی کا حکم آجائے، ﴿فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰىهَا﴾ ''چنانچہ ہم تمہارا رُخ ضرور اس قبلے کی طرف پھیر دیں گے جو تمہیں پسند ہے۔'' بظاہر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو پہلے سے یہ اندازہ تھا کہ جب بیت المقدس کو قبلہ بنایا گیا ہے تو یہ عارضی حکم ہے اور کسی وقت بھی اللہ تبارک وتعالیٰ بیت اللہ کو قبلہ بنانے والے ہیں، کیونکہ بیت اللہ، بیت المقدس کے مقابلے میں زیادہ قدیم بھی تھا اور اس سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی یادیں بھی وابستہ تھیں، اس لیے آپ کی طبعی خواہش بھی یہی تھی کہ اسی کو قبلہ بنایا جائے۔

مسجدِ حرام کی طرف رُخ کرنے کا حکم دینے کی حکمت

چنانچہ آگے پھر صریح الفاظ میں یہ حکم آگیا کہ ﴿فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ﴾ ''لو اَب اپنا رُخ مسجدِ حرام کی سمت کرلو۔'' جس حکم کا پہلے وعدہ کیا گیا تھا اب اس حکم کو نافذ کرنے کے لیے یہ جملہ ارشاد فرمایا گیا کہ اب اپنا رُخ مسجدِ حرام کی سمت کرلو، اور فرمایا: ﴿وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ﴾ اور آئندہ جہاں کہیں تم ہو ﴿فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ﴾ ''تو اپنے چہروں کا رخ (نماز پڑھتے ہوئے) اسی کی طرف رکھا کرو۔''

یہاں پر جو یہ الفاظ فرمائے گئے ہیں کہ ''اب اپنا رُخ مسجدِ حرام کی سمت کرلو اور (آئندہ) جہاں کہیں بھی تم ہو، اپنے چہروں کا رُخ اسی (مسجدِ حرام) کی طرف رکھا کرو۔'' یہاں یہ بھی ہوسکتا تھا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ تحویلِ قبلہ کا یہ حکم دیتے ہوئے فرماتے کہ ''اپنا رُخ کعبہ یا بیت اللہ کی طرف کرلو،'' لیکن ایسا نہیں کہا گیا، بلکہ فرمایا گیا کہ ''اب اپنا رُخ مسجدِ حرام کی طرف کرلو۔'' یہ انداز دراصل اللہ تعالیٰ نے ہماری سہولت وآسانی کے لیے اختیار فرمایا اور اس سے استقبالِ قبلہ کے کئی مسائل واضح ہو جاتے ہیں۔

اگر یہاں یہ کہا جاتا کہ بیت اللہ یا کعبہ کی طرف رُخ کرو تو ظاہر ہے کہ اصل بیت اللہ کا استقبال اسی جگہ تک ہوسکتا ہے جہاں تک بیت اللہ نظر آتا ہے، جو لوگ وہاں سے دور ہیں، اگر ان پر یہ پابندی عائد کی جاتی تو ظاہر ہے کہ اس حکم کی تعمیل دشوار ہو جاتی، جبکہ شریعتِ محمدیہ کا مدار اللہ تعالیٰ نے آسانی اور سہولت پر

رکھا ہے۔ اس لیے بیت اللہ کے بجائے مسجدِ حرام کی طرف رُخ کرنے کا حکم دیا گیا جو بیت اللہ کی بہ نسبت بہت زیادہ وسیع رقبہ پر مشتمل ہے اور اس کی طرف رُخ پھیر لینا دور دور تک لوگوں کے لیے آسان ہے۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ انسان مکّہ مکرمہ سے دور، مشرق میں یا مغرب میں کہیں بھی ہو تو اس کا رُخ مسجدِ حرام کی طرف ہونا چاہیے، اور بعض روایتوں (۱) سے بھی یہ بات معلوم ہوتی ہے اور فقہائے کرام نے بھی یہ بات مختلف دلائل کی روشنی میں ارشاد فرمائی ہے کہ جب کوئی شخص مکّہ مکرمہ میں ہو، تو اس کے لیے مسجدِ حرام قبلہ ہے اور اگر کوئی شخص مکّہ مکرم شہر سے باہر ہو، مگر حدودِ حرم میں ہو تو مکّہ مکرمہ کا شہر اس کے لیے قبلہ ہے، اور اگر کوئی شخص حدودِ حرم سے باہر ہے، تو پوری حدودِ حرم اس کے لیے قبلہ بنتی ہیں۔ (۲) اسی لیے یہ آسانی اللہ تبارک وتعالیٰ نے عطا فرمائی ہے کہ جب کوئی شخص ہزاروں میل دور قبلے کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھ رہا ہے تو اس کے لیے بالکل عین کعبے کی طرف مکمل رُخ ہونا لازمی شرط نہیں ہے۔ انسان کو ضرور چاہیے کہ وہ جتنا کعبے کی طرف حقیقی رُخ کر سکے اتنا ہی کرے، لیکن اگر تھوڑا بہت انحراف ہو جائے تو اس کی وجہ سے نماز فاسد نہیں ہوتی، نماز پھر بھی ہو جاتی ہے۔ (۳) اس انحراف کی حد فقہائے کرام نے ۴۵ درجے مقرّر کی ہے، یعنی سمتِ قبلہ سے ۴۵ درجے دائیں یا بائیں جانب مائل ہونے سے سمتِ قبلہ فوت نہیں ہوگی۔ (۴)

---

(۱) كما في جامع الترمذي (۲/۱۷۳) (۳٤٤) عن أبي هريرة، عن النبي ﷺ قال: "ما بين المشرق والمغرب قبلة" وقال: "هذا حديث حسن صحيح." وكذا أخرجه الحاكم في "المستدرك" (۱/۳۲۳) (۷٤۱) عن ابن عمر وقال: حديث صحيح على شرط الشيخين."

(۲) الاختيار لتعليل المختار (۱/٤٦): "من كان بحضرة الكعبة يتوجه إلى عينها، وإن كان نائيا عنها يتوجه إلى جهتها) لقيام الجهة عند العجز مقام عينها؛ لأن التكليف بقدر الطاقة..." وفي تبيين الحقائق شرح كنز الدقائق (۱/۱۰۰): والمسجد قبلة من بمكة ومكة قبلة الحرم والحرم قبلة العالم قال المصنف في التجنيس هذا يشير إلى من كان بمعاينة الكعبة فالشرط إصابة عينها ومن لم يكن بمعاينتها فالشرط إصابة جهتها هو المختار.

(۳) الدر المختار وحاشية ابن عابدين (رد المحتار) (۱/٤۳۰): فعلم أن الانحراف اليسير لا يضر، وهو الذي يبقى معه الوجه أو شيء من جوانبه مسامتا لعين الكعبة أو لهوائها.

(۴) الدر المختار وحاشية ابن عابدين (رد المحتار) (۱/٤۲۸) "وعبارة الدرر هكذا: وجهتها أن يصل الخط الخارج من جبين المصلي إلى الخط المار بالكعبة على استقامة بحيث يحصل قائمتان. أو نقول: هو أن تقع الكعبة فيما بين خطين يلتقيان في الدماغ فيخرجان إلى العينين كساقي مثلث، كذا قال النحرير التفتازاني في شرح الكشاف، فيعلم منه أنه لو انحرف عن العين انحرافا لا تزول منه المقابلة بالكلية جاز، ويؤيده ما قال في الظهيرية: إذا تيامن أو تياسر تجوز لأن وجه الإنسان مقوس لأن عند التيامن أو التياسر يكون أحد جوانبه إلى القبلة اهـ"

ضد اور عناد کی وجہ سے تبدیلیٔ قبلہ کے حکم سے رُوگردانی

پھر آگے فرمایا: ﴿وَ اِنَّ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ﴾ ''اور جن لوگوں کو کتاب دی گئی ہے،'' یعنی یہودی اور نصرانی، ﴿لَیَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ﴾ ''وہ خوب جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جو قبلہ متعین فرمایا ہے یہ بات برحق ہے۔'' اہلِ کتاب کو یہ بات اس لیے اچھی طرح معلوم ہے، کیونکہ وہ لوگ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو مانتے تھے اور یہ بات تاریخی طور پر ثابت تھی کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہی مکّہ مکرمہ میں کعبہ تعمیر کیا تھا، بلکہ بعض مؤرخین نے خود تورات کے دلائل سے یہ ثابت کیا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد جس میں حضرت اسحاق اور حضرت یعقوب علیہما السلام بھی داخل ہیں، وہ اپنی عبادتوں کے وقت میں کعبہ ہی کا رُخ کیا کرتے تھے، چنانچہ جو خیمہ یا عبادت گاہ اس زمانے میں قائم کی گئی تھی اس میں رُخ ہمیشہ وہاں کے لحاظ سے جنوب کی طرف رکھا جاتا تھا، یعنی جس طرف بیت اللہ تھا اسی طرف رُخ کیا جاتا تھا۔ بعد میں جب بیت المقدس تعمیر ہوا تو بیت المقدس میں بھی لوگ عبادت کرتے وقت بیت المقدس کے اندر سے رُخ اسی کعبہ کی طرف کیا کرتے تھے۔ واللہ اعلم

بہرحال! قرآنِ کریم کا ارشاد یہ ہے کہ ان لوگوں کو جو تورات کے عالم ہیں اور تورات کی تمام باتوں کو اچھی طرح جانتے ہیں، انہیں خوب پتہ ہے کہ حق بات وہی ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے آئی ہے کہ کعبہ کو قبلہ بنایا جائے۔ پھر آگے فرمایا: ﴿وَ مَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا یَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۴﴾﴾ ''اور یہ لوگ جو کچھ کر رہے ہیں اللہ اس سے غافل نہیں ہے،'' یعنی اللہ تبارک وتعالیٰ کو معلوم ہے کہ یہ جانتے بوجھتے ہوئے حق بات سے اس لیے انحراف کر رہے ہیں کہ انہیں نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد سے حسد ہو گیا ہے۔

گمراہ قوموں کی خواہشات کی پیروی کی ممانعت

پھر آگے اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَ لَىِٕنْ اَتَیْتَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ بِكُلِّ اٰیَةٍ﴾ اور جن لوگوں کو کتاب دی گئی تھی (یعنی یہود اور نصاریٰ) اگر تم ان کے پاس ہر قسم کی نشانیاں لے آؤ ﴿مَّا تَبِعُوْا قِبْلَتَكَ﴾ تب بھی یہ تمہارے قبلے کی پیروی نہیں کریں گے، ﴿وَ مَاۤ اَنْتَ بِتَابِعٍ قِبْلَتَهُمْ﴾ ''اور نہ تم ان کے قبلہ پر عمل کرنے والے ہو،'' یعنی اب آپ کا قبلہ منسوخ ہونے والا نہیں اور قیامت تک کے لیے آپ کا قبلہ بیت اللہ ہی رہے گا، لہٰذا اس طرح بھی موافقت نہیں ہو سکتی۔ ﴿وَ مَا بَعْضُهُمْ بِتَابِعٍ قِبْلَةَ بَعْضٍ﴾ ''اور نہ یہ ایک دوسرے کے قبلے پر عمل کرنے والے ہیں،'' یعنی یہودی عیسائیوں کے قبلے پر عمل نہیں کرتے

اور عیسائی یہودیوں کے قبلے پر عمل نہیں کرتے۔

آگے فرمایا: ﴿وَ لَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ﴾ اور جو علم تمہارے پاس آچکا ہے اس کے بعد اگر کہیں تم نے ان کی خواہشات کی پیروی کرلی تو ﴿اِنَّكَ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝۱۴۵﴾ ''اس صورت میں یقیناً تمہارا شمار ظالموں میں ہوگا۔'' یہ خطاب اگرچہ ظاہری طور پر نبی کریم ﷺ سے ہے، تاہم آنحضرت ﷺ کے بارے میں یہ تصوّر بھی نہیں کیا جاسکتا کہ وہ یہودیوں اور نصرانیوں کی خواہشات کے پیچھے چلیں گے، لہٰذا یہ خطاب فرضِ محال کے طور پر ہے، جس کے وقوع کا کوئی احتمال نہیں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ اس خطاب کے ذریعے درحقیقت دوسرے تمام انسانوں کو متنبہ فرمارہے ہیں کہ حقیقت وہی ہے جو نبی کریم ﷺ کے ذریعے ہم نے تمہارے اوپر واضح کردی۔ اس کے بعد اگر تم کسی قوم کی خواہشات کی پیروی میں اس حقیقت سے انحراف کروگے تو تم ظالم کہلاؤ گے۔

عناد اور ہٹ دھرمی کے سبب حق کا انکار

آگے ارشاد فرمایا: ﴿اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ﴾ ان لوگوں میں سے جن کو ہم نے کتاب دی ہے ﴿يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ﴾ ''وہ اسے اتنی اچھی طرح پہچانتے ہیں جیسے اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں۔'' اس کے یہ معنیٰ بھی ہوسکتے ہیں کہ یہ لوگ کعبہ کے قبلہ ہونے کو خوب اچھی طرح جانتے ہیں جیسا کہ پیچھے گزر چکا ہے، اور یہ معنیٰ بھی ہوسکتے ہیں کہ یہ آنحضرت ﷺ کو اچھی طرح پہچانتے ہیں کہ یہ وہی رسول ہیں جن کی خبر پچھلے انبیائے کرام علیہم السلام کے صحیفوں میں دی جاچکی ہے۔ جس طرح یہ لوگ اپنے بیٹوں کو پوری طرح پہچانتے ہیں، ان میں کبھی شبہہ و اشتباہ نہیں ہوتا، اسی طرح تورات و انجیل میں جو رسول اللہ ﷺ کی بشارت اور آپ ﷺ کی واضح علامات ونشانات کا ذکر آیا ہے، اس کے ذریعے یہ لوگ رسول اللہ ﷺ کو بھی یقینی طور سے جانتے پہچانتے ہیں، ان کا انکار محض عناد اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے ہے۔

آگے فرمایا: ﴿وَ اِنَّ فَرِيْقًا مِّنْهُمْ لَيَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَ هُمْ يَعْلَمُوْنَ ۝۱۴۶﴾ ''اور یقین جانو ان میں سے کچھ لوگوں نے حق کو جان بوجھ کر چھپا رکھا ہے،'' کیونکہ اہلِ کتاب میں سے بھی بہت سے حضرات تو وہ تھے جو نبی کریم ﷺ کو اچھی طرح پہچان گئے تھے اور انہیں یہ یقین ہوگیا تھا کہ یہ وہی نبی آخر الزماں ہیں جن کی پیشین گوئی پچھلے صحیفوں میں کی گئی تھی، اس لیے وہ آپ پر ایمان لے آئے تھے، لیکن یہاں دوسرے فریق

کا ذکر ہورہا ہے جنہوں نے حق کو جان بوجھ کر چھپا رکھا تھا۔ آگے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ﴿اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ﴾ حق وہی ہے جو تمہارے پروردگار کی طرف سے آیا ہے ﴿فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ ﴿۱۴۷﴾﴾ ''لہٰذا شک کرنے والوں میں ہرگز شامل نہ ہونا۔''

بحث مباحثہ کے بجائے نیک کام میں لگنے کا حکم

جو لوگ قبلے کی تبدیلی پر اعتراض کر رہے تھے، ان پر حُجّت تمام کرنے کے بعد مسلمانوں کو یہ ہدایت دی جا رہی ہے کہ ہر مذہب کے لوگوں نے اپنے اپنے قبلے الگ الگ بنا رکھے ہیں اور تمہارے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ اس دنیا میں انہیں کسی ایک قبلے پر جمع کرسکو، لہٰذا اب ان لوگوں سے قبلے کی بحث میں پڑنے کے بجائے تمہیں اپنے کام میں لگ جانا چاہیے اور وہ یہ ہے کہ اپنے نامۂ اعمال میں زیادہ سے زیادہ نیکیوں کا اضافہ کرو اور اس کام میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کرو، چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيْهَا﴾ اور ہر گروہ کی ایک سمت ہے جس کی طرف وہ رُخ کرتا ہے، ﴿فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ﴾ ''لہٰذا تم نیک کاموں میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرو،'' یعنی ابتداء سے ہی یہ عادۃُ اللہ جاری رہی ہے کہ ہر مذہب والے شخص کے واسطے ایک قبلہ رہا ہے، جس کی طرف وہ عبادت کے وقت منہ کرتا ہے۔ چونکہ شریعتِ محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام ایک مستقل دین ہے، لہٰذا اس کا بھی ایک خاص قبلہ ہوگیا ہے اور اس کی حکمت بھی سب پر واضح ہوچکی ہے، لہٰذا اے مسلمانو! تم اب اس بحث کو چھوڑ کر اپنے دین کے نیک کاموں میں آگے بڑھنے کی کوشش کرو۔

﴿اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا يَاْتِ بِكُمُ اللّٰهُ جَمِيْعًا﴾ تم جہاں بھی ہوگے اللہ تم سب کو اپنے پاس لے آئے گا ﴿اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۴۸﴾﴾ ''یقیناً اللہ ہر چیز پر قادر ہے،'' یعنی تم اپنے کام میں لگ جاؤ اور نیک کاموں میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرو۔ آخری انجام یہ ہوگا کہ تمام مذہب والوں کو اللہ تعالیٰ اپنے پاس بلائے گا اور اس وقت ان سب کی تُرکی تمام[1] ہو جائے گی، وہاں سب کا قبلہ ایک ہی ہوجائے گا، کیونکہ سب اللہ کے سامنے کھڑے ہوں گے۔

---

(۱) تُرکی تمام ہونا: گھمنڈ جاتا رہنا، ساری بہادری نکل جانا (فیروز اللغات)۔

قبلہ کا حکم بار بار دہرانے کی حکمت

پیچھے فرمایا تھا: ''فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ'' ''لو اب اپنا رُخ مسجدِ حرام کی سمت کرلو،'' اب آگے پھر اللہ تبارک وتعالیٰ نے کعبے کی طرف رُخ کرنے کے حکم کو زیادہ صریح لفظوں میں بیان کرتے ہوئے فرمایا: ﴿وَ مِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ﴾ اور تم جہاں سے بھی نکلو، (یعنی جس جگہ سے بھی سفر کے لیے نکلو) تو (نماز کے وقت) اپنا منہ مسجدِ حرام کی طرف کرو، ﴿وَ اِنَّهٗ لَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ﴾ اور یقیناً یہی بات حق ہے جو تمہارے پروردگار کی طرف سے آئی ہے، ﴿وَ مَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۹﴾﴾ ''اور جو کچھ بھی تم کرتے ہو اللہ تعالیٰ اس سے بے خبر نہیں ہے۔''

دو مرتبہ بیت اللہ کی طرف رُخ کرنے کا حکم دینے کے بعد اب اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہاں پر پھر تیسری بار اسی طرف رُخ کرنے کے حکم کو دہراتے ہوئے فرمایا: ﴿وَ مِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ﴾ اور جہاں سے بھی تم نکلو اپنا منہ مسجدِ حرام کی طرف کرو ﴿وَ حَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ﴾ ''اور تم جہاں کہیں بھی ہو اپنے چہرے اسی کی طرف رکھو۔''

یہاں یہ بات ذہن میں رکھنے کی ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے مسجدِ حرام کی طرف رُخ کرنے کا حکم ان آیتوں میں تین مرتبہ دہرایا ہے۔ اس سے ایک تو حکم کی اہمیت اور تاکید جتلانی مقصود ہے، دوسرے یہ بھی بتانا مقصود ہے کہ قبلہ کا رُخ کرنا صرف اس حالت میں نہیں ہے کہ جب کوئی شخص بیت اللہ کے سامنے موجود ہو، بلکہ جب مکّہ مکرمہ سے نکلا ہوا ہو تب بھی یہی حکم ہے اور اگر کہیں دور چلا جائے تب بھی یہ فریضہ ختم نہیں ہوتا۔

یہاں یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ تینوں جگہ قبلہ کا حکم دیتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے ﴿شَطْرَهٗ﴾ کا لفظ استعمال فرمایا، جس کا مطلب سمت ہوتا ہے۔ یہ لفظ استعمال کر کے اس طرف اشارہ فرمادیا گیا کہ کعبے کا رُخ کرنے کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ انسان کعبے کی سو فیصد سیدھ میں ہو، بلکہ اگر انسان محض اس سمت کو بھی اختیار کرلے تو کعبے کی طرف رُخ کرنے کا حکم پورا ہوجائے گا، جیسا کہ پیچھے تفصیل گزر چکی ہے۔ انسان اس معاملے میں اتنا ہی مکلّف ہے کہ وہ اپنے بہترین ذرائع استعمال کر کے صحیح سمت متعین کرلے، ایسا کرنے کے بعد اس کی نماز ہوجائے گی۔

تیسرے اس حکم کو دہرانے کی ایک وجہ یہ ہے کہ اس تیسری مرتبہ اس کی حکمتیں بیان کرنی بھی مقصود ہیں، چنانچہ آگے فرمایا: ﴿لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ حُجَّةٌ﴾ ''تاکہ لوگوں کو تمہارے خلاف حُجّت بازی کا موقع نہ ملے۔'' اس کا مطلب یہ ہے کہ جب تک بیت المقدس قبلہ تھا، یہودی یہ حُجّت کرتے تھے کہ ہمارا

دین برحق ہے، اسی لیے یہ لوگ ہمارے قبلے کو اختیار کرنے پر مجبور ہوئے ہیں اور مشرکینِ ملّہ یہ بحث کرتے تھے کہ مسلمان اپنے آپ کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کا مُتبع کہتے ہیں مگر انہوں نے ابراہیمی قبلے کو چھوڑ کر ان سے سنگین انحراف کر لیا ہے۔ اب جبکہ قبلے کی تبدیلی میں جو مصلحت تھی، وہ حاصل ہوگئی، تو اس کے بعد مسلمان ہمیشہ کے لیے کعبے کو قبلہ قرار دے کر اس پر عمل پیرا ہوں گے تو ان دونوں کی حجتیں ختم ہوجائیں گی۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم نے تحویلِ قبلہ کا حکم دے کر تمہارے مخالف لوگوں کی حجّت بازی اور الزام تراشی کا موقع ختم کردیا، مگر ان میں سے جو بالکل ہی بے انصاف لوگ ہیں، وہ اب بھی کٹ حجتی کرتے رہیں گے۔ اسی بات کو بیان کرتے ہوئے فرمایا: ﴿اِلَّا الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ﴾ ''البتہ ان میں جو لوگ ظلم کے خوگر ہیں'' وہ کبھی خاموش نہیں ہوں گے۔ ﴿فَلَا تَخْشَوْهُمْ﴾ ''لہٰذا ان سے مت ڈرو،'' ان کا کچھ خوف نہ رکھو ﴿وَاخْشَوْنِیْ﴾ ''اور ہاں میرا خوف رکھو،'' یعنی وہ کٹ حُجّت لوگ جنہوں نے اعتراض کرتے رہنے کی قسم ہی کھا رکھی ہے، اُن کی زبانیں کوئی نہیں روک سکتا، لیکن مسلمانوں کو اُن سے خوف کھانے کی ضرورت نہیں ہے، انہیں اللہ کے سوا کسی اور سے ڈرنا نہیں چاہیے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں نے تمہیں ہمیشہ کے لیے یہ احکام دے دیے ہیں، ﴿وَ لِاُتِمَّ نِعْمَتِیْ عَلَیْكُمْ وَ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿۱۵۰﴾﴾ ''اور تاکہ میں تم پر اپنا انعام مکمل کردوں اور تاکہ تم ہدایت حاصل کرو،'' کیونکہ جب تم ان کی پابندی کرو گے تو اللہ تعالیٰ کا انعام تمہیں دیا جائے گا اور تم سیدھے راستے کی ہدایت پاجاؤ گے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دو دعائیں اور ان کی قبولیت

اب تک قبلے کا اور اس اُمّتِ محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کو ایک معتدل امّت بنانے کا بیان چل رہا تھا۔ اس کے بعد اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا: ﴿كَمَاۤ اَرْسَلْنَا فِیْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ﴾ جیسے ہم نے تمہارے درمیان تم ہی میں سے ایک رسول بھیجا ﴿یَتْلُوْا عَلَیْكُمْ اٰیٰتِنَا﴾ جو تمہارے سامنے ہماری آیتوں کی تلاوت کرتا ہے ﴿وَ یُزَكِّیْكُمْ﴾ اور تمہیں پاکیزہ بناتا ہے ﴿وَ یُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ﴾ اور تمہیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے ﴿وَ یُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۵۱﴾﴾ ''اور تمہیں وہ باتیں سکھاتا ہے جو تم نہیں جانتے تھے۔''

یہاں پر اللہ تبارک وتعالیٰ نے ایک عجیب انداز سے بات شروع کی ہے کہ ﴿كَمَاۤ اَرْسَلْنَا فِیْكُمْ﴾ جس کا مطلب ہے کہ ''جیسے ہم نے تمہارے درمیان رسول بھیجا۔'' ''جیسے'' کے لفظ سے پتہ چل رہا ہے کہ یہاں پر کسی اور بات کی طرف بھی اشارہ کیا جارہا ہے اور اس بات کا تعلق پچھلی کسی بات سے بھی ہے۔

چنانچہ اس آیت کا پچھلی آیات سے تعلق سمجھنے کے لیے یہ بات ذہن میں رہنی چاہیے کہ پیچھے جو ۱۲۸ اور ۱۲۹ نمبر آیات گزری ہیں، ان میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے بیان فرمایا تھا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کعبہ کی تعمیر کے وقت دو دعائیں کی تھیں:

- ایک یہ کہ ہماری نسل سے ایسی امّت پیدا فرمادیجیے جو آپ کی مکمل فرماں بردار ہو۔ ﴿رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ﴾
- دوسری یہ کہ ان میں ایک ایسا رسول بھی بھیجنا جو انہی میں سے ہو، جو ان کے سامنے تیری آیتوں کی تلاوت کرے، انہیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دے، اور انہیں پاکیزہ بنائے۔ ﴿رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ ۭ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۱۲۹﴾

ان آیات کی تفصیل وتشریح پیچھے گزر چکی ہے۔ ان دعاؤں میں سے پہلی دعا جو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے مانگی تھی کہ ہماری نسل سے ایسی امّت پیدا فرمایئے جو آپ کی مکمل فرمانبردار ہو، یہ دعا اللہ تعالیٰ نے اس طرح قبول فرمائی کہ اُمّتِ محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کو معتدل امّت قرار دے کر پیدا فرمایا، جیسا کہ اسی پارے کے شروع میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا کہ ﴿وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا﴾ اور اسی طرح تو ہم نے تم کو ایک معتدل اُمّت بنایا ہے۔

اب یہاں پر اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ یہ فرمارہے ہیں کہ جس طرح ہم نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا قبول کرتے ہوئے تم پر یہ انعام فرمایا کہ تمہیں معتدل اُمّت بنا کر آئندہ ہمیشہ کے لیے انسانیت کی رہنمائی تمہیں عطا کردی، جس کی ایک اہم علامت یہ بھی ہے کہ ہمیشہ کے لیے کعبہ کو تمہارا قبلہ بنادیا گیا، اسی طرح ہم نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دوسری دعا قبول کرتے ہوئے رسولِ اکرم سرورِ دوعالم محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تمہارے درمیان بھیج دیا ہے، جو بعینہٖ انہی خصوصیات اور انہی فرائضِ منصبی کے حامل ہیں جو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان کے لیے مانگے تھے۔ یہی مطلب ہے ﴿كَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ﴾ کا، یعنی جس طرح ہم نے اُن کی وہ دعا قبول کی اسی طرح یہ دعا بھی قبول کی، اور ٹھیک انہی اوصاف کے ساتھ ہم نے تمہارے درمیان اپنا رسول بھیج دیا جن اوصاف کی حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دعا مانگی تھی۔ اُن اوصاف کی مکمّل تشریح پیچھے آیت نمبر ۱۲۹ میں گذر چکی ہے۔

انسان کی زندگی کو سنوارنے کا بہترین دستورُ العمل

اللہ تعالیٰ نے اس اُمّت کو جو معتدل اُمّت بنایا ہے اور سرورِ دوعالم حضرت محمد ﷺ کی صورت میں ایک عظیم رسول کی نعمت سے نوازا ہے، تو اس کا تقاضا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو یاد کیا جائے اور اس کا شکر بجا لایا جائے، چنانچہ یہی حکم دیتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿فَاذْكُرُوْنِيْٓ﴾ تم مجھے یاد کرو ﴿اَذْكُرْكُمْ﴾ میں تمہیں یاد رکھوں گا ﴿وَاشْكُرُوْا لِيْ﴾ اور میرا شکر ادا کرو ﴿وَلَا تَكْفُرُوْنِ ۝۱۵۲﴾ ''اور میری ناشکری نہ کرو۔''

یہ مختصر سی آیت ہے، لیکن امّت محمد یہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام پر اپنے انعامات کا ذکر کرنے کے بعد اور یہ بتانے کے بعد کہ اس اُمّت کو ایک معتدل اُمّت بنا کر انسانیت کی رہنمائی کے لیے بھیجا گیا ہے، اب اس اُمّت کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے ایسا مختصر دستورِ عمل عطا فرمایا ہے کہ اگر امّت کے افراد اسے اپنے پیشِ نظر رکھیں، تو ان کی پوری زندگی اس مقصد کے تحت آجائے گی جس مقصد کے تحت انہیں اس دنیا میں بھیجا گیا۔

چنانچہ فرمایا: ﴿فَاذْكُرُوْنِيْٓ﴾ ''میرا ذکر کرو،'' یعنی مجھے یاد کرو اور میری یاد اپنے دل میں بساؤ۔ اللہ تعالیٰ کو یاد کرنے کا حکم دینے کی وجہ یہ ہے کہ اس دنیا میں اللہ تبارک وتعالیٰ کی اطاعت وفرمانبرداری، اللہ تبارک وتعالیٰ کے احکام کے مطابق زندگی گزارنا، اللہ تعالیٰ نے جن چیزوں سے بچنے کا حکم دیا ہے ان سے بچنا اور گناہوں سے پرہیز کرنا، یہ کام آدمی اسی وقت صحیح طریقے سے انجام دیتا ہے جب اللہ تعالیٰ کی یاد اس کے دل میں بسی ہوئی ہو۔

دیکھیے! اس دنیا میں جتنے بھی جرائم یا ناانصافیاں ہوتی ہیں، کوئی شخص دوسرے کا حق لے اڑتا ہے یا گناہ کا ارتکاب کرتا ہے تو وہ درحقیقت اس وجہ سے ہوتا ہے کہ اس وقت انسان کے دل میں اللہ تعالیٰ کا دھیان، اس کا تصوّر، اس کا ذکر اور اس کی یاد نہیں ہوتی۔ اگر اللہ تعالیٰ کی یاد، اللہ تعالیٰ کا ذکر اور اس بات کا دھیان اس کے دل میں ہو کہ مجھے ایک دن اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش ہو کر اپنے ہر قول وفعل کا جواب دینا ہے، تو پھر گناہ سرزد نہیں ہوگا۔ اس لیے اگر دیکھا جائے تو یہ مختصر سا حکم کہ ''مجھے یاد کرو یا مجھے یاد رکھو'' یہ انسان کی زندگی کو سنوارنے کا بہترین دستورُ العمل ہے جو اللہ تعالیٰ نے یہاں بیان فرمایا ہے۔

شکرگزاری؛ اللہ تعالیٰ کو یاد کرنے کا آسان طریقہ

اللہ تبارک وتعالیٰ نے ﴿فَاذْكُرُوْنِيْٓ﴾ میں حکم دیا کہ ''مجھے یاد کرو،'' پھر آگے خود طریقہ بھی بتا دیا کہ

مجھے کیسے یاد کرنا ہے؟ اللہ تعالیٰ کو یاد کرنے اور اس کے ذکر کا بڑا آسان طریقہ یہ ہے کہ ﴿وَ اشْكُرُوْا لِيْ وَ لَا تَكْفُرُوْنِ ﴿۱۵۲﴾﴾ ''میرا شکر ادا کرو، اور میری ناشکری نہ کرو،'' یعنی ذکر کرنے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ تم اپنے اردگرد پھیلی ہوئی ان نعمتوں کا تصوّر کرو جو تمہیں اللہ تعالیٰ نے عطا فرما رکھی ہیں، تمہارا جسم ہے، تمہاری آنکھ ہے، تمہارے کان ہیں، تمہارے اعضاء ہیں جو صحت مند طریقے پر کام کر رہے ہیں۔ تمہیں جو رزق مل رہا ہے اور جس انداز میں مل رہا ہے اسے سوچو۔ تمہارے چاروں طرف جو اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی بارش ہو رہی ہے ان کا تصوّر کرو کہ یہ سب اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے مجھے عطا فرمائی ہیں، اس لیے مجھے اللہ تبارک وتعالیٰ کا شکر ادا کرنا چاہیے۔

جب انسان اللہ تبارک وتعالیٰ کی ان نعمتوں کا تصوّر کرتا ہے جو چاروں طرف بکھری ہوئی ہیں اور یہ سوچتا ہے کہ یہ کس نے میرے استحقاق کے بغیر مجھے عطا فرمائی ہیں؟ تو اس کے نتیجے میں بے ساختہ اس ذات کا شکر بھی اس کے دل میں پیدا ہوتا ہے جو ان نعمتوں کی عطا کرنے والی ہے، چنانچہ اس ذات کی محبت بھی دل میں آتی ہے اور پھر وہ اس کا ذکر بھی کرتا ہے۔

اللہ تعالیٰ سے محبت کرنے والوں کے لیے بڑی خوشخبری

حقیقت یہ ہے کہ یہ ﴿فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ﴾ بظاہر چھوٹا سا جملہ ہے، لیکن انسان کی زندگی کو صحیح راستے پر لانے کے لیے ایک بہترین نسخے کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اس جملے میں ایک خوشخبری بھی سنادی گئی ہے اور وہ ایک محبت کرنے والے انسان کے لیے بڑی عظیم خوشخبری ہے۔ اور وہ یہ کہ ﴿فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ﴾ ''تم مجھے یاد کرو میں تمہیں یاد رکھوں گا،'' یعنی جب تم مجھے یاد کرو گے یا میرا ذکر کرو گے تو میں بھی تمہیں یاد رکھوں گا اور میں تمہارا ذکر کروں گا۔ اللہ تبارک وتعالیٰ جو کہ ربُّ العالمین اور احکمُ الحاکمین ہیں، وہ اپنے کسی بندے کا ذکر فرمائیں اور اپنے بندے کو یاد رکھیں، یہ ایک بہت بڑی نعمت ہے جو ذکر کے نتیجے میں اور اللہ کی یاد کو دل میں بسانے کے نتیجے میں انسان کو حاصل ہوتی ہے۔ ایک حدیث میں نبیِ کریم سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ:

> ''جب میرا بندہ اکیلے میں مجھے یاد کرتا ہے تو میں بھی اکیلے میں اسے یاد کرتا ہوں، اور اگر وہ کسی جماعت اور لوگوں کے سامنے میرا ذکر کرتا ہے تو میں ایسی جماعت کے

سامنے اس کا ذکر کرتا ہوں جو اس سے بہتر ہے (یعنی فرشتوں کی جماعت)۔"(۱)

یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے کہ محبوبِ حقیقی ہمارا ذکر کرے۔ ؏

ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اُس محفل میں ہے

آیت نمبر ۱۵۳ تا ۱۵۷

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ۝۱۵۳ وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ۭ بَلْ اَحْيَاۗءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ۝۱۵۴ وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ۭ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ ۝۱۵۵ۙ الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ۝۱۵۶ ۭ اُولٰۗىِٕكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ ۣ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ ۝۱۵۷

اے ایمان والو! صبر اور نماز سے مدد حاصل کرو۔ بے شک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ (۱۵۳) اور جو لوگ اللہ کے راستے میں قتل ہوں انہیں مردہ نہ کہو۔ دراصل وہ زندہ ہیں، مگر تم کو (ان کی زندگی کا) احساس نہیں ہوتا۔ (۱۵۴) اور دیکھو ہم تمہیں آزمائیں گے ضرور، (کبھی) کچھ خوف سے، اور (کبھی) بھوک سے، اور (کبھی) مال و جان اور پھلوں میں کمی کرکے۔ اور جو لوگ (ایسے حالات میں) صبر سے کام لیں انہیں خوشخبری سنادو۔ (۱۵۵) یہ وہ لوگ ہیں کہ جب انہیں کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو یہ کہتے ہیں کہ "ہم

---

(۱) كما في صحيح مسلم (٤/٢٠٦١) (٢٦٧٥): "عن أبي هريرة، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: يقول الله عز وجل: "أنا عند ظن عبدي بي، وأنا معه حين يذكرني، إن ذكرني في نفسه، ذكرته في نفسي، وإن ذكرني في ملإ، ذكرته في ملإهم خير منهم، وإن تقرب مني شبرا، تقربت إليه ذراعا...." كتاب الذكر والدعاء والتوبة والاستغفار، باب الحث على ذكر الله تعالى.

سب اللہ ہی کے ہیں، اور ہم کو اللہ ہی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔' (۱۵۶) یہ وہ لوگ ہیں جن پر ان کے پروردگار کی طرف سے خصوصی عنایتیں ہیں، اور رحمت ہے۔ اور یہی لوگ ہیں جو ہدایت پر ہیں۔ (۱۵۷)

اللہ تعالیٰ کی رضا پر راضی رہنے کا حکم

ان آیاتِ مبارکہ میں مسلمانوں کو یہ ہدایت کی گئی ہے کہ وہ فضول بحثوں میں الجھنے کے بجائے اپنے دین پر زیادہ سے زیادہ عمل کی طرف متوجہ ہوں، چنانچہ اب مختلف اسلامی عقائد اور احکام کا بیان شروع ہورہا ہے۔ اس بیان کا آغاز صبر کی تاکید سے ہوا ہے، کیونکہ یہ وہ دور تھا جس میں مسلمانوں کو اپنے دین پر عمل کرنے اور اس کی تبلیغ میں دشمنوں کی طرف سے طرح طرح کی رکاوٹیں پیش آرہی تھیں۔ اسی زمانے میں جنگوں کا سلسلہ بھی جاری تھا اور بہت سی سختیاں برداشت کرنی پڑ رہی تھی، جنگوں میں اپنے عزیز رشتے دار اور دوست بھی شہید ہورہے تھے یا ہونے والے تھے، لہٰذا اب مسلمانوں کو تلقین کی جارہی ہے کہ دینِ حق کے راستے میں یہ آزمائشیں تو پیش آنی ہیں، ایک مومن کا کام یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی مشیت پر راضی رہ کر صبر کا مظاہرہ کرے، چنانچہ ان آیات میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے صبر کا بطورِ خاص ذکر فرمایا ہے۔اس مضمون کی یہ آیتیں، آیت نمبر ۱۵۳ سے شروع ہوکر ۱۵۷ تک اختتام پذیر ہوتی ہیں۔

اللہ تعالیٰ سے مدد حاصل کرنے کے لیے دو اہم چیزیں

جیسا کہ اوپر بیان ہوا، ان آیات میں مسلمانوں کو اپنی تمام حاجتیں اور ضرورتیں پوری کرنے اور دین پر عمل کرنے کے راستے میں پیش آنے والی مشکلات اور دشواریوں کو دور کرنے کا طریقہ بتایا گیا ہے، چنانچہ سب سے پہلے یہ فرمایا گیا کہ ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِيْنُوْا﴾ ''اے ایمان والو! مدد حاصل کرو،'' پھر آگے مدد حاصل کرنے کا طریقہ بتاتے ہوئے فرمایا: ﴿بِالصَّبْرِ وَ الصَّلٰوةِ﴾ ''صبر سے اور نماز سے،'' یعنی صبر اور نماز کے ذریعے سے مدد حاصل کرو۔مشکلات پر قابو پانے، مشقتوں کو برداشت کرنے اور اپنی حاجتوں کو پورا کرنے کے لیے اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان دو چیزوں، یعنی صبر اور نماز کا حکم دیا ہے۔یہ دو چیزیں ایسی ہیں کہ ان کے ذریعے انسان ہر ضرورت میں اللہ تعالیٰ سے مدد حاصل کرسکتا ہے۔

صبر کا معنی و مفہوم اور اس کی اقسام

''صبر'' کے معنیٰ عربی زبان میں باندھنے کے آتے ہیں اور اس کا مفہوم یہ ہے کہ کوئی انسان اپنے نفس کو کسی چیز پر باندھ لے۔ یعنی اپنے نفس کو کسی ناگوار چیز کے برداشت کرنے پر آمادہ کر لے اور اس پر قابو رکھے۔ اردو زبان میں جب ''صبر'' کا لفظ بولا جاتا ہے تو عام طور سے اس سے مراد یہ لیا جاتا ہے کہ اگر کسی آدمی کو کوئی تکلیف پہنچی ہو تو اس تکلیف پر وہ واویلا (شور شرابا) نہ کرے، بلکہ صبر سے کام لے، لیکن عربی زبان میں اور قرآنِ کریم کی اصطلاح میں صبر کا لفظ بہت وسیع ہے اور اپنے اندر بہت عظیم معنیٰ رکھتا ہے۔ اس کی تین قسمیں ہیں، جن کی تفصیل حسبِ ذیل ہے:

- ''صبر علی الطاعات'': صبر کی پہلی قسم یہ ہے کہ کوئی شخص اپنے آپ کو اللہ تبارک وتعالیٰ کی طاعات کے اوپر روک کر رکھے، یعنی اپنے نفس کو قابو میں رکھے اور اللہ تعالیٰ کی طاعت بجا لاتا رہے۔ جس کام کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے اس کام کے کرنے میں اگر کوئی سستی پیش آرہی ہو یا طبیعت کو وہ ناگوار ہو رہا ہو تو آدمی اپنی طبیعت کی اس ناگواری اور اپنے نفس کی اس سستی کو دور کر کے یا اس کا مقابلہ کر کے اپنے آپ کو زبردستی اس طاعت کی طرف لے جائے۔ جیسے مثلاً کوئی آدمی سو رہا ہے اور نماز کا وقت ہو گیا یا اذان کی آواز کان میں پڑ گئی۔ اب طبیعت کا تقاضا تو یہ ہے کہ نیند بہت میٹھی معلوم ہو رہی ہے اور اس صورت میں نیند کو چھوڑ کر جانا طبیعت پر بھاری گزر رہا ہے، لیکن آدمی یہ سوچ کر کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے مجھے بلایا ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ کا یہ حکم ہے کہ میں نماز کے لیے جاؤں تو وہ اپنے نفس کی مخالفت کرتا ہے اور اپنی طبیعت کے تقاضے کے خلاف ناگواری کو برداشت کر کے اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑا ہوتا ہے تو یہ صبر ہے۔ گویا صبر کی پہلی قسم یہ ہے کہ کسی طاعت یا عبادت کو یا اللہ تعالیٰ کے کسی حکم کو بجالانے میں انسان کو جو تکلیف ہوتی ہے یا اس میں انسان کو جو اپنی طبیعت کے خلاف کرنا پڑتا ہے، اسے برداشت کرنا۔ اسے ''صبر علی الطاعات'' کہا جاتا ہے، یعنی اطاعت پر صبر کرنا یا جمے رہنا۔ یہ صبر کی پہلی قسم ہے۔
- ''صبر عن المعصیۃ'': صبر کی دوسری قسم یہ ہے کہ بعض اوقات انسان کی طبیعت کسی گناہ کی طرف مائل ہو رہی ہوتی ہے اور اس کا دل چاہتا ہے کہ میں فلاں گناہ کا ارتکاب کر کے

لذت حاصل کرلوں۔ اس وقت اسے اس گناہ سے رکنا بڑا مشکل معلوم ہورہا ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں اگر وہ اس وقت اپنے دل کی خواہش کے باوجود اور دل کے مچلنے کے باوجود اللہ تبارک وتعالیٰ کے حکم کا تصوّر کرکے اور یہ سوچ کر کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے اس کام سے منع کیا ہے، اپنے آپ کو زبردستی اس کام سے روک لے تو یہ صبر ہے۔ اسے ''صبر عن المعصیۃ'' کہتے ہیں، یعنی گناہوں سے بچنے کے لیے اپنے اوپر قابو پانا، یہ صبر کی دوسری قسم ہے۔

- ''صبر علی المصیبۃ'': صبر کی تیسری قسم صبر علی المصیبۃ ہے، یعنی اگر کسی کو کوئی تکلیف پہنچی، اچانک کوئی مصیبت آگئی یا کوئی بھی صدمہ پہنچا، تو اس صدمے اور تکلیف کے موقع پر وہ اللہ تعالیٰ کی تقدیر کا شکوہ کرنے کے بجائے یہ سوچے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی مشیت اور چاہت ہی یہی تھی۔ اللہ تعالیٰ اس کائنات کا مالک اور خالق ہے، اس کے ہر فعل اور ہر فیصلے میں کوئی نہ کوئی حکمت ہوتی ہے، چاہے وہ حکمت ہماری سمجھ میں آئے یا نہ آئے، لہٰذا باوجودیکہ مجھے اس واقعے سے تکلیف پہنچی ہے، لیکن اس کے باوجود میں اللہ تعالیٰ کی مشیت پر راضی ہوں۔ یہ صبر کی تیسری قسم ہے، جسے ''صبر علی المصیبۃ'' کہا جاتا ہے۔

صبر کی تینوں اقسام پر عمل کے مواقع

جہاں اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا کہ تم صبر سے مدد حاصل کرو تو اس میں صبر کی تینوں قسمیں داخل ہیں، اور یہ تینوں قسمیں اس طرح داخل ہیں کہ جب تمہیں یہ کہا جارہا کہ اب دوسرے لوگوں کے ساتھ بحث میں الجھنے کے بجائے جو تمہارے کرنے کا کام ہے وہ کرو، یعنی اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق اپنی زندگی گزارو، البتہ اس طرح زندگی گزارنے میں تمہیں تکلیفیں بھی پیش آئیں گی، کبھی یہ ہوگا کہ کسی طاعت کو بجا لانے میں سستی ہورہی ہوگی، مثلاً اللہ تعالیٰ کی طرف سے جہاد کا حکم آگیا تو اگرچہ یہ ایک مشکل حکم ہے اور یہ حکم طبیعت کے خلاف معلوم ہوتا ہے، لیکن اگر تم اپنی طبیعت کو مجبور کرکے جہاد میں شامل ہوجاؤ گے تو یہ صبر کہلائے گا اور یہ ''صبر علی الطاعات'' ہوگا اور اس سے اللہ تعالیٰ کی مدد حاصل ہوگی۔

اسی طرح بعض اوقات معصیتوں اور گناہوں کا تقاضا ہوگا، طبیعت گناہ کرنے کو چاہے گی، اس وقت بھی اپنے آپ کو زبردستی گناہوں سے روکو گے تو اس سے تمہیں اللہ تعالیٰ کی مدد ملے گی، یہ ''صبر عن المعصیۃ'' ہوگا۔ نیز بعض اوقات دین پر عمل پیرا ہونے میں یا دنیاوی زندگی میں مصیبتیں اور تکالیف پیش

آئیں گی، آزمائشوں کا سامنا کرنا پڑے گا تو ایسے مواقع پر بھی واویلا کرنے کے بجائے صبر وہمت سے کام لینا ہوگا اور اللہ تعالیٰ کی رضا پر راضی رہنا ہوگا۔ یہ ''صبر علی المصیبة'' کہلائے گا۔

اطاعتِ الٰہی پر صبر سے مدد لینے کا مطلب

یہاں یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ یہاں یہ نہیں فرمایا گیا کہ ''صبر کرو'' بلکہ یہ فرمایا گیا ہے کہ ''صبر سے مدد حاصل کرو۔'' صبر سے مدد حاصل کرنے کا مطلب یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کی اطاعت بجا لانا یا گناہوں سے بچنا مشکل معلوم ہورہا ہو، تو اپنے اوپر زبردستی کرکے صبر سے کام لیا جائے۔ شروع میں بے شک یہ کام مشکل معلوم ہوگا، لیکن جب تم بار بار اس مشکل پر صبر کرتے رہوگے، تو رفتہ رفتہ وہی مشکل کام آسان ہو جائے گا۔ مثلاً پہلے پہل انسان کو نماز پڑھنا مشکل معلوم ہوتا ہے، لیکن وہ اپنے آپ پر زبردستی کرکے کچھ عرصے تک نماز پڑھتا رہتا ہے، تو رفتہ رفتہ وہ اس کا عادی بن جاتا ہے، پھر اسے نماز مشکل نہیں لگتی، بلکہ ایک مرحلہ ایسا آجاتا ہے کہ اُسے نماز کے بغیر چین نہیں آتا۔

اس کی یہ مشکل جو آسان ہوئی یہ اُس صبر کی مدد سے ہوئی جو شروع میں اپنے آپ پر زبردستی کرکے اس نے کیا تھا۔ یہی صورت گناہوں سے بچنے کی بھی ہے کہ شروع میں بچنا بہت بھاری معلوم ہوتا ہے، لیکن جب انسان اس مشقت کو برداشت کرلیتا ہے، تو رفتہ رفتہ اس کے لیے گناہوں سے بچنا آسان ہوجاتا ہے۔

نماز کی پابندی سے دین پر چلنا آسان ہوتا ہے

اللہ تعالیٰ کے احکام کے مطابق زندگی گزارنے کے لیے جن چیزوں سے مدد لینے کی ہدایت کی گئی ہے، ان میں سے دوسری چیز نماز ہے۔ یعنی نماز ایسی چیز ہے کہ اگر انسان اسے پورے آداب اور شرائط کے ساتھ اپنے وقت پر انجام دے، تو یہ اللہ تعالیٰ کے احکام کے مطابق زندگی گزارنے کے لیے خود انسان کو مدد فراہم کرتی ہے، چنانچہ دوسری جگہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا:

اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ (۱)

بے شک نماز بے حیائی اور برے کاموں سے روکتی ہے۔

---

(۱) سورۃ العنکبوت (۲۹): آیت (۴۵)

نماز کی خاصیت ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ اس کی بدولت انسان کو طاعات کی طرف لے جاتے ہیں اور گناہوں سے بچنے کا موقع عطا فرماتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے نماز کے اندر یہ تاثیر رکھی ہے کہ جو شخص نماز کا پابند ہوگا اور آداب وشرائط کے ساتھ اسے اہتمام سے ادا کرے گا، تو اللہ تبارک وتعالیٰ کی رحمت سے دوسرے لوگوں کے مقابلے میں اسے دین پر چلنے کی زیادہ توفیق ہوگی اور وہ نماز اسے عمومی طور پر گناہ کے کاموں سے روکے گی۔ اس کی مزید تفسیر آگے جہاں یہ آیت آئے گی۔ اگر اللہ تعالیٰ نے زندگی دی تو۔ ان شاء اللہ اس موقع پر بیان کردی جائے گی۔

کسی حاجت کو پورا کرنے کے لیے سب سے اہم وظیفہ

بہرحال! فرمایا یہ جارہا ہے کہ چاہے دین پر زندگی گزارنے کی مشکل ہو اور اس مشکل کا مقابلہ کرنا ہو، یا کوئی مصیبت یا صدمہ پیش آجائے، ہر صورت میں تمہیں نماز سے مدد ملے گی۔ یہی وجہ ہے کہ حدیث میں نبیِ کریم سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں روایت ہے کہ:

كَانَ إِذَا حَزَبَهُ أَمْرٌ فَزِعَ إِلَى الصَّلٰوة[1]

نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جب بھی کوئی اہم معاملہ پیش آتا، آپ فوراً نماز کا اہتمام فرماتے۔

یعنی نماز پڑھ کر اس مصیبت یا اس تکلیف یا صدمے کو دور کرنے کا راستہ تلاش کرتے تھے۔ حقیقت یہی ہے کہ جب انسان ایسے میں اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتا ہے، تو اللہ تبارک وتعالیٰ یا تو اُس مصیبت کو دور کرکے یا اس کی دلی پریشانی دور کرکے اور سکون عطا فرما کر ضرور اس کی مدد فرماتے ہیں۔ چونکہ نماز ایک ایسی عبادت ہے جو دوسری تمام عبادتوں سے افضل ہے اور اس میں بندے کا تعلق براہِ راست اللہ تعالیٰ کے ساتھ قائم ہوتا ہے، پھر اس میں سجدہ بھی ہوتا ہے جو اللہ تعالیٰ کے قرب کا سب سے بہترین ذریعہ ہے، اس لیے وہ اللہ تبارک وتعالیٰ سے رجوع کرنے کا سب سے بہتر ذریعہ ہے، چنانچہ ایک حدیث میں نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

---

(۱) الحديث بهذا اللفظ أخرجه الطبري في تفسيره (۱۲/۱). وأخرج أبو داود (۳۵/۲) (۱۳۱۹) بلفظ "إذا حزبه أمر، صلى." باب وقت قيام النبي ﷺ من الليل. وقال ابن حجر في فتح الباري (۱۸۲/۳): "أخرجه أبو داود بإسناد حسن."

''جب کسی انسان کو اللہ تعالیٰ سے یا انسانوں میں سے کسی سے کوئی حاجت درپیش ہو تو اسے چاہیے کہ وہ اچھی طرح وضو کرے اور پھر دو رکعت پڑھے۔[1] (دو رکعت نمازِ حاجت کی نیت سے پڑھ کر اللہ تبارک وتعالیٰ سے دعا کرے اسے **صلوۃُ الحاجۃ** یا نمازِ حاجت بھی کہا جاتا ہے)۔''

یہ سب سے اہم وظیفہ اور سب سے اہم عمل ہے جو کسی حاجت کو پورا کرنے کے لیے نبیِ کریم سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سکھایا، اور اس آیتِ کریمہ نے بھی اس کی طرف اشارہ کیا ہے کہ جب کبھی تمہیں کوئی دشواری پیش آئے تو صبر سے اور نماز سے مدد لو، لہٰذا یہ نمازِ حاجت اللہ تعالیٰ سے اپنی حاجت پوری کرانے کی درخواست کرنے کا دوسرے تمام وظائف و اعمال کے مقابلے میں زیادہ افضل طریقہ ہے۔

صبر کرنے والوں کے لیے بے حساب اجر کا وعدہ

پھر آگے فرمایا: ﴿اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ۝۱۵۳﴾ ''بے شک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے،'' یعنی جب کوئی بندہ صبر کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی مدد اس کے شاملِ حال ہوتی ہے اور اسے اللہ تعالیٰ کی معیّت نصیب ہوتی ہے، جس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ اسے آخرت میں بھی اپنی نعمتوں سے سرفراز فرماتے ہیں اور دنیا میں بھی اس کی دستگیری فرماتے ہیں۔ یہ صبر کرنے والوں کے لیے بہت بڑے اعزاز و اکرام کا اعلان ہے کہ اللہ ان کے ساتھ ہے اور ظاہر ہے کہ جس شخص کے ساتھ اللہ ربُّ العزت کی طاقت ہو، اسے دنیا میں غموں اور پریشانیوں سے کیا خطرات لاحق ہوسکتے ہیں اور کون سی طاقت اسے عاجز کرسکتی ہے؟ اسی طرح ایک اور جگہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

اِنَّمَا يُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ [2]

---

(۱) ''قال رسول الله ﷺ: ''من كانت له إلى الله حاجة، أو إلى أحد من بني آدم فليتوضأ وليحسن الوضوء، ثم ليصل ركعتين.'' أخرجه الترمذي (۲/۳٤٤) (٤٧٩) باب ما جاء في صلاة الحاجة، وقال: ''هذا حديث غريب وفي إسناده مقال.'' ورواه أيضاً ابن ماجه (۱/٤٤١) (۱۳۸٤) كتاب في إقامة الصلاة والسنة فيها، باب ما جاء في صلاة الحاجة. والحاكم (۱/٤٦٦) (۱۱۹۹). وقال الهيثمي في ''المجمع'' (۲/۲۷۹) (۳٦٦۸): ''قلت روى الترمذي وابن ماجه طرفا من آخره خاليا عن القصة، وقد قال الطبراني عقبه: والحديث صحيح بعد ذكر طرقه التي روي بها.''

(۲) سورۃ الزمر (۳۹): آیت (۱۰)

بے شک اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کو بے حساب اجر عطا فرماتے ہیں۔

یعنی اس اجر کی کوئی گنتی ہی نہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ چاہتے تو گنتی بیان فرمادیتے، لیکن ہم لوگ گنتی سے عاجز ہیں، ہمارے پاس تو گنتی کے لیے چند عدد ہیں، مثلاً ہزار، لاکھ، کروڑ، ارب، کھرب، پدم، بس آگے کوئی اور لفظ نہیں ہے۔ اللہ چاہتے تو صبر کا اجر دینے کے لیے ان میں سے کوئی لفظ ذکر فرمادیتے، جیسا کہ صدقے کا ثواب سات سو گنا بیان فرمایا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ نے یہاں فرمادیا کہ صبر کرنے والے کو اجر دینے کے لیے کوئی گنتی ہی نہیں۔

شہادت ایک اعلیٰ مرتبہ اور عظیم نعمت

مسلمانوں کو جو معاملات درپیش تھے اور جو اندیشے لاحق تھے، ان میں ایک بہت بڑا مسئلہ یہ بھی تھا کہ مسلمانوں پر کفار کی طرف سے جنگ مسلّط کی جاتی تھی، اور اس جنگ کے نتیجے میں بہت سے حضرات شہادت کا درجہ حاصل کرتے تھے۔ اس لیے یہ فرمایا جارہا ہے کہ اگر کافروں کے مقابلے میں جہاد کرتے ہوئے کسی کی شہادت ہوجائے تو یہ بھی اس شخص کے لیے ایک بڑی عظیم نعمت ہے، چنانچہ فرمایا: ﴿وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ﴾ اور جو لوگ اللہ کے راستے میں قتل ہوں، انہیں مردہ نہ کہو ﴿بَلْ اَحْيَآءٌ﴾ بلکہ درحقیقت وہ زندہ ہیں ﴿وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ۝۱۵۴﴾ ”مگر تم کو احساس نہیں ہوتا“ یعنی تمہیں ان کی زندگی کا احساس نہیں ہوتا۔

اخروی زندگی کے دو درجے اور شہداء کی حیاتِ برزخی کی تفصیل

یہاں یہ بات سمجھنی چاہیے کہ جو شخص آخرت پر ایمان نہیں رکھتا، اس کے نزدیک تو جو کچھ ہے وہ اس دنیا کی ہی زندگی ہے، اسی میں جینا ہے، اسی میں مرنا ہے، اسی کی لذتیں اور راحتیں اسے سب سے بڑا مقصد نظر آتی ہیں، لیکن قرآنِ کریم نے جگہ جگہ اس بات کی طرف توجہ دلائی ہے کہ یہ دنیوی زندگی تو چند روز کی ہے اور نہ جانے کب ختم ہوجائے، اصل اور اَبدی زندگی تو وہ ہے جو مرنے کے بعد شروع ہوگی، جسے اخروی زندگی کہا جاتا ہے۔ اس زندگی کے دو درجے ہیں:

- ایک وہ زندگی ہے جو مرنے کے بعد سے لے کر قیامت کے وقت تک جاری رہے گی، اسے

''برزخی زندگی'' کہتے ہیں۔

- اور ایک وہ زندگی ہے جو قیامت کے بعد اور حساب و کتاب مکمل ہونے کے بعد شروع ہوگی، وہ ''آخرت کی زندگی'' ہے۔

اس آخرت کی زندگی میں تو صورتِ حال یہ ہوگی کہ انسان کے جسم اور روح دونوں کو دوبارہ زندہ کیا جائے گا، لہٰذا وہ زندگی جسم اور روح کے اعتبار سے بالکل ایسی ہی ہوگی جیسے کہ ہم دنیا میں زندہ رہتے ہیں، اِس میں ہمارے ساتھ روح بھی ہے اور جسم بھی ہے، دونوں کے باہمی تعلق سے یہ زندگی قائم ہوتی ہے، آخرت کی زندگی بھی اسی طرح کی ہوگی، البتہ دنیا کی زندگی کے بنسبت وہ زیادہ مکمل اور زیادہ پائیدار ہوگی، کیونکہ اس دنیا کی زندگی میں جسم کا تعلق روح کے ساتھ ہے تو سہی، لیکن اسے مختلف قسم کے عوارض لاحق ہوتے رہتے ہیں اور بہت سی بیماریاں آتی رہتی ہیں، جبکہ وہاں آخرت میں اس قسم کی کوئی چیز نہیں ہوگی، بلکہ جسم اور روح کا تعلق مستحکم بنیادوں پر قائم رہے گا۔

مرنے سے لے کر جنت اور جہنم کا فیصلہ ہونے تک یا قیامت تک کی جو زندگی ہوگی وہ برزخ کی زندگی کہلاتی ہے۔ اس میں صورتِ حال یہ ہوتی ہے کہ انسان کا جسم تو مردہ ہوجاتا ہے، لیکن روح مردہ نہیں ہوتی، بلکہ روح کو ایک زندگی حاصل رہتی ہے اور اس روح کا دنیا کے اندر پڑے ہوئے جسم کے ساتھ بھی کچھ نہ کچھ تعلق باقی رہتا ہے، لیکن چونکہ وہ تعلق بہت ہی ادنیٰ درجے کا اور معمولی قسم کا ہوتا ہے، اس واسطے جس کو یہاں موت لاحق ہوگئی اور اسے قبر میں دفن کردیا گیا اس آدمی کو ہم زندہ نہیں کہتے، بلکہ مردہ کہتے ہیں۔

جو اللہ تعالیٰ کے خاص بندے ہوتے ہیں، مثلاً: شہداء - جو اللہ کے راستے میں شہید ہوتے ہیں۔ انہیں بھی وہ برزخی زندگی حاصل ہوتی ہے، لیکن اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے وہاں برزخ میں ہی انہیں انعام واکرام سے نوازا جاتا ہے، اور ان کا تعلق اپنے جسم کے ساتھ عام لوگوں کے مقابلہ میں زیادہ مضبوط ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو اللہ تعالیٰ کے راستے میں شہید ہوتا ہے تو اس کا جسم گلتا سڑتا نہیں ہے، بلکہ بڑی حد تک اپنی اصلی حالت میں برقرار رہتا ہے، جس کے بے شمار شواہد دنیا میں لوگوں نے دیکھے بھی ہیں۔ وہ لوگ جو عرصۂ دراز پہلے اللہ تعالیٰ کے راستے میں شہید ہوگئے تھے، جب ان کی قبر کو کسی وجہ سے کھولا گیا تو ان کا جسم اسی طرح تروتازہ پایا گیا جس طرح انہیں دفن کیا گیا تھا۔

شہداء کے جسم کے ساتھ روح کا تعلق عام لوگوں کے مقابلے میں زیادہ قوی ہوتا ہے اور وہ اس برزخی

زندگی میں اللہ تبارک وتعالیٰ کی نعمتوں سے فیضیاب ہوتے رہتے ہیں، اس لیے انہیں خاص طور پر یہ کہا گیا کہ انہیں تم معمولی مُردوں کی طرح مُردہ نہ سمجھو، بلکہ انہیں ایک ممتاز حیات حاصل ہے اور وہ زندہ ہیں۔ زندہ ہونا کئی اعتبار سے ہے؛ اس اعتبار سے بھی کہ ان کے جسم کے ساتھ ان کی روح کا تعلق مضبوط ہے، اس اعتبار سے بھی کہ اللہ تبارک وتعالیٰ انہیں اپنی خاص نعمتوں سے نوازتے رہتے ہیں، اس معنیٰ میں بھی کہ ان کا جسم گلتا سڑتا نہیں ہے، اور اس معنیٰ میں بھی کہ بعض دنیاوی احکام میں بھی شہید کا حکم عام مُردوں سے مختلف ہوتا ہے۔ مثلاً عام مُردوں کو غسل دیا جاتا ہے، لیکن جو اللہ تعالیٰ کے راستے میں شہید ہوا ہو، اسے غسل دینے کی ضرورت نہیں ہوتی، بلکہ اسے اسی حالت میں دفن کر دیا جاتا ہے۔

انبیائے کرام علیہم السلام کی اعلیٰ درجے کی حیاتِ برزخی

حیاتِ برزخی کے اعتبار سے اگرچہ شہداء کو مذکورہ بالا امتیازات حاصل ہیں، تاہم اتنی بات ضرور ہے کہ شہداء احکامِ ظاہرہ میں عام مُردوں کی طرح ہی ہوتے ہیں، چنانچہ ان کی میراث تقسیم ہوتی ہے اور ان کی بیویاں دوسروں سے نکاح کر سکتی ہیں، جبکہ شہداء سے بھی اعلیٰ درجے کی حیات اور زندگی انبیائے کرام علیہم السلام کو حاصل ہوتی ہے۔ ان کی روح کا جسم سے جو تعلق ہوتا ہے وہ شہیدوں سے بھی زیادہ اعلیٰ درجے کا ہوتا ہے اور اس کی وجہ سے انہیں جو برزخی حیات حاصل ہوتی ہے وہ دیگر تمام انسانوں سے زیادہ اعلیٰ اور اکمل درجے کی ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے انبیائے کرام علیہم السلام کی میراث بھی تقسیم نہیں ہوتی اور اُن کی جو ازواجِ مطہرات ہیں ان کے لیے کسی دوسرے سے نکاح کرنا بھی جائز نہیں ہوتا۔ دنیا میں بھی ان پر یہ سارے احکام جاری ہوتے ہیں۔

بہرحال! اللہ تبارک وتعالیٰ یہاں یہ فرما رہے ہیں کہ جو لوگ اللہ تبارک وتعالیٰ کے راستے میں جہاد کرتے ہوئے کفار کے ہاتھوں شہید ہو جاتے ہیں، تو تم اگرچہ ظاہری نظر سے انہیں مردہ سمجھ رہے ہو، لیکن حقیقت میں وہ زندہ ہیں اور تمہیں ان کی زندگی کا احساس نہیں ہے۔ انہیں چونکہ برزخی زندگی زیادہ قوی قسم کی حاصل ہے اور اللہ تعالیٰ کی نعمتوں سے بھی وہ فیضیاب ہو رہے ہیں، لہٰذا تمہیں ان پر غم کرنے کی ضرورت نہیں ہے، وہ یقیناً اللہ تبارک وتعالیٰ کے نزدیک بڑے درجے والے ہیں، اس درجے کے ملنے پر تمہیں افسوس کرنے کے بجائے اس بات پر اطمینان رکھنا چاہیے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے راستے میں شہید ہوئے ہیں۔

صدموں کے مواقع پر ایک مومن کا صحیح طرزِ عمل

پھر آگے فرمایا: ﴿وَ لَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَ الْجُوْعِ وَ نَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَ الْاَنْفُسِ وَ الثَّمَرٰتِ﴾ ''اور دیکھو ہم تمہیں کبھی خوف سے، کبھی بھوک سے اور کبھی مال و جان اور پھلوں میں کمی کر کے ضرور آزمائیں گے۔''

یہاں بتلانا یہ مقصود ہے کہ یہ صرف جہاد ہی کا معاملہ نہیں ہے جس میں لوگ شہید ہوجائیں تو اس سے تمہیں صدمہ پہنچے، بلکہ صدمہ پہنچنے کے کچھ اور اسباب بھی پیش آسکتے ہیں، کیونکہ یہ دنیا ہے، جنت نہیں ہے جس میں کبھی کوئی تکلیف ہی پیش نہ آئے۔ ایسے مواقع پر ایک صاحبِ ایمان کو کیا سوچنا چاہیے اور کیا کرنا چاہیے؟ اس کے بارے میں یہاں تفصیلی ہدایات دی جارہی ہیں۔ چنانچہ پہلے قدم پر تو یہ سمجھنا چاہیے کہ صدمے کے یہ واقعات دراصل ایک صاحبِ ایمان کے لیے آزمائش ہوتے ہیں۔ آزمائش اس بات کی کہ ایسے مواقع پر تمہارا ردِّ عمل کیا ہوتا ہے؟ چنانچہ عموماً ایسے مواقع پر دو صورتیں پیش آتی ہیں:

- ایک صورت تو یہ ہے کہ کسی صدمے کے نتیجے میں تم اللہ تعالیٰ سے شکوہ کرنے لگ جاؤ کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے اس صدمے میں کیوں مبتلا کیا۔ سوچ کے اس انداز سے مصیبت تو نہیں ٹلے گی، البتہ ایمان کی پختگی ہاتھ سے چلی جائے گی۔
- دوسری صورت یہ ہے کہ تم یہ سمجھو کہ اللہ تعالیٰ کا کوئی فیصلہ حکمت سے خالی نہیں ہوسکتا، اس لیے یقیناً اس میں بھی کوئی حکمت اور مصلحت ہے اور اس سے نہ جانے میرے کون کون سے گناہ معاف ہورہے ہوں، اور آخرت میں میرے درجات میں کتنا اضافہ ہورہا ہو، اس لیے میں اللہ تعالیٰ کے فیصلے پر راضی رہ کر اسی کی طرف رجوع کروں گا کہ یا اللہ! میں کمزور ہوں، اس مصیبت کا تحمل میرے لیے مشکل ہورہا ہے، اسے دور فرما دیجیے!

اس طرح امید ہے کہ یا تو وہ مصیبت اللہ تعالیٰ کے فضل سے دور ہوجائے گی یا کم از کم صبر وسکون کی دولت حاصل ہوجائے گی۔ صدموں کے موقع پر انسان کی آزمائش یہی ہے کہ وہ ان دونوں میں سے کون سا راستہ اختیار کرتا ہے۔

یہاں یہ سمجھ لینا چاہیے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے تین قسم کے عالَم پیدا فرمائے ہیں:

- ایک عالَم وہ ہے جس میں خوشی ہی خوشی، راحت ہی راحت ہے اور وہ ہے جنت۔ اس میں کسی غم اور کسی تکلیف کا گزر نہیں ہے۔
- اور دوسرا عالَم وہ ہے جس میں تکلیف ہی تکلیف ہے، اور راحت و آرام کا کوئی سوال ہی نہیں، اور وہ ہے جہنم -أعاذنا الله منها-
- اور ایک عالَم وہ ہے جو ان دونوں کے درمیان ہے، اور وہ ہے دنیا۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نے دنیا ایسی بنائی ہے کہ اس میں انسان کو راحت بھی میسر آتی ہے، خوشیاں بھی آتی ہیں، لذتیں بھی حاصل ہوتی ہیں، لیکن ساتھ ساتھ تکلیفیں اور پریشانیاں بھی پیش آتی ہیں، صدمے بھی اٹھانے پڑتے ہیں اور ناگوار باتوں کا سامنا بھی کرنا پڑتا ہے۔

ان آیاتِ مبارکہ میں اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو یہ بتانا چاہ رہے ہیں کہ دنیا میں انسان کو جو تکلیفیں پیش آتی ہیں، ان سے کوئی شخص مستثنیٰ نہیں، کوئی بڑے سے بڑا صاحبِ اقتدار، کوئی بڑے سے بڑا بادشاہ اور کوئی بڑے سے بڑا سرمایہ دار ایسا نہیں ہے جس کو دنیا میں کبھی کوئی تکلیف پیش نہ آئی ہو، ہر شخص پر کوئی نہ کوئی آزمائش آتی ہے۔ اس لیے مسلمانوں سے یہ کہا جارہا ہے کہ تم ان تکلیفوں کے مواقع پر ذرا غور کرو کہ ہم تمہیں جو یہ تکلیفیں آزمائش کے لیے دے رہے ہیں، یہ درحقیقت اس لیے دے رہے ہیں تاکہ تم ان آزمائشوں سے گزر کر کُندن (خالص سونا/ پکے مسلمان) بن جاؤ، اور ان آزمائشوں سے گزر کر تمہاری مکمل تطہیر اور تزکیہ ہوجائے، اس لیے تمہارا علی العموم تھوڑی تھوڑی تکلیف اور مصیبت میں وقتاً فوقتاً امتحان لیا جائے گا اور دیکھا جائے گا کہ اس موقع پر تم کیا رویّہ اپناتے ہو؟

اللہ تعالیٰ کی طرف سے آزمائش کی شکلیں

یہاں اللہ تعالیٰ نے اس آیتِ مبارکہ میں صدموں اور تکلیفوں کی پانچ صورتوں کا بیان فرمایا ہے:

(۱) **خوف کے ذریعے آزمائش:** اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ﴾ ''اور ہم تمہیں کبھی کچھ خوف کے ساتھ آزمائیں گے،'' یعنی تمہارے اوپر کوئی خوف طاری ہوجائے گا۔ مسلمان جب مدینہ منوّرہ کے اندر اپنی ریاست قائم کررہے تھے، تو انہیں مختلف اطراف سے خطرات درپیش رہتے تھے، ایک طرف کفارِ مکّہ تھے جو اُن پر حملہ آور ہونے کے منصوبے بنارہے تھے اور بہت مرتبہ حملہ آور بھی ہوئے اور

ان کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ کسی طرح مسلمانوں کو نیست و نابود کردیں، جبکہ دوسری طرف یہودی تھے، جن کا خطرہ اس طرح تھا کہ شمال میں ان کی ایک ریاست خیبر میں آباد تھی اور وہاں سے وہ مسلمانوں کے خلاف سازشیں کرتے رہتے تھے اور دوسری طرف خود مدینہ منوّرہ کے اندر جو یہودی آباد تھے، وہ بعض اوقات مشرکین سے مل کر مسلمانوں کے خلاف سازشوں کے جال بُنتے رہتے تھے۔ اسی طرح آئندہ بھی ہر مسلمان کو کبھی نہ کبھی کوئی خوف لاحق ہوسکتا ہے۔

(۲) **بھوک کے ذریعے آزمائش:** ﴿وَالْجُوْعِ﴾ اور کبھی بھوک کے ذریعے آزمایا جائے گا، بھوک کا مطلب یہ کہ تمہیں فقر وفاقہ سے بھی سابقہ پیش آسکتا ہے۔ اس زمانے کے حالات کو اگر مدِّنظر رکھا جائے تو صورتِ حال یہ تھی کہ اس وقت تجارت پر تمام تر قبضہ قریش کے لوگوں کا تھا اور قریش کے لوگ ہی مسلمانوں کے دشمن ہوگئے تھے، لہٰذا تجارت کے جو معاشی راستے تھے وہ مسلمانوں پر بند کردیے گئے تھے، اسی طرح دنیا میں اور لوگوں کو بھی کبھی ایسے حالات پیش آسکتے ہیں۔

(۳) **اموال کے نقصان کے ذریعے آزمائش:** پھر فرمایا: ﴿وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ﴾ ''اور کبھی مال میں کمی کر کے آزمائیں گے،'' یعنی کسی بھی طریقے سے تمہارے مال میں کوئی کمی ہوجائے گی، کوئی چوری ہوگئی، کوئی ڈاکا پڑ گیا، کبھی تجارت میں نقصان ہوگیا۔

(۴) **جانی نقصان کے ذریعے آزمائش:** آگے فرمایا: ﴿وَالْاَنْفُسِ﴾ اور کبھی تمہاری جانوں میں کمی کے ذریعے آزمائش ہوگی، جانوں میں کمی ہونے کے معنیٰ یہ ہیں کہ تمہارے عزیزوں میں، رشتے داروں میں، دوست احباب میں کسی کا انتقال ہوگیا اور وہ دنیا سے چلا گیا۔ اس کی زندگی میں تمہیں اس پر بھروسہ تھا، لیکن وہ دنیا سے چلا گیا تو اس کی وجہ سے تم اپنے لیے خطرات محسوس کرتے ہو یا اس کی وجہ سے تمہیں صدمہ ہوتا ہے۔

(۵) **پھلوں میں کمی کے ذریعے آزمائش:** پانچویں نمبر پر فرمایا: ﴿وَالثَّمَرٰتِ﴾ اور اسی طرح پھلوں کے اندر کمی سے بھی تمہیں آزمایا جائے گا۔ اگرچہ عمومی اعتبار سے دیکھا جائے تو پھلوں کا ذکر اموال کے اندر خود بخود موجود تھا، کیونکہ یہ بھی مال اور سرمایہ ہوتے ہیں، لیکن اسے خاص طور پر الگ سے اس لیے ذکر فرمایا کہ اموال عربی زبان میں عام طور سے یا تو تجارت کے مال کو کہا جاتا ہے یا جو مال مویشی ہوتے ہیں انہیں کہا جاتا ہے، جبکہ مدینہ منوّرہ کے جو حضرات تھے وہ زیادہ تر کھیتی باڑی کا پیشہ کرتے تھے، ان کے یہاں کھجور کے

باغات اور کچھ کھیت ہوا کرتے تھے، انہی پر ان کی معاشی زندگی کا دارومدار تھا۔ اس لیے ثمرات کو خاص طور پر الگ سے ذکر کر دیا گیا، ثمرات سے زمین کی پیداوار مراد ہوتی ہے، جس میں باغات اور کھیت بھی شامل ہیں۔

آزمائشوں پر صبر کا مظاہرہ کرنے والوں کے لیے خوشخبری

ان مختلف قسم کی آزمائشوں کا تذکرہ کر کے آگے فرمایا: ﴿وَ بَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ ۝۱۵۵﴾ ''اور خوشخبری سنا دو صبر کرنے والوں کو،'' یعنی ان تمام تکلیفوں کے مواقع پر جو لوگ صبر کا مظاہرہ کریں انہیں خوشخبری سنا دو۔ صبر کا مظاہرہ کرنے والے کون لوگ ہیں اس کی تفصیل اگلی آیت میں ارشاد فرمائی کہ ﴿الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ﴾ یہ وہ لوگ ہیں جب انہیں کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو ﴿قَالُوْٓا﴾ وہ کہتے ہیں ﴿اِنَّا لِلّٰهِ﴾ کہ ہم سب اللہ ہی کے ہیں ﴿وَ اِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ۝۱۵۶﴾ ''اور ہم کو اللہ ہی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔''

مصیبت میں غم کا اظہار صبر کے منافی نہیں

اس آیتِ کریمہ میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے جب صبر کرنے والوں کی تعریف بیان فرمائی اور انہیں خوشخبری دی تو یہ نہیں فرمایا کہ صبر کرنے والے وہ ہیں جو رنج وغم کا اظہار نہ کریں یا روئیں نہیں، بلکہ فرمایا کہ جو اس تکلیف اور مصیبت پہنچنے کے موقع پر یہ کہیں کہ: ﴿اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ﴾ ''ہم اللہ ہی کے ہیں اور ہم کو اللہ ہی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔'' اس میں بتلا دیا کہ صبر کے معنیٰ یہ نہیں ہیں کہ کسی تکلیف کے موقع پر انسان غم کا اظہار نہ کرے، کیونکہ یہ تو ایک بشری تقاضا اور ایک غیر اختیاری کیفیت ہے۔ اگر کسی انسان کو کوئی صدمہ پہنچتا ہے تو وہ اس کے اوپر رنجیدہ ہوتا ہی ہے، چونکہ یہ غیر اختیاری معاملہ ہے۔ اس لیے اس پر اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے کوئی گرفت نہیں اور نہ یہ کوئی گناہ ہے۔

یہاں تک کہ اگر تکلیف کی وجہ سے یا صدمہ کی وجہ سے بے اختیار رونا بھی آجائے، تو وہ رونا بھی صبر کے منافی نہیں ہے اور وہ بے صبری نہیں کہلائے گا، کیونکہ یہ رونا غیر اختیاری طور پر آیا ہے۔ عام طور سے اگر کسی کا انتقال ہوجائے اور اس کی موت پر کوئی بے اختیار رو رہا ہو تو اسے بے صبری سمجھتے ہیں، یہ بات صحیح نہیں ہے۔ اگر جان بوجھ کر نہیں رو رہا، بلکہ بے اختیار اسے رونا آگیا ہے تو نہ صرف یہ کہ ناجائز نہیں، بلکہ یہ صبر کے بھی خلاف نہیں ہے۔

مصائب پر صبر کا حقیقی مفہوم

صبر کے معنیٰ یہ ہیں کہ مصیبت و تکلیف پہنچنے پر آدمی یہ کہے کہ: ''اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ'' یعنی وہ اس تکلیف یا اس صدمے پر اللہ تعالیٰ کی کوئی شکایت نہ کرے، نہ اللہ تعالیٰ کی تقدیر کا شکوہ کرے۔ اگر ایک طرف آدمی یہ سوچے کہ بے شک مجھے تکلیف اور صدمہ پہنچا ہے، اس صدمے اور تکلیف کی وجہ سے میں اپنے اس صدمے اور تکلیف کا اظہار بھی کر رہا ہوں، اس پر مجھے رونا بھی آرہا ہے، میرے دل میں غم کی آگ بھی بھڑک رہی ہے، لیکن اس سب کے باوجود میں اس بات پر یقین رکھتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ فیصلہ فرمایا ہے، وہی برحق اور وہی درست ہے، مجھے اللہ تعالیٰ کی تقدیر سے کوئی شکوہ نہیں ہے، تو یہ مکمل صبر ہے اور اس پر ان شاء اللہ تعالیٰ اسے صبر کا پورا ثواب حاصل ہوگا۔

اِنَّا لِلّٰهِ.... تسلیم و رضا کا خوبصورت جملہ

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ صبر کرنے والے لوگ تکلیف و مصیبت کے موقع پر ﴿اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ﴾ کہتے ہیں۔ یہ تسلیم و رضا کا خوبصورت جملہ ہے۔ اس میں راضی برضا ہونے کا پہلو بھی ہے اور آخرت کے انعامات کی امید بھی۔ پہلے جملے میں ﴿اِنَّا لِلّٰهِ﴾ کے ذریعے اللہ تعالیٰ کے فیصلے پر راضی رہنے کی بات ارشاد فرمائی گئی اور کہا گیا کہ ''ہم سب اللہ ہی کے ہیں،'' یعنی ہم اللہ تبارک وتعالیٰ کی ملکیت ہیں، اللہ تعالیٰ ہی ہمارا مالک ہے، لہٰذا مالک کا ہر تصرّف اپنی ملکیت میں برحق ہوتا ہے۔ اگرچہ بظاہر اور وقتی طور پر ہمیں تکلیف پہنچ رہی ہے، لیکن اس نے جو کچھ بھی ہمارے ساتھ معاملہ کیا ہے وہ برحق ہے۔

پھر صبر کے بدلے میں آخرت کے ثواب کی امید کے لیے فرمایا: ﴿وَ اِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ﴾ ''اور ہم اسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں۔'' اس میں اشارہ اس طرف ہے کہ اگرچہ یہاں فوری طور پر ہمیں تکلیف پہنچ رہی ہے اور صدمہ ہو رہا ہے، لیکن بالآخر ہم اللہ تبارک وتعالیٰ کے پاس پہنچیں گے، وہاں پر اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہمارے لیے صبر کے بدلے کے طور پر اور اللہ تعالیٰ کی تقدیر پر راضی رہنے کے نتیجے میں بہت عظیم اجر و ثواب تیار کر رکھا ہے، لہٰذا یہ جو تکلیف ہمیں یہاں پہنچ رہی ہے، یہ درحقیقت اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہمارے درجات بلند کرنے کے لیے، ہمارے گناہوں کی معافی کے لیے اور آخرت میں اپنے انعامات سے نوازنے کے لیے دی ہے۔

اگر ﴿اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ﴾ کا یہ جملہ کسی کے انتقال کے موقع پر کہا جائے تو پھر اس کا مفہوم یہ بنتا ہے کہ پہلے تو ﴿اِنَّا لِلّٰهِ﴾ یعنی ''ہم سب اللہ ہی کے ہیں۔'' اس میں اس حقیقت کا اظہار کیا گیا ہے کہ چونکہ ہم سب اللہ تعالیٰ کی ملکیت میں ہیں، اس لیے اسے ہمارے بارے میں ہر فیصلے کا اختیار ہے اور چونکہ ہم اس کے ہیں اور کوئی بھی اپنی چیز کا برا نہیں چاہتا، اس لیے ہمارے بارے میں اس کا ہر فیصلہ خود ہماری مصلحت میں ہوگا، چاہے فی الحال ہمیں وہ مصلحت سمجھ میں نہ آرہی ہو۔

دوسری طرف ﴿وَ اِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ﴾ یعنی ''اور ہم کو اللہ ہی کی طرف لوٹ کا جانا ہے۔'' اس حقیقت کا اظہار ہے کہ ایک دن ہمیں بھی اللہ تعالیٰ کے پاس اسی جگہ جانا ہے جہاں ہمارا کوئی عزیز یا دوست گیا ہے، لہٰذا یہ جدائی عارضی ہے ہمیشہ کے لیے نہیں ہے۔ اور جب ہم اس کے پاس لوٹ کر جائیں گے تو ہمیں اس صدمے یا تکلیف پر ان شاء اللہ ثواب بھی ملنا ہے۔ جب یہ اعتقاد دل میں ہو تو اسی کا نام صبر ہے، خواہ اس کے ساتھ بے اختیار آنسو بھی نکل رہے ہوں، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

دنیا کی تکالیف بلندیٔ درجات کا ذریعہ

ایک حدیث میں آتا ہے کہ نبیِ کریم سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

> ''جب آخرت میں اللہ تبارک وتعالیٰ صبر کرنے والوں کو اپنے اجر وثواب سے نوازیں گے اور ان پر انعامات کی بارشیں ہوں گی، تو لوگ یہ سوچیں گے کہ کاش دنیا کے اندر ہماری کھالیں قینچی سے کاٹی گئی ہوتیں، (اور اس پر ہم صبر کرتے تو آج ہمیں یہ اعلیٰ درجے کے انعامات نصیب ہوتے۔)''(۱)

آخرت میں دنیا کی ان تکلیفوں کی حقیقت واضح ہوگی کہ اللہ تبارک وتعالیٰ ان کے بدلے میں جو انعامات عطا فرما رہے ہیں، اُن کے مقابلے میں یہ تکلیفیں کچھ بھی حقیقت نہیں رکھتی تھیں۔ اس کی مثال کچھ

---

(۱) أخرجه الترمذي في سننه (٤/٦٠٣) (٢٤٠٢) وقال: "هذا حديث غريب لا نعرفه بهذا الإسناد إلا من هذا الوجه." ابواب الزهد. وقال المنذري في "الترغيب" (٤/ ١٤٢): "رواه الترمذي وابن أبي الدنيا من رواية عبدالرحمن بن مغراء وبقية رواته ثقات." وأخرجه الطبراني في المعجم الصغير (١/١٥٦) (٢٤١) باب الألف، من اسمه إبراهيم.

ایسی ہے کہ جیسے کوئی ڈاکٹر کسی بیمار کا آپریشن کرے، تو آپریشن کے دوران مریض کو تکلیف تو بے شک ہوتی ہے اور اس تکلیف کی وجہ سے بعض اوقات وہ کراہ بھی رہا ہوتا ہے، لیکن اس کا دل اس بات پر مطمئن ہوتا ہے کہ ڈاکٹر جو کچھ کر رہا ہے وہ بالکل ٹھیک کر رہا ہے، میرے فائدے کے لیے کر رہا ہے اور اس کا نتیجہ بالآخر میرے ہی حق میں بہتر ہوگا، کیونکہ اس کے نتیجے میں مجھے صحت حاصل ہوگی۔ اسی طرح اس دنیا میں جو تکلیفیں پہنچ رہی ہیں، ان کے بارے میں یہ سمجھنا چاہیے کہ یہ ہمارے مالک و خالق کی طرف سے اس لیے ہمیں پہنچائی جارہی ہیں تاکہ ہمیں اس کے فائدے حاصل ہوں اور ہمارے درجات بلند ہوں۔ چونکہ ہم اسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں اور وہی ہمارے ساتھ انعامات کا معاملہ فرمائیں گے، اس لیے اس پر غمزدہ ہونے کے باوجود ہم اس کے فیصلے پر راضی ہیں۔

صبر کرنے والوں کے لیے خصوصی عنایتیں اور انعامات

پھر آگے فرمایا: ﴿اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَ رَحْمَةٌ﴾ ''یہ وہ لوگ ہیں جن پر ان کے پروردگار کی طرف سے خصوصی عنایتیں ہیں اور رحمت ہے۔'' جو لوگ اس طرح صبر کرنے والے ہیں کہ چاہے ان کے رویّے سے تکلیف کا اظہار ہو بھی رہا ہو، لیکن وہ اللہ تعالیٰ کے فیصلے پر راضی ہوں، اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّا اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ کہہ رہے ہوں اور اس کے معنیٰ بھی سمجھ رہے ہوں کہ ''ہم اللہ ہی کے ہیں اور اللہ ہی کے پاس واپس لوٹ کر جانے والے ہیں،'' تو ایسے لوگوں پر اُن کے پروردگار کی طرف سے ﴿صَلَوٰتٌ﴾ یعنی ''خصوصی عنایتیں ہیں۔''

''صلوات'' صلاۃ کی جمع ہے اور لغت میں اس کے معنیٰ کسی کی طرف آگے بڑھنے کے آتے ہیں۔ جب اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف اس لفظ کی نسبت ہوتی ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے اللہ تبارک وتعالیٰ کا کسی کی طرف خصوصی طور سے متوجّہ ہونا اور اسے اپنی عنایات سے نوازنا۔ ﴿صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ﴾ ان کے پروردگار کی طرف سے خصوصی عنایتیں ہیں، ﴿وَ رَحْمَةٌ﴾ ''اور رحمت ہے۔'' اللہ تبارک وتعالیٰ کے ان کی طرف متوجہ ہونے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ان لوگوں پر خاص خاص عنایتیں بھی ہوں گی اور عام رحمت بھی نازل ہوگی۔ ﴿وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ ﴿۱۵۷﴾﴾ ''اور یہی لوگ ہیں جو ہدایت پر ہیں،'' کیونکہ انہوں نے حق تعالیٰ شانہٗ کو ہر چیز کا مالک ہونے کے ساتھ ساتھ ہر نقصان کا تدارک کرنے والا سمجھ رکھا ہے اور ہر آزمائش میں اس کی رضا پر راضی ہوتے ہیں۔

ہر چھوٹی بڑی تکلیف پر اِنَّا لِلّٰہِ... کہنے کی عادت بنائیں!

ان آیات میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس طرح صبر کرنے والوں کو تین بشارتیں عطا فرمائیں:

۱- ایک اللہ تعالیٰ کی خصوصی عنایت ان کی طرف متوجہ ہوگی۔

۲- دوسرا یہ کہ ان پر رحمتیں نازل ہوں گی۔

۳- تیسرا یہ کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے صحیح ہدایت پر ہوں گے، اللہ تبارک وتعالیٰ انہیں گمراہی سے محفوظ رکھیں گے۔

یہ بہت ہی عظیم بشارتیں ہیں جو صبر کرنے والوں کو عطا ہوئی ہیں۔ اسی لیے کہا گیا ہے کہ دنیا میں جب بھی تمہیں کوئی ناگوار بات پیش آئے، چاہے وہ معمولی درجے ہی کی کیوں نہ ہو تو تم ''اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ'' کہا کرو، تاکہ تمہیں ان عنایتوں کا سزاوار (مستحق) قرار دیا جاسکے۔ ایسا کہنے میں ثواب بھی بڑا ہے اور اگر یہ کلمات دل سے سمجھ کر کہے جائیں تو یہ رنج وغم کے دور کرنے اور دل کو تسلی دینے کے معاملے میں بھی اکسیر کا درجہ رکھتے ہیں۔

بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اِنَّا لِلّٰہ کا کلمہ صرف کسی کی موت ہی پر پڑھا جاتا ہے، اگر کوئی کسی دوسرے موقع پر پڑھ دے تو بعض لوگ ناراض ہونے لگتے ہیں، حالانکہ یہ کلمہ ہر چھوٹی بڑی تکلیف کے موقع پر پڑھنا چاہیے۔ حدیث میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ رات کے وقت چراغ جل رہا تھا اور کسی وجہ سے وہ بجھ گیا تو نبیِ کریم سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ'' حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے پوچھا کہ یا رسول اللہ! کیا چراغ بجھنا بھی ایسا موقع ہے کہ اس پر اِنَّا لِلّٰہِ پڑھا جائے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہر وہ چیز جو مومن کو ناگوار ہو ایک مصیبت ہے (جس پر اِنَّا لِلّٰہ پڑھنا چاہیے)۔[1]

اس سے پتہ چلا کہ چاہے چھوٹی سی بھی کوئی بات ہو، جو طبیعت کے خلاف ہوئی ہو یا کسی چیز پر ناگواری ہوئی ہو تو اس پر بھی ''اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ'' پڑھنا چاہیے۔ یہ کلمات پڑھنے سے اور اس کے معنیٰ سمجھنے

---

(۱) أخرجه أبو داود في "المراسيل" (ص: ۲۹۷) (٤١٢): عن عمران القصير، قال: طفئ مصباح النبي ﷺ فاسترجع قالت عائشة: إن هذا مصباح، قال: "كل ما ساء المؤمن فهو مصيبة." وأورده الزيلعي في "تخريج أحاديث الكشاف" (ص: ۹٦) (۷۹)، وعزاه إلى أبي داود في "المراسيل"، ولم يتكلم عليه.

سے اللہ تعالیٰ کی رحمتیں متوجہ ہوں گی اور جو تین بشارتیں دی گئی ہیں، ان شاء اللہ وہ بھی حاصل ہوں گی۔

آیت نمبر ۱۵۸ تا ۱۶۲

اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآىِٕرِ اللّٰهِ ۚ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ اَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا ؕ وَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا ۙ فَاِنَّ اللّٰهَ شَاكِرٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۵۸﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ وَالْهُدٰى مِنْۢ بَعْدِ مَا بَيَّنّٰهُ لِلنَّاسِ فِى الْكِتٰبِ ۙ اُولٰٓئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللّٰهُ وَيَلْعَنُهُمُ اللّٰعِنُوْنَ ﴿۱۵۹﴾ ۙ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا وَاَصْلَحُوْا وَبَيَّنُوْا فَاُولٰٓئِكَ اَتُوْبُ عَلَيْهِمْ ۚ وَاَنَا التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۶۰﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَمَاتُوْا وَهُمْ كُفَّارٌ اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ لَعْنَةُ اللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ﴿۱۶۱﴾ ۙ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ ﴿۱۶۲﴾

بے شک صفا اور مروہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں، لہٰذا جو شخص بھی بیت اللہ کا حج کرے یا عمرہ کرے تو اس کے لیے اس بات میں کوئی گناہ نہیں ہے کہ وہ ان کے درمیان چکر لگائے۔ اور جو شخص خوشی سے کوئی بھلائی کا کام کرے تو اللہ یقیناً قدر دان (اور) جاننے والا ہے۔ ﴿۱۵۸﴾ بے شک وہ لوگ جو ہماری نازل کی ہوئی روشن دلیلوں اور ہدایت کو چھپاتے ہیں، باوجودیکہ ہم انہیں کتاب میں کھول کھول کر لوگوں کے لیے بیان کر چکے ہیں، تو ایسے لوگوں پر اللہ بھی لعنت بھیجتا ہے اور دوسرے لعنت کرنے والے بھی لعنت بھیجتے ہیں۔ ﴿۱۵۹﴾ ہاں وہ لوگ جنہوں نے توبہ کرلی ہو اور اپنی اصلاح کرلی ہو اور (چھپائی ہوئی باتوں کو) کھول کھول کر بیان کردیا ہو تو میں ایسے لوگوں کی توبہ قبول کرلیتا ہوں۔ اور میں توبہ قبول کرنے کا خوگر ہوں، بڑا رحمت والا۔ ﴿۱۶۰﴾ بے شک وہ لوگ جنہوں نے کفر اختیار کیا اور کافر ہونے کی حالت ہی میں مرے، ان

پر اللہ کی اور فرشتوں کی اور سارے انسانوں کی لعنت ہے۔ (۱۶۱) وہ ہمیشہ اسی پھٹکار میں رہیں گے۔ نہ ان پر سے عذاب کو ہلکا کیا جائے گا، اور نہ ان کو مہلت دی جائے گی۔ (۱۶۲)

آیاتِ مبارکہ کا ماقبل سے ربط

ان آیاتِ کریمہ میں سے پہلی آیت میں صفا اور مروہ کے درمیان سعی کا ذکر فرمایا گیا ہے۔ اس آیت کا تعلق پچھلی آیات سے دو طرح ہے؛

- ایک تو یہ بات کہ پیچھے جہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذکر آیا تھا، وہاں اُن کی اس دعا کا بھی ذکر آیا تھا کہ ''اور ہمیں ہماری عبادتوں کے طریقے سکھادے''۔ (۱) انہی حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دینی شعائر، یعنی طریقۂ عبادت میں سے ایک یہ بھی تھا کہ صفا اور مروہ کے درمیان سعی کو حج کا ایک لازمی حصہ قرار دیا گیا تھا، لیکن اس عبادت میں مشرکین نے کچھ تبدیلیاں کردی تھیں، اس لیے ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے سعی کا تذکرہ فرمایا ہے۔
- دوسرے یہ کہ اس آیت سے پہلے جو آیتیں آئی ہیں جن کی تشریح ہم پہلے کرچکے ہیں، وہ مسلمانوں کو یہ حکم دے رہی ہیں کہ وہ آنے والی مصیبتوں پر بے صبری کا مظاہرہ کرنے کے بجائے صبر اختیار کریں، اور یہ بتایا گیا ہے کہ صبر کرنے والوں کے لیے اللہ تعالیٰ کی نصرت ہوتی ہے اور ان کے اوپر اللہ تعالیٰ کی رحمتیں نازل ہوتی ہیں۔ اب یہاں اسی قسم کی ایک آزمائش اور اس پر صبر کی منفرد مثال بیان کی جارہی ہے، جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اہلیہ محترمہ حضرت ہاجرہ علیہا السلام کو پیش آئی تھی اور اس کا انجام دنیا نے دیکھا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے ان کی مدد کی گئی۔

حضرت ہاجرہ کا صفا اور مروہ کے درمیان پانی کی تلاش میں دوڑنا اور زم زم کا ظاہر ہونا یہ سب باتیں اکثر مسلمانوں کو معلوم ہوتی ہیں، اور پیچھے آیت نمبر ۱۲۵ کی تفسیر میں اس کا واقعہ بھی تفصیل سے آچکا ہے۔

---

(۱) ﴿وَ اَرِنَا مَنَاسِكَنَا﴾ [البقرة:۱۲۸]

صفا و مروہ اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ہیں

یہاں ان آیاتِ مبارکہ میں یہ بتلایا گیا ہے کہ صفا اور مروہ اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہیں، چنانچہ فرمایا: ﴿اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآىِٕرِ اللّٰهِ﴾ ''بے شک صفا اور مروہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں۔''

''شَعَآئر'' شعیرہ کی جمع ہے اور شعیرہ کے لغوی معنیٰ علامت کے آتے ہیں۔ جیسے اگر کسی چیز کی علامت کے لیے، اس کا راستہ بتانے کے لیے کوئی بورڈ لگا دیا جائے یا کوئی ستون نصب کر دیا جائے، تو اسے عربی میں شعیرہ کہتے ہیں۔ اسلام میں بعض اعمال ایسے ہیں جو اسلام اور مسلمانوں کی نمایاں علامت کے طور پر پہچانے جاتے ہیں، جیسے مساجد، اذان، بیت اللہ شریف وغیرہ، انہیں ''شعائرِ اسلام'' کہا جاتا ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہ صفا اور مروہ بھی اللہ کے شعائر اور اللہ تبارک وتعالیٰ کی عبادت کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہیں۔

''صفا'' عربی زبان میں کسی بھی چٹان کو کہہ سکتے ہیں، لیکن مکّہ مکرمہ کی خاص پہاڑی کا نام صفا ہے، اور ''مروہ'' عربی زبان میں چکنے پتھر کو کہتے ہیں، لیکن مکّہ مکرّمہ میں صفا کے بالمقابل ایک دوسری پہاڑی ہے، جسے مروہ کہا جاتا ہے۔ اور ان دونوں کے ناموں کو ملا کر صفا و مروہ کہا جاتا ہے۔ ان کے بارے میں کہا گیا کہ یہ اللہ تعالیٰ کے شعائر میں سے ہیں۔ یہاں خاص طور پر ان کا ذکر اس لیے فرمایا گیا ہے کہ جس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دین کو کفارِ مکّہ نے، بلکہ کفارِ عرب نے بگاڑ کر کچھ سے کچھ بنا دیا تھا، اسی طرح اللہ تعالیٰ کی ان نشانیوں (صفا و مروہ) کو بھی انہوں نے اپنے مشرکانہ عقائد کے سبب بُت پرستی کی نذر کر دیا تھا، چنانچہ عرب کے بعض قبائل، بالخصوص مدینہ منوّرہ کے باشندے صفا و مروہ کی سعی کرنے کے بجائے وادیٔ قُدید میں رکھے ہوئے ایک بُت کے پاس جا کر، جس کا نام مناۃ تھا، احرام باندھتے اور وہ صفا و مروہ کی سعی نہیں کرتے تھے۔[1]

حج وعمرہ میں صفا و مروہ کی سعی کا حکم

دوسرے کفر کے زمانے میں کفار نے صفا اور مروہ پر ''اساف'' اور ''نائلہ'' کے نام سے دو بت رکھ دیے تھے اور بہت سے لوگ جب سعی کرتے تھے تو ان کے ذہن میں یہ ہوتا تھا کہ ہم بتوں کی عبادت کر رہے

---

(۱) صحيح البخاري (۲/۱۵۷) (۱٦٤٣) كتاب الحج، باب وجوب الصفا والمروة، وجعل من شعائر الله.

ہیں۔ جب اسلام آیا اور اللہ تعالیٰ نے حج لازم کیا تو اس وقت بعض صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ صفا اور مروہ کا طواف تو ان بتوں کی تعظیم کے لیے تھا، جب بتوں کی تعظیم حرام ہوئی تو صفا اور مروہ کا طواف بھی ممنوع ہونا چاہیے، اب تو یہ جاہلیت کی نشانی بن گئے ہیں۔

انہیں یہ معلوم نہ تھا کہ صفا اور مروہ کا طواف تو اصل میں حج کے لیے تھا، کفار نے اپنی جہالت سے ان پر بت رکھ چھوڑے تھے، چنانچہ اس بات کی وضاحت کے لیے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآىِٕرِ اللّٰهِ﴾ ''صفا اور مروہ تو اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ہیں۔'' ان کو تم جاہلیت کی نشانی مت سمجھو ﴿فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ اَوِ اعْتَمَرَ﴾ چنانچہ اگر کوئی شخص بیت اللہ کا حج کرے یا عمرہ کرے ﴿فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا﴾ ''تو اس کے لیے اس بات میں کوئی گناہ نہیں ہے کہ وہ ان دونوں کے چکر لگائے۔'' اس کا مطلب یہ ہوا کہ تمہارے ذہن میں یہ جو خیال پیدا ہو رہا ہے کہ جاہلیت کے لوگ بت رکھ کر اس کے چکر لگایا کرتے تھے تو یہ عمل کہیں ناجائز نہ ہو؟ تو خوب سمجھ لو کہ یہ ناجائز نہیں ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے۔

صفا و مروہ کے درمیان سعی واجب ہے

مذکورہ آیت کے الفاظ سے یہ شبہ نہ پیدا ہونا چاہیے کہ اس آیت میں تو صفا و مروہ کی سعی کے متعلق صرف اتنا فرمایا گیا ہے کہ سعی کرنا گناہ نہیں ہے، لہٰذا اس سے زیادہ سے زیادہ یہی ثابت ہوا کہ یہ سعی مباحات میں سے ہے اور لازم نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں ''لاجناح'' یعنی ''کوئی گناہ نہیں'' کا لفظ صحابۂ کرام کے ذہن میں پیدا ہونے والے سوال کی مناسبت سے رکھا گیا ہے، وگرنہ درحقیقت حج وعمرہ میں یہ چکر لگانا اور سعی کرنا واجب بھی ہے۔ نبیِ کریم سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات سے یہ بات واضح ہے کہ حج کے افعال میں بھی اور عمرے کے افعال میں بھی سعی واجب ہے[1] اور کرنا ضروری ہے۔ اگر کوئی شخص حج میں سعی نہ کرے تو اس کے اوپر دم واجب ہوتا ہے[2] اور اسی طرح سعی، عمرے کا بھی ایک اہم رکن ہے، اس کے بغیر عمرہ مکمل نہیں ہوتا۔

---

(۱) كما في صحيح مسلم (۲/۹۲۸) (۱۲۷۷) كتاب الحج، باب بيان أن السعي بين الصفا والمروة ركن لا يصح الحج إلا به.

(۲) كما في "الأصل" المعروف بالمبسوط للشيباني (۲/۴۰۷۴): "وإن ترك السعي فيما بين الصفا والمروة رأسا في حج أو عمرة فعليه دم."

دوبارہ حج یا عمرہ کرنا باعثِ خیر و برکت

پھر آگے فرمایا: ﴿وَ مَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَإِنَّ اللّٰهَ شَاكِرٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۵۸﴾﴾ ''اور جو شخص خوشی سے کوئی بھلائی کا کام کرے تو اللہ یقیناً قدر دان اور جاننے والا ہے۔'' یہاں ﴿وَ مَنْ تَطَوَّعَ﴾ میں ''تطوّع'' کا لفظ ''طوعٌ'' سے نکلا ہے اور عربی زبان میں ''طوع'' کے معنیٰ خوشی کے آتے ہیں، اس لحاظ سے تطوّع کے معنیٰ ہیں اپنی خوشی سے کوئی کام کرنا، یعنی کسی کے ذمہ کوئی کام لازمی اور فرض نہیں تھا، لیکن آدمی اپنی خوشی سے کوئی اچھا کام کرے تو اسے تطوُّع کہا جاتا ہے۔ اس کے لیے اردو اور عربی میں دوسرا لفظ ''نفل یا نفلی عمل'' بھی استعمال ہوتا ہے۔ جتنی بھی نفلی عبادتیں ہیں وہ سب تطوّع ہیں، یعنی وہ سب خوشی سے کی جانے والی عبادتیں ہیں، انہیں اللہ تعالیٰ نے لازم نہیں کیا، نہ فرض قرار دیا۔ اگر کوئی شخص نفل عبادتیں چھوڑے تو اس پر کوئی گناہ نہیں ہوتا، لیکن اگر کوئی آدمی اپنی خوشی سے کرتا ہے تو اسے ثواب ملتا ہے۔

حج ہر صاحبِ استطاعت مسلمان پر زندگی میں ایک مرتبہ فرض ہوتا ہے اور عمرہ زندگی میں کم از کم ایک مرتبہ کرنا حنفی مسلک میں سنتِ مؤکدہ ہے،(۱) اور امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک ساری زندگی میں کم از کم ایک مرتبہ عمرہ کرنا واجب ہے،(۲) لیکن یہ حج کا فریضہ یا عمرہ (جو کہ بطورِ سنت مؤکدہ یا بطورِ واجب) ادا کرنے کے بعد بھی اگر کوئی شخص نفلی طور پر حج کرنا چاہے یا نفلی طور پر عمرہ کرنا چاہے تو یہ بھلائی کا کام ہے جو وہ اپنی خوشی سے کرسکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے ہاں خیر اور بھلائی کے کاموں کی قدر دانی

اگر کوئی شخص بھلائی کا کام خوشی سے کرے گا تو ﴿فَإِنَّ اللّٰهَ شَاكِرٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۵۸﴾﴾ ''یقیناً اللہ تعالیٰ قدر دان ہے اور جاننے والا ہے۔'' ﴿شَاكِرٌ﴾ یعنی ''قدر دان'' ہونے کا معنیٰ یہ کہ جس شخص نے اپنی خوشی سے بغیر کسی دباؤ کے، بغیر فرض ہونے کے کوئی نفلی عبادت انجام دی تو اس پر اللہ تبارک وتعالیٰ اس کے اس جذبے کی قدر

---

(۱) كما في الدر المختار وحاشية ابن عابدين (رد المحتار) (۲/۴۷۲): ''(قوله والعمرة في العمر مرة سنة مؤكدة) أي إذا أتى بها مرة فقد أقام السنة غير مقيد بوقت.''

(۲) كما في الأم للشافعي (۲/۱۴۴): ''(قال الشافعي): والذي هو أشبه بظاهر القرآن وأولى بأهل العلم عندي وأسأل الله التوفيق أن تكون العمرة واجبة، فإن الله عز وجل قرنها مع الحج فقال: ﴿وَ اَتِمُّوا الْحَجَّ وَ الْعُمْرَةَ لِلّٰهِ...﴾''

جانتے ہوئے، ان شاء اللہ اسے بہت زیادہ اجر وثواب عطا فرمائے گا۔

اور ﴿عَلِیْمٌ﴾ کے معنی ہیں جاننے والا، یعنی اللہ تبارک وتعالیٰ جانتے ہیں کہ کون شخص کتنی نفلی عبادت کررہا ہے اور کس نیت سے کررہا ہے؟ اس میں اس بات کی طرف بھی اشارہ ہے کہ جب آدمی کوئی عبادت کرے تو اگرچہ وہ نفلی عبادت ہو، لیکن اس میں نیت اللہ تبارک وتعالیٰ کو راضی کرنے کی ہونی چاہیے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنا مقصود ہو، اس میں دکھاوا یا کوئی اور مقصد پیشِ نظر نہ ہو۔ اس کی حقیقت سے بھی اللہ تبارک وتعالیٰ خوب واقف ہیں اور خوب جانتے ہیں کہ یہ عبادت کس نیت سے انجام دی گئی ہے۔

﴿وَمَنْ تَطَوَّعَ خَیْرًا﴾ کا یہ جملہ اگرچہ حج اور عمرے کے سیاق میں آیا ہے، لیکن یہ ہر قسم کی عبادت کے لیے عام ہے، اسی لیے الفاظ بھی عام ہیں: ﴿وَمَنْ تَطَوَّعَ خَیْرًا﴾ یعنی ''جو شخص کوئی بھی بھلائی کا کام اپنی خوشی سے کرے،'' لہٰذا اس میں نفلی نمازیں بھی داخل ہیں، نفلی روزے بھی داخل ہیں، نفلی صدقات بھی داخل ہیں اور اسی طرح کسی بھی قسم کا کوئی ایسا کام جو شرعاً انسان کے ذمے فرض نہیں تھا، لیکن اچھائی کا کام ہے، مثلاً کسی کا ہاتھ بٹادینا، کسی کی مدد کردینا، کسی کے کام آجانا، وغیرہ یہ سب باتیں اس میں داخل ہیں۔ اگر انسان ایسا کوئی نفلی عمل یا خیر کا کام انجام دے گا تو اس پر اللہ تعالیٰ اسے اجر وثواب سے نوازیں گے۔

کفار کی تکلیفوں کے مقابلے میں مسلمانوں کے لیے تسلی کا پہلو

آگے کی آیات جو ﴿اِنَّ الَّذِیْنَ یَکْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلْنَا﴾ سے شروع ہورہی ہیں۔ ان کی تشریح سے پہلے سمجھنا چاہیے کہ اگر آپ سلسلۂ کلام کو دیکھیں تو پیچھے سلسلۂ کلام یہ چلا آرہا تھا کہ مسلمانوں کا اہلِ کتاب اور مشرکینِ عرب، ان دونوں سے مقابلہ تھا۔ اُن کے عقائد ونظریات کی کئی جگہ تردید بھی کی گئی اور بتایا گیا تھا کہ وہ حق بات کو جان بوجھ کر چھپاتے ہیں۔ نیز ساتھ ساتھ مسلمانوں کو یہ تاکید بھی کی گئی تھی کہ اب ان کے ساتھ زیادہ بحث ومباحثہ کرنے کے بجائے تم اپنے کاموں میں لگ جاؤ۔ اسی کے ذیل میں اس بات کا ذکر آیا تھا کہ یہ لوگ تمہیں پریشان کریں گے، طرح طرح سے تکلیفیں پہنچائیں گے تو تمہیں اس موقع پر صبر سے کام لینا چاہیے۔ اگر تم صبر سے کام لوگے تو اللہ تعالیٰ کی مدد شاملِ حال ہوگی اور انجامِ کار تمہاری ہی کامیابی ہوگی۔

اس پسِ منظر کے ساتھ جن مسلمانوں کو ان کافروں کے ہاتھوں سخت تکلیفیں پہنچی تھیں اور تواتر کے ساتھ پہنچ رہی تھیں، تو اُن کے دل میں اِن کفار کے خلاف عداوت پیدا ہونا ایک لازمی بات تھی اور ساتھ ہی ان

کے دل میں یہ جذبہ پیدا ہونا بھی لازمی تھا کہ یہ لوگ ہمیں جو تکلیفیں پہنچا رہے ہیں، ان تکلیفوں کا ان سے کوئی بدلہ کیسے لیا جائے؟

اگلی آیات میں اللہ تبارک وتعالیٰ یہ فرمارہے ہیں کہ مسلمانوں کو اس فکر میں فی الحال پڑنے کی ضرورت نہیں ہے، کیونکہ ان کی بدعنوانیوں اور بدعملیوں کا بدلہ اللہ تبارک وتعالیٰ خود لینے والے ہیں اور جب اللہ تبارک وتعالیٰ بدلہ لیں گے تو خوب اچھی طرح لیں گے۔ تمہارے دلوں میں جو آج یہ بات ہے کہ ہم ان سے بدلہ نہیں لے سکے اور تم اس پر افسردہ بھی ہو، تو یہ بات اپنے دل سے نکال دو، کیونکہ ان کا معاملہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے ہاتھ میں ہے وہ خود ہی ان سے بدلہ لے لے گا۔

حق بات کو چھپانے والے اہلِ کتاب کی سزا

اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان دونوں گروہوں (یعنی اہلِ کتاب ومشرکینِ عرب) کے بارے میں، ان سے خود بدلہ لینے کی بات ارشاد فرمائی ہے، کیونکہ انہی کی طرف سے مسلمانوں کو زیادہ تکلیفیں پہنچتی تھیں۔ دونوں کا ذکر یکے بعد دیگرے کرتے ہوئے پہلے اہلِ کتاب اور پھر مشرکین عرب کا تذکرہ کیا گیا ہے، چنانچہ اہلِ کتاب کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا: ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ وَالْهُدٰى﴾ بے شک وہ لوگ جو ہماری نازل کی ہوئی روشن دلیلوں اور ہدایت کو چھپاتے ہیں ﴿مِنْۢ بَعْدِ مَا بَيَّنّٰهُ لِلنَّاسِ فِي الْكِتٰبِ﴾ ''باوجودیکہ انہیں ہم کتاب میں کھول کھول کر لوگوں کے لیے بیان کر چکے ہیں۔'' اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ پچھلی کتابوں؛ تورات اور انجیل وغیرہ میں نبیِ کریم سرورِ دو عالم ﷺ کی جو پیشین گوئیاں اور بشارتیں مذکور تھیں اور آپ ﷺ کی تشریف آوری کی جو علامتیں بیان کی گئی تھیں، یہ لوگ حسد کی وجہ سے ان نشانیوں اور ان روشن دلیلوں کو چھپاتے ہیں اور ان سے پہلو تہی اختیار کرتے ہیں۔

جو لوگ ایسا کام کر رہے ہیں ﴿اُولٰٓئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللّٰهُ وَيَلْعَنُهُمُ اللّٰعِنُوْنَ ۝۱۵۹﴾ ''ایسے لوگوں پر اللہ بھی لعنت بھیجتا ہے اور دوسرے لعنت کرنے والے بھی لعنت بھیجتے ہیں۔'' جب لوگوں کو پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے اللہ کی بھیجی ہوئی کتاب کے اندر اپنی خواہشات کے مطابق محض حسد اور عناد کی وجہ سے تبدیلیاں کر دی ہیں تو دوسرے لوگ بھی ان پر لعنت بھیجتے ہیں۔ اس طرح مسلمانوں کو بتایا جارہا ہے کہ آپ ان سے بدلہ لینے کی فکر میں زیادہ نہ پڑیں، اُن پر اللہ تعالیٰ بھی لعنت بھیجتا ہے اور لعنت کرنے والے بھی لعنت بھیجتے ہیں، یعنی

وہ لوگ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے بھی دھتکارے ہوئے ہیں اور دیگر لوگ بھی ان کے لیے بددعا کرتے ہیں۔

پھر آگے فرمایا کہ ان اہلِ کتاب میں سب لوگ ایک جیسے نہیں ہیں، بلکہ کچھ لوگ ایسے ہیں کہ جو تورات کے احکام پر ٹھیک ٹھیک عمل کرتے ہیں اور اس میں نبیِ کریم ﷺ کی جو نشانیاں مذکور ہیں انہیں آپ ﷺ میں پاکر آپ پر ایمان لاتے ہیں۔ اس لیے آگے حق کو چھپانے والے لوگوں میں سے ایسے لوگوں کا استثناء کرتے ہوئے فرمایا: ﴿اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا﴾ ہاں وہ لوگ جنہوں نے توبہ کرلی ہو ﴿وَ اَصْلَحُوْا﴾ اور اپنی اصلاح کرلی ہو ﴿وَ بَيَّنُوْا﴾ ''اور کھول کھول کر بیان کر دیا ہو،'' یعنی جو باتیں چھپائی ہوئی تھیں انہیں کھول کھول کر بیان کردیا ہو۔ ﴿فَاُولٰٓئِكَ اَتُوْبُ عَلَيْهِمْ﴾ تو ایسے لوگوں کی توبہ میں قبول کرلیتا ہوں ﴿وَ اَنَا التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۶۰﴾﴾ ''اور میں بہت توبہ قبول کرنے والا، بڑا رحمت والا ہوں۔''

روشن دلیلوں اور ہدایت کو چھپانے کی ایک اور تشریح

جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا کہ ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلْنَا﴾ میں یہود اور نصاریٰ کی طرف سے روشن دلیلوں اور ہدایت کو چھپانے کی جو بات آئی ہے، اس سے مراد نبیِ کریم سرورِ دو عالم ﷺ کی تشریف آوری کی بشارتیں ہیں، یہ اس کا واضح مفہوم ہے جو اپنی جگہ درست ہے۔

تاہم اس جگہ ہمارے بعض علمائے عصر نے ایک اور تحقیق بھی کی ہے اور وہ یہ کہ ان کی تحقیق کے مطابق تورات میں اس بات کا ذکر موجود ہے کہ مروہ کو بنی اسرائیل کے لیے قبلہ بنایا گیا تھا اور عبادت کرتے وقت وہ مروہ کی طرف رُخ کرتے تھے، اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کو بھی مروہ پر قربان کیا گیا تھا۔ بنی اسرائیل نے مروہ کے لفظ کو توڑ موڑ کر اسے تورات سے اس طرح نکال دیا کہ اب اس کا ذکر بھی بظاہر کہیں نظر نہیں آتا۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ یہاں جس کتمان کا ذکر ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کی بھیجی ہوئی دلیلوں اور نشانیوں کو چھپانے کا ذکر ہے، تو اس میں خاص طور پر مروہ کی طرف بھی اشارہ ہوسکتا ہے۔ یہ مولانا حمید الدین فراہیؒ صاحب مرحوم[1] کی تحقیق ہے، چنانچہ اس آیت کی تفسیر میں ایک ممکنہ احتمال یہ بھی موجود ہے کہ اس میں مروہ کی نشانی کی طرف اشارہ کیا گیا ہو کہ انہوں نے مروہ کی اہمیت کو کم کرنے کے لیے تورات کی آیتوں کو چھپایا ہے۔

---

(۱) تورات وانجیل کے بعض اہم موضوعات پر مولانا مرحوم کی بعض تحقیقات بہت قیمتی ہیں، البتہ تفسیر قرآن کے معاملے میں ان کی حدیث گریزی اور بعض پُرتکلف تاویلات، ان کا شذوذ اور جمہور امت کے موقف کے خلاف ہے۔ (محمد تقی عثمانی)

مسلمانوں کو ستانے والے مشرکین کی سزا

یہاں تک اہلِ کتاب کا ذکر تھا، اب آگے ان مشرکین کا ذکر ہے جو مکّہ مکرمہ کے اندر بیٹھ کر نبیِ کریم سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے خلاف سازشیں تیار کرتے تھے اور انہیں تکلیفیں پہنچاتے تھے، چنانچہ ان کے بارے میں فرمایا: ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا﴾ بے شک وہ لوگ جنہوں نے کفر اختیار کیا ﴿وَمَاتُوْا وَهُمْ كُفَّارٌ﴾ اور کافر ہونے کی حالت میں ہی مرے ﴿اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ لَعْنَةُ اللّٰهِ﴾ ان پر اللہ کی لعنت ہے ﴿وَالْمَلٰٓئِكَةِ﴾ اور فرشتوں کی ﴿وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ﴿۱۶۱﴾﴾ ''اور سارے انسانوں کی۔'' اور لعنت بھی ایسی کہ ﴿خٰلِدِيْنَ فِيْهَا﴾ ہمیشہ اسی پھٹکار میں رہیں گے۔ ﴿لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ﴾ نہ ان پر سے عذاب کو ہلکا کیا جائے گا۔ ﴿وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ ﴿۱۶۲﴾﴾ ''اور نہ انہیں مہلت دی جائے گی۔''

ساری بات کا حاصل یہی ہے کہ مسلمانوں سے کہا جارہا ہے کہ آپ لوگ ان سے انتقام لینے کی فکر میں نہ پڑیں، اللہ تبارک وتعالیٰ ان سے انتقام لینے کے لیے کافی ہے، آخرت میں انہیں جو عذاب ہوگا وہ بڑا شدید ہوگا۔ اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کو اس سے محفوظ رکھے۔ آمین!

آیت نمبر ۱۶۳ تا ۱۶۷

وَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۶۳﴾ ع ۱۹/۱۱/۳ اِنَّ فِيْ خَلْقِ
السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِيْ تَجْرِيْ فِي
الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْيَا بِهِ
الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِيْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ ۖ وَّتَصْرِيْفِ الرِّيٰحِ
وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ﴿۱۶۴﴾
وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ ؕ
وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ؕ وَلَوْ يَرَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اِذْ يَرَوْنَ

الْعَذَابَ ۙ اَنَّ الْقُوَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ۙ وَّ اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعَذَابِ ﴿۱۶۵﴾ اِذْ تَبَرَّاَ الَّذِيْنَ اتُّبِعُوْا مِنَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْا وَرَاَوُا الْعَذَابَ وَتَقَطَّعَتْ بِهِمُ الْاَسْبَابُ ﴿۱۶۶﴾ وَقَالَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْا لَوْ اَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَتَبَرَّاَ مِنْهُمْ كَمَا تَبَرَّءُوْا مِنَّا ؕ كَذٰلِكَ يُرِيْهِمُ اللّٰهُ اَعْمَالَهُمْ حَسَرٰتٍ عَلَيْهِمْ ؕ وَمَا هُمْ بِخٰرِجِيْنَ مِنَ النَّارِ ﴿۱۶۷﴾ ع ۲۰/۲۴/۲

تمہارا خدا ایک ہی خدا ہے، اُس کے سوا کوئی خدا نہیں جو سب پر مہربان، بہت مہربان ہے۔ ﴿۱۶۳﴾ بے شک آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں، رات دن کے لگاتار آنے جانے میں، اُن کشتیوں میں جو لوگوں کے فائدے کا سامان لے کر سمندر میں تیرتی ہیں، اُس پانی میں جو اللہ نے آسمان سے اُتارا اور اس کے ذریعے زمین کو اُس کے مردہ ہوجانے کے بعد زندگی بخشی، اور اس میں ہر قسم کے جانور پھیلا دیئے، اور ہواؤں کی گردش میں، اور اُن بادلوں میں جو آسمان اور زمین کے درمیان تابع دار بن کر کام میں لگے ہوئے ہیں، اُن لوگوں کے لیے نشانیاں ہی نشانیاں ہیں جو اپنی عقل سے کام لیتے ہیں۔ ﴿۱۶۴﴾ اور (اس کے باوجود) لوگوں میں کچھ وہ بھی ہیں جو اللہ کے علاوہ دوسروں کو اس کی خدائی میں اس طرح شریک قرار دیتے ہیں کہ ان سے ایسی محبت رکھتے ہیں جیسے اللہ کی محبت (رکھنی چاہیے)۔ اور جو لوگ ایمان لاچکے ہیں وہ اللہ ہی سے سب سے زیادہ محبت رکھتے ہیں۔ اور کاش کہ یہ ظالم جب (دُنیا میں) کوئی تکلیف دیکھتے ہیں، اُسی وقت یہ سمجھ لیا کریں کہ تمام تر طاقت اللہ ہی کو حاصل ہے، اور یہ کہ اللہ کا عذاب (آخرت میں) اُس وقت بڑا سخت ہوگا۔ ﴿۱۶۵﴾ جب وہ (پیشوا) جن کے پیچھے یہ لوگ چلتے رہے ہیں، اپنے پیروکاروں سے مکمل بے تعلقی کا اعلان کریں گے اور یہ سب لوگ عذاب کو اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ لیں گے اور ان کے تمام باہمی رشتے کٹ کر رہ جائیں گے۔ ﴿۱۶۶﴾ اور جنہوں نے ان (پیشواؤں) کی پیروی کی تھی وہ

کہیں گے کہ کاش ہمیں ایک مرتبہ پھر (دُنیا میں) لوٹنے کا موقع دے دیا جائے، تو ہم بھی ان (پیشواؤں) سے اسی طرح بے تعلقی کا اعلان کریں جیسے انہوں نے ہم سے بے تعلقی کا اعلان کیا ہے۔ اس طرح اللہ انہیں دکھا دے گا کہ ان کے اعمال (آج) اُن کے لیے حسرت ہی حسرت بن چکے ہیں، اور اب وہ کسی صورت دوزخ سے نکلنے والے نہیں ہیں۔ (۱۶۷)

اسلام کی روح، یعنی عقیدۂ توحید اور اس کے دلائل

یہاں سے اللہ تبارک وتعالیٰ نے مسلمانوں کو اپنے کام میں لگنے کی طرف متوجہ فرمایا ہے اور اس سلسلے میں انہیں بہت سے احکام دیے ہیں۔ سب سے پہلے اسلام کی جو اصل روح ہے، یعنی عقیدۂ توحید، جس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کو ایک مانا جائے اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرایا جائے، اس کا قدرے تفصیل کے ساتھ بیان فرمایا ہے، نیز جو لوگ توحید کے منکر ہیں اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کا ارتکاب کرتے ہیں، ان کے طریقِ کار کو بیان کر کے اس کے برے انجام کی طرف متوجہ فرمایا گیا ہے، چنانچہ فرمایا: ﴿وَ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ﴾ اور تمہارا معبود ایک ہی معبود ہے ﴿لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ﴾ اس کے سوا کوئی معبود نہیں، اس کے سوا کوئی خدا نہیں ﴿الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ (۱۶۳)﴾ ''وہ سب پر مہربان، بہت مہربان ہے۔''

روایات[1] میں آتا ہے کہ جب نبیِ کریم سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کے سامنے عقیدۂ توحید بیان فرمایا تو وہ لوگ جو شرک کے عادی تھے اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ انہوں نے بہت سے من گھڑت دیوتاؤں کو شریک کر رکھا تھا، انہوں نے کہا کہ اتنی بڑی کائنات کو ایک خدا کیسے چلا سکتا ہے؟ اور اگر ساری کائنات کو ایک خدا چلا سکتا ہے تو اس کی کوئی دلیل ہمیں بتایئے، چنانچہ اس قسم کی باتوں کے جواب میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا کہ اگر تمہارے اندر ذرا بھی سمجھ ہو تو آسمان و زمین اور ان کے درمیان اللہ تبارک وتعالیٰ نے جو مخلوقات پیدا فرمائی ہیں اور جیسا محیّر العقول (عقل کو حیران کر دینے والا) نظام بنایا ہے، اس پر اگر تم ذرا بھی

---

(۱) كما في شعب الإيمان للبيهقي (۱/۲۵٤) (۱۰۳): ﴿وَ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ﴾ [البقرة: ۱۶۳] لما نزلت هذه الآية عجب المشركون وقالوا: إن محمدا يقول: وإلهكم إله واحد، فليأتنا بآية إن كان من الصادقين، فأنزل الله عز وجل: ﴿اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ...﴾.

ٹھنڈے دل سے غور کرلو اور سمجھنے والی آنکھ سے اسے دیکھ لو، تو تمہیں پتہ چل جائے گا کہ ان میں سے ہر چیز اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر اور اس کے ایک ہونے پر دلالت کر رہی ہے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس آیت میں بہت سی چیزوں کا ذکر فرمایا ہے جن میں سے ہر چیز میں اللہ تبارک وتعالیٰ کی وحدانیت کی دلیل نمایاں نظر آتی ہے۔ پہلے فرمایا: ﴿اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ﴾ بے شک آسمانوں کی تخلیق میں بہت سی نشانیاں ہیں۔ ''السَّمٰوٰتِ'' سماء کی جمع ہے۔ اگرچہ ہم اردو زبان میں اس کا ترجمہ ایک لفظ میں کر کے آسمان کہہ دیتے ہیں، لیکن عربی زبان میں ''سماء'' ہر اس چیز کو کہا جاتا ہے جو اوپر ہو، چنانچہ کہتے ہیں: ''کلُّ ما عَلاكَ فأظلَّك فهو سماء''[1] جو چیز بھی تمہارے اوپر ہے اور سایہ فگن ہے، وہ سب آسمان میں داخل ہے۔

لہٰذا کئی جگہ پر قرآنِ کریم نے سماء کا لفظ بادلوں کے لیے بھی استعمال کیا ہے، جیسا کہ اسی آیت کے اندر آگے آرہا ہے کہ ہم نے آسمان سے پانی اتارا، حالانکہ آسمان سے مراد یہاں پر بادل ہیں کہ بادلوں سے پانی اتارا۔ اسی طرح ہمارے اوپر جو خلا ہے وہ بھی سماء کے مفہوم میں داخل ہے اور جو چاند، سورج اور ستارے ہمیں نظر آتے ہیں وہ بھی اس کے مفہوم میں داخل ہیں۔ ان چاند ستاروں سے اوپر جو آسمان ہے، جس کو ہم حقیقی معنیٰ میں آسمان کہتے ہیں، وہ بھی اسی کے مفہوم میں داخل ہے۔

آسمان و زمین کا محیّر العقول اور زبردست نظام

یہاں پر ﴿اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ﴾ کہنے میں اشارہ اس طرف ہے کہ اگر تم اوپر کی طرف دیکھو تو تمہارے سر کے اوپر جتنی بھی چیزیں تمہیں نظر آئیں گی، وہ سب کی سب اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کی دلیل ہیں۔ اوپر دیکھو تو تمہیں چاند نظر آئے گا، سورج نظر آئے گا، ستارے نظر آئیں گے اور اگر تم غور کرو تو یہ سارے اتنے عظیم اجسام ہیں اور اتنے عظیم عالَم ہیں کہ ان میں سے ہر ایک تمہاری اِس دنیا سے بہت بڑا ہے۔ یہ ایک خاص نظام کے تحت چل رہے ہیں اور اس نظام میں ذرّہ برابر بھی کہیں کوئی فرق نہیں آتا۔ ایسا محیّر العقول نظام خود سے تو وجود میں آ نہیں سکتا، یقیناً کسی بنانے والے نے اسے بنایا ہے۔ جب سے یہ نظام وجود میں آیا ہے اسی وقت سے یہ اس طرح چل رہا ہے کہ اس میں ایک لمحے کا بھی کہیں کوئی تغیّر یا تبدیلی نہیں آتی۔

---

(۱) فقه اللغة وسر العربية (۲۵/۱).

جو لوگ اس کائنات کے اس نظام کے حساب سے واقف ہیں تو وہ صدیوں پہلے بتا سکتے ہیں کہ چاند کس وقت کہاں ہوگا؟ سورج کس وقت کہاں ہوگا؟ اس نظام کے اندر ہر ہر چیز ایک حکمت کے تحت اور یکجہتی کے ساتھ گردش کر رہی ہے۔ اگر تم اس پر غور کرو گے تو اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کی دلیلیں تمہیں نظر آئیں گی۔ اگر خدا ایک سے زیادہ ہوتے اور کئی خدا اس کائنات کو چلا رہے ہوتے، تو ان کے درمیان آپس میں اختلاف بھی ہو جاتا اور اس پورے نظام کے اندر اتنی یکسانیت باقی نہ رہتی۔ اسی بات کو قرآنِ مجید میں دوسری جگہ فرمایا:

لَوْ كَانَ فِيهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا ۚ فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا يَصِفُوْنَ (۱)

اگر آسمان اور زمین میں اللہ کے سوا دوسرے خدا ہوتے تو دونوں درہم برہم ہو جاتے، لہٰذا عرش کا مالک اللہ، ان باتوں سے بالکل پاک ہے جو یہ لوگ بنایا کرتے ہیں۔

پھر فرمایا: ﴿وَ الْاَرْضِ﴾ یعنی بے شک زمین کی تخلیق میں بہت سی نشانیاں ہیں۔ زمین کو دیکھو کہ یہ زمین کس طرح ایک خلا کے اندر تیر رہی ہے اور کس طرح اللہ تعالیٰ نے اسے ایک انتہائی مستحکم نظام کے تحت چلایا ہوا ہے۔ اس کے اندر جو کچھ بھی پیدا ہو رہا ہے، جو حیوانات، نباتات اور جمادات ہیں، وہ سب کے سب اس بات کی دلیل ہیں کہ ان کا کوئی بنانے والا ہے اور وہ بنانے والا ایک ہی ہے جس نے ان کو بڑی حکمت سے ایک ہی نظام کے تحت چلایا ہوا ہے۔ ﴿وَ اخْتِلَافِ الَّيْلِ وَ النَّهَارِ﴾ ''اور رات دن کے لگاتار آنے جانے میں بھی اللہ کی نشانیاں ہیں،'' یعنی تم دیکھ رہے ہو کہ رات اور دن کا آنا جانا یہ بھی ایک معین اور مستحکم حساب کے تحت ہو رہا ہے، پہلے سے پتہ لگایا جا سکتا ہے کہ کس دن، کس وقت سورج غروب ہوگا؟ اور رات طلوع ہوگی اور کب سورج کی روشنی نمودار ہوگی اور صبح طلوع ہوگی؟ ایک خاص نظام کے تحت یہ دن اور رات ایک دوسرے کے آگے پیچھے چل رہے ہیں، ان کے اندر اگر غور کرو تو تمہیں پتہ چل جائے گا کہ یہ رات اور دن کا نظام خود بخود وجود میں نہیں آ گیا، بلکہ یہ کسی کی حکمتِ بالغہ اور قدرتِ کاملہ کا نتیجہ ہے اور وہ اکیلے خدائے وحدہ لاشریک ہی کی ذات ہے۔

---

(۱) سورۃ الأنبیاء (۲۱): آیت (۲۲)

سمندروں پر تیرتی کشتیوں کو چلانے والا کون ہے؟

﴿وَ الْفُلْكِ الَّتِيْ تَجْرِيْ فِي الْبَحْرِ﴾ اور ان کشتیوں میں جو سمندر میں تیرتی ہیں ﴿بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ﴾ ''لوگوں کے فائدے کا سامان لے کر۔'' ان میں بھی عقلمند لوگوں کے لیے بڑی نشانیاں ہیں۔ ''فائدے کا سامان لے کر تیرنے'' سے مراد یہ ہے کہ ان کشتیوں کا استعمال تجارت کے لیے کیا جاتا ہے، اور ایک ملک کی یا ایک شہر کی مصنوعات دوسرے ملک یا شہر میں انہی سمندری کشتیوں کے ذریعے بھیجی جاتی ہیں۔ پہلے چھوٹی کشتیاں استعمال ہوتی تھیں، اب بڑی کشتیاں اور جہاز استعمال ہوتے ہیں۔ یہ ساری کی ساری کشتیاں اس سمندر کے اندر تیر رہی ہوتی ہیں جو اگر ایک مرتبہ کروٹ لے لے تو بڑے بڑے شہروں کو ڈبو ڈالتا ہے، لیکن اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے تمہارے لیے اس سمندر کو مسخر (تابعِ فرمان) کر رکھا ہے۔ یہ تمہارے لیے تباہی و بربادی کا سامان لانے کے بجائے، تمہاری کشتیوں کو لے کر چلتا ہے اور تمہیں فائدہ پہنچاتا ہے۔

ان کشتیوں کا نظام ایسا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے جب ہوائیں ان کے موافق چلائی جاتی ہیں تو وہ چلتی ہیں۔ پہلے زمانے میں تو ساری کشتیوں کا دار و مدار ہواؤں کے چلنے پر ہوتا تھا، ہوا کا رُخ کشتی کے موافق ہوتا تھا تو وہ کشتی اپنی منزل تک پہنچ سکتی تھی، لیکن اگر ہوا مخالف ہو جاتی تو بعض اوقات وہ ان کشتیوں کو میلوں پیچھے دھکیل دیتی تھی۔ پھر رفتہ رفتہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے انسان کو سمجھ عطا فرمائی اور اس نے مشینی جہاز ایجاد کیے اور اب ان مشینی جہازوں کے ذریعے وہ سمندوں کے فاصلے طے کرتا ہے، لیکن اس میں بھی یہ حقیقت بہرحال ماننی پڑے گی کہ کتنی ہی مشینوں اور آلات سے آراستہ، بڑا اور مستحکم جہاز ہو، لیکن اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے سمندر کو اس کے آگے مسخر نہ کیا گیا ہو تو سمندر اسے ڈبو دیتا ہے اور اس کی تباہی کا ذریعہ بن جاتا ہے۔

چنانچہ آپ نے بے شمار واقعات سنے اور پڑھے ہوں گے کہ بعض اوقات بڑے بڑے جہاز بھی سمندر میں ڈوب جاتے ہیں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے جو عمومی نظام بنایا ہوا ہے، اسی کے تحت یہ ساری کشتیاں چلتی ہیں اور انسانوں کے نفع اور فائدے کا سامان لے کر ایک جگہ سے دوسری جگہ جاتی ہیں۔ تجارت کی ساری بنیاد ان کے اوپر ہے، اگر سمندروں کا یہ نظام نہ ہو اور کشتیاں نہ چلیں تو لوگوں تک ان کی ضروریات نہیں پہنچ سکتیں۔ سیّال[1] پانی پر لاکھوں من وزن کے بڑے بڑے جہازوں کا چلنا اللہ تعالیٰ کی قدرت کی بڑی نشانی ہے۔

---

(۱) سیّال: رواں/ پتلا

کون دریاؤں کی موجوں سے اٹھاتا ہے سحاب!

پھر فرمایا: ﴿وَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ﴾ اور اس پانی میں جو اللہ نے آسمان سے اتارا ﴿فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا﴾ ''اور اس کے ذریعے زمین کو اس کے مردہ ہوجانے کے بعد زندگی بخشی،'' اس میں بھی عقلمند لوگوں کے لیے بڑی نشانیاں ہیں۔ زمین کے مردہ ہو جانے کے بعد زندگی بخشنے کا مطلب یہ ہے کہ اگر قحط پڑا ہوا ہوتا ہے، اور بارش نہیں ہوتی، تو زمین بالکل خشک ہوجاتی ہے اور اس میں کوئی چیز نہیں اُگ سکتی، لیکن اسی مردہ زمین پر اللہ تبارک وتعالیٰ آسمان سے پانی برسا کر اسے زندہ کر دیتے ہیں۔ وہ سمندر جو اس زمین سے ہزارہا میل دور ہے، وہاں سے بادل اٹھائے جاتے ہیں اور بادلوں کے اندر اللہ تبارک وتعالیٰ نے پانی کا ذخیرہ اس طرح تیار کردیا ہے کہ وہی پانی جو سمندر کے اندر نمکین، کھارا اور کڑوا تھا، جب بادلوں کے ذریعے اوپر اٹھتا ہے تو اس کی ساری کڑواہٹ ختم ہوجاتی ہے اور وہ میٹھا اور حیات افزا بن کر برستا ہے۔

بادل سمندروں سے پانی لے کر اوپر اٹھتے ہیں اور پھر ہزاروں میل کے فاصلوں کو طے کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق کسی جگہ جا کر برس جاتے ہیں۔ اس طرح اللہ تبارک وتعالیٰ نے انسان کو سمندر سے پانی حاصل کرنے کے لیے ایک مفت کارگو سروس فراہم کر دی ہے، اگر انسان سے خود کہا جاتا کہ تم سمندر سے پانی لے کر آؤ اور سمندر کے پانی کو پہلے میٹھا کرو اور پھر اپنے مواصلاتی ذرائع [1] کے ذریعے اسے زمین کے دور دراز حصوں تک لے جاؤ، تو کسی انسان کے لیے یہ کام ممکن نہیں تھا، اور اگر کوئی کرتا بھی تو اس پر کروڑوں اربوں روپے کا خرچ ہوتا، لیکن اللہ تبارک وتعالیٰ نے ایک خودکار نظام کے تحت وہاں سے پانی اٹھا کر اسے ایک ہوائی اور قدرتی کارگو سروس کے ذریعے بادلوں کے سہارے تم تک پہنچایا اور پھر جہاں پانی کی ضرورت تھی وہاں پانی برسایا۔ اس پانی کے برسنے کے نتیجے میں وہ زمین جو مردہ پڑی ہوئی تھی، اسے اللہ تبارک وتعالیٰ نے نئی زندگی بخشی۔

اللہ تعالیٰ نے آسمان سے پانی برسا کر اس سے زمین کو سرسبز اور تروتازہ کیا جس سے تمام حیوانات نشوونما پاتے ہیں، چنانچہ فرمایا: ﴿وَ بَثَّ فِيْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ﴾ ''اور اس میں ہر قسم کے جانور پھیلا دیے۔'' اللہ

---

(۱) مواصلاتی ذرائع: نقل وحمل کے ذرائع

تبارک وتعالیٰ کے اس نظام کے تحت (یعنی بارشوں کے ذریعے) جہاں نباتات اگتے ہیں، بہت سی فصلیں تیار ہوتی ہیں، بہت سے پھل پیدا ہوتے ہیں، وہیں اس پانی کے ذریعے بہت سے حیوانات بھی یا تو پیدا ہوتے ہیں یا اس پانی سے سیراب ہوکر انہیں زندگی ملتی ہے۔ وہ سارے جانور اس دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ہر جانور کسی نہ کسی مقصد کے تحت پیدا کیا گیا ہے اور انسان ان جانوروں سے اپنے اپنے مقاصد کے لیے فائدہ بھی اٹھاتا ہے۔

ہواؤں کی گردش اللہ کی نشانیوں میں سے ایک بڑی نشانی

آگے فرمایا: ﴿وَّ تَصْرِيْفِ الرِّيٰحِ﴾ ''اور ہواؤں کی گردش میں اللہ کی نشانیاں ہیں۔'' یہ سارا کام جو ہورہا ہے کہ انسان زندہ ہیں، جانور زندہ ہیں، یہ سب ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہورہے ہیں، کشتیاں چل رہی ہیں، بادل اڈرہے ہیں اور پانی برسارہے ہیں۔ اگر دیکھا جائے تو یہ سب کچھ ہواؤں کی گردش کی بدولت ہورہا ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہواؤں کو اس طرح مسخر کردیا ہے اور وہ اس طرح چلتی ہیں کہ ان سے انسان کی ضروریات پوری ہوتی ہیں۔ نباتات و جمادات اور حیوانات کا سارے کا سارا نظام بھی اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہواؤں کی گردش کے ذریعے قائم کیا ہوا ہے۔

﴿وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَآءِ﴾ ''اور ان بادلوں میں جو آسمان اور زمین کے درمیان تابعدار بن کر کام میں لگے ہوئے ہیں،'' ان میں بھی نشانیاں ہیں۔ یہ بادل نہ کسی چیز پر ٹکے ہوئے ہیں اور نہ کوئی چیز ان کو سہارا دیے ہوئے ہے۔ انہیں اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس طرح بنایا ہے کہ یہ آسمان اور زمین کے درمیان لٹکے ہوئے ہیں۔ یہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے حکم کے تابع ہوکر پانی کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنے کا کام انجام دیتے ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ یہ اپنی خواہش سے یا خود اپنی سمجھ سے برس جائیں، بلکہ اللہ تبارک وتعالیٰ جہاں کا حکم فرماتے ہیں وہیں پر وہ جاکر برستے ہیں۔

ان تمام چیزوں کا ذکر کرکے باری تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ان تمام چیزوں میں ﴿لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ﴿۱۶۴﴾﴾ ''ان لوگوں کے لیے نشانیاں ہی نشانیاں ہیں جو اپنی عقل سے کام لیتے ہیں۔'' اگر عقل سے کام لیا جائے ان میں سے ہر اک چیز ایک تو اس بات پر دلالت کررہی ہے کہ یہ چیزیں خود بخود وجود میں نہیں آگئیں، بلکہ کسی پیدا کرنے والے نے انہیں پیدا کیا ہے، اور دوسرے اس بات پر دلالت کررہی ہیں کہ جس

ذات نے انہیں پیدا کیا ہے وہ بڑی حکمت اور بڑی قدرت والی ذات ہے۔ جب وہ بڑی حکمت اور قدرت والی ذات ہے تو اس کو اپنے ان کاموں کی انجام دہی میں کسی مددگار کی ضرورت نہیں، لہٰذا اسے کسی شریک کی بھی ضرورت نہیں، اللہ تعالیٰ تنہا ہے اور تنہا ہی وہ یہ سارے کام انجام دیتا ہے۔

مشرکین کی اپنے بتوں سے اور اہلِ ایمان کی اپنے خدا سے محبت

آگے اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہ ارشاد فرمایا کہ یہ کائنات میں پھیلی ہوئی مختلف چیزیں تو پکار پکار کر کہہ رہی ہیں کہ اس کائنات کا خالق، اس کا مالک اور معبود ایک ہی ہے، لیکن بہت سے لوگ ہیں جو ان حقیقتوں کو پہچانے بغیر یا ان حقیقتوں پر غور کیے بغیر اللہ تعالیٰ کے ساتھ دوسروں کو شریک ٹھہراتے ہیں، چنانچہ فرمایا: ﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا﴾ ''اور اس کے باوجود لوگوں میں کچھ وہ بھی ہیں جو اللہ کے علاوہ دوسروں کو اس کی اس خدائی میں شریک قرار دیتے ہیں۔'' انداد ''نِدّ'' کی جمع ہے اور ''نِدّ'' اسے کہتے ہیں جو کسی بھی کام میں کسی کا شریک یا ساجھی ہو۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ان لوگوں نے، یعنی مشرکین نے اللہ تبارک وتعالیٰ کے ساتھ اس کی خدائی میں کچھ چیزوں کو شریک بنا رکھا ہے اور اس طرح شریک بنا رکھا ہے کہ ﴿يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ﴾ ''وہ ان سے ایسی محبت رکھتے ہیں جیسے اللہ تعالیٰ سے رکھنی چاہیے۔''

یہ تو مشرکین کی حالت کا بیان تھا، جبکہ ان کے مقابلے میں اللہ تبارک وتعالیٰ اہلِ ایمان کے بارے میں فرماتے ہیں کہ ﴿وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ﴾ ''اور جو لوگ ایمان لا چکے ہیں وہ اللہ ہی سے سب سے زیادہ محبت رکھتے ہیں۔'' یہ ایک طرح سے ایمان کی علامت ہے کہ انسان اپنے خالق و مالک سے محبت کرے، کیونکہ اس کی زندگی کی ہر ضرورت اللہ تعالیٰ کی قدرت اور رحمت پر موقوف ہے، اس نے ہمیں ہمارے مانگے بغیر وہ اعضاء عطا فرمائے ہیں جن میں سے ایک ایک عضو کو کروڑوں اربوں روپے خرچ کر کے بھی حاصل نہیں کیا جاسکتا اور گردوپیش کی بے شمار نعمتیں اُسی کی دی ہوئی ہیں، اس لیے اُس سے محبت نہ ہو، تو کس سے ہو؟

خدائی کے کاموں میں کسی کو شریک سمجھنا بھی شرک ہے

یہاں پر بتلانا یہ مقصود ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے ساتھ اس کی خدائی کے کاموں میں کسی کو بھی شریک قرار دینا، اللہ تبارک وتعالیٰ کی توحید کی خلاف ورزی اور شرک ہے، اور یہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی عظمت کو نہ

پہچاننے کا نتیجہ ہے۔ یہ بات جس طرح ان لوگوں پر صادق آتی ہے جو بت پرستی کرتے ہیں، اسی طرح ان پر بھی صادق آتی ہے جو کسی کو اللہ کا بیٹا قرار دیتے ہیں یا جو کسی مخلوق کے بارے میں یہ کہتے ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کی خدائی کے فلاں کام میں شریک ہے۔ مثلاً فلاں بزرگ اولاد دیتے ہیں یا فلاں پیغمبر یا فلاں ولی اللہ ہمیں رزق دیتے ہیں یا ہماری بگڑی بنا دیتے ہیں۔ یہ تصوّر اگر اس نیت سے کیا جائے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان بزرگوں کو یا کسی ولی کو یا کسی پیغمبر کو اپنی خدائی کا اختیار دے دیا ہے تو یہ بھی شرک ہے اور اس کے اوپر یہ مذکورہ بالا آیت صادق آتی ہے کہ ”کچھ لوگ وہ ہیں جو اللہ کے سوا دوسرے لوگوں کو یا دوسری چیزوں کو اس کی خدائی میں شریک ٹھہراتے ہیں۔“

البتہ اس میں کوئی شک نہیں کہ جو اللہ تبارک وتعالیٰ کے برگزیدہ بندے ہیں؛ چاہے وہ پیغمبر ہوں یا اولیائے کرام ہوں، بزرگانِ دین ہوں یا سلفِ صالحین ہوں، ان کی عزت وعظمت اور ان کی توقیر اس لیے ان کا حق ہے کہ وہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے برگزیدہ بندے ہیں، لیکن اس عظمت وتوقیر اور محبت کو اس درجہ نہ بڑھانا چاہیے کہ انہیں خدائی کے اختیارات سپرد کردیئے جائیں کہ وہ ہمارے مشکل کُشا یا کارساز ہیں۔ مخلوق میں سے کسی کے بارے میں اس قسم کے الفاظ استعمال کرنا - اللہ بچائے - انسان کو شرک کی سرحد تک پہنچا دیتا ہے، اس لیے اس سے پرہیز کرنا ضروری ہے۔

کفار بھی تکلیف کے وقت اللہ ہی کو پکارتے ہیں

آگے باری تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہ لوگ جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ دوسروں کو شریک ٹھہرا رہے ہیں، انہیں چاہیے کہ ذرا اس بات پر غور کیا کریں کہ جب انہیں کوئی سخت تکلیف پہنچتی ہے، تو اس تکلیف کے وقت میں یہ بے ساختہ کس کو پکارتے ہیں؟ اگر پکارتے ہیں تو اپنے اللہ کو پکارتے ہیں، چنانچہ فرمایا: ﴿وَ لَوْ يَرَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اِذْ يَرَوْنَ الْعَذَابَ﴾ اور کاش کہ یہ ظالم جب دنیا میں کوئی تکلیف دیکھتے ہیں اسی وقت یہ سمجھ لیا کریں کہ ﴿اَنَّ الْقُوَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا﴾ ”تمام تر طاقت اللہ ہی کو حاصل ہے۔“

جیسا کہ قرآنِ کریم نے دوسری جگہوں[1] پر بھی فرمایا ہے کہ جب یہ لوگ سمندر میں تجارت کے لیے سفر کرتے ہوئے کشتیوں میں چلتے ہیں اور کشتیاں طوفان میں گھر جاتی ہیں اور انہیں بچنے کا کوئی اور راستہ نظر نہیں

---

(۱) مثلاً دیکھیے: سورۃ یونس (۱۰): آیت (۲۳ - ۲۲)

آتا، تو اس وقت یہ جن بتوں کی عبادت کرتے تھے اور ان کے نام رکھتے تھے کہ یہ ''لات'' ہے، یہ ''عزیٰ'' ہے، یہ ''ہبل'' ہے، یہ ''منات'' ہے، ان سب کو بھول جاتے ہیں اور اس وقت صرف اکیلے اللہ کو پکارتے ہیں کہ یا اللہ! اپنے فضل وکرم سے ہمیں اس مصیبت سے نکال دیجیے اور ہمیں کنارے تک پہنچا دیجیے، لیکن جب کنارے پہنچتے ہیں تو پھر دوبارہ ان بتوں کو پکارنا شروع کر دیتے ہیں۔

باری تعالیٰ فرمارہے ہیں کہ جب انہیں کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو اگر یہ اس موقع پر اللہ تعالیٰ کی قدرت کا احساس کریں کہ ﴿اَنَّ الْقُوَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا﴾ یعنی ''ساری قوت اللہ کے قبضے میں ہے۔'' جب ساری قوت اللہ کے قبضے میں ہے تو پھر اس کا کوئی شریک نہیں ہے جسے خدائی میں اس کے برابر قرار دیا جائے اور کاش ساتھ میں یہ بھی سمجھتے کہ ﴿وَّ اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعَذَابِ ﴿۱۶۵﴾﴾ ''اور اللہ تعالیٰ کا عذاب بھی بڑا سخت ہے۔''

قیامت کے دن گمراہ لوگ ایک دوسرے کو ذمے دار ٹھہرائیں گے

پچھلی آیت کے آخر میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا کہ آخرت میں اللہ کا عذاب بڑا سخت ہوگا، چنانچہ آگے اللہ تعالیٰ نے اس عذاب کی ایک منظر کشی فرمائی ہے۔ یہ اس وقت کا منظر ہے جب قیامت کے دن حشر میں سب لوگ جمع ہوں گے، اس میں کچھ لوگ تو وہ ہوں گے جو اپنی قوم کے، اپنے قبیلے کے، اپنے خاندان کے یا اپنی بستی کے سردار سمجھے جاتے تھے اور کچھ لوگ وہ ہوں گے جو ان کے پیروکار سمجھے جاتے تھے۔ یہ عموماً ہوتا رہا ہے کہ جب کسی قوم کے سردار کسی غلط عقیدے پر یا کسی غلط عمل پر کاربند ہوتے ہیں تو ان کی بستی کے رہنے والے عام لوگ بھی انہیں دیکھ دیکھ کر انہی کا عقیدہ اختیار کر لیتے ہیں اور ان ہی کے طریقۂ کار کو درست قرار دیتے ہیں۔

جب قیامت کے دن یہ منظر سامنے آئے گا کہ جو سردار تھے وہ بھی گمراہ تھے، انہوں نے دوسروں کو بھی غلط راستہ دکھایا تھا اور ان کے پیچھے چلنے والے بھی گمراہی میں پڑے ہوئے تھے، تو جنہوں نے اپنے سرداروں کی پیروی کی تھی، وہاں پر یہ لوگ کہیں گے کہ ہم میں جو کچھ بھی گمراہی آئی ہے، وہ ہمارے ان سرداروں کی وجہ سے آئی ہے۔ سردار اس موقع پر کہیں گے کہ نہیں! یہ گمراہی ہماری وجہ سے نہیں آئی اور ہم بالکل اس بات سے بری ہیں کہ ہم نے ان کو گمراہ کیا تھا۔

اللہ تبارک وتعالیٰ اس صورتِ حال کی منظر کشی کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ﴿اِذْ تَبَرَّاَ الَّذِيْنَ اتُّبِعُوْا مِنَ

﴿الَّذِيْنَ اتُّبِعُوْا﴾ ''جب وہ پیشوا جن کے پیچھے یہ لوگ چلتے رہے ہیں، اپنے پیروکاروں سے مکمل لاتعلقی کا اعلان کریں گے،'' یعنی اعلان کردیں گے ہمارا ان سے کوئی تعلق نہیں، ہم نے انہیں گمراہ نہیں کیا تھا۔ ﴿وَ رَاَوُا الْعَذَابَ﴾ اور یہ سب لوگ عذاب کو اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ لیں گے، ﴿وَ تَقَطَّعَتْ بِهِمُ الْاَسْبَابُ ﴿۱۶۶﴾﴾ ''اور ان کے تمام باہمی رشتے کٹ کر رہ جائیں گے،'' یعنی دنیا میں تو صورت یہ تھی کہ ایک سردار تھا اور دوسرا اس کا پیروکار، ایک پیشوا تھا اور دوسرا اس کا مُتّبع (اتباع کرنے والا) یا ایک استاد تھا اور دوسرا اس کا شاگرد، لیکن وہاں یہ سارے رشتے کٹ کر رہ جائیں گے۔ اب آخرت میں یہ حال ہوگا کہ استاد اپنے استاد ہونے سے انکار کردے گا، اور یہ ماننے کے لیے تیار نہیں ہوگا کہ میں نے اسے غلط سبق پڑھایا تھا، جبکہ شاگرد ساری ذمے داری انہی پر ڈال رہے ہوں گے۔

کفار کی دنیا میں واپس لوٹنے کی حسرت و آرزو

آگے فرمایا: ﴿وَ قَالَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْا﴾ اور وہ لوگ جنہوں نے ان بڑوں کی پیروی کی تھی، وہ کہیں گے ﴿لَوْ اَنَّ لَنَا كَرَّةً﴾ کہ کاش ہمیں ایک مرتبہ پھر دنیا میں لوٹنے کا موقع دے دیا جائے ﴿فَنَتَبَرَّاَ مِنْهُمْ﴾ تو ہم بھی ان (پیشواؤں) سے اسی طرح لاتعلقی کا اعلان کریں، ﴿كَمَا تَبَرَّءُوْا مِنَّا﴾ ''جیسا کہ آج انہوں نے ہم سے لاتعلقی کا اعلان کیا ہے،'' یعنی جب وہ دیکھیں گے کہ ہمارا سارا بھروسہ تو ان سرداروں پر تھا اور آخرت میں جاکر ان سارے سرداروں نے ہماری پیشوائی سے دستبرداری اختیار کرلی، گویا ایک طرح سے طوطا چشمی سے کام لیا اور کہہ دیا کہ ہمارا ان سے کوئی تعلق نہیں ہے، تو ان متبعین اور پیروکاروں یا چھوٹے لوگوں میں یہ خیال اور خواہش پیدا ہوگی کہ کاش ایک مرتبہ دوبارہ ہم دنیا میں جائیں اور پھر جب یہ سردار ہمیں اپنی طرف بلائیں تو ہم اس وقت ان سے اپنی لاتعلقی کا اسی طرح اعلان کردیں جیسا آج انہوں نے ہم سے لاتعلقی کا اعلان کیا ہے۔

باری تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿كَذٰلِكَ يُرِيْهِمُ اللّٰهُ اَعْمَالَهُمْ حَسَرٰتٍ عَلَيْهِمْ﴾ ''اسی طرح اللہ تعالیٰ انہیں دکھادے گا کہ ان کے اعمال ان کے لیے حسرت ہی حسرت بن چکے ہیں،'' یعنی اب یہ حسرت تو ہوگی اور یہ تمنا بھی ہوگی کہ کاش ایک مرتبہ دوبارہ ہم دنیا میں چلے جائیں، لیکن یہ ایسی حسرت ہے جس کے پورا ہونے کا کوئی راستہ نہیں، یہ حسرت پوری ہونے کا راستہ کیوں نہیں ہے؟ آگے باری تعالیٰ اس کی وجہ ارشاد فرماتے ہیں

کہ ﴿وَمَا هُمْ بِخٰرِجِيْنَ مِنَ النَّارِ ﴿۱۶۷﴾﴾ ''اور اب وہ کسی صورت دوزخ سے نکلنے والے نہیں ہوں گے،'' یعنی ان کی یہ خواہش کہ ایک مرتبہ ہم دوبارہ دنیا میں واپس جا کر اپنے حالات درست کرلیں اور ان سرداروں سے مکمل لاتعلقی کا اعلان کرلیں تو یہ خواہش پوری ہونے والی نہیں ہے اور اس لیے نہیں ہے کہ اب یہ کسی صورت بھی جہنم کی آگ سے نکلنے والے نہیں ہیں۔

آیت نمبر ۱۶۸ تا ۱۷۶

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ كُلُوْا مِمَّا فِي الْاَرْضِ حَلٰلًا طَيِّبًا ۖ وَّلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ
الشَّيْطٰنِ ۭ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿۱۶۸﴾ اِنَّمَا يَاْمُرُكُمْ بِالسُّوْۗءِ وَالْفَحْشَاۗءِ وَاَنْ
تَقُوْلُوْا عَلَي اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۶۹﴾ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ
قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَآ اَلْفَيْنَا عَلَيْهِ اٰبَاۗءَنَا ۭ اَوَلَوْ كَانَ اٰبَاۗؤُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ
شَيْـــًٔا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ ﴿۱۷۰﴾ وَمَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا كَمَثَلِ الَّذِيْ يَنْعِقُ بِمَا لَا
يَسْمَعُ اِلَّا دُعَاۗءً وَّنِدَاۗءً ۭ صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ ﴿۱۷۱﴾ يٰٓاَيُّهَا
الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَاشْكُرُوْا لِلّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ
تَعْبُدُوْنَ ﴿۱۷۲﴾ اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيْرِ وَمَآ
اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ ۚ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۭ اِنَّ
اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۷۳﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ الْكِتٰبِ وَ
يَشْتَرُوْنَ بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۙ اُولٰۗىِٕكَ مَا يَاْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ اِلَّا النَّارَ وَلَا
يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَلَا يُزَكِّيْهِمْ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۷۴﴾ اُولٰۗىِٕكَ
الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى وَالْعَذَابَ بِالْمَغْفِرَةِ ۚ فَمَآ اَصْبَرَهُمْ

عَلَى النَّارِ ﴿۱۷۵﴾ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ نَزَّلَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ ؕ وَ اِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا
فِي الْكِتٰبِ لَفِيْ شِقَاقٍۭ بَعِيْدٍ ﴿۱۷۶﴾ ع ۲۱ ع ۵

اے لوگو! زمین میں جو حلال پاکیزہ چیزیں ہیں وہ کھاؤ، اور شیطان کے نقشِ قدم پر نہ چلو۔ یقین جانو کہ وہ تمہارے لیے ایک کھلا دُشمن ہے۔ ﴿۱۶۸﴾ وہ تو تم کو یہی حکم دے گا کہ تم بدی اور بے حیائی کے کام کرو اور اللہ کے ذمے وہ باتیں لگاؤ جن کا تمہیں علم نہیں ہے۔ ﴿۱۶۹﴾ اور جب ان (کافروں) سے کہا جاتا ہے کہ اس کلام کی پیروی کرو جو اللہ نے اُتارا ہے، تو وہ کہتے ہیں کہ نہیں! ہم تو ان باتوں کی پیروی کریں گے جن پر ہم نے اپنے باپ دادوں کو پایا ہے۔ بھلا کیا اس صورت میں بھی (ان کو یہی چاہیے) جب ان کے باپ دادے (دِین کی) ذرا بھی سمجھ نہ رکھتے ہوں، اور انہوں نے کوئی (آسمانی) ہدایت بھی حاصل نہ کی ہو؟ ﴿۱۷۰﴾ اور جن لوگوں نے کفر کو اَپنالیا ہے ان (کو حق کی دعوت دینے) کی مثال کچھ ایسی ہے جیسے کوئی شخص اُن (جانوروں) کو زور زور سے بلائے جو ہانک پکار کے سوا کچھ نہیں سنتے۔ یہ بہرے، گونگے، اندھے ہیں، لہٰذا کچھ نہیں سمجھتے۔ ﴿۱۷۱﴾ اے ایمان والو! جو پاکیزہ چیزیں ہم نے تمہیں رزق کے طور پر عطا کی ہیں، ان میں سے (جو چاہو) کھاؤ، اور اللہ کا شکر ادا کرو، اگر واقعی تم صرف اسی کی بندگی کرتے ہو۔ ﴿۱۷۲﴾ اُس نے تو تمہارے لیے بس مردار جانور، خون، اور سور کا گوشت حرام کیا ہے، نیز وہ جانور جس پر اللہ کے سوا کسی اور کا نام پکارا گیا ہو۔ ہاں اگر کوئی شخص انتہائی مجبوری کی حالت میں ہو (اور ان چیزوں میں سے کچھ کھالے) جبکہ اس کا مقصد نہ لذّت حاصل کرنا ہو اور نہ وہ (ضرورت کی) حد سے آگے بڑھے، تو اُس پر کوئی گناہ نہیں۔ یقیناً اللہ بہت بخشنے والا بڑا مہربان ہے۔ ﴿۱۷۳﴾ حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ اللہ کی نازل کی ہوئی کتاب کو چھپاتے ہیں اور اس کے بدلے تھوڑی سی قیمت وصول کرلیتے ہیں، وہ اپنے پیٹ میں آگ کے سوا کچھ نہیں بھر رہے۔ قیامت کے دن اللہ ان سے کلام بھی نہیں کرے گا، اور نہ انہیں پاک کرے گا، اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔ ﴿۱۷۴﴾ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے ہدایت کے

بدلے گمراہی، اور مغفرت کے بدلے عذاب کی خریداری کرلی ہے، چنانچہ (اندازہ کروکہ) یہ دوزخ کی آگ سہنے کے لیے کتنے تیار ہیں! ﴿۱۷۵﴾ یہ سب کچھ اِس لیے ہوگا کہ اللہ نے حق پر مشتمل کتاب اُتاری ہے، اور جن لوگوں نے ایسی کتاب کے بارے میں مخالفت کا رویہ اختیار کیا ہے، وہ ضد اضدی میں بہت دُور نکل گئے ہیں۔ ﴿۱۷۶﴾

کسی حلال چیز کو حرام قرار دینا بھی شرک کا شعبہ ہے

ان آیات کا پچھلی آیتوں کے ساتھ یہ تعلق ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے پچھلی آیتوں میں اُن مشرکین کا ذکر فرمایا تھا جو اللہ تبارک وتعالیٰ کے ساتھ دوسرے جھوٹے خداؤں کو اپنا معبود سمجھتے تھے اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہراتے تھے۔ اسی شریک ٹھہرانے کا ایک شاخسانہ یہ بھی تھا کہ انہوں نے کسی آسمانی تعلیم کے بغیر مختلف چیزوں کے بارے میں حلال وحرام کے فیصلے خود گھڑ رکھے تھے۔ مثلاً مردار جانوروں کو کھانا ان کے نزدیک جائز تھا، مگر بہت سے حلال جانوروں کو انہوں نے اپنے اوپر حرام کررکھا تھا۔ بعض اوقات کسی جانور کو وہ کسی بت کے نام پر آزاد چھوڑ دیتے تھے جس کو ''سائبہ'' کہتے تھے اور پھر اس کی تعظیم کے سبب اسے خود پر حرام سمجھتے تھے، جس کی پوری تفصیل ان شاء اللہ سورۂ انعام میں آئے گی۔ یہاں یہی بتانا مقصود ہے کہ جس چیز کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے حلال قرار دیا ہے، نہ قرآنِ کریم میں اُس کی ممانعت آئی ہے، نہ اللہ تعالیٰ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اُسے حرام قرار دیا، اُسے حرام سمجھنا بھی ایک طرح کا شرک ہے، کیونکہ کسی چیز کو حرام قرار دینا اللہ تعالیٰ ہی کا منصب ہے۔ انسان اگر عملاً یہ کام کرے، تو وہ اللہ تعالیٰ کے دائرۂ اختیار میں اپنے آپ کو داخل کررہا ہے۔

چنانچہ فرمایا: ﴿يَاَيُّهَا النَّاسُ﴾ ''اے لوگو!'' یہاں یہ بات ذہن میں رہے کہ اللہ تعالیٰ جب قرآنِ کریم میں ﴿يَاَيُّهَا النَّاسُ﴾ کا لفظ استعمال کرتے ہیں تو اس میں مسلمان اور کافر دونوں شامل ہوتے ہیں، گویا یہ خطاب صرف کافروں یا مسلمانوں کو نہیں ہے، بلکہ تمام انسانوں کو ہے جن میں مسلمان بھی داخل ہیں اور غیر مسلم بھی، انہیں خطاب کرتے ہوئے فرمایا: ﴿كُلُوْا مِمَّا فِي الْاَرْضِ حَلٰلًا طَيِّبًا﴾ ''زمین میں جو حلال پاکیزہ چیزیں ہیں وہ کھاؤ۔'' جن کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے حرام قرار نہیں دیا، انہیں کھانے میں تمہیں کوئی تکلف یا کوئی تامّل نہ ہونا چاہیے اور یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ یہ ہمارے لیے ناجائز ہیں، کیونکہ یہ جو تم نے رسمیں بنالی ہیں کہ فلاں جانور ہمارے لیے حرام ہے یہ بالکل غلط ہیں۔ اس لیے کہ درحقیقت اللہ تعالیٰ نے تو اس کے حرام

ہونے کا حکم نازل کیا نہیں، لہٰذا یقیناً یہ شیطان نے تم کو سجھایا ہے۔

یاد رکھو! جب تک اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے کسی چیز کے حرام ہونے کا حکم نہ آئے، تو محض کسی ایک شخص کے کھڑے ہوکر کہہ دینے سے کہ یہ چیز حرام ہے وہ حرام نہیں ہوتی، وہ درحقیقت شیطان کی طرف سے گمراہی کا ایک راستہ پیدا کیا جاتا ہے، لہٰذا آگے فرمایا: ﴿وَّلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ﴾ ''اور شیطان کے نقشِ قدم پر نہ چلو،'' کیونکہ وہ تمہیں گمراہی کی طرف لے کر جاتا ہے ﴿اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿۱۶۸﴾﴾ ''یقین جانو وہ تمہارے لیے ایک کھلا دشمن ہے۔''

شیطان کا انسان کو برائی پر اُبھارنا اور اس کی صورتیں

پھر آگے یہ بھی فرمایا کہ شیطان کا کام ہی یہ ہے کہ تم برائی کا راستہ اختیار کرو ﴿اِنَّمَا يَاْمُرُكُمْ بِالسُّوْٓءِ وَالْفَحْشَآءِ﴾ وہ تو تم کو یہی حکم دے گا کہ تم بدی اور بے حیائی کے کام کرو ﴿وَاَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۶۹﴾﴾ ''اور اللہ کے ذمے وہ باتیں لگاؤ جن کا تمہیں علم نہیں ہے۔''

یہاں پر اللہ تبارک وتعالیٰ نے تین باتیں ارشاد فرمائیں کہ شیطان تمہیں تین باتوں کا حکم دیتا ہے:

۱۔ برائی کا،

۲۔ بے حیائی کے کام کا،

۳۔ اور یہ کہ تم اللہ کے ذمے وہ باتیں لگاؤ جن کا تمہیں علم نہیں ہے۔ یعنی تمہیں کسی نے نہیں بتایا کہ اللہ تعالیٰ نے یہ بات کہی ہے، لیکن تم اپنی طرف سے وہ اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کردو۔

ان تین چیزوں میں سے سب سے پہلی چیز ''السوء''، یعنی برائی میں تو ہر گناہ داخل ہے، مثلاً جھوٹ بولنا، رشوت لینا، ظلم کرنا وغیرہ۔ شیطان ان کاموں کا حکم دیتا ہے اور ان کی طرف انسان کو متوجہ کرتا ہے کہ اس قسم کے کام کرو۔ دوسرا لفظ ''فحشاء'' ہے جو قرآنِ کریم میں بہت سی جگہوں پر آیا ہے اور یہ ہر اس عمل کے لیے بولا جاتا ہے جو بے حیائی اور بے شرمی کا کام ہو۔ شیطان بے حیائی اور بے شرمی کے کام پر انسانوں کو اُکساتا ہے۔

تیسرے نمبر پر یہ بات ارشاد فرمائی کہ شیطان تمہیں حکم دیتا ہے کہ ''اللہ کے ذمے وہ باتیں لگاؤ جن کا

تمہیں علم نہیں ہے۔'' مطلب یہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف کسی بات کی نسبت کرنا، مثلاً یہ کہنا کہ اللہ تعالیٰ نے یوں فرمایا ہے یا یہ حکم دیا ہے، یہ کسی انسان کے لیے اس وقت تک جائز نہیں ہے جب تک اس کے پاس یقینی طور سے یہ علم نہ آ گیا ہو کہ واقعی اللہ تعالیٰ نے ایسا کہا، مثلاً قرآنِ کریم میں آ گیا ہو یا اللہ کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم آپ کو آ کر بتائیں تو بے شک آپ کو علم ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ نے یہ کہا ہے، لیکن اگر نہ قرآن کہہ رہا ہے نہ اللہ کا پیغمبر بتا رہا ہے اور تم نے محض اپنی طرف سے کچھ باتیں گھڑ لی ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کرتے ہو، تو یہ درحقیقت شیطانی عمل ہے، شیطان تمہیں اس پر اُکساتا ہے کہ ''اللہ کے ذمے وہ باتیں لگاؤ جس کا تمہیں علم نہیں۔''

حق سے اعراض کے لیے باپ دادا کی پیروی کا بہانہ

آگے اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتے ہیں کہ جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تو کوئی ایسا حکم نہیں آیا، تم نے اپنی طرف سے ان چیزوں کو کیسے حرام کر لیا؟ تمہیں تو اس حکم کی پیروی کرنی چاہیے جو اللہ تبارک وتعالیٰ نے قرآنِ کریم کی صورت میں تم پر حکم نازل کیا ہے، تو اس کے جواب میں وہ ہمیشہ ایک ہی بات کہتے ہیں کہ ہم تو اپنے باپ دادوں کو اسی طرح دیکھتے چلے آئے ہیں، لہٰذا ہم انہی کی اِتباع اور پیروی کریں گے، چنانچہ اسی بات کو بیان کرتے ہوئے فرمایا: ﴿وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ﴾ اور جب ان سے کہا جاتا ہے اس کلام کی پیروی کرو جو اللہ نے اتارا ہے ﴿قَالُوْا﴾ تو یہ جواب میں کہتے ہیں کہ ﴿بَلْ نَتَّبِعُ﴾ نہیں ہم تو ان باتوں کی پیروی کریں گے ﴿مَآ اَلْفَيْنَا عَلَيْهِ﴾ جن پر پایا ہے ہم نے ﴿اٰبَآءَنَا﴾ ''اپنے باپ دادوں کو،'' یعنی ہم ان کے اس طریقے کو نہیں چھوڑ سکتے۔

باری تعالیٰ ان کی اس بات کے جواب میں فرماتے ہیں کہ ﴿اَوَ لَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ شَيْـًٔا﴾ بھلا کیا اس صورت میں بھی انہیں اپنے باپ دادوں کی پیروی کرنی چاہیے جب کہ ان کے باپ دادا دین کی ذرا بھی سمجھ نہ رکھتے ہوں؟ ﴿وَّ لَا يَهْتَدُوْنَ ۝۱۷۰﴾ ''اور نہ ان کے پاس اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایت ہو،'' بلکہ انہوں نے محض اپنی طرف سے کوئی بات گھڑ لی ہو، یعنی باپ دادا کی کسی ایسے معاملے میں پیروی کرنا جو ہدایت کا راستہ نہ ہو، شرک ہے۔ اگر کوئی شخص کسی چیز کو حرام کہہ دے جس کی کوئی دلیل نہ ہو، نہ قرآن میں، نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات میں، نہ کسی پیغمبر کی تعلیم میں، تو چاہے اس کے بعد نسلوں تک

اسے برا سمجھا جاتا رہا ہو، لیکن ان لوگوں کی نسلوں کے برا سمجھنے کی وجہ سے وہ چیز بری نہیں ہوجاتی، ان کے غلط سمجھنے کی وجہ سے وہ حلال چیز حرام نہیں ہوجاتی۔

اہلِ علم سے رہنمائی لینا مذموم پیروی میں داخل نہیں

یہاں ایک بات یہ بھی سمجھنی اور یاد رکھنی چاہیے کہ قرآنِ کریم کی آیات کو اُن کے صحیح پسِ منظر میں سمجھنا ضروری ہوتا ہے۔ یہاں مذکورہ بالا آیت ﴿وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَآ اَلْفَيْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا ....﴾ میں باپ دادوں کی پیروی سے منع کیا گیا ہے۔ بعض مرتبہ اس قسم کی آیتیں اس صورتِ حال پر بھی چسپاں کردی جاتی ہیں جب کوئی عالم یا مفتی کسی چیز کے بارے میں فتویٰ دیتا ہے کہ یہ چیز حرام ہے، حالانکہ وہ فتویٰ کوئی اپنی طرف سے نہیں دیتا، بلکہ قرآن وسنت کی بنیاد پر دیتا ہے۔ جو لوگ براہِ راست قرآن وسنت سے مسئلے کو سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے، وہ اس بات پر مجبور ہوتے ہیں کہ کسی ایسے عالم کی طرف رجوع کریں جس کے پاس قرآن وسنت کا صحیح علم ہو، چنانچہ وہ جس چیز کو حلال بتاتا ہے اسے حلال سمجھتے ہیں اور جس کو حرام بتاتا ہے اسے حرام سمجھتے ہیں۔

مثلاً امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ چونکہ قرآن وسنت کے بڑے عالم تھے، تو بعض مرتبہ ہم علماء سے پوچھتے ہیں کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے اس کے بارے میں کیا فرمایا ہے؟ اگر انہوں نے کسی چیز کو حلال کہا ہو تو اسے حلال سمجھتے ہیں، کسی چیز کو حرام کہا ہو تو اسے حرام سمجھتے ہیں۔ بعض لوگ اس کے اوپر یہ آیت چسپاں کردیتے ہیں کہ دیکھو یہ تو باپ دادوں کی اتباع ہوئی۔ خوب سمجھ لینا چاہیے کہ قرآنِ کریم نے یہاں صاف صاف کہہ دیا ہے کہ باپ دادوں کی پیروی اس وقت ناجائز یا حرام ہے کہ جب ان کے پاس نہ عقل ہو اور نہ ہی ہدایت ہو۔ ہدایت کے معنیٰ یہ کہ قرآن وسنت کی کوئی دلیل ان کے پاس نہیں ہے اور پھر بھی وہ اپنی طرف سے کوئی بات کہہ رہے ہیں، تو ایسی صورت میں ان کی پیروی بالکل شرک کے مترادف ہے۔

لیکن اگر کسی عالم کی پیروی اس بنا پر کی جائے کہ چونکہ ہمارے پاس تو قرآن وسُنّت کا علم نہیں ہے اور اس کے پاس قرآن وسُنّت کا علم ہے، وہ خود اپنی طرف سے کوئی حکم نہیں دے رہا، بلکہ وہ قرآن وسُنّت کے حکم کی تشریح کررہا ہے۔ اس طرح اس کے علم وفضل اور تقویٰ پر اعتماد کرتے ہوئے ہم اگر اس سے مسئلہ پوچھ کر اس پر عمل کریں تو اس پر یہ پھبتی نہیں کسی جاسکتی کہ یہ باپ دادوں کی پیروی ہورہی ہے۔ اور یہ بات قرآن وسُنّت کے منافی نہیں ہے۔

دینی مسائل و معاملات میں اہلِ علم کی تقلید

لہٰذا یہ آیت دینی احکام میں اہلِ علم حضرات کی تقلید کرنے پر صادق نہیں آتی، جس کی واضح دلیل یہ ہے کہ بالفرض اگر ہم پر یہ واضح ہوجائے کہ مثلاً اس معاملے میں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے جو بات فرمائی تھی اس کے خلاف نبیِ کریم سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا صاف اور صریح حکم موجود ہے، بشرطیکہ ہم اس موضوع کی تمام احادیث کا جائزہ لے چکے ہوں اور ہمارے اندر اس جائزہ لینے کی صلاحیت بھی موجود ہو، تو اس صورت میں ہم امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے بجائے اس حدیث پر عمل کریں گے۔

دوسری طرف یہ کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی یا کسی عالم کی تقلید اس وقت کی جاتی ہے جب جزوی مسائل کا معاملہ ہو، لیکن جہاں تک عقائد کا تعلق ہے تو عقائد میں کسی کی تقلید اور پیروی نہیں کی جاتی، قرآن و سنّت کے جو عقائد ہیں بالکل واضح ہیں اور انہی پر عمل کیا جاتا ہے۔ ضرورت وہاں پر پیش آتی ہے جہاں ہم براہِ راست قرآن وسنت سے مسائل کا خود استنباط نہیں کرسکتے، تو وہاں پر ان کے فہم اور ان کے علم و فضل پر اعتماد کیا جاتا ہے، لہٰذا اس آیت میں مذکور حکم کو یہاں پر چسپاں نہیں کیا جاسکتا، کیونکہ قرآن نے صاف صاف کہہ دیا کہ باپ دادوں کی پیروی اس وقت ناجائز ہے جب کہ ان کے اندر نہ عقل ہو نہ ہدایت ہو، لیکن عقل اور ہدایت ہو اور وہ ہدایت کی بنیاد پر کوئی بات کہہ رہے ہوں تو پھر ان کی پیروی کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ (۱)

دعوتِ حق کو قبول نہ کرنے والے کافروں کی مثال

اس کے بعد اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان کافروں کی ایک مثال دی ہے جن کو نبیِ کریم سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم توحید کی دعوت دے رہے ہیں یا شرک سے بچانا چاہتے ہیں، لیکن وہ آپ کی بات سن نہیں رہے۔ اس کی مثال اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہ دی ہے کہ ﴿وَمَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا﴾ اور جن لوگوں نے کفر کو اپنالیا ہے ان کی مثال کچھ ایسی ہے ﴿كَمَثَلِ الَّذِيْ يَنْعِقُ بِمَا لَا يَسْمَعُ اِلَّا دُعَآءً وَّ نِدَآءً﴾ ''جیسے کوئی شخص ان جانوروں کو زور زور سے بلائے جو ہانک پکار کے سوا کچھ نہیں سنتے'' یعنی جانوروں کو اگر کوئی پکارے تو وہ ہانک پکار تو بے شک انہیں معلوم ہوجائے گی کہ کوئی ہمیں پکار رہا ہے، لیکن نہ اس کے معنیٰ سمجھیں گے نہ اس

---

(۱) تقلید کے مسئلہ سے متعلق تفصیل کے لیے حضرت والا (حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب) دامت برکاتہم کی کتاب: ''تقلید کی شرعی حیثیت'' ملاحظہ کیجیے۔ (راشد)

کے مطابق وہ عمل کریں گے۔

اسی طریقے سے ان لوگوں کا حال یہ ہے کہ نبیِ کریم سرورِ دو عالم ﷺ انہیں دعوت تو دے رہے ہیں، لیکن یہ لوگ یا تو سنتے نہیں، یا سن کر اسے جانوروں کی طرح ایک ہانک پکار سمجھتے ہیں، اس لیے اسے قبول نہیں کرتے۔ آگے اللہ تبارک و تعالیٰ نے فرمایا: ﴿صُمٌّ﴾ یہ بہرے ہیں ﴿بُكْمٌ﴾ گونگے ہیں ﴿عُمْيٌ﴾ اندھے ہیں، ﴿فَهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ ۝۱۷۱﴾ ''وہ کچھ نہیں سمجھتے ہیں۔'' ''بہرے'' تو اس لیے ہیں کہ نبیِ کریم سرورِ دو عالم ﷺ کی بات یا تو سنی نہیں یا کم از کم اسے سمجھنے کی کوشش نہیں کی، ''گونگے'' اس لیے ہیں کہ جو حق بات ان سے کہنے کی فرمائش کی جارہی ہے کہ ''لا الٰہ الا اللہ'' کہہ دو، یعنی اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں، تو یہ حق کی بات ان کی زبان سے نہیں نکلتی اور ''اندھے'' اس لیے ہیں کہ نبیِ کریم سرورِ دو عالم ﷺ کی سچائی اور آپ کی نبوّت و رسالت کے بے شمار شواہد اور قرائن ان کی آنکھوں کے سامنے آچکے ہیں، اس کے باوجود انہیں دیکھ نہیں رہے ہیں۔ جب ان کے یہ سارے حواس مختل (بگڑے ہوئے) ہیں تو نتیجہ یہ ہے کہ ﴿فَهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ ۝۱۷۱﴾ ''وہ کچھ نہیں سمجھتے ہیں۔''

حلال و پاکیزہ چیزیں کھانے کا حکم اور حرام چیزوں سے بچنے کی تاکید

مشرکینِ عرب بہت سے جانوروں کو بتوں کے نام پر چھوڑ کر ان کا کھانا حرام سمجھتے تھے، یہ بھی درحقیقت بت پرستی کا ہی ایک شاخسانہ تھا، چنانچہ پیچھے آیت نمبر ۱۶۸ میں اس حوالے سے اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہ ارشاد فرمایا تھا کہ جو چیزیں حلال ہیں انہیں اپنے اوپر حرام مت کرو۔ اب آگے اہلِ ایمان کو اس بات سے خبردار کیا جارہا ہے کہ وہ اس غلطی میں مشرکین کی موافقت و ہمنوائی نہ کرنے لگیں۔ اسی بات کے ضمن میں اہلِ ایمان پر اپنے انعامات کا ذکر اور شکر ادا کرنے کی تعلیم و ترغیب بھی دی گئی ہے۔ چنانچہ فرمایا: ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ اے ایمان والو! ﴿كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ﴾ ''جو پاکیزہ چیزیں ہم نے تمہیں رزق کے طور پر عطا کی ہیں، ان میں سے (جو چاہو) کھاؤ،'' اور کھانے کی اس اجازت کے ساتھ یہ حکم بھی ہے کہ ﴿وَاشْكُرُوْا لِلّٰهِ﴾ اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو۔ ﴿اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ﴾ ''اگر تم واقعی صرف اسی کی بندگی کرتے ہو،'' چونکہ اہلِ ایمان اللہ تعالیٰ ہی کی بندگی کرتے ہیں اس لیے ان پر اللہ تعالیٰ کی تمام نعمتوں پر شکر بھی واجب ہے۔

اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ پاکیزہ رزق کھانے اور اس پر شکر ادا کرنے میں یہ بات بھی داخل ہے کہ ان حلال و پاکیزہ چیزوں کو نہ تو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کا ذریعہ بنایا جائے اور نہ ہی خود اپنی طرف سے حلال

کو حرام یا حرام کو حلال قرار دیا جائے، جیسا کہ مشرکین کا طرزِ عمل تھا۔ نیز اس آیت میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ نیک عمل کرنے میں پاکیزہ اور حلال رزق کا بڑا عمل دخل ہے، جبکہ حرام رزق، قبولیتِ دعا سے مانع ہونے کے ساتھ ساتھ عبادت کی توفیق سلب ہوجانے کا سبب بھی بن سکتا ہے۔ ایک حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے حرام مال کے سبب دعائیں قبول نہ ہونے کی تفصیل بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ ایک آدمی جو لمبے لمبے سفر کرتا ہے اور اس کی وجہ سے اس کے بال پراگندہ اور غبار آلودہ ہوتے ہیں، وہ اللہ کے سامنے دعا کے لیے ہاتھ پھیلاتا ہے اور ''یارب!'' ''یارب!'' پکارتا ہے، مگر اس کا کھانا حرام، پینا حرام، پہناوا (لباس) حرام اور اس کی پرورش بھی حرام مال کے ذریعے ہوئی ہوتی ہے، تو بھلا ایسے میں اس کی دعا کیسے قبول ہوسکتی ہے؟ (۱)

جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا، آیت نمبر ۱۶۸ میں کہا گیا تھا کہ جو چیزیں حلال ہیں، انہیں اپنے اوپر حرام مت کرو، پھر بیچ میں مومنین سے خطاب کیا گیا اور اب یہ کہا جارہا ہے کہ جو چیزیں اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دے دی ہیں، انہیں حلال مت سمجھو، جیسا کہ مشرکین اس میں مبتلا تھے۔ کسی چیز کو حلال یا حرام کرنا، اللہ تعالیٰ ہی کا استحقاق ہے، کوئی بھی مخلوق اپنی طرف سے کسی چیز کو حلال یا حرام نہیں کرسکتی، لہٰذا جن جانوروں کو ان لوگوں نے خود پر حرام کر رکھا ہے، وہ تو اللہ تعالیٰ کا حکم تھا ہی نہیں، البتہ کچھ چیزیں ہیں، جن کو اللہ تعالیٰ نے حرام کیا ہوا ہے، انہی میں سے بعض چیزوں کا یہاں ذکر کیا گیا ہے، چنانچہ فرمایا: ﴿إِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ﴾ اللہ تبارک وتعالیٰ نے تمہارے لیے مردار جانور کو حرام قرار دیا ہے۔ ''الْمَيْتَةَ'' یعنی ''مردار'' اور مردار سے وہ جانور مراد ہے جو بغیر ذبح کیے خود بخود مرجائے یا گلا گھونٹ کر یا کسی دوسری طرح چوٹ مار کر مار دیا جائے، تو وہ مردار اور حرام ہوتا ہے۔

جس طرح پورا جانور اگر مرجائے تو اسے مردار کہتے ہیں، اسی طرح اگر کسی زندہ جانور کو زندہ رکھتے ہوئے اس کا کوئی عضو کاٹ کر کھا لیا جائے، تو یہ بھی حرام ہے کیونکہ جب یہ عضو کٹتا ہے تو یہ بھی مردار ہوتا ہے۔ اہلِ جاہلیت کے ہاں یہ طریقہ عام تھا کہ اونٹ زندہ کھڑا ہوا ہے، اسی حالت میں اس کے کوہان کو کاٹ لیتے اور پکا کر کھا لیتے تھے یا اس کی چربی نکال کر اسے پکا کر کھا لیتے تھے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ اس طرف اشارہ فرمارہے ہیں کہ تم لوگوں نے بہت سے حلال جانوروں کو تو اپنی طرف سے حرام کر رکھا ہے، لیکن جو مردار

---

(۱) صحیح مسلم (۲/۷۰۳) (۱۰۱۵) کتاب الزکاۃ، باب قبول الصدقۃ من الکسب الطیب وتربیتھا.

جانور ہیں انہیں تو تم کھالیتے ہو حالانکہ مردار کو تو اللہ تعالیٰ نے حرام کیا ہوا ہے۔

اسی طرح ﴿وَ الدَّمَ﴾ ''اور خون کو بھی حرام کیا ہے۔'' خون کی بھی بعض صورتیں ایسی تھیں جو زمانۂ جاہلیت میں استعمال کی جاتی تھیں، اس لیے فرمایا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے خون کو بھی حرام قرار دیا ہے، لہٰذا کسی خون کو پینا یا خون کو کسی کھانے میں استعمال کرکے کھانا، یہ کسی طرح بھی جائز نہیں۔ ﴿وَ لَحْمَ الْخِنْزِیْرِ﴾ ''اور اسی طرح خنزیر کا گوشت اللہ تعالیٰ نے حرام کیا ہے،'' لہٰذا اسے بھی تم لوگوں کو حرام سمجھنا چاہیے، لیکن اسے تو حرام سمجھتے نہیں ہو، اور اپنی طرف سے کچھ بتوں کے نام پر جانور چھوڑ کر انہیں اپنے اوپر حرام کررکھا ہے۔ ﴿وَ مَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَیْرِ اللّٰهِ﴾ ''اور اسی طرح وہ جانور جس پر اللہ کے سوا کسی اور کا نام پکارا گیا ہو،'' وہ بھی حرام ہے۔ مشرکین جب جانوروں کو ذبح کرتے تھے تو اللہ تبارک وتعالیٰ کا نام لینے کے بجائے کسی بت کے نام پر ذبح کرتے تھے۔ مثلاً یوں کہتے کہ ہم یہ جانور ''لات'' کے نام پر قربان کررہے ہیں یا ''عزیٰ'' یا ''ہبل'' کے نام پر ذبح کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے سوا اور کسی کا نام پکار کر کوئی جانور ذبح کیا جائے گا تو وہ بھی حرام شمار ہوگا۔ اس میں یہ بات بھی داخل ہے کہ صرف بتوں ہی کے نام پر نہیں، اگر کسی انسان کے نام پر بھی ذبح کیا جائے تو یہ بھی ناجائز ہو جاتا ہے۔

واضح رہے کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے حرام کی گئی تمام چیزوں کا احاطہ کرنا مقصود نہیں، کیونکہ دوسری آیات اور احادیثِ نبویہ سے ان چیزوں کے علاوہ اور بھی بہت سی چیزوں کی حرمت ثابت ہے، یہاں مقصد صرف یہ جتلانا ہے کہ جن جانوروں کو تم نے حرام سمجھ رکھا ہے وہ تو اللہ نے حرام نہیں کیے، تم خواہ مخواہ ان کی حرمت اللہ تعالیٰ کے ذمے لگا رہے ہو، البتہ کئی چیزیں ایسی ہیں جن کو تم حرام نہیں سمجھتے مگر اللہ نے انہیں حرام قرار دیا ہے، لہٰذا حرام چیزیں وہ نہیں ہیں جو تم سمجھ رہے ہو، بلکہ حرام تو وہ ہیں جنہیں تم نے حلال سمجھا ہوا ہے۔

مجبوری کی حالت میں حرام کھانے کی شرائط

پھر آگے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ویسے تو جن چیزوں کو ہم نے حرام کیا ہے جیسے مردار، خون یا خنزیر کا گوشت، ان کا کھانا ناجائز ہے، لیکن اگر کوئی شخص انتہائی مجبوری کی حالت میں ہو، یعنی بھوک سے بے تاب ہو اور غالب گمان یہ ہو کہ اگر کچھ کھائے گا نہیں تو مرجائے گا، تو ایسی مجبوری اور اضطرار کی حالت میں اگر وہ کچھ شرائط کے ساتھ مجبوراً حرام کھالے تو گناہ نہیں ہوگا، چنانچہ فرمایا: ﴿فَمَنِ اضْطُرَّ غَیْرَ بَاغٍ وَّ لَا عَادٍ﴾

ہاں! اگر کوئی شخص حالتِ اضطرار (انتہائی مجبوری کی حالت) میں ہو اور ان چیزوں میں سے کچھ کھالے، جبکہ اس کا مقصد نہ لذت حاصل کرنا ہو اور نہ وہ (ضرورت کی) حد سے آگے بڑھے، ﴿فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ﴾ ''تو اس صورت میں اس کے اوپر کوئی گناہ نہیں۔''

''مضطر'' شرعی اصطلاح میں اس شخص کو کہا جاتا ہے کہ جس کی جان خطرے میں ہو، معمولی تکلیف یا ضرورت کی وجہ سے کوئی مضطر نہیں بنتا، لہٰذا جو شخص مضطر ہوجائے، یعنی بھوک کی وجہ سے ایسی حالت میں پہنچ جائے کہ اگر کچھ نہ کھائے گا تو جان جاتی رہے گی تو ایسی مجبوری کی حالت میں حرام کھانے کے لیے دو شرطیں لگادی گئی ہیں؛

- ایک تو یہ کہ ﴿غَيْرَ بَاغٍ﴾ اس کا مقصد لذت حاصل کرنا نہ ہو، یعنی حرام کھانا صرف اسی صورت میں جائز ہوگا جبکہ کوئی لذت حاصل کرنا اور شوق سے کھانا مقصود نہ ہو، بلکہ صرف اپنی موت کے اندیشے کو دور کرنا مقصود ہو۔
- اور دوسری شرط ﴿وَّلَا عَادٍ﴾ اور نہ وہ ضرورت کی حد سے آگے بڑھے۔ اتنا ہی کھائے جتنی ضرورت ہے، یعنی جس سے اپنی جان بچاسکے۔ اس سے زیادہ نہ کھائے۔

ایسی حالت میں حرام کردہ چیزوں کے کھانے میں بھی کچھ گناہ نہیں ہوتا۔ آگے فرمایا: ﴿اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۷۳﴾﴾ ''بے شک اللہ تعالیٰ بہت بخشنے والا بڑا مہربان ہے،'' کہ ایسے وقت میں یہ رحمت فرمائی کہ گناہ کی چیز میں بھی گناہ اٹھادیا۔

یہاں یہ بات سمجھنی چاہیے کہ بالکل شدید مجبوری کی حالت میں اگر کوئی یہ حرام چیزیں کھالے تو اس کو کوئی گناہ تو نہیں ہوتا، لیکن وہ چیزیں حرام اس وقت بھی رہتی ہیں، مجبوری کی وجہ سے وہ حلال نہیں ہوجاتیں، لیکن اپنی ضرورت کو مٹانے کی خاطر ان کے استعمال پر اللہ تبارک وتعالیٰ وقتی طور پر گناہ کو اٹھالیتے ہیں۔ اس لیے یہ تعبیر اختیار کی گئی کہ ﴿فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ﴾ ''اس پر کوئی گناہ نہیں،'' یعنی وقتی طور پر اس کے حق میں یہ گناہ اٹھا دیا گیا ہے۔

حرام اجزاء سے بنی دوا کے استعمال کا حکم اور شرائط

اسی آیت کی وجہ سے فقہائے کرام نے یہ مسئلہ مستنبط کیا ہے اور اس کی تائید کچھ دوسری آیات اور

نبیِ کریم سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث سے بھی ہوتی ہے کہ جن جن چیزوں کے کھانے کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے حرام قرار دیا ہے، اگر کسی وقت ایسا موقع پیش آجائے کہ اگر انسان اسے نہ کھائے یا اسے استعمال نہ کرے تو یا تو اس کی موت واقع ہوجائے، یا اس بات کا اندیشہ ہو کہ اس کا کوئی عضو ضائع ہوجائے گا، تو ایسی صورت میں وقتی طور پر اس کے استعمال میں گناہ نہیں رہتا۔ اور اسی سے یہ بات بھی فرمائی گئی ہے کہ اگر کوئی شخص بیمار ہے اور اس کا علاج سوائے اس کے کوئی اور نہیں ہے کہ کوئی ایسی چیز یا ایسی دوا کھائے جس میں شراب یا خنزیر کے کسی حصے کی ملاوٹ ہو، تو اگر کوئی دوسرا علاج موجود نہ ہو اور بیماری کے بڑھنے کا اندیشہ ہو تو ایسی صورت میں وقتی طور پر اس کے استعمال میں گناہ نہیں رہتا۔ (۱)

اسی کو فقہائے کرام نے ایک اصول سے تعبیر فرمایا ہے کہ:

الضرورات تبیح المحظورات (۲)

یعنی ضرورتیں بعض اوقات ممنوع چیزوں کو بھی مباح کردیتی ہیں۔

مباح کرنے کے معنیٰ یہ ہیں کہ ان کے استعمال پر گناہ نہیں رہتا، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ آدمی اپنی طرف سے سمجھ لے کہ فلاں کام میرے لیے ضروری ہے یا فلاں چیز میرے لیے حلال ہوگئی، بلکہ اس کا معیار وہی ہے جو اوپر مذکور ہوا کہ یا تو اگر اسے استعمال نہ کرے گا تو موت آجائے گی، یعنی موت کا قوی اندیشہ ہوگا یا کسی عضو کے ضائع ہوجانے کا اندیشہ ہوگا۔ اسی طرح حرام چیز کو بطورِ علاج استعمال کرنے میں یہ صورت بھی داخل ہے کہ کوئی سخت بیماری انسان کو درپیش ہو اور اگر اس نے کسی ایسی دوا کا استعمال نہ کیا، جس میں کسی ناجائز چیز کی آمیزش اور ملاوٹ ہو تو اس کی بیماری بڑھ جائے گی اور کوئی حاذق (ماہر) طبیب یہ کہے کہ اس کے سوا اس کا کوئی علاج نہیں ہے تو اس صورت میں اس کے استعمال کی بھی اجازت ہوجاتی ہے۔

اللہ تعالیٰ کی آیتوں کو بیچنے اور چھپانے والوں کا اخروی انجام

آگے اللہ تبارک وتعالیٰ نے پھر فرمایا: ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ الْكِتٰبِ﴾ حقیقت یہ

---

(۱) كما في الدر المختار وحاشية ابن عابدين (رد المحتار) (۱/۲۱۰): "اختلف في التداوي بالمحرم وظاهر المذهب المنع كما في رضاع البحر، لكن نقل المصنف ثمة وهنا عن الحاوي: وقيل يرخص إذا علم فيه الشفاء ولم يعلم دواء آخر كما رخص الخمر للعطشان وعليه الفتوى."

(۲) الأشباه والنظائر لابن نجيم (۱/۷۳).

ہے کہ وہ لوگ جو اللہ تعالیٰ کی اتاری ہوئی کتاب کو چھپاتے ہیں ﴿وَ يَشْتَرُوْنَ بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا﴾ ''اور اس کے بدلے تھوڑی سی قیمت وصول کر لیتے ہیں۔'' یہ ان لوگوں کا ذکر ہے جو یہودی تھے اور انہوں نے اللہ تعالیٰ کی کتاب کی آیتوں کو چھپایا ہوا تھا یا انہیں پسِ پشت ڈالا ہوا تھا۔ ﴿اُولٰٓئِكَ مَا يَاْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ اِلَّا النَّارَ﴾ ''وہ اپنے پیٹ میں آگ کے سوا کچھ نہیں بھر رہے۔'' جو لوگ تھوڑا سا دنیاوی فائدہ حاصل کرنے کی خاطر اللہ تبارک وتعالیٰ کی کتاب میں تحریف کرتے ہیں یا اس کے احکام کو چھپاتے ہیں تو حقیقت میں وہ جو کچھ کھا رہے ہیں، یعنی رشوت لے کر جو چیز وہ کھاتے ہیں وہ درحقیقت آگ ہے جو وہ اپنے پیٹ میں بھر رہے ہیں۔

پھر فرمایا کہ ان کے ساتھ معاملہ یہ ہوگا کہ ﴿وَ لَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ﴾ ''قیامت کے دن اللہ ان سے کلام بھی نہیں کرے گا۔'' اللہ تعالیٰ کے ان کے ساتھ بات نہ کرنے سے مراد ایسا کلام ہے جو ناراضگی کے بغیر ہو، ورنہ قرآنِ کریم میں کئی جگہ آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ ناراضگی کے ساتھ ان سے کلام فرمائیں گے، لیکن ایسا کلام جس میں ناراضگی نہ ہو، ان سے نہیں فرمائیں گے۔

گناہ گار مسلمان کو جہنم میں پاک کرنے کے لیے ڈالا جائے گا

آگے فرمایا: ﴿وَ لَا يُزَكِّيْهِمْ وَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۷۴﴾﴾ ''اور اللہ تعالیٰ انہیں پاک صاف بھی نہیں کریں گے اور انہیں دردناک عذاب ہوگا۔'' اس میں اشارہ اس طرف ہے کہ اگر کوئی شخص صاحبِ ایمان ہے، اللہ تعالیٰ کی وحدانیت، نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت اور تمام ضروریاتِ دین پر ایمان رکھتا ہے، لیکن عمل میں کمزور ہے اور اس سے کچھ گناہ سرزد ہو گئے ہیں تو آخرت میں جہنم کا عذاب تو اسے بھی ہونا ہے، لیکن اسے وہ جہنم کا عذاب اس لیے ہوگا کہ اسے پاک صاف کر دیا جائے، یعنی اس کے اوپر جو گناہ کا میل کچیل لگا ہوا ہے اسے اللہ تعالیٰ دوزخ کی آگ سے صاف کر دیں گے، پھر پاک ہو کر وہ آخر میں جنت میں جائے گا۔ یہ مسلمان کا معاملہ ہوگا، لیکن کافروں کے بارے میں یہاں فرمایا کہ چونکہ یہ لوگ ایمان ہی سے محروم ہیں، انہوں نے نہ صرف یہ کہ ایمان قبول نہیں کیا، بلکہ اللہ تعالیٰ کی کتاب میں تحریف بھی کرتے رہے ہیں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ انہیں پاک نہیں کرے گا، انہیں جو جہنم کا عذاب ہوگا وہ عذاب دینے کے لیے ہی ہوگا، پاک کرنے کی غرض سے نہیں ہوگا۔

اپنا انجام معلوم ہونے کے باوجود کفار کی دیدہ دلیری

آگے فرمایا: ﴿اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى﴾ ''یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے ہدایت کے بدلے گمراہی خرید لی ہے،'' یعنی ان کے سامنے ہدایت آچکی تھی اس کے دلائل واضح ہو چکے تھے، ان کے بس میں اور اختیار میں تھا کہ اس ہدایت کو قبول کر لیتے، لیکن انہوں نے اسے چھوڑ کر گمراہی کو اختیار کیا، گویا ہدایت کے بدلے گمراہی خرید لی ﴿وَ الْعَذَابَ بِالْمَغْفِرَةِ﴾ ''اور انہوں نے مغفرت کے بدلے عذاب کی خریداری کر لی۔'' اگر یہ ایمان لے آتے اور ہدایت کی پیروی کرتے تو انہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے مغفرت کا انعام ملتا اور پچھلی زندگی کے گناہوں اور بداعمالیوں کی بخشش ہوجاتی، لیکن انہوں نے اس راستے کو اختیار کرنے کے بجائے گمراہی کا راستہ اختیار کیا جس کا آخرت میں نتیجہ اللہ تعالیٰ کا عذاب ہے، گویا انہوں نے مغفرت کے بدلے میں عذاب کی خریداری کر لی ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿فَمَآ اَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ ﴿۱۷۵﴾﴾ ''چنانچہ (اندازہ کرو کہ) یہ لوگ دوزخ کی آگ سہنے کے لیے کتنے تیار ہیں!'' یہ ایک تعجب کا جملہ ہے کہ جب ایک آدمی کو یہ پتہ ہو کہ اس عمل کے نتیجے میں مجھے جہنم کا عذاب سہنا پڑے گا، اس کے باوجود وہ وہی عمل کرتا رہے اور اس پر جما رہے تو گویا اس نے اپنے آپ کو اس بات کے لیے آمادہ کر رکھا ہے کہ میں وہ عذاب بھگت لوں گا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ کیسی تعجب کی بات ہے کہ یہ لوگ اس دوزخ کی آگ سہنے کے لیے اتنے تیار ہیں!!

آگے اللہ تعالیٰ انہیں دی جانے والی ان سزاؤں کی وجہ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ﴿ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ نَزَّلَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ﴾ اور یہ سب کچھ اس لیے ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے حق پر مشتمل کتاب اتاری ہے ﴿وَ اِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِي الْكِتٰبِ﴾ اور جن لوگوں نے ایسی کتاب کے بارے میں مخالفت کا رویّہ اختیار کیا ہے ﴿لَفِيْ شِقَاقٍۭ بَعِيْدٍ ﴿۱۷۶﴾﴾ ''وہ ضد اضدی میں بہت دور نکل گئے ہیں،'' یعنی کتاب کا برحق ہونا تو ان پر واضح ہو چکا، اس کے دلائل ان کے سامنے آچکے اور اس کے شواہد روزِ روشن کی طرح ان کی آنکھوں کے سامنے ہیں، لیکن اس کے باوجود یہ لوگ جو اختلاف کر رہے ہیں اور نبی کریم ﷺ پر ایمان نہیں لا رہے، تو درحقیقت اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے دل میں ضد ہے اور اس ضد، حسد اور عناد کی وجہ سے یہ راہِ راست سے بہت دور نکل گئے ہیں۔

آیت نمبر ۱۷۷

لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ۚ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ ۙ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ ۚ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ ۚ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا ۚ وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ ۭ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا ۭ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ﴿۱۷۷﴾

نیکی بس یہی تو نہیں ہے کہ اپنے چہرے مشرق یا مغرب کی طرف کرلو، بلکہ نیکی یہ ہے کہ لوگ اللہ پر، آخرت کے دن پر، فرشتوں پر اور اللہ کی کتابوں اور اس کے نبیوں پر ایمان لائیں، اور مال کی محبت کے باوجود رشتے داروں، یتیموں، مسکینوں، مسافروں اور سائلوں کو دیں، اور غلاموں کو آزاد کرانے میں خرچ کریں، اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں، اور جب کوئی عہد کرلیں تو اپنے عہد کو پورا کرنے کے عادی ہوں، اور تنگی اور تکلیف میں، نیز جنگ کے وقت، صبر و استقلال کے خوگر ہوں۔ ایسے لوگ ہیں جو سچے (کہلانے کے مستحق) ہیں، اور یہی لوگ ہیں جو متقی ہیں۔ ﴿۱۷۷﴾

بحث مباحثے سے بچنے اور ایمان وعمل کی تلقین

ان آیاتِ کریمہ میں اللہ تبارک وتعالیٰ اہلِ کتاب کو یہ فرمارہے ہیں کہ تم نے چند ظاہری علامتوں کو ہی اپنے سارے بحث ومباحثے اور جنگ وجدل کا محور بنا رکھا ہے اور اس میں بھی خاص طور پر قبلے کے معاملے کو اس طرح موضوعِ بحث بنا رکھا ہے جیسے دین میں اس سے زیادہ اہم کوئی اور مسئلہ نہیں ہے۔

قبلے کے بارے میں پیچھے گزر چکا ہے کہ اہلِ کتاب نے بڑا شور مچایا تھا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے قبلہ کی تبدیلی کا حکم کیوں دیا یا مسلمانوں نے اپنا قبلہ کیوں تبدیل کرلیا؟ تو اللہ تعالیٰ فرمارہے ہیں کہ تم نے تو نیکیاں

بس ان چند چیزوں میں ہی منحصر سمجھ رکھی ہیں، یہ بات ٹھیک ہے کہ قبلے کی طرف رُخ کرنا بھی بے شک نیکی ہے، لیکن اس کے علاوہ بھی بہت سارے نیکی کے کام ہیں اور انہیں بجالانا ہی درحقیقت اللہ تبارک وتعالیٰ کی اِتباع کا تقاضا ہے۔ مسلمانوں سے کہا جارہا ہے کہ قبلے کے مسئلے کی جتنی وضاحت ضروری تھی وہ ہو چکی ہے، اب آپ کو دین کے دوسرے اہم مسائل کی طرف توجہ دینی چاہیے اور اہلِ کتاب سے بھی یہ کہنا چاہیے کہ قبلے کے مسئلے پر بحث سے زیادہ ضروری بات یہ ہے کہ اپنا ایمان درست کرو اور وہ صفات پیدا کرو جو ایمان کو مطلوب ہیں، اس سلسلے میں آگے قرآنِ کریم نے نیکی کے مختلف شعبے بیان فرمائے ہیں اور اسلامی قانون کے مختلف احکام کی وضاحت کی ہے جو ایک ایک کرکے آگے آرہے ہیں۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ﴿لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ﴾ ''نیکی بس یہی تو نہیں ہے کہ تم اپنے چہرے مشرق یا مغرب کی طرف کرلو،'' بلکہ نیکیاں کیا ہیں؟ ان کی فہرست بیان کرتے ہوئے اللہ تبارک وتعالیٰ نے آگے ارشاد فرمایا: ﴿وَ لٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ الْمَلٰٓئِكَةِ وَ الْكِتٰبِ وَ النَّبِيّٖنَ﴾ ''بلکہ نیکی یہ ہے کہ لوگ اللہ پر اور یومِ آخرت پر اور اللہ کے فرشتوں پر، اللہ کی کتاب پر، اللہ کے نبیوں پر ایمان لائیں،'' سب سے بڑی نیکی تو یہی ہے۔ اب اگر آدمی ایمان کی طرف تو توجہ نہ دے، غلط عقیدوں پر اصرار کرتا رہے اور پھر اسی بحث میں الجھ جائے کہ کون سا قبلہ برحق ہے اور کون سا قبلہ غلط ہے؟ تو اس کے معنیٰ یہ ہوئے کہ جو اہم ترین اور بنیادی مسئلہ تھا اس سے تو اس نے آنکھیں چرالیں اور اپنے آپ کو اس سے الگ کرلیا، لیکن دوسری طرف اس فروعی اور چھوٹے مسئلے کے اندر بحث ومباحثہ شروع کردیا۔

قرآنِ کریم کی ان آیات کی رُو سے آدمی کے ذمے سب سے پہلا کام یہ ہے کہ وہ اللہ پر ایمان لائے، اللہ کی توحید پر ایمان لائے، یومِ آخرت پر ایمان لائے کہ ایک دن سب کو اللہ کے سامنے پیش ہونا ہے، اللہ تعالیٰ کے فرشتوں پر ایمان لائے، جو اللہ تعالیٰ کے حکم سے اللہ تعالیٰ کی وحی لے کر پیغمبروں پر نازل ہوتے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے اور بھی دوسرے کئی کام ان کے سپرد کیے ہوئے ہیں، تمام انبیاء پر ایمان لائے، ان میں کسی کا استثناء نہ کرے، یہ نہ کہے کہ ہم موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لاتے ہیں اور عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان نہیں لاتے جیسا کہ یہودی کہتے ہیں، یا موسیٰ علیہ السلام اور عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لاتے ہیں، لیکن نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہیں لاتے، جیسا کہ یہودی اور نصرانی دونوں کہا کرتے تھے، یہ ایمان نہیں ہے۔ ایمان یہ ہے کہ سارے انبیاء پر ایمان لایا جائے، پھر آگے ایمان کے تقاضے کے مطابق اللہ تبارک وتعالیٰ نے کچھ اعمال ذکر فرمائے ہیں اور اُن کی ایک مختصر فہرست عطا فرمائی ہے۔

مسلمانوں اور کفار کو نیکی کے مختلف شعبوں کی طرف دعوت

اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں اور کفار کو نیکی کے جن مختلف اعمال اور شعبوں کی طرف دعوت دی ہے ان اعمال میں سے سب سے پہلے یہ ذکر فرمایا کہ کوئی شخص اپنے مال کا کچھ حصہ رشتے داروں پر، یتیموں پر، مسکینوں پر، مسافروں پر اور مانگنے والوں پر صرف کرے اور اسی طرح غلاموں کو آزاد کرنے میں صرف کرے، چنانچہ فرمایا: ﴿وَ اٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ﴾ یعنی کہ ''مال کی محبت کے باوجود وہ اپنا مال دیتا ہے۔'' مطلب یہ ہے کہ ہر انسان کے دل میں بشری تقاضے سے مال کی طرف میلان پایا جاتا ہے اور ہر انسان چاہتا ہے کہ اس کے پاس کچھ مال ہو اور اس مال کی محبت اس کے دل میں موجود ہوتی ہے۔ اس محبت کی وجہ سے بعض اوقات وہ بخل کرنے لگتا ہے اور اس مال کو صحیح جگہ پر صرف کرنے کے بجائے وہ صرف اپنی ذاتی خواہشات کے اوپر صرف کرتا ہے تو یہ اس مال کا ایک بہت بڑا فتنہ ہے، لیکن اس کے برعکس جس کو اللہ تبارک وتعالیٰ کے احکام کی پیروی مقصود ہوتی ہے اور اس کے پیشِ نظر نبیِ کریم سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے دین پر عمل کرنا ہوتا ہے تو وہ مال کی محبت کے باوجود اپنا مال ان لوگوں پر خرچ کرتا ہے۔

یہ جو فرمایا گیا کہ ''مال کی محبت کے باوجود'' اس سے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ اصل قابلِ تعریف صدقہ وہ ہے جو انسان اپنے محبوب مال میں سے ادا کرے، بیکار اور گھٹیا چیزوں کا صدقہ تو بخیل انسان بھی کر دیتا ہے، لیکن جس چیز سے خصوصی محبت ہو، اس کا صدقہ کرنا اللہ تعالیٰ کو زیادہ پسند ہے، اور اسی کو اصل نیکی کہا گیا ہے۔

مال کس کو دینا نیکی ہے؟ اس کے بارے میں بیان فرمایا کہ ﴿ذَوِي الْقُرْبٰى وَ الْيَتٰمٰى وَ الْمَسٰكِيْنَ﴾ ''رشتے داروں، یتیموں اور مسکینوں کو دینا نیکی ہے۔'' جو رشتے دار ہیں انہیں اُن کی ضروریات میں پیسے دینا یا ان کی ضروریات کو اپنے مال کے ذریعے رفع کرنا، یہ پہلا کام ہے، اور اسی طرح یتیموں اور مسکینوں کی مدد و اعانت کرنا بھی نیکی ہے۔ مسکین سے مراد وہ شخص ہے کہ جس کے پاس کچھ بھی نہیں ہے اور وہ فقر و فاقہ کا شکار ہے اس کی حاجت کو رفع کرنے کے لیے اپنے مال کو استعمال کرنا نیکی ہے۔ ﴿وَ ابْنَ السَّبِيْلِ﴾ ''اور مسافروں کو دینا نیکی ہے،'' یعنی وہ مسافر جس کے پاس اگرچہ اس کے گھر میں یا اس کے وطن میں مال موجود ہو، لیکن مسافرت کی حالت میں وہ کسی تنگی کا شکار ہو گیا ہو اور اسے پیسوں کی ضرورت ہو تو اس کی حاجت کو رفع کرنا بھی بہت بڑی فضیلت کی چیز ہے، جس کا اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس جگہ ذکر فرمایا ہے۔

پیشہ ور بھکاریوں کو بھیک دینا جائز نہیں

آگے فرمایا: ﴿وَ السَّآىِٕلِيْنَ﴾ ''اور سائلین کو دینا نیکی ہے۔'' سائلین کے لفظی معنی ہیں مانگنے والے۔ مانگنے والوں کی بھی دو قسمیں ہوتی ہیں؛ ایک تو وہ ہوتے ہیں جو پیشہ ور مانگنے والے ہوتے ہیں، یعنی انہوں نے ہاتھ پھیلانے کو یا بھیک مانگنے کو اپنا پیشہ بنا رکھا ہوتا ہے اور وہ اپنے ہاتھ پاؤں کو ہلا کر محنت کر کے کمانے کی طرف راغب نہیں ہوتے، بلکہ لوگوں سے مانگتے پھرتے ہیں، انہیں دینا تو ویسے بھی جائز نہیں ہوتا، کیونکہ جس آدمی کے پاس شریعت کی مقرّر کردہ حد کے مطابق ایک دن ایک رات کی روزی موجود ہو، اسے کسی دوسرے سے سوال کرنا جائز نہیں ہوتا، لہٰذا اگر کسی شخص کے بارے میں معلوم ہو کہ اس کے پاس ایک دن اور ایک رات کی روزی موجود ہے تو جس طرح اس کے لیے شرعاً مانگنا جائز نہیں، اسی طرح اسے دینا بھی گناہ کے کام میں اس کی اعانت شمار ہوگا، اس واسطے وہ بھی جائز نہیں ہے۔

دوسری قسم کے سائل اور مانگنے والے وہ ہوتے ہیں جو بھکاری یا پیشہ ور مانگنے والے نہیں ہوتے، بلکہ انہیں کسی مجبوری کی وجہ سے مانگنے کی ضرورت پیش آجاتی ہے۔ ایسے لوگوں کو دینے اور ان کی مدد کرنے کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے باعثِ اجر وثواب قرار دیا ہے اور اس کا ذکر کئی جگہ قرآنِ کریم میں فرمایا ہے۔ نبیِ کریم سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی یہ معمول تھا کہ اگر کوئی آپ سے اپنی حاجت مانگتا تو آپ کبھی اسے ردّ نہیں فرماتے تھے۔[1] یہاں ''سائلین'' سے مراد یہی دوسرے قسم کے لوگ ہیں جو پیشہ ور سائل اور پیشہ ور گداگر نہیں ہیں، لیکن اپنی کسی حاجت کی وجہ سے انہیں مانگنا پڑ گیا ہے تو انہیں دینے کی بڑی فضیلت ہے۔

نیکی کے مختلف شعبوں کے بیان میں آخری بات یہ ذکر فرمائی کہ ﴿وَ فِي الرِّقَابِ﴾ ''اور اللہ کی محبت میں اپنا مال غلاموں کے آزاد کرانے میں خرچ کریں۔'' پہلے زمانے میں غلام ہوا کرتے تھے جو لوگوں کی غلامی اور خدمت کیا کرتے تھے، ان غلاموں کو آزاد کرنا بھی بہت بڑی فضیلت کی بات قرار دی گئی ہے۔ ایک حدیث میں نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ:

''اگر کوئی شخص کسی غلام کو آزاد کرے تو اس کے ہر عضو کے بدلے آزاد کرنے والے

---

(۱) كما في صحيح البخاري (۸/ ۱۳) (٦٠٣٤): عن جابر رضي الله عنه، يقول: "ما سئل النبي ﷺ عن شيء قط فقال: لا." كتاب الأدب، باب حسن الخلق والسخاء، وما يكره من البخل.

انسان کے ہر عضو کو جہنم سے نجات عطا ہو جاتی ہے۔"(۱)

زکوٰۃ کے علاوہ نفلی صدقات ادا کرنے والے لوگ

جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا، آدمی کے لیے دنیا میں سب سے بڑا فتنہ مال ہوتا ہے، اسی مال کی وجہ سے انسان دنیا میں بہت سے گناہوں کا ارتکاب کرتا ہے اور بہت سے فرائض میں کوتاہی کرتا ہے۔ اس لیے یہاں نیکی کے کاموں میں پہلے ان لوگوں کا ذکر فرمایا گیا ہے جو مال کی محبت کے باوجود اللہ تعالیٰ کے راستے میں اپنا مال خرچ کرتے ہیں۔ پھر آگے فرمایا: ﴿وَ اَقَامَ الصَّلٰوةَ﴾ "اور نماز قائم کریں،" یعنی ان کا دوسرا عمل یہ ہے کہ وہ نماز کو قائم کرتے ہیں اور یہ پہلے بھی گزر چکا ہے کہ نماز کو قائم کرنے سے مراد یہ ہے کہ نماز کو اس کے آداب و شرائط کے ساتھ اور پابندی کے ساتھ ادا کرتے ہیں، اس میں ناغہ نہیں کرتے۔

﴿وَ اٰتَى الزَّكٰوةَ﴾ "اور زکوٰۃ ادا کریں،" یعنی ان کا تیسرا عمل یہ ہے کہ وہ زکوٰۃ ادا کرتے ہیں۔ ہر وہ شخص جو صاحبِ نصاب ہو اس کے مال پر زکوٰۃ فرض ہے، اور اس کی خاص مقدار اللہ تبارک وتعالیٰ نے طے کر رکھی ہے۔ مثلاً عام طور سے نقدی کی زکوٰۃ چالیسواں حصہ یا ڈھائی فیصد ہوتی ہے جو فرض ہے۔ یہاں زکوٰۃ کا الگ سے ذکر فرمایا گیا ہے، اس سے یہ بات معلوم ہوئی کہ پیچھے جو بات کہی گئی تھی کہ وہ ان مختلف مدات میں اپنا مال خرچ کرتے ہیں، تو وہاں اس سے نفلی صدقات مراد ہیں۔

ایفائے عہد اور صبر کرنے والوں کی تعریف

پھر آگے فرمایا: ﴿وَ الْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا﴾ "اور وہ لوگ جو اپنے عہد کو پورا کرنے کے عادی ہوں،" جب کوئی عہد کرلیں تو اس عہد کو پورا کرتے ہوں۔ یہ بھی بہت بڑی عظیم تعلیم ہے کہ جب آپ کسی کے ساتھ کوئی وعدہ کریں یا عہد اور معاہدہ کریں تو اسے ہر حال میں پورا کریں اور جب تک کہ کوئی شدید عذر لاحق نہ ہو جائے، اس وعدے سے پہلو تہی اختیار نہ کریں۔ ایفائے عہد، یعنی وعدہ پورا کرنے والے لوگوں کی اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہ تعریف فرمائی ہے کہ وہ جب بھی کوئی عہد کرلیں تو اسے پورا کرتے ہیں۔

---

(۱) كما في صحيح البخاري (۳/۱٤٤) (۲۵۱۷) قال النبي ﷺ: "أيما رجل أعتق امرأ مسلما، استنقذ الله بكل عضو منه عضوا منه من النار." كتاب العتق، باب في العتق وفضله.

اس آیت میں: ﴿وَ الْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ﴾ کا لفظ بہت ہی جامع ہے اوراگر غور کیا جائے تو اس میں انسان کے تمام معاملات ہی آجاتے ہیں، کیونکہ ہر قسم کا لین دین، خرید و فروخت اور کاروباری اور نجی معاہدات کی بنیاد وعدوں کی پاسداری پر ہی قائم ہوتی ہے۔

﴿وَ الصّٰبِرِیْنَ فِی الْبَاْسَآءِ وَ الضَّرَّآءِ وَ حِیْنَ الْبَاْسِ﴾ ''اور تنگی اور تکلیف کے حالات میں اور جنگ کے وقت میں یہ صابرین ہوتے ہیں،'' یعنی صبر اور استقلال کے خوگر ہوتے ہیں۔ ''بأساء'' کے معنیٰ تنگی یا تنگدستی اور ''ضراء'' کے معنیٰ تکلیف کے ہوتے ہیں اور مطلب یہ ہے کہ جب بھی دنیا کے اندر کوئی مالی پریشانی، صدمہ یا کوئی تکلیف پیش آئے تو اس میں یہ لوگ صبر کرتے ہیں۔ ﴿وَ حِیْنَ الْبَاْسِ﴾ ''اور لڑائی کے وقت بھی،'' یعنی جب ان پر کوئی دشمن حملہ آور ہو جائے یا اس کے ساتھ جنگ کا موقع آجائے تو ایسی صورت میں یہ لوگ استقلال اور ثابت قدمی کے ساتھ اس جنگ میں حصہ لیتے ہیں اور صبر سے کام لیتے ہیں۔ صبر کی تفصیل پیچھے عرض کی جا چکی ہے۔[1]

''صدق'' کا معنیٰ و مفہوم اور اس کی حقیقت

ان تمام اوصاف کو ذکر کر کے اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ صَدَقُوْا﴾ ''یہ ہیں وہ لوگ جو سچے ہیں،'' یعنی سچا کہلانے کے مستحق ہیں۔ اس جملے نے یہ بات بتادی کہ سچ کے مفہوم میں صرف یہ بات داخل نہیں ہے کہ آدمی زبان سے سچ بولے، بلکہ جب اس کے تمام کام اللہ تبارک وتعالیٰ کی رضا کے مطابق ہوں تو وہ سچا کہلانے کا مستحق ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ جب ایک شخص نے یہ کہہ دیا کہ ''لا الہ الا اللہ''، یعنی اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں تو اس طرح اس نے ایک طرح سے یہ عہد کرلیا کہ میں صرف اللہ تبارک وتعالیٰ کے احکام کی پابندی کروں گا۔ اس عہد میں سچا اُترنے کا تقاضا یہ ہے کہ وہ ان ساری باتوں پر عمل کرے اور ان سارے احکام کو بجالائے جو اللہ تعالیٰ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے عطا فرمائے ہیں۔ اس لیے فرمایا کہ ''یہ ہیں وہ لوگ جو سچے ہیں۔''

''صدق'' کا لفظی ترجمہ اگرچہ سچائی ہے، لیکن قرآنِ کریم کی اصطلاح میں یہ بڑا وسیع مفہوم رکھتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ انسان جو کام بھی کرے، وہ اُسی طرح کرے جس طرح اسے کرنا چاہیے، اس میں

---

(۱) دیکھیے: سورۃ البقرۃ (۲): آیت ۱۵۳

زبان کی سچائی بھی آتی ہے، وعدہ پورا کرنا بھی آتا ہے، صحیح نیت سے کام کرنا بھی آتا ہے، عبادت کو عبادت کی طرح سُنّت کے مطابق ادا کرنا بھی صدق ہے۔ جہاد میں اللہ تعالیٰ کی خاطر جان دے دینا بھی صدق ہے، غرض اللہ تعالیٰ کی خاطر ہر نیکی کو سُنّت کے مطابق ادا کرنا صدق کے مفہوم میں شامل ہے۔ امام غزالی رحمہ اللہ نے اس کی تفصیل بتاتے ہوئے ''احیاءُ العلوم'' میں کئی صفحات لکھے ہیں۔ (۱) اسی لیے نیک کاموں کی فہرست بتا کر اللہ تعالیٰ اس پر عمل کرنے والوں کے بارے میں فرماتے ہیں: ﴿اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا﴾ ایسے ہی لوگ ہیں جو سچے (کہلانے کے مستحق) ہیں، ﴿وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ۝۱۷۷﴾ ''اور یہی لوگ ہیں جو متقی ہیں۔''

صدق و اخلاص کے حصول کا آسان طریقہ

انسان کا ہر عمل کتاب وسنت کے مطابق ہو، یہ صدق ہے۔ اور ہر عمل میں یہ نیت کرنا کہ اس سے صرف اللہ تعالیٰ کی رضامندی مقصود ہے، یہ اخلاص ہے۔ یہ دو چیزیں جب جمع ہو جاتی ہیں؛ صدق اور اخلاص تو بس بندہ منزل پالیتا ہے۔ اور یہ صدق اور اخلاص کوئی ایسی چیز نہیں ہیں کہ انہیں پانا کوئی مشکل ہو، یہ معمولی سے کام سے بھی حاصل ہو جاتی ہیں۔ پہلے زمانے میں ان کے حصول کے لیے بڑے بڑے مجاہدات اور ریاضتیں کی جاتی تھیں، لیکن اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائے ہمارے بزرگوں کو کہ انہوں نے ہمارے جیسے کمزوروں کے لیے آسان راستے بھی تجویز فرما دیے کہ بس یہ کام کر لو تو ان شاء اللہ صدق اور اخلاص حاصل ہو جائے گا۔

صدق و اخلاص کے حصول کا آسان راستہ یہ ہے کہ انسان جو نیک عمل کرنا شروع کرے تو اس سے پہلے اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کر لے کہ یا اللہ! یہ کام کرنے جا رہا ہوں، مجھے صدق اور اخلاص کے ساتھ کرنے کی توفیق عطا فرما۔ نماز پڑھنے سے پہلے یہ دعا کر لے کہ یا اللہ! اخلاص کے ساتھ اور اپنی رضا کے مطابق پڑھنے کی توفیق عطا فرما۔ یہ کہنے میں کوئی دیر بھی نہیں لگتی، لیکن جب آدمی اللہ تعالیٰ کے سامنے یہ رٹ لگاتا رہے گا تو -ان شاء اللہ- اللہ تعالیٰ محروم نہیں کریں گے۔ دنیا کی دعاؤں میں تو یہ احتمال ہوتا ہے کہ وہ ہمارے حق میں بہتر نہ ہوں، اس لیے اللہ تعالیٰ ان کے بدلے میں بعض اوقات اس سے اچھی کوئی اور چیز عطا فرما دیتے ہیں، لیکن جب کوئی آدمی اللہ تعالیٰ سے دین مانگے یا اللہ تعالیٰ کی رضا مانگے تو اللہ تعالیٰ کیوں ردّ فرمائیں گے؟ ان شاء اللہ تعالیٰ ایسی دعا ضرور قبول ہوگی۔

---

(۱) إحياء علوم الدين (۳۸٦/٤) الباب الثالث في الصدق وفضيلته وحقيقته - الناشر: دار المعرفة - بيروت

اسلام کا نظامِ قصاص: احکام، فوائد اور حکمتیں

آیت نمبر ۱۷۸ تا ۱۷۹

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلٰى ۭ اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْاُنْثٰى بِالْاُنْثٰى ۭ فَمَنْ عُفِيَ لَهٗ مِنْ اَخِيْهِ شَيْءٌ فَاتِّبَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ وَاَدَاۗءٌ اِلَيْهِ بِاِحْسَانٍ ۭ ذٰلِكَ تَخْفِيْفٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَرَحْمَةٌ ۭ فَمَنِ اعْتَدٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝۱۷۸ وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۝۱۷۹

اے ایمان والو! جو لوگ (جان بوجھ کر ناحق) قتل کر دیے جائیں ان کے بارے میں تم پر قصاص (کا حکم) فرض کر دیا گیا ہے۔ آزاد کے بدلے آزاد، غلام کے بدلے غلام، اور عورت کے بدلے عورت (ہی کو قتل کیا جائے)، پھر اگر قاتل کو اس کے بھائی (یعنی مقتول کے وارث) کی طرف سے کچھ معافی دے دی جائے تو معروف طریقے کے مطابق (خوں بہا کا) مطالبہ کرنا (وارث کا) حق ہے، اور اسے خوش اُسلوبی سے ادا کرنا (قاتل کا) فرض ہے۔ یہ تمہارے پروردگار کی طرف سے ایک آسانی پیدا کی گئی ہے اور ایک رحمت ہے۔ اس کے بعد بھی کوئی زیادتی کرے تو وہ دردناک عذاب کا مستحق ہے۔ ۱۷۸ اور اے عقل رکھنے والو! تمہارے لیے قصاص میں زندگی (کا سامان) ہے، اُمید ہے کہ تم (اس کی خلاف ورزی سے) بچو گے۔ ۱۷۹

• انسانی زندگی سے متعلق مختلف پہلوؤں کا بیان

گزشتہ آیت میں چونکہ متقیوں کا ذکر آیا تھا اور تقویٰ کی بعض صفات کا بیان فرمایا گیا تھا، اس لیے اس کے بعد کی آیتوں میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے تقویٰ کے مختلف پہلوؤں کو بیان فرماتے ہوئے دیگر ایسے احکام عطا فرمائے ہیں جو انسان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں سے تعلق رکھتے ہیں اور جن کو اختیار کر کے انسان متقی بن

جاتا ہے، چنانچہ سب سے پہلے اللہ تبارک وتعالیٰ نے انسان کی جان اور اس کے مال کی حرمت کا ذکر فرمایا ہے، کیونکہ انسان کے لیے سب سے اہم کام یہ ہے کہ وہ انسانوں کی جانوں کے احترام کا سبق سیکھے اور یہ دیکھے کہ کسی شخص کی بھی جان، کسی جائز وجہ کے بغیر لے لینا کسی طرح بھی جائز نہیں۔ اگر کوئی شخص کسی کی جان لے لے تو پھر معاشرے کا یہ فرض ہے کہ اس قاتل کو کیفرِ کردار تک پہنچائے۔ اس نے ایک بے گناہ کی جان لی ہے تو اس طرح اس کی بھی جان لی جائے، لہٰذا اللہ تبارک وتعالیٰ نے آئندہ احکام میں سب سے پہلے قصاص کے احکام کو ذکر فرمایا ہے، جس کے معنیٰ یہ ہیں کہ اگر کوئی شخص بغیر کسی شرعی وجہ کے قتل کر دیا گیا، تو معاشرے پر فرض ہے کہ اس قاتل سے اس کا قصاص لیا جائے، یعنی قاتل کو بھی قتل کیا جائے۔

• قاتل سے قصاص لینا شرعاً فرض ہے

کسی مقتول کے قتل کا بدلہ لیتے ہوئے قاتل کو قتل کرنے کو قصاص کہتے ہیں اور اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہاں قصاص کے سلسلے میں تین احکام بہت وضاحت کے ساتھ بیان فرمائے ہیں، اور پھر قصاص کی ایک حکمت بھی بیان فرمائی ہے۔

سب سے پہلے تو یہ فرمایا کہ ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ اے ایمان والو! ﴿كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلٰى﴾ ''تمہارے اوپر قصاص فرض کر دیا گیا ہے مقتول لوگوں کے بدلے میں،'' یعنی جو لوگ مقتول ہو جائیں، ان کے بدلے میں قاتل کو قتل کرنا تمہارے ذمے فرض کر دیا گیا ہے۔ یہاں یہ بات خاص طور پر قابلِ توجہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہاں تمام ایمان والوں کو خطاب کر کے یہ فرمایا ہے کہ تمہارے اوپر یہ فرض کر دیا گیا ہے کہ تم قاتل سے قصاص لو۔ اگرچہ قصاص کے مطالبے کا براہِ راست حق تو مقتول کے وارثوں کو ہی ہوتا ہے، کیونکہ یہ فطری بات ہے کہ جتنا رنج اور جتنا صدمہ مقتول کے وارثوں کو پہنچا اور جتنا نقصان انہیں ہوا، وہ دوسروں کو نہیں ہوتا، لیکن چونکہ یہ پورے معاشرے کے خلاف ایک بہت بڑا جرم ہے اس لیے تمام مسلمانوں کو خطاب کیا گیا ہے کہ اے ایمان والو! تمہارے اوپر فرض کر دیا گیا ہے کہ قصاص لو، اس کا مطلب یہ ہے کہ تمام مسلمانوں کے ذمے لازم ہے کہ سب مل کر قاتل کا کھوج لگائیں اور چونکہ ایک انسانی جان کی حرمت کو پامال کیا گیا ہے، اس لیے تمام لوگوں کی ذمے داری بنتی ہے کہ وہ اپنے معاشرے کو ایسے جرائم سے پاک کرنے کے لیے قاتل کو پکڑنے کی کوشش کریں۔

• جاہلیت میں نظامِ قصاص کے طریقوں کی اصلاح

دوسری بات جو اگلے جملے میں ارشاد فرمائی گئی ہے، وہ یہ ہے کہ اگرچہ قصاص کا قاعدہ تو بہت سے پچھلے معاشروں میں بھی چلا آتا تھا، مثلاً اہلِ کتاب میں بھی قصاص کا حکم موجود تھا اور خود مشرکینِ عرب میں بھی یہ رواج تھا کہ اگر کوئی شخص قتل ہوجاتا تو قاتل سے بدلہ لیا جاتا تھا، لیکن اس بدلے کے معاملے میں طرح طرح کے غلط اصول جاری تھے جن سے انسان کی مساوات اور برابری کا تصوّر مجروح ہوتا تھا۔ جاہلیت میں اگر کسی کا قصاص لینا ہوتا تو مشرکین یہ کہہ دیتے کہ مقتول جس مرتبے کا تھا، اسی مرتبے کے شخص سے قصاص لیا جائے گا، لہٰذا اگر مقتول کسی اعلیٰ مرتبے کا ہو یا مثلاً آزاد ہو اور قاتل غلام ہو، تو وہ کہتے کہ اب ہم اس کے بدلے میں اس غلام کو یا نچلے درجے کے آدمی کو قتل نہیں کریں گے، بلکہ اُس کے قبیلے کے کسی ایسے شخص کو قتل کریں گے جو درجے اور منصب یا رتبے کے لحاظ سے مقتول کے برابر ہو۔

جاہلیت میں اس قسم کے تصوّر کے لیے ''بُواء'' کا لفظ استعمال کیا جاتا تھا اور کہا جاتا تھا کہ فلاں شخص فلاں کا ''بُواء'' ہے، یعنی اس کا ہم پلہ ہے۔ اگر قاتل مقتول کا ہم پلہ ہے تب تو قاتل کو قتل کیا جاتا، لیکن اگر قاتل مقتول کا ہم پلہ نہیں ہے، تو اس کے خاندان، اس کی برادری اور اس کے قبیلے میں سے کسی ایسے شخص کو تلاش کیا جاتا تھا جو اس کے ہم پلہ ہو، بلکہ بعض اوقات مقتول کے ورثاء یہاں تک بھی مطالبہ کرتے تھے کہ ہمارا آدمی تو دو آدمیوں کے برابر تھا، لہٰذا ہم اس کے بدلے میں دو آدمی قتل کریں گے۔ بعض یہ کہتے کہ ہمارا آدمی دس آدمیوں کے برابر تھا، لہٰذا ہم دس آدمی قتل کریں گے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے قصاص کے اس اصل حکم کو تو برقرار رکھا، اور فرمایا کہ بے شک یہ ایک اہم فریضہ ہے، لیکن اس میں جو غلط رسم و رواج پڑ گئے تھے، یعنی جان کے اعتبار سے بھی انسانوں کی درجہ بندی کردی گئی تھی، اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس تصوّر اور ناانصافی کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم فرمادیا۔ اُن کے اِس جاہلانہ اور ظالمانہ طریقے کے مقابلے میں اسلام کے عادلانہ نظامِ قصاص کو پیش کرتے ہوئے باری تعالیٰ نے فرمایا کہ ﴿اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ﴾ آزاد کے بدلے آزاد ﴿وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ﴾ ''اور غلام کے بدلے غلام۔'' معنیٰ یہ ہوئے کہ اگر ایک غلام نے کسی آزاد آدمی کو قتل کردیا ہو، تو جیسے پہلے مطالبہ کیا جاتا تھا کہ ہم اس قاتل غلام کے بجائے کسی آزاد آدمی کو قتل کریں گے تو اب اس طرح عمل نہیں کیا جائے گا، بلکہ اگر قاتل غلام ہے اور مقتول آزاد ہے، تو جان دونوں کی برابر ہے۔ اس لیے قاتل غلام ہی کو قتل کیا جائے گا۔ یہ مطالبہ کسی طرح بھی برحق

اور انصاف کے مطابق نہیں ہے کہ قاتل کو قتل کرنے کے بجائے اسی قبیلے کے کسی آزاد آدمی کو پکڑ کر قتل کر دیا جائے۔

اسی طرح ﴿وَ الْاُنْثٰی بِالْاُنْثٰی﴾ ''اور عورت کے بدلے عورت کو ہی قتل کیا جائے گا۔'' جاہلیت میں بعض اوقات یہ بھی کیا جاتا تھا کہ اگر قتل کرنے والی عورت ہے اور مقتول مرد ہے تو وہ یہ کہتے تھے کہ مقتول چونکہ مرد تھا اور مرد کا درجہ عورت کے مقابلے میں بڑا ہے، لہٰذا ہم مقابلے میں اسی قبیلے کے کسی مرد کو قتل کریں گے، عورت کو نہیں کریں گے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ بالکل غلط بات ہے، جس طرح مرد کی جان حرمت والی ہے، اسی طرح عورت کی جان بھی حرمت والی ہے، لہٰذا عورت اور مرد میں اس معاملے میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اس معاملے میں اعتبار قاتل کا ہے، اگر قاتل کوئی عورت ہے تو عورت کو قتل کیا جائے گا اور اگر قاتل مرد ہے تو مرد کو قتل کیا جائے گا۔ اسی بات کو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ''عورت کے بدلے عورت۔''

• قصاص کے بدلے میں دیت لینے کا حکم

پھر تیسرا حکم یہ بیان فرمایا کہ اگرچہ مقتول کے ورثاء کو یہ پورا پورا حق حاصل ہے کہ وہ قاتل سے قصاص لیں، یعنی اسے بدلے میں قتل کریں، لیکن اس کے ساتھ ساتھ اللہ تبارک وتعالیٰ نے قاتل کے وارثوں کو یہ حق بھی دے دیا کہ اگر وہ چاہیں تو قاتل کو قتل کرنے کے بجائے اس سے خوں بہا کا مطالبہ کر سکتے ہیں۔ مقتول سے قصاص کے بدلے خون بہا کے طور پر کچھ رقم لینے کو عربی میں ''دِیت'' کہتے ہیں، اور اردو اور فارسی میں اس کو ''خوں بہا'' کہا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مقتول کے ورثاء کو دِیت کا مطالبہ کرنے کا حق دیا اور یہ کہا کہ اگر مقتول کے ورثاء یہ کہہ دیں کہ اگر قاتل ہمیں اتنی رقم دے دے، تو ہم اس کے قصاص کو معاف کر دیں گے، تو یہ معافی معتبر ہوگی، چنانچہ فرمایا: ﴿فَمَنْ عُفِیَ لَهٗ مِنْ اَخِیْهِ شَیْءٌ﴾ ''اگر قاتل کو اس کے بھائی (یعنی مقتول کے وارث) کی طرف سے کچھ معافی دے دی جائے (تو اب اسے قتل نہیں کیا جائے گا،)'' یعنی مقتول کے وارثوں میں سے اگر کوئی ایک بھی مقتول کا خون معاف کر دے، تو اب اس قاتل کو قصاص میں قتل نہیں کیا جائے گا، لیکن بطورِ مصالحت جس مال پر رضامندی ظاہر کر کے قصاص سے دستبرداری کی گئی ہے، قاتل کے لیے مقتول کے ورثاء کو ادا کرنا لازم ہوگا۔

یہاں ''اخیہ'' کا لفظ استعمال کر کے یہ بتلا دیا کہ جب کسی آدمی کا قتل ہوا ہو، تو اس قتل کی وجہ سے

اگرچہ اس کے وارثوں کی قاتل کے ساتھ دشمنی ہوجاتی ہے، لیکن اگر وہ چاہیں تو اس دشمنی کو بھائی چارے میں تبدیل کرسکتے ہیں کہ اس سے کہیں کہ ہم اب تمہاری جان تو نہیں لینا چاہتے، لیکن تم ہمیں اتنی رقم ادا کردو تو یہ قصاص ہم معاف کردیں گے۔ یہ رقم خوں بہا کے طور پر ادا کی جاتی ہے اور باہمی رضا مندی سے جو رقم بھی طے ہوجائے اسے خوں بہا مقرر کیا جاسکتا ہے۔

اگر قاتل کو اس کے بھائی، یعنی مقتول کے وارث کی طرف سے کچھ معافی دے دی جائے تو اس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ﴿فَاتِّبَاعٌ بِالْمَعْرُوْفِ﴾ ''تو معروف طریقے کے مطابق خون بہا کا مطالبہ کرنا وارث کا حق ہے،'' یعنی مقتول کے وارثوں کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ قاعدے قانون کے مطابق مطالبہ کریں، اور قاتل سے کہیں کہ تم ہمیں اتنی رقم ادا کرو۔ قاتل کے لیے فرض ہے کہ ﴿وَ اَدَآءٌ اِلَيْهِ﴾ وہ اسے ادا کردے ﴿بِاِحْسَانٍ﴾ ''خوش اسلوبی سے،'' یعنی قاتل کو چاہیے کہ وہ دیت کی مقدار میں کمی یا ٹال مٹول کیے بغیر خوش اسلوبی اور احسن طریقے سے ورثاء کو دیت ادا کرے۔

• خوں بہا کے حکم کے آداب اور اس کی حکمت

ایک طرف مقتول کے وارثوں کو یہ فرمایا گیا کہ دیت یا خوں بہا کا مطالبہ کرنا تمہارا حق ہے، لیکن یہ مطالبہ ''بالمعروف'' ہونا چاہیے، یعنی اس میں زور زبردستی، دھونس دھاندلی اور جبر و استبداد کا انداز نہ ہونا چاہیے، بلکہ یہ مطالبہ بھلے طریقے سے کیا جائے۔ اس میں یہ بات بھی داخل ہے کہ جتنا معاوضہ طلب کیا جائے، وہ عرف کے مطابق ہو، یہ نہ ہو کہ اتنا مطالبہ کرلیا جائے جو عرف کے لحاظ سے بہت زیادہ ہو۔ اور دوسری طرف قاتل سے یہ کہا گیا ہے کہ ادائیگی اس کا کام ہے، وہ ادائیگی بھی خوش اسلوبی سے کرے۔ یہ نہ ہو کہ ادائیگی کرتے وقت ادائیگی تو کردی، لیکن اس کے بعد ان کے ساتھ مزید دشمنی گانٹھ لی جائے اور اس کے بعد ان سے کوئی اور زیادتی کی جائے، لہٰذا دونوں فریق شرافت کے ساتھ یہ خون بہا کا لین دین کرسکتے ہیں۔

• قصاص کے بجائے خوں بہا لینے کی حکمت اور اس کے فوائد

پھر آگے اسی خون بہا کی حکمت بیان کرتے ہوئے باری تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ﴿ذٰلِكَ تَخْفِيْفٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ﴾ یہ (خون بہا کی جو اجازت دی گئی ہے یہ) تمہارے پروردگار کی طرف سے ایک آسانی پیدا کی گئی ہے، ﴿وَ رَحْمَةٌ﴾ ''اور یہ ایک رحمت ہے۔'' ورنہ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ قتل کی سزا قتل ہی ہوتی، لیکن تمہارے

پروردگار نے اس میں اپنی رحمت سے آسانی پیدا کردی ہے اور تم معاف کیے جانے کی صورت میں اس کے بدلے میں رقم بھی ادا کر سکتے ہو۔

اس طرح اللہ تعالیٰ نے ایک ایسا راستہ بھی بتادیا ہے کہ قتل در قتل، باہمی دشمنیوں اور دو خاندانوں کے درمیان ہمیشہ جنگ کی فضا قائم رکھنے کے بجائے وہ آپس میں کچھ صلح کرلیں اور یہ سوچیں کہ جس کی جان جانی تھی وہ تو چلی گئی، اب ہم آپس میں ایسا معاملہ کرلیتے ہیں جس سے ہماری دشمنی ختم ہوجائے اور جو غلطی ہوئی ہے اس کی تلافی بھی ہوجائے۔ اس طرح کرنے کے نتیجے میں بعض اوقات دو خاندان، جن میں مستقل دشمنی چلی آتی تھی، اُن کے درمیان دوستیاں قائم ہوجاتی ہیں۔

اس کا ایک مشاہدہ بعض اوقات یہ بھی ہوا ہے کہ بہت سے خاندانوں میں خون بہا کی ادائیگی کے بعد آپس میں تعلقات بہتر ہوگئے اور تعلقات بہتر ہونے کے نتیجے میں ان کے درمیان آپس میں شادی بیاہ بھی ہوئے اور وہ جو دشمنی کی آگ سی بھڑکی ہوئی تھی وہ ٹھنڈی پڑگئی، یہ اللہ تبارک و تعالیٰ کی طرف سے ایک رحمت ہے۔

• خوں بہا لینے کے بعد کوئی زیادتی جائز نہیں

پھر اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہ بھی فرمایا کہ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ مقتول کے ورثاء نے خوں بہا کا مطالبہ کیا اور خوں بہا لے بھی لیا، لیکن خوں بہا لے کر بھی ان کے انتقام کی آگ ٹھنڈی نہیں ہوئی اور وہ خوں بہا لینے کے باوجود قاتل کے پیچھے پڑے رہے اور اس کے ساتھ کوئی نہ کوئی زیادتی کرتے رہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جب تم نے خوں بہا پر راضی ہوکر اس کے قتل کو ایک طرح سے معاف کردیا، تو اب تمہارے لیے جائز نہیں ہے کہ تم کوئی زیادتی کرو اور اسے پھر کوئی اور نقصان پہنچاؤ۔ چنانچہ فرمایا: ﴿فَمَنِ اعْتَدٰى بَعْدَ ذٰلِكَ﴾ اس کے بعد بھی کوئی زیادتی کرے ﴿فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۷۸﴾﴾ ”تو وہ دردناک عذاب کا مستحق ہے۔“

• قصاص کے عادلانہ حکم پر عقل پرستوں کے اعتراض

پھر آخر میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے ایک مختصر جملے میں قصاص کے حکم کی بڑی جامع حکمت ومصلحت بیان کرتے ہوئے فرمایا: ﴿وَ لَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰۤاُولِي الْاَلْبَابِ﴾ ”اور اے عقل رکھنے والو! تمہارے

لیے قصاص میں زندگی کا سامان ہے۔'' یہ جملہ اس لیے فرمایا کہ بعض اوقات کسی کے دل میں یہ خیال پیدا ہوجاتا ہے اور آج کل اس کا بڑا چرچا ہے کہ ایک آدمی کی جان تو چلی گئی اور اس کے خاندان والوں کو اس کا صدمہ بھی بہت ہوا اور ان کا نقصان بھی ہوا، لیکن اب اگر قاتل کی جان بھی لے لی جائے تو قاتل کی جان لینے سے ایک اور خاندان برباد ہو جائے گا، اس لیے بعض لوگ یہ بات کہتے ہیں کہ ایک آدمی کی جان تو چلی گئی، اب قاتل کو کیوں قتل کیا جائے؟ اس طرح تو دو جانوں کا نقصان ہو جائے گا!

اسی وجہ سے آج کل یہ آوازیں مختلف حلقوں سے اٹھتی رہتی ہیں کہ قاتل کو قتل کرنے کا قانون منسوخ کیا جائے، سزائے موت کے قانون (capital panishment) کو ختم کیا جائے۔ ان سب باتوں کو رد کرنے کے لیے اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہاں قصاص کے حکم کی ایک بڑی عظیم حکمت بیان فرمائی کہ ﴿وَ لَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰۤاُولِي الْاَلْبَابِ﴾ ''اور اے عقل والو! تمہارے لیے قصاص میں زندگی کا سامان ہے،'' یعنی بظاہر تو قصاص میں ایک آدمی کی جان لی جارہی ہے، لیکن اس کا انجام اور اس کا نتیجہ زندگی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے، اس لیے کہ اگر آپ نے قصاص نہ لیا تو ایک طرف تو قاتلوں کو کھلی چھوٹ مل جائے گی اور وہ ہر طرف فساد مچاتے پھریں گے، کیونکہ انہیں پتہ ہوگا کہ ہم کسی کو بھی قتل کرتے پھریں ہمیں کوئی پوچھنے والا نہیں، ہمیں اپنی جان کا کوئی خطرہ لاحق نہیں۔

اور دوسری طرف یہ ہوگا کہ جو مقتول کے ورثاء ہیں، انہیں جب قانونی طور پر اپنے انتقام کی آگ ٹھنڈی کرنے کا موقع نہیں ملے گا تو وہ قانون ہاتھ میں لے کر اپنا انتقام لیں گے اور پھر اس میں کوئی حد قائم نہیں رکھ سکیں گے۔ جیسا کہ جاہلیت میں ہوتا تھا کہ قتل ایک آدمی ہوا، لیکن مقتول کے وارثوں نے دس آدمی قتل کردیے۔ جب قانون کسی جائز مطالبے کو تسکین نہ دے سکے تو پھر لاقانونیت پھیلتی ہے اور اس لاقانونیت کے نتیجے میں قتل و غارت گری اور فتنہ وفساد میں اور زیادہ اضافہ ہوتا ہے۔

• مختصر جملے میں حکمِ قصاص کی حکمت کا انتہائی جامع بیان

قرآنِ کریم فرماتا ہے کہ ﴿وَ لَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰۤاُولِي الْاَلْبَابِ﴾ ''اور تمہارے لیے قصاص کے احکام میں زندگی کا سامان ہے۔'' یہاں پر ''يّٰۤاُولِي الْاَلْبَابِ'' کہہ کر متوجّہ کردیا کہ ذرا عقل سے سوچو گے تو تمہیں اس میں زندگی کا سامان نظر آئے گا، لہٰذا یہ سمجھنا کہ اس اقدام کے ذریعے ہم نے کسی دوسرے شخص کی جان لے لی ہے، یہ بالکل غلط بات ہے۔

قصاص کے حکم کی حکمت بیان کرنے والا یہ جملہ ''وَ لَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ'' قرآنِ کریم نے بڑے بلیغ انداز میں ارشاد فرمایا ہے۔ جاہلیت میں بھی قصاص کی تعریف اور اہمیت میں کئی جملے مشہور تھے اور یہ کہا جاتا تھا کہ:

اَلْقَتْلُ أَنْفٰى لِلْقَتْلِ

قتل کرنا قتل کی روک تھام کا ذریعہ بنتا ہے۔

اسی طرح کے بعض اور جملے بھی مشہور تھے، لیکن جب قرآنِ کریم کا یہ بلاغت اور معنویت سے بھرپور جملہ آیا کہ ﴿وَ لَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ﴾ تو وہ سارے مقولے جو جاہلیت میں کہے جاتے تھے، وہ سب اس کی بلاغت کے آگے سجدہ ریز نظر آنے لگے۔ اس میں بتا دیا گیا کہ قصاص کا حکم اگرچہ بظاہر مشکل نظر آتا ہے، لیکن عقلمند لوگ سمجھ سکتے ہیں کہ یہ حکم زندگی کا ذریعہ ہے، کیونکہ جب قصاص کا خوف ہوگا تو ہر شخص کسی کو قتل کرنے سے رکے گا تو اس طرح نہ صرف دونوں کی جان محفوظ رہے گی، بلکہ اس کے نتیجے میں دونوں کے قبیلے بھی قتل وقتال سے محفوظ رہیں گے، اس لیے اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس حکم کو سراپا زندگی قرار دیا۔ پھر آگے یہ بھی ارشاد فرما دیا کہ ﴿لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۱۷۹﴾﴾ ''امید ہے کہ تم تقویٰ سے کام لو گے'' اور تقویٰ کا تقاضا یہی ہے کہ قصاص کے جو احکام جن حدود کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں، تم ان پر عمل کرو گے۔

• خود قصاص لینے کا کسی کو اختیار حاصل نہیں

یہاں یہ بات واضح رہنی چاہیے کہ قصاص لینے کا حق اگرچہ مقتول کا ہے، مگر باجماعِ اُمّت انہیں اپنا یہ حق خود وصول کرنے کا اختیار نہیں کہ خود ہی قاتل کو مار ڈالیں، بلکہ اس حق کو حاصل کرنے کے لیے سلطانِ مسلم یا اس کے کسی نائب کا حکم ہونا ضروری ہے۔ کیونکہ قصاص کس صورت میں واجب ہوتا ہے، کس صورت میں نہیں؟ اس کی جزئیات دقیق ہیں، جن کو ہر شخص معلوم نہیں کرسکتا، اس کے علاوہ مقتول کے اولیاء غصے سے مغلوب ہوکر کوئی زیادتی بھی کر سکتے ہیں۔ اس لیے باتفاقِ علمائے اُمّت حقِ قصاص حاصل کرنے کے لیے اسلامی حکومت کی طرف رجوع کرنا ضروری ہے۔[1]

---

(۱) كما في تفسير القرطبي (۲/۲٤٥) "لا خلاف أن القصاص في القتل لا يقيمه إلا أولو الأمر، فرض عليهم النهوض بالقصاص وإقامة الحدود وغير ذلك، لأن الله سبحانه خاطب جميع المؤمنين بالقصاص، ثم لا يتهيأ للمؤمنين جميعا أن يجتمعوا على القصاص، فأقاموا السلطان مقام أنفسهم في إقامة القصاص وغيره من الحدود."

آیت نمبر ۱۸۰ تا ۱۸۲

كُتِبَ عَلَيْكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ اِنْ تَرَكَ خَيْرَا ۖ الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۸۰﴾ فَمَنْۢ بَدَّلَهٗ بَعْدَ مَا سَمِعَهٗ فَاِنَّمَآ اِثْمُهٗ عَلَى الَّذِيْنَ يُبَدِّلُوْنَهٗ ۭ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۸۱﴾ فَمَنْ خَافَ مِنْ مُّوْصٍ جَنَفًا اَوْ اِثْمًا فَاَصْلَحَ بَيْنَهُمْ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۸۲﴾ ع ۲۲/۶

تم پر فرض کیا گیا ہے کہ اگر تم میں سے کوئی اپنے پیچھے مال چھوڑ کر جانے والا ہو تو جب اس کی موت کا وقت قریب آجائے، وہ اپنے والدین اور قریبی رشتہ داروں کے حق میں دستور کے مطابق وصیت کرے۔ یہ متقی لوگوں کے ذمے ایک لازمی حق ہے۔ (۱۸۰) پھر جو شخص اِس وصیت کو سننے کے بعد اس میں کوئی تبدیلی کرے گا، تو اس کا گناہ ان لوگوں پر ہوگا جو اس میں تبدیلی کریں گے۔ یقین رکھو کہ اللہ (سب کچھ) سنتا جانتا ہے۔ (۱۸۱) ہاں اگر کسی شخص کو یہ اندیشہ ہو کہ کوئی وصیت کرنے والا بے جا طرف داری یا گناہ کا اِرتکاب کر رہا ہے اور وہ متعلقہ آدمیوں کے درمیان صلح کرا دے تو اُس پر کوئی گناہ نہیں۔ بے شک اللہ تعالیٰ بہت بخشنے والا، بڑا مہربان ہے۔ (۱۸۲)

وصیت سے متعلق شرعی احکام

قصاص کا حکم بیان کرنے کے بعد اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان تین آیتوں میں وصیت کا حکم بیان فرمایا ہے اور جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا تھا کہ ایک انسان کی زندگی میں دو چیزیں خاص طور پر حرمت رکھتی ہیں، ایک اس کی جان اور دوسرا اس کا مال۔ جان کے بارے میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے پچھلی آیتوں میں قصاص کے احکام عطا فرمائے اور مال کے سلسلے میں خاص طور پر یہاں وصیت کا ذکر فرمایا۔ وصیت کا لفظ بعض اوقات نصیحت کے معنیٰ میں بھی استعمال ہوتا ہے، لیکن اصطلاح میں اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ کوئی شخص اپنے مرنے کے بعد کے لیے اپنے ورثاء یا تعلق والوں یا حکومت سے کسی بات کی فرمائش کرے۔ یہاں ہر اُس شخص پر وصیت

کرنا فرض قرار دیا گیا ہے، جسے یہ خیال ہو کہ میری موت کا وقت قریب آ رہا ہے۔ یہ آیت اُس دور میں نازل ہوئی تھی جب اللہ تبارک وتعالیٰ نے مرنے والے کے ترکے میں وارثوں کے حصے ابھی متعین نہیں فرمائے تھے، چنانچہ اس وقت یہ ہوتا تھا کہ کسی کے مرنے کے بعد سارا ترکہ اس کے لڑکوں کو مل جاتا تھا۔

اس آیتِ کریمہ نے یہ فرض قرار دیا کہ ہر انسان مرنے سے پہلے اپنے والدین اور دوسرے رشتے داروں کے حق میں وصیت کر کے جائے، یعنی یہ بتائے کہ اس کے مال میں سے کتنا حصہ والدین کو اور کتنا حصہ کسی دوسرے رشتے داروں کو دیا جائے گا۔ بعد میں سورۂ نساء کی آیات؛ نمبر ۱۱ سے لے کر ۱۴ تک نازل ہوئیں، ان آیتوں میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے تمام وارثوں کی تفصیل اور ان کے حصے خود مقرّر فرما دیے۔ سورۂ نساء کی آیات نازل ہونے کے بعد جس وصیت کا اس آیت میں ذکر ہے وہ فرض تو نہیں رہی، البتہ اگر کسی شخص کے ذمے کوئی حق ہو، مثلاً اس کے ذمے کسی کا قرض واجب ہے یا اس نے کسی کے کچھ پیسے دینے ہیں تو اس کی وصیت کرنا اب بھی فرض ہے۔

اس کے علاوہ جو لوگ شرعی اعتبار سے وارث نہیں ہیں، یعنی جن کا ذکر اُس فہرست میں نہیں آیا جو اللہ تبارک وتعالیٰ نے سورۂ نساء کی آیات میں نازل فرمائی ہے، تو ان کے لیے اپنے ترکہ کے ایک تہائی کی حد تک وصیت کرنا اب بھی جائز، بلکہ بعض حالات میں مستحب ہے، کیونکہ بعض رشتے دار ایسے ہوتے ہیں جو براہِ راست تو وارث نہیں ہوتے، لیکن ان کے ساتھ خصوصی تعلق ہوتا ہے یا وہ محتاج ہوتے ہیں تو ان کے حق میں وصیت کرنا اب بھی مستحب ہے، لیکن یہ وصیت کل ترکے کے ایک تہائی کے اندر اندر ہونی چاہیے اور بہتر یہ ہے کہ ایک تہائی سے کچھ تھوڑا کم ہو۔ (۱)

اس آیتِ مبارکہ میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے پہلے یہ فرمایا: ﴿كُتِبَ عَلَيْكُمْ﴾ ''تمہارے اوپر فرض کیا گیا ہے۔'' کب فرض کیا گیا ہے؟ ﴿اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ﴾ ''جب تم میں سے کسی کی موت کا وقت قریب آجائے۔'' اور کیا فرض کیا گیا ہے؟ ﴿اِنْ تَرَكَ خَيْرَا ۨ الْوَصِيَّةُ﴾ ''اگر اس نے کوئی مال چھوڑا ہو، تو وصیت کرنا فرض کیا گیا ہے۔'' کس کے لیے وصیت کرنا فرض کیا گیا ہے؟ ﴿لِلْوَالِدَيْنِ وَ الْاَقْرَبِيْنَ﴾ ''والدین اور اقرباء،'' یعنی قریبی رشتے داروں کے لیے ﴿بِالْمَعْرُوْفِ﴾ ''دستور کے مطابق،'' یعنی عام طور سے اپنے خاص رشتہ داروں سے متعلق وصیت کرنے کا جو دستور رائج ہو، اس دستور کے مطابق وصیت کرنا

---

(۱) لما في الاختيار لتعليل المختار (٤٦/٥) (ويستحب أن ينقص من الثلث) لقوله عليه السلام "والثلث كثير".

فرض قرار دیا گیا ہے اور ساتھ میں یہ بھی فرمادیا گیا تھا کہ ﴿حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۸۰﴾﴾ ''یہ وصیت کرنا متقی لوگوں کے لیے ایک لازمی حق ہے۔''

جیسا کہ عرض کیا گیا، یہ اُس وقت کی بات ہے جب اللہ تعالیٰ نے خود رشتے داروں کے حقوق متعین نہیں کیے تھے اور ان کے حصے نہیں بتائے تھے تو اس وقت ان کے ذمے اسے لازم قرار دیا گیا تھا، لیکن میراث کے احکام آنے کے بعد اب یہ لازمی حق نہیں رہا۔ حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

إِنَّ اللهَ قَدْ أَعْطَى كُلَّ ذِي حَقٍّ حَقَّهُ فَلَا وَصِيَّةَ لِوَارِثٍ (۱)

اللہ تعالیٰ نے ہر ایک حق والے کو اس کا حق دے دیا ہے۔ اس لیے اب کسی وارث کے حق میں وصیت جائز نہیں۔

مرنے والے کی وصیت میں تبدیلی کرنا جائز نہیں

عام طور پر ہوتا یہ ہے کہ جس وقت انسان وصیت کر رہا ہوتا ہے تو اس وقت میں کچھ لوگ اس کے آس پاس موجود ہوتے ہیں، وصیت کرنے کے بعد اس کا انتقال ہوگیا اور اب اس بارے میں سوال پیدا ہوا کہ اس نے کیا وصیت کی تھی؟ تو جو لوگ اس وصیت کے گواہ تھے وہ بعض اوقات اس کی وصیت میں اپنی خواہشات کے مطابق کچھ تبدیلی کردیتے ہیں، مثلاً کسی رشتے دار کے لیے اس نے وصیت نہیں کی تھی، مگر وہ چاہتے تھے کہ اس کے لیے وصیت کی جائے تو انہوں نے مرنے والے کی وصیت بتاتے ہوئے اس رشتے دار کا اضافہ کردیا یا کسی رشتے دار کے لیے اس نے مال کی جو مقدار متعین کی تھی اس میں کمی یا زیادتی کردی۔ اللہ تعالیٰ آگے اسی بات کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ﴿فَمَنْۢ بَدَّلَهٗ بَعْدَ مَا سَمِعَهٗ﴾ ''پھر اس وصیت کو سننے کے بعد جو شخص اس میں کوئی تبدیلی کرے گا،'' یعنی لوگوں کو اپنی طرف سے کوئی تبدیلی کرکے بتائے گا کہ مرنے والے نے یہ وصیت کی تھی، حالانکہ اس کی وصیت کچھ اور تھی تو ﴿فَاِنَّمَآ اِثْمُهٗ عَلَى الَّذِيْنَ يُبَدِّلُوْنَهٗ﴾ ''اس کا گناہ ان لوگوں پر ہوگا جو اس میں تبدیلی کریں گے۔'' بتلادیا کہ وصیت میں اس قسم کی تبدیلی کرنا اللہ تبارک وتعالیٰ کے نزدیک بہت بڑا جرم اور بہت بڑا گناہ ہے۔

---

(۱) أخرجه أبو داود في "سننه" (۳/۱۱۵) (۲۸۸۲) من حديث أبي أمامة، وأورده المنذري في "مختصره" (۳/۴۸) (۲۷۵۰) وقال: "وفي إسناده إسماعيل بن عياش، وقد اختلف في الاحتجاج بحديثه، ومنهم من ذكر أن حديثه عن أهل الحجاز وأهل العراق ليس بذاك، وأن روايته عن أهل الشام أصح، وهذا الحديث من روايته عن أهل الشام."

کسی حکم پر عمل کروانے کے لیے قرآنِ کریم کا خاص اسلوب

مرنے والے کی وصیت میں تبدیلی نہ کرنے کا یہ حکم بیان کرنے کے بعد آخر میں یہ بھی فرمادیا کہ ﴿اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۸۱﴾﴾ ''یاد رکھو اللہ تعالیٰ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے،'' لہٰذا یہ نہ سمجھنا کہ وصیت کرنے والے نے جب وصیت کی تھی تو ہمارے سوا کوئی اور موجود نہیں تھا، لہٰذا ہم جو کچھ کہیں گے اس بات کی تصدیق کرلی جائے گی۔ اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتے ہیں کہ اور کوئی موجود ہو یا نہ ہو، لیکن اس بات کو ہمیشہ یاد رکھنا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ خوب اچھی طرح تمہاری بات سن بھی رہا تھا اور اسے علم بھی ہے کہ حقیقی وصیت کیا تھی اور تم نے اس میں کیا تبدیلی کی ہے۔

یہ قرآنِ کریم میں اللہ تبارک وتعالیٰ کا خاص طریقہ اور اسلوب ہے کہ جب کوئی حکم بیان فرماتے ہیں تو اس طرف متوجہ کرتے ہیں کہ اس حکم پر صحیح صحیح عمل اس وقت ہوگا جب انسان اس بات کا اپنے دل میں دھیان رکھے کہ وہ ہر وقت اللہ تعالیٰ کی نظر میں ہے، وہ جو کچھ کر رہا ہے اسے بھی اللہ تعالیٰ دیکھ رہے ہیں اور وہ جو بات بھی زبان سے نکال رہا ہے اسے بھی اللہ تعالیٰ سن رہے ہیں۔

جب انسان کے دل میں یہ احساس پیدا ہوتا ہے تو اسی کا نام ''تقویٰ'' ہے۔ پھر انسان چاہے جنگل کی تنہائی میں ہو یا رات کی تاریکی میں ہو، ہر حالت میں وہ صحیح رویّہ اختیار کرتا ہے، کیونکہ اسے اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ میرے ہر کام کو دیکھ بھی رہا ہے اور میری ہر بات کو سن بھی رہا ہے۔ اس تصور کے ساتھ اس کے دل میں اللہ تعالیٰ کے دیے ہوئے حکم کے مطابق عمل کرنے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے، پھر وہ اس کے مطابق عمل کرتا ہے اور اس کی خلاف ورزی نہیں کرتا۔

خیر خواہی کی وجہ سے وصیت میں تبدیلی کی صورت

پہلے کہا گیا کہ وصیت میں تبدیلی نہ کرو، لیکن بعض اوقات وصیت میں تبدیلی کوئی آدمی بد نیتی سے نہیں، بلکہ نیک نیتی سے کرتا ہے اور وہ نیک نیتی یہ ہوتی ہے کہ وہ سمجھتا ہے کہ مثلاً فلاں رشتے دار واقعۃً اس بات کا مستحق تھا کہ اس کے لیے بھی کوئی وصیت کی جاتی، مگر مرنے والے نے اس کے لیے وصیت نہیں کی یا مثلاً کسی شخص کے دل میں خیال ہوتا ہے کہ جتنی مقدار مال کی اس نے کسی خاص رشتے دار کے حق میں قرار دی ہے، یہ مقدار کم ہے اور اسے زیادہ ملنی چاہیے۔ اس خیال کے پیدا ہونے کی وجہ سے بعض اوقات وہ سوچتا ہے کہ

جانے والا تو چلا گیا، لیکن میں اب اس وصیت میں اس طرح تبدیلی کردوں کہ وہ صحیح طریقے کے مطابق ہوجائے اور حق دار کو اس کا حق مل جائے تو یہاں وہ جو وصیت میں تبدیلی کرنا چاہ رہا ہے، وہ بدنیتی کی وجہ سے نہیں، بلکہ نیک نیتی کی وجہ سے اور کسی شخص کی خیر خواہی کی وجہ سے ایسا کرتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اس قسم کی صورتِ حال میں خود ایک طریقہ بتادیا کہ اگر تمہیں یہ خیر خواہی کرنی ہے تو وہ خیر خواہی وصیت کرنے والے کے مرنے کے بعد نہیں، بلکہ جب وہ زندہ ہے اور جس وقت اس نے وصیت کی ہے، اس وقت اس کی زندگی میں ہی اس کے مرنے سے پہلے ہی اسے سمجھا دو، اسے تنبیہ کر دو اور یہ بتا دو کہ آپ نے جو فلاں شخص کے لیے وصیت کی ہے، اس میں یہ کمی رہ گئی ہے، ایسا کرنے میں کوئی حرج نہیں، بلکہ یہ خیر خواہی کی بات ہے، چنانچہ فرمایا: ﴿فَمَنْ خَافَ مِنْ مُّوْصٍ جَنَفًا اَوْ اِثْمًا﴾ ''ہاں! اگر کسی شخص کو یہ اندیشہ ہو کہ کوئی وصیت کرنے والا بے جا طرفداری یا گناہ کا ارتکاب کر رہا ہے۔'' ''جَنَفًا'' کے معنیٰ کسی طرف مائل ہونا یا کسی کی بے جا طرف داری کرنا، مطلب یہ کہ وہ کسی کی اس طرح بے جا طرفداری کر رہا ہے کہ کوئی شخص فی الواقع اتنا وصیت کا مستحق نہیں تھا، لیکن اس نے اس کے حق میں وصیت کر دی ہے، ﴿اَوْ اِثْمًا﴾ ''یا گناہ کا ارتکاب کر رہا ہے،'' یعنی کسی ایسے شخص کے حق میں وصیت کر رہا ہے جو درحقیقت اس کی وصیت کا مستحق ہی نہیں تھا، یا اس مقدار میں مستحق نہیں تھا جس مقدار میں اس کے لیے وصیت کی گئی ہے۔ اگر کسی کو ان باتوں کا اندیشہ ہو تو ﴿فَاَصْلَحَ بَيْنَهُمْ﴾ ''پھر وہ متعلقہ آدمیوں کے درمیان صلح کرادے،'' یعنی متعلقہ آدمیوں کے حق میں خیر خواہی کرتے ہوئے اس کا جو صحیح راستہ ہے وہ وصیت کرنے والے کو بتادے۔

پھر وہ وصیت کرنے والا خود اپنی وصیت میں اس مشورے کے مطابق تبدیلی کردے، ﴿فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ﴾ تو ایسا کرنے والے کے لیے کوئی گناہ نہیں، ﴿اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۸۲﴾﴾ ''بے شک اللہ تعالیٰ بہت بخشنے والا بڑا مہربان ہے،'' یعنی جس وصیت کرنے والے نے وصیت کرتے وقت اگر کسی کی بے جا طرفداری کی تھی یا کسی کو خوامخواہ محروم کرنے کی کوشش کی تھی اور بعد میں اِس بیچ والے آدمی کی صلاح کی بنا پر اس نے اس میں تبدیلی کرلی تو پہلے اگرچہ اس نے طرف داری یا گناہ کا ارتکاب کیا تھا، لیکن اسے اللہ تعالیٰ معاف فرمادیں گے، کیونکہ اللہ تعالیٰ ''غَفُوْرٌ'' ہیں، یعنی بہت بخشنے والے ہیں اور ''رَّحِيْمٌ'' ہیں، یعنی بڑے مہربان ہیں۔

روزوں کی فرضیت، مقصد اور احکام

آیت نمبر ۱۸۳ تا ۱۸۷

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ
قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۱۸۳﴾ اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ ؕ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا
اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ ؕ وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ
طَعَامُ مِسْكِيْنٍ ؕ فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ ؕ وَاَنْ تَصُوْمُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ
اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۸۴﴾ شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى
لِّلنَّاسِ وَ بَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ ۚ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ
فَلْيَصُمْهُ ؕ وَمَنْ كَانَ مَرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ ؕ يُرِيْدُ
اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ ز وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ
عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۱۸۵﴾ وَ اِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَاِنِّيْ
قَرِيْبٌ ؕ اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ ۙ فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لِيْ وَلْيُؤْمِنُوْا بِيْ
لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُوْنَ ﴿۱۸۶﴾ اُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ اِلٰى نِسَآئِكُمْ ؕ هُنَّ
لِبَاسٌ لَّكُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ ؕ عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَكُمْ
فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَعَفَا عَنْكُمْ ۚ فَالْـٰٔنَ بَاشِرُوْهُنَّ وَابْتَغُوْا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ ۠
وَكُلُوْا وَاشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ
مِنَ الْفَجْرِ ۠ ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى الَّيْلِ ۚ وَلَا تُبَاشِرُوْهُنَّ وَاَنْتُمْ

عٰكِفُوْنَ ۙ فِي الْمَسٰجِدِ ۭ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَقْرَبُوْهَا ۭ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ۝۱۸۷

اے ایمان والو! تم پر روزہ فرض کر دیا گیا ہے، جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر فرض کیا گیا تھا، تاکہ تمہارے اندر تقویٰ پیدا ہو۔ ۝۱۸۳ گنتی کے چند دِن روزے رکھنے ہیں۔ پھر بھی اگر تم میں سے کوئی شخص بیمار ہو یا سفر پر ہو تو وہ دوسرے دنوں میں اتنی ہی تعداد پوری کرلے، اور جو لوگ اس کی طاقت رکھتے ہوں اُن کے ذمے یہ ہے کہ وہ ایک مسکین کو کھانا کھلا کر (روزے کا) فدیہ ادا کردیں۔ اس کے علاوہ اگر کوئی شخص اپنی خوشی سے کوئی نیکی کرے، تو یہ اس کے حق میں بہتر ہے۔ اور اگر تم کو سمجھ ہو تو روزے رکھنے میں تمہارے لیے زیادہ بہتری ہے۔ ۝۱۸۴ رمضان کا مہینہ وہ ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا جو لوگوں کے لیے سراپا ہدایت اور ایسی روشن نشانیوں کا حامل ہے جو صحیح راستہ دِکھاتی اور حق و باطل کے درمیان دوٹوک فیصلہ کردیتی ہیں، لہٰذا تم میں سے جو شخص بھی یہ مہینہ پائے، وہ اس میں ضرور روزہ رکھے، اور اگر کوئی شخص بیمار ہو یا سفر پر ہو تو وہ دوسرے دنوں میں اتنی ہی تعداد پوری کرلے۔ اللہ تمہارے ساتھ آسانی کا معاملہ کرنا چاہتا ہے، اور تمہارے لیے مشکل پیدا کرنا نہیں چاہتا، تاکہ (تم روزوں کی) گنتی پوری کرلو، اور اللہ نے تمہیں جو راہ دِکھائی اس پر اللہ کی تکبیر کہو اور تاکہ تم شکر گزار بنو۔ ۝۱۸۵ اور (اے پیغمبر!) جب میرے بندے آپ سے میرے بارے میں پوچھیں تو (آپ ان سے کہہ دیجیے کہ) میں اتنا قریب ہوں کہ جب کوئی مجھے پکارتا ہے تو میں پکارنے والے کی پکار سنتا ہوں، لہٰذا وہ بھی میری بات دِل سے قبول کریں، اور مجھ پر اِیمان لائیں، تاکہ وہ راہِ راست پر آجائیں۔ ۝۱۸۶ تمہارے لیے حلال کردیا گیا ہے کہ روزوں کی رات میں تم اپنی بیویوں سے بے تکلّف صحبت کرو۔ وہ تمہارے لیے لباس ہیں، اور تم اُن کے لیے لباس ہو۔ اللہ کو علم تھا کہ تم اپنے آپ سے خیانت کر رہے تھے، پھر اس نے تم پر عنایت کی اور تمہاری غلطی معاف فرمادی، چنانچہ اب تم ان سے صحبت کرلیا کرو، اور جو کچھ اللہ نے تمہارے لیے لکھ رکھا ہے اسے طلب کرو،

اور اس وقت تک کھاؤ پیو جب تک صبح کی سفید دھاری سیاہ دھاری سے ممتاز ہو کر تم پر واضح (نہ) ہو جائے۔ اس کے بعد رات آنے تک روزے پورے کرو۔ اور ان (اپنی بیویوں) سے اس حالت میں مباشرت نہ کرو جب تم مسجدوں میں اِعتکاف میں بیٹھے ہو۔ یہ اللہ کی (مقرّر کی ہوئی) حدود ہیں، لہٰذا اِن (کی خلاف ورزی) کے قریب بھی مت جانا۔ اسی طرح اللہ اپنی نشانیاں لوگوں کے سامنے کھول کھول کر بیان کرتا ہے، تاکہ وہ تقویٰ اختیار کریں۔ ﴿۱۸۷﴾

• روزوں کی فرضیت کا حکم اور ایک تسلّی کا جملہ

سورۂ بقرہ کی یہ آیات روزے اور اس کے کچھ احکام پر مشتمل ہیں اور جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا تھا، سورۂ بقرہ میں اب مختلف احکام کا ذکر آرہا ہے، جن میں سے بعض کا تعلق عبادتوں سے ہے، جبکہ بعض کا تعلق معاملات سے یا معاشرت سے ہے۔ یہاں عبادات میں سے روزے کے احکام بیان کیے گئے ہیں اور اسے اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس طرح شروع فرمایا کہ ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ اے ایمان والو! ﴿كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ﴾ تم پر روزہ فرض کر دیا گیا ہے ﴿كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ﴾ ''جیسے کہ تم سے پہلے کے لوگوں پر بھی فرض کیا گیا تھا۔'' یہ بتادیا کہ یہ تمہیں کوئی نیا حکم نہیں دیا جارہا جو دوسری امتوں کو نہ دیا گیا ہو، یا دوسرے پیغمبر وہ حکم لے کر نہ آئے ہوں، بلکہ تم سے پہلے جو اُمتیں گزری ہیں انہیں بھی کسی نہ کسی شکل میں، کسی نہ کسی زمانے میں روزوں کے احکام عطا فرمائے گئے تھے۔

یہاں ''عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ'' کے الفاظ عام ہیں جو حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک، تمام شریعتوں اور امتوں کو شامل ہیں، اس عموم سے معلوم ہوا کہ جس طرح نماز کی عبادت سے کوئی اُمّت خالی نہیں رہی اسی طرح روزہ بھی ہر شریعت میں فرض رہا ہے۔

• روزوں کی فرضیت کی حکمت اور اصلی مقصود

پھر آگے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۱۸۳﴾﴾ ''تاکہ تمہارے اندر تقویٰ پیدا ہو۔'' یہاں اللہ تعالیٰ نے روزوں کی فرضیت کی حکمت بیان فرمائی کہ بظاہر تو روزہ رکھنے میں انسان کے لیے تکلیف اور مشقت ہے، کیونکہ اسے کھانے پینے سے رکنا پڑتا ہے۔ بھوک لگتی ہے لیکن کھا نہیں سکتا، پیاس لگتی ہے مگر پی

نہیں سکتا۔اسی طرح وہ اپنی جنسی خواہشات کو بھی روزے کی حالت میں پورا نہیں کرسکتا، لہٰذا بظاہر تو یہ مشقت کی بات ہے، لیکن اللہ تبارک وتعالیٰ فرمارہے ہیں کہ یہ روزے ہم نے تم پر اس لیے فرض کیے ہیں تا کہ تمہارے اندر تقویٰ پیدا ہو، معلوم ہوا کہ روزے کا اصل مقصود انسان کے اندر تقویٰ پیدا کرنا ہے۔

''تقویٰ'' کے معنیٰ یہ ہوتے ہیں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے سامنے جوابدہی سے ڈر کر انسان اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے بچے، یعنی انسان کو ہر وقت یہ خیال رہے کہ میرا اللہ مجھے دیکھ رہا ہے، ایک دن مجھے اس کے سامنے پیش ہونا ہے اور اپنے سارے اعمال کا جواب بھی دینا ہے۔ اس بات کا احساس ہو تو انسان اللہ تعالیٰ کے احکام کی نافرمانی نہیں کرتا، اسی کو تقویٰ کہتے ہیں۔

- **روزہ؛ تقویٰ پیدا کرنے کا بہترین ذریعہ**

روزہ انسان میں تقویٰ پیدا کرنے اور اپنے نفس پر قابو پانے کا بہترین ذریعہ ہے اور یہ اس لیے کہ اس دنیا میں جتنی نافرمانیاں، جتنے گناہ یا جتنے جرائم سرزد ہوتے ہیں تو وہ درحقیقت اس وجہ سے ہوتے ہیں کہ انسان اپنی نفسانی خواہشات کے پیچھے چل پڑتا ہے، دل نے جو چاہا انسان وہی کر گزرا اور اسے اس بات کا احساس نہیں ہوتا کہ جو کام میں اپنی خواہشِ نفس کی خاطر کر رہا ہوں وہ اللہ تعالیٰ کو ناراض کرنے والا ہے اور یہ مجھے نہیں کرنا چاہیے۔ اکثر اوقات انسان اپنے نفس کی اس خواہش کے ہاتھوں اتنا مغلوب ہوجاتا ہے کہ وہ اس پر غالب آجاتی ہے اور باجودیکہ وہ جانتا ہے کہ یہ کام جو میں کرنے جارہا ہوں، یہ کوئی اچھا کام نہیں ہے، گناہ کا کام ہے، لیکن وہ خواہشات کے آگے ہتھیار ڈال دیتا ہے اور خواہشات کو اپنے اوپر غالب کرلیتا ہے، اس کے نتیجے میں گناہ کا ارتکاب کرتا ہے۔

روزے میں اللہ تبارک وتعالیٰ انسان کو خواہشات پر قابو پانے کی تربیت دیتے ہیں اور اسے ایک ٹریننگ کورس سے گزارتے ہیں، چنانچہ اس کا ایک عام مشاہدہ ہر انسان کرسکتا ہے کہ جو مسلمان بھی صبح کو ایک مرتبہ روزہ رکھ لیتا ہے، اب وہ سارا دن کھانے پینے سے پرہیز کرتا ہے۔ یہ بات ہر روزہ دار کے بارے میں دیکھی جاسکتی ہے، مثلاً کسی روزہ دار کو شدید بھوک لگ رہی ہے اور ظاہر ہے کہ بھوک کی حالت میں انسان کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ فوری طور پر اچھا کھانا کھائے۔ اب اگر بھوک کی حالت میں کھانا سامنے موجود ہو تب بھی روزہ دار کھانے کا ارتکاب نہیں کرتا، اس لیے کہ اسے یہ احساس ہوتا ہے کہ میں نے روزہ رکھا ہوا ہے اور روزے کی حالت میں اگر میں کوئی چیز کھاؤں گا یا روزہ توڑ دوں گا تو اس سے اللہ تعالیٰ کے حکم کی خلاف

ورزی ہوگی اور بہت بڑا گناہ ہوگا، اس لیے باوجود دل میں خواہش پیدا ہونے کے وہ اپنی اس خواہش پر عمل نہیں کرتا۔

اسی طرح اگر سخت گرمی کا دن ہے اور پیاس کی وجہ سے حلق میں کانٹے چبھ رہے ہیں، دوسری طرف گھر میں پانی بھی موجود ہے اور کوئی دیکھنے والا بھی نہیں ہے، تب بھی جو روزہ دار ہوگا وہ باوجود اپنی شدید خواہش کے پانی پینے کی جرأت نہیں کرے گا، بلکہ صحیح بات تو یہ ہے کہ جو آدمی روزہ رکھ لیتا ہے، اگر کوئی شخص اسے کسی بڑے سے بڑے انعام کی پیش کش بھی کرے کہ تم روزہ توڑ دو اور اس کے بدلے میں، میں تمہیں اتنا انعام دوں گا، تو ایک عام مسلمان بھی اس بات پر کبھی آمادہ نہیں ہوگا، لہٰذا معلوم ہوا کہ انسان کے اندر جو خواہشاتِ نفس پیدا ہو رہی ہوتی ہیں روزہ ان کا مقابلہ کرنا سکھا رہا ہے۔

انسان روزہ رکھ کر ایک عرصے تک یہ تربیت حاصل کرتا ہے کہ میں اپنی خواہشات پر کس طرح قابو پاؤں؟ سو اُسے یہ سوچنا چاہیے کہ اپنی عام زندگی میں بھی جو ناجائز خواہشات میرے دل میں پیدا ہو رہی ہیں، ان ناجائز خواہشات کو بھی اسی طرح دبایا جاسکتا ہے جیسے روزے کی حالت میں دبایا تھا۔ اس طرح تصوّر کرنے سے ان شاء اللہ گناہوں سے بچنا آسان ہو جائے گا۔

• نفسانی خواہشات کے آگے ہتھیار ڈال دینے کی غلطی

یہ جو انسان بعض اوقات خواہشات کے آگے ہتھیار ڈال دیتا ہے، تو وہ اس وجہ سے کہ وہ یہ سمجھتا ہے کہ میں ان خواہشات کے آگے مجبور ہو گیا ہوں اور اب میرے پاس اس کے سوا کوئی راستہ نہیں ہے کہ میں اپنی ان خواہشات پر عمل کروں، یہ بہت بڑی غلطی اور غلط فہمی ہے۔ روزہ انسان کو یہ سکھاتا ہے کہ خواہشات ایسی چیز نہیں ہیں جو تمہیں مجبور و مغلوب کر ڈالیں، بلکہ ان خواہشات کو تم اپنے قابو میں رکھ سکتے ہو اور ان کی خلاف ورزی کر سکتے ہو۔ جب یہ بات انسان کے دل میں پیدا ہو جائے تو یہی چیز انسان کے اندر رفتہ رفتہ ''تقویٰ'' پیدا کرتی ہے اور اپنی عام زندگی میں بھی اگر نفسانی خواہشات اسے کسی غلط راستے پر لے جا رہی ہوں یا کسی گناہ پر آمادہ کر رہی ہوں، تو وہ خود پر جبر کر کے نفسانی خواہشات پر اسی طرح قابو پاتا ہے جس طرح اس نے روزے کی حالت میں کھانے پینے کی خواہش پر قابو پایا تھا، چنانچہ نفسانی خواہشات پر قابو پانے اور گناہوں سے بچنے کے نتیجے میں اس کے اندر تقویٰ پیدا ہو جاتا ہے۔

• روزوں کا مختصر دورانیہ اور اس میں آسانیاں

پھر آگے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہ جو ہم نے تمہیں روزے کا حکم دیا ہے یہ کوئی بہت لمبا چوڑا مشقت والا معاملہ نہیں ہے، یہ ٹریننگ کورس جس سے تمہیں گزارا جارہا ہے یہ کوئی بہت طویل ٹریننگ کورس نہیں ہے، بلکہ ﴿اَیَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ﴾ ''گنتی کے چند دن ہیں (جن میں روزہ رکھنا ہے،)'' یعنی وہ دن اتنے زیادہ نہیں ہیں کہ تمہارے لیے ناقابلِ برداشت ہوجائیں۔ گنتی کے چند دن مقرر کرکے پھر اس میں بھی ایک یہ رعایت دے دی ہے کہ ﴿فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ﴾ ''اگر تم میں سے کوئی شخص بیمار ہو یا سفر پر ہو،'' تو پھر وہ دن، چاہے فرض روزے کے بھی دن ہوں، لیکن ہم نے اس میں بھی تمہیں یہ گنجائش دے دی ہے کہ اس زمانے میں روزہ نہ رکھو، بلکہ ﴿فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ﴾ ''اس کے بدلے میں دوسرے دنوں میں اتنی ہی تعداد پوری کرلو۔''

• بیماری کی حالت میں فرض روزہ چھوڑنے کی گنجائش

اس آیتِ کریمہ کے مطابق اللہ تبارک و تعالیٰ نے دو صورتوں میں اجازت دی ہے کہ روزے فرض ہونے کے باوجود تم روزے چھوڑ سکتے ہو؛ ایک تو بیماری کی حالت ہے، اس میں روزہ چھوڑا جا سکتا ہے، اور ظاہر ہے کہ بیماری سے مراد وہ بیماری ہے جس میں روزہ رکھنا انسان کی طاقت سے باہر ہو یا جس میں ایک حاذق (ماہر) طبیب یہ کہے کہ روزہ رکھنے سے تمہاری بیماری بہت بڑھ جائے گی اور تکلیف میں بہت اضافہ ہوجائے گا، تو ایسی بیماری کی صورت میں انسان کے لیے جائز ہے کہ وہ اس زمانے میں روزے چھوڑ دے۔

جس بیماری کی وجہ سے روزے چھوڑنے کی اجازت ہے، اس سے مراد وہ بیماری ہے جس میں روزہ رکھنے کی طاقت نہ رہے یا اس سے بیماری بڑھ جانے کا قوی اندیشہ ہو۔ ظاہر ہے کہ معمولی بیماری مثلاً کسی کو نزلہ زکام ہوگیا یا معمولی بخار ہوگیا، تو یہ ایسی بیماری نہیں ہوتی جس میں آدمی کے لیے روزہ چھوڑنا ضروری ہوجائے، لہٰذا اس کا معیار یہی ہے کہ کوئی حاذق طبیب یہ کہے کہ تمہارے لیے اس زمانے میں روزہ رکھنا مضر ہے اور یہ تمہاری بیماری میں اضافے کا سبب بنے گا، تو ایسی صورت میں وہ روزہ چھوڑ کر بعد میں اس کی قضا کرسکتا ہے۔

• سفر کی حالت میں روزہ چھوڑنے کا حکم

اور دوسری حالت جس میں روزہ ترک کرنے کی اجازت دی گئی وہ سفر کی حالت ہے، کیونکہ اگر انسان سفر کررہا ہے،تو اس میں عام طور سے اسے مشقت کا سامنا کرنا پڑتا ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس بات کی اجازت دی ہے کہ اگر کوئی شخص رمضان کے مہینے میں سفر کرے تو اس میں وہ روزہ چھوڑ دے اور بعد میں اس کی قضا کرلے۔

سفر میں جو روزہ چھوڑنے کی اجازت دی گئی ہے، اس سے ہر معقول آدمی کو خود بخود یہ بات سمجھ میں آنی چاہیے کہ اگر سفر بہت چھوٹا اور معمولی سا ہے، تو معمولی سے سفر کے اندر تو اتنی بڑی مشقت نہیں ہوتی کہ اس کی وجہ سے انسان روزہ چھوڑنے پر مجبور ہوجائے۔اس لیے سفر کی کوئی ایسی مقدار ہونی چاہیے جس میں عمومی طور پر واقعۃً عام انسان کو کچھ مشقت پیش آتی ہو۔

رسولِ کریم سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی احادیث اور صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے مختلف آثار وغیرہ سے فقہائے کرام نے یہ بات فرمائی ہے کہ وہ سفر جس میں روزے اور نماز وغیرہ کی شرعی رخصت حاصل ہوتی ہے وہ کم از کم اڑتالیس میل کا ہونا چاہیے، یعنی اپنے شہر سے اس کا فاصلہ اڑتالیس میل تک کا ہو تو اس سفر کے اندر انسان کے لیے جائز ہے کہ وہ روزہ ترک کردے، اگر اس سے کم مسافت کا سفر ہے تو اس میں اجازت نہیں ہے۔ پھر آگے فرمایا کہ ان دنوں میں روزہ ترک کرنے کی اجازت تو ہے، لیکن بعد میں اس کی قضا بھی کرنی لازمی ہوگی، خواہ بیماری کی وجہ سے چھوڑا ہو یا سفر کی وجہ سے چھوڑا ہو، اس کی قضا کرنی ہوگی۔

• چھوڑے ہوئے روزوں کی قضا میں سہولت

اگر کسی کے سفر یا بیماری کی وجہ سے روزے رہ گئے ہوں تو اس کے ذمے ان روزوں کی قضا لازم ہے۔ قضا کے لیے اللہ تعالیٰ نے عنوان یہ اختیار فرمایا کہ ﴿فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ﴾ ''دوسرے دنوں میں اتنی ہی تعداد پوری کرلیں۔'' ''عِدَّةٌ'' کے معنی تعداد یا گنتی اور ''مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ'' یعنی دوسرے دنوں میں سے۔ اگر کسی شخص کے روزے قضا ہوئے ہوں تو اگرچہ بہتر یہ ہے کہ وہ جلد از جلد قضا کرلے، کیوں کہ انسان کی زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں ہوتا، تاہم اس میں بھی اللہ تعالیٰ نے یہ سہولت رکھ دی ہے کہ اس کے لیے کوئی خاص دن یا وقت مقرر نہیں فرمایا، نہ یہ ضروری قرار دیا ہے کہ جونہی وہ عذر ختم ہو تو فوراً ہی تمہارے ذمے قضا کرنا

واجب ہے، بلکہ اگر دو چار دن کی تاخیر بھی ہوگئی یا کچھ مزید تاخیر ہوگئی، تب بھی اگر وہ قضا کے روزے رکھ لے تو قضا ادا ہو جائے گی۔

اسی طرح ﴿فَعِدَّةٌ﴾ یعنی دوسرے دنوں کی تعداد پوری کرنے کے اندر دوسرا اشارہ یہ ہے کہ یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ قضا روزے متواتر، یعنی پے در پے اور مسلسل رکھے جائیں، بلکہ انہیں مختلف دنوں میں بھی رکھ سکتے ہیں۔ مثلاً کسی کے دس روزے قضا ہوئے ہیں تو ضروری نہیں کہ دس روزے مسلسل رکھے، بلکہ ایک روزہ آج رکھ لیا، ایک کل رکھ لیا، باقی دو چار دن کے بعد رکھ لیے تو اس طرح بھی وہ قضا ادا ہو جاتی ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے یہ عنوان اختیار کیا کہ وہ دوسرے دنوں میں اتنی ہی تعداد پوری کرلے۔

• تدریجی احکام کی ایک مثال؛ روزوں کا فدیہ

پھر آگے فرمایا: ﴿وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ﴾ ''اور جو لوگ اس کی طاقت رکھتے ہوں وہ ایک مسکین کو کھانا کھلا کر (روزے کا) فدیہ ادا کردیں۔''

اس آیت کا تعلق درحقیقت اسلام کے ابتدائی دور سے ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے جب لوگوں کو دین کے احکام دیے تو عمل میں آسانی کے لیے تدریج اور آہستگی کا طریقہ اختیار فرمایا۔ یہ طریقہ شریعت کے مختلف احکام میں نظر آتا ہے اور یہ طریقہ اختیار کرنے میں حکمت یہ تھی کہ رسولِ کریم سرورِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم ایک ایسے معاشرے میں تشریف لائے تھے جو بالکل دین سے ہٹا ہوا تھا۔ اس لیے ایسے نئے احکام جو لوگوں کے لیے کسی قدر مشقت کا باعث ہوں، اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے انہیں تھوڑا تھوڑا کر کے اور تدریجاً لازم کیا گیا۔ اسی تدریج کا ایک حصہ یہ تھا کہ شروع میں جب روزے فرض کیے گئے تو چونکہ لوگوں کو روزہ رکھنے کی عادت نہ تھی اور کامل ایک ماہ کے روزے رکھنا ان کے لیے مشقت کا سبب بن سکتا تھا، اس لیے اس حکم میں ایک سہولت یہ دے دی گئی تھی کہ اگرچہ تمہیں روزہ رکھنے کی طاقت ہو، پھر بھی اگر تم چاہو تو روزے کے بجائے ایک مسکین کو کھانا کھلا کر روزے کا فدیہ ادا کردو۔

اسی کو اس آیت میں بیان فرمایا گیا کہ ﴿وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ﴾ اور جو لوگ اس کی طاقت رکھتے ہوں تو ان پر ﴿فِدْيَةٌ﴾ ''فدیہ واجب ہوگا۔'' اس فدیے کی مقدار ﴿طَعَامُ مِسْكِيْنٍ﴾ ہوگی، یعنی کہ ایک مسکین کو کھانا کھلا دیا جائے۔ جو لوگ روزہ نہ رکھنا چاہیں ان کے ذمہ یہ فدیہ واجب ہوگا، لیکن آگے یہ بھی

فرمایا کہ ﴿فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ﴾ ''اگر کوئی شخص اپنی خوشی سے کوئی نیکی کرے تو یہ اس کے حق میں بہتر ہے۔'' اس میں بتا دیا گیا کہ ایک روزے کے بدلے ایک مسکین کو (دو وقت کا کھانا) کھلانا تو لازمی ہے، لیکن اگر کوئی ایک سے زیادہ مسکینوں کو کھلا دے یا ایک دن کا کھانا کھلانا کے بجائے اسے ایک دن سے زیادہ کھانا کھلا دے تو یہ اور زیادہ بہتر ہے۔ ہر شخص کو یہ دونوں اختیار حاصل تھے کہ چاہے تو وہ روزہ رکھ لے یا چاہے تو ایک مسکین کو یا ایک سے زیادہ مسکینوں کو کھانا کھلا دے۔

• روزہ چھوڑنے کی سہولت کے باوجود روزہ رکھنا بہتر ہے

یہ اختیار دینے کے ساتھ ساتھ آیت کے آخر میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَ اَنْ تَصُوْمُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ﴾ اور اگر تم روزہ رکھو تو یہ تمہارے لیے بہتر ہے۔ ﴿اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۸۴﴾﴾ ''اگر تمہیں حقیقت کا علم ہو،'' یعنی اگرچہ آسانی کے لیے روزہ نہ رکھنے کی بھی اجازت ہے، لیکن پھر بھی اگر تم روزہ رکھ لو تو یہ زیادہ بہتر ہے، لیکن جیسا کہ پہلے گزر چکا کہ یہ ابتداء کی بات تھی، اب اس کے بعد جو آیت آرہی ہے وہ بعد میں نازل ہوئی اور اس نے اس سہولت کو منسوخ، یعنی ختم کر دیا، کیونکہ تدریج کے ساتھ روزے کے حکم کی طرف لانا مقصود تھا، اس لیے اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہ طریقہ اختیار فرمایا کہ شروع میں دونوں چیزوں کا اختیار دے دیا، لیکن دوسرے مرحلے میں یہ اختیار ختم کر کے روزوں کو فرض کر دیا گیا۔

یہ جو ایک مسکین کو کھانا کھلا کر روزے کا فدیہ ادا کرنے کی سہولت تھی، اس کو اگرچہ عام مسلمانوں کے لیے تو ختم کر دیا گیا تھا، لیکن ایسے بوڑھے اور بیمار لوگ جو روزہ رکھنے کی طاقت ہی نہیں رکھتے، یعنی وہ اتنے بوڑھے اور اتنے کمزور ہو گئے ہیں یا اتنے بیمار ہو گئے ہیں کہ ان کے دوبارہ صحت مند ہو کر روزہ رکھنے کی توقع نہیں ہے، تو ایسے لوگوں کے لیے یہ حکم اب بھی باقی ہے کہ ایسی صورت میں وہ روزہ رکھنے کے بجائے روزے کا فدیہ ادا کر دیا کریں۔ اگر نقد رقم سے فدیہ ادا کرنا ہو، تو پونے دو سیر گندم کی اُس وقت جو بھی قیمت بنتی ہو، وہ ایک دن کے روزے کا فدیہ ہے۔[1]

• رمضان المبارک میں قرآنِ کریم نازل کرنے کا مطلب

پچھلی آیت میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہ فرمایا تھا کہ تمہارے لیے روزے فرض کیے گئے ہیں ''گنتی کے

---

(۱) دیکھیے فتاویٰ عثمانی: جلد ۲ ص ۱۸۰، روزہ کے فدیہ کی تفصیل۔

چند دن۔'' اب اگلی آیت میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے اُس اجمال کی کچھ تفصیل بیان فرمائی ہے کہ وہ گنتی کے چند دن کون سے ہیں؟ تاہم اس سے پہلے اللہ تبارک وتعالیٰ نے اِس رمضان کے مہینے کا تعارف کرایا جس میں روزے رکھوانے مقصود ہیں اور جس میں روزوں کو فرض قرار دیا گیا ہے، چنانچہ فرمایا: ﴿شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ﴾ ''رمضان کا مہینہ وہ ہے جس میں قرآنِ کریم نازل کیا گیا'' قرآنِ کریم کے نزول کے لیے شہرِ رمضان، یعنی رمضان کے مہینے کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے منتخب فرمایا۔

یہ بات تو تقریباً ہر مسلمان جانتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر قرآنِ کریم دفعۃً ایک ہی مرتبہ میں نازل نہیں کیا گیا، بلکہ اس کی مختلف آیتیں مختلف حالات میں نازل ہوتی رہی ہیں۔ یہاں تک کہ یہ رفتہ رفتہ ۲۳ سال کے عرصے میں مکمل ہوا۔ یہاں جو کہا گیا ہے کہ ''رمضان کا مہینہ وہ مہینہ ہے جس میں قرآنِ کریم نازل کیا گیا'' تو اس نزول کا مطلب مختلف احادیث کی روشنی میں یہ ہے کہ یہ پورا کا پورا قرآن جو لوحِ محفوظ میں موجود تھا، اللہ تبارک وتعالیٰ نے، وہاں سے اسے سمائے دنیا پر (یعنی دنیا والے آسمان) پر رمضان کی اس رات میں جس کو شبِ قدر کہا جاتا ہے، نازل فرمادیا تھا۔ اسی لیے سورۂ قدر میں فرمایا گیا کہ:

اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ (۱)

بے شک ہم نے اس قرآن کو شبِ قدر میں نازل کیا۔

لہٰذا معلوم ہوا کہ قرآنِ کریم ایک مرتبہ لوحِ محفوظ سے آسمانِ دنیا کی طرف نازل کیا گیا اور وہاں فرشتوں کے حوالے کردیا گیا اور پھر حضرت جبرئیل علیہ السلام اس کے مختلف حصے، مختلف مواقع پر حسبِ ضرورت نبیِ کریم سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل کرتے رہے۔

رمضان کے مہینے میں قرآنِ کریم کے نازل کرنے کا ایک دوسرا مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے نزولِ قرآن کا آغاز نبیِ کریم سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر رمضان کے مہینے میں کیا، یعنی غارِ حرا میں جب سب سے پہلی وحی نازل ہوئی وہ رمضان کا مہینہ تھا، اس لحاظ سے رمضان کے مہینے میں قرآنِ کریم نازل کرنے کا مطلب یہ ہوا کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے رمضان المبارک کے مہینے میں نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر قرآنِ کریم نازل کرنا شروع کیا۔

---

(۱) سورۃ القدر (۹۷): آیت (۱)

• کلامِ باری تعالیٰ کے نزول کے لیے رمضان کا انتخاب

اللہ تبارک وتعالیٰ نے ﴿الَّذِیْٓ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ﴾ میں اس ماہِ مبارک، یعنی رمضان کے مہینے کی ایک خصوصیت یہ بیان فرمائی کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنی کتاب؛ قرآنِ مجید، اپنے حبیب، خاتم الانبیاء سرورِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کرنے کے لیے اسی مہینے کو منتخب فرمایا۔ مسند احمد کی روایت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے بھی جو کتابیں اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے انبیائے کرام پر نازل فرمائی ہیں، وہ کتابیں بھی رمضان ہی کے مہینے میں نازل فرمائی گئی تھیں، چنانچہ حضرات واثلہ بن اسقع رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

> ''حضرت ابراہیم علیہ السلام کے صحیفے رمضان کی پہلی تاریخ میں نازل ہوئے، اور تورات ۶ رمضان کو، انجیل تیرھویں رمضان میں اور قرآن چوبیسویں رمضان میں نازل ہوا۔''(۱)

اس روایت کی اسنادی حیثیت قدرے کمزور ہے، لیکن یہ ایک احتمال ضرور ہے کہ جس طرح نبیِ کریم سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآنِ کریم اسی مہینے میں عطا فرمایا گیا، اسی طرح پچھلے انبیائے کرام علیہم السلام کو رمضان ہی کے مہینے میں اُن کی آسمانی کتابیں عطا فرمائی گئیں، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس مہینے کو یہ اعزاز بخشا ہے کہ اپنا کلام اپنے بندوں کی طرف منتقل کرنے کے لیے اس مہینے کو منتخب فرمایا ہے۔

• قرآنِ کریم بنی نوعِ انسان کے لیے سرچشمۂ ہدایت

پھر آگے اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کی تعریف بیان فرمائی ہے کہ قرآنِ کریم کیا چیز ہے؟ پہلے تو فرمایا کہ ﴿هُدًى لِّلنَّاسِ﴾ ''یہ قرآن وہ ہے جو لوگوں کے لیے سراپا ہدایت ہے۔'' قرآنِ کریم کے سراپا ہدایت ہونے کی تشریح آپ سورۂ بقرہ کے شروع میں ''هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ'' کے ذیل میں پڑھ چکے ہیں، وہاں بتایا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنا یہ کلام انسانوں کی ہدایت کے لیے نازل فرمایا ہے۔ یہ رہنمائی تو وہ ہر ایک انسان کو کرتا ہے، لیکن اس رہنمائی سے فائدہ وہی اٹھاتے ہیں جو اس کی باتوں کو قبول کرتے ہیں۔ اس لیے وہاں پر

---

(۱) مسند أحمد (۲۸/۱۹۱) (۱۶۹۸٤). وأورده الهيثمي في "المجمع" (۱/۱۹۷) (۹۵۹) وقال: "رواه أحمد والطبراني في "الكبير" و"الأوسط" وفيه عمران بن داور القطان ضعفه يحيى، ووثقه ابن حبان، وقال أحمد: أرجو أن يكون صالح الحديث، وبقية رجاله ثقات."

''هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ'' فرمایا گیا تھا، یعنی متقی لوگوں کے لیے ہدایت اور یہاں ''هُدًى لِّلنَّاسِ'' فرمایا گیا کہ یہ تمام انسانوں کے لیے ہدایت کا راستہ دکھاتا ہے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے قرآنِ کریم کا دوسرا وصف یہ بیان فرمایا: ﴿وَ بَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَ الْفُرْقَانِ﴾ ''اور یہ ایسی روشن نشانیوں کا حامل ہے جو صحیح راستہ دکھاتی اور حق و باطل کے درمیان دوٹوک فیصلہ کردیتی ہیں۔'' سراپا ہدایت ہونے کا بیان تو پچھلے لفظ ﴿هُدًى لِّلنَّاسِ﴾ میں فرما دیا گیا تھا، لیکن یہاں ﴿بَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى﴾ میں ہدایت کی صفت کو دوبارہ ذکر کرنے سے بظاہر مقصود یہ ہے کہ صرف ایسا نہیں ہے کہ اس میں جو مضامین صراحت کے ساتھ بیان فرما دیے گئے ہیں وہ لوگوں کے لیے ہدایت ہیں، بلکہ اس میں وہ معیار بھی بتادیا گیا ہے اور وہ اصول بھی وضع کردیے گئے ہیں جن کی روشنی میں انسان اُن باتوں میں بھی رہنمائی حاصل کرسکتا ہے جو صراحتاً قرآنِ کریم میں مذکور نہیں ہیں۔

• فدیہ کے سابقہ حکم کی منسوخی اور مسافر و مریض کے لیے سہولت

اب آگے اللہ تبارک وتعالیٰ فرمارہے ہیں کہ ﴿فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ﴾ ''لہٰذا تم میں سے جو شخص بھی یہ مہینہ پائے، وہ اس میں ضرور روزہ رکھے۔'' ''شَهِدَ'' کے لفظی معنیٰ ہوتے ہیں کسی جگہ پر حاضر ہونا، موجود ہونا، مشاہدہ کرنا، مطلب یہ کہ جو شخص بھی تم میں سے اس مہینے کو اپنی زندگی میں اور اپنی ایسی حالت میں پالے، جب کہ انسان احکام کا مکلّف ہوتا ہے، تو ''فَلْيَصُمْهُ'' یعنی اس کے ذمے فرض ہے کہ وہ روزہ رکھے۔

روزوں سے متعلق وہ سہولت جو پہلے دی گئی تھی کہ چاہے تم روزہ رکھو اور چاہے تو اس کے بدلے میں کسی مسکین کو کھانا کھلا کر اس کا فدیہ ادا کردو، اس جملے میں اس سہولت کو واپس لے لیا گیا ہے اور یہاں فرمایا گیا کہ اب تمہارے لیے ضروری ہے کہ جو شخص بھی یہ مہینہ پائے وہ ضرور روزہ رکھے۔ چونکہ فدیہ ادا کرنے کی سہولت واپس لے کر اب روزہ رکھنا ہی ضروری قرار دے دیا گیا، تو کسی کے دل میں یہ خیال پیدا ہوسکتا تھا کہ جس طرح فدیہ دینے کی سہولت واپس لی گئی تو پیچھے ایک سہولت یہ بھی دی گئی تھی کہ بیماری کی حالت میں یا سفر کی حالت میں انسان کے لیے روزہ قضا کرنا جائز کردیا گیا تھا، تو شاید ہوسکتا ہے کہ وہ سہولت بھی واپس لے لی گئی ہو۔

اس شبہے کے ازالے کے لیے اللہ تعالیٰ نے اس جملہ کو دوبارہ ذکر کرتے ہوئے فرمایا: ﴿وَمَنْ كَانَ مَرِيْضًا﴾ اور اگر کوئی شخص بیمار ہو ﴿اَوْ عَلٰى سَفَرٍ﴾ یا سفر پر ہو ﴿فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ﴾ ''تو وہ دوسرے دنوں میں سے انہی دنوں کی گنتی پوری کرلے۔'' گنتی پوری کرنے کی تفصیل پہلے آچکی ہے۔ اس حکم کو دہرانے کا مقصد یہ ہے کہ فدیے کی سہولت تو بے شک واپس لی گئی ہے، لیکن سفر اور بیماری کی وجہ سے جو روزہ چھوڑنے کی اجازت دی گئی تھی وہ واپس نہیں لی گئی، وہ اب بھی باقی ہے لہٰذا سفر یا بیماری کی وجہ سے تم روزہ چھوڑ سکتے ہو، بشرطیکہ جتنے روزے چھوڑے ہیں اتنے ہی روزے بعد میں تم قضا بھی کرلو۔

• دین سراسر آسانی پر مشتمل ہے

پھر اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ﴾ اللہ تبارک وتعالیٰ تمہارے ساتھ آسانی کا معاملہ کرنا چاہتا ہے ﴿وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ﴾ ''اور تمہارے لیے مشکل پیدا نہیں کرنا چاہتا،'' یعنی ہم تمہیں جو احکام بھی عطا کرتے ہیں تو ہم سے زیادہ کون اس بات کو جانتا ہوگا کہ تم واقعی اس کام کے کرنے کے قابل ہو یا نہیں ہو۔ تم جس کام کے قابل ہوتے ہو، ہم اسی کا تمہیں حکم دیتے ہیں اور جو کام تمہاری طاقت سے باہر ہوتا ہے، ہم اس کا حکم نہیں دیتے، چنانچہ سورۂ بقرہ کے آخر میں آنے والا ہے کہ ''لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا''، یعنی ''اللہ تعالیٰ کسی بھی انسان کو اس کی وسعت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتے۔'' اسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

إِنَّ الدِّينَ يُسْرٌ (۱)

بے شک دین آسان ہے۔

یہاں پر اللہ تعالیٰ فرمارہے ہیں کہ تمہیں جو یہ روزے بظاہر کچھ مشکل نظر آرہے ہیں، حقیقت میں مشکل نہیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ تمہارے لیے آسانی پیدا کرنا چاہتا ہے، مشکل پیدا نہیں کرنا چاہتا۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے روزوں کے حکم میں یہ آسانی فرمائی کہ کسی بیماری یا سفر کی وجہ سے چھوڑے جاسکتے ہیں، پھر دیگر ایام میں ان کی قضا کی صورت پیدا فرمادی تاکہ ثواب سے محروم نہ رہ جائیں، نیز اس میں بھی یہ سہولت دے دی کہ جیسے چاہیں قضا کریں، ایک ساتھ سارے روزے قضا کرنا ضروری نہیں، یہ اللہ تعالیٰ کا کرم ہے کہ اس نے تمہیں

---

(۱) صحيح البخاري (۱/۱۶) (۳۹) كتاب الإيمان، باب: الدين يسر.

یہ سہولتیں عطا فرمائیں۔ ﴿وَ لِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ﴾ ''اور تا کہ تم روزوں کی گنتی پوری کرلو،'' یعنی اس بات کا حکم کہ تم پورے رمضان کے روزے رکھو اور اگر سفر پر ہو یا بیماری کی حالت میں ہو تو اتنی ہی گنتی بعد میں پوری کرلو، یہ حکم اس لیے دیا ہے تا کہ تم یہ گنتی پوری کرلو۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے روزوں کی جتنی تعداد تمہارے ذمے ضروری قرار دی ہے، وہ تم مکمل کرلو۔

• تکبیراتِ عید کی طرف ایک لطیف اشارہ

﴿وَ لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ﴾ اور تا کہ تم اللہ کی بڑائی بیان کرو، تکبیر کہو ﴿عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ﴾ ''اس پر کہ اللہ نے تمہیں جو راہ دکھائی،'' یعنی اللہ تبارک وتعالیٰ نے روزے فرض کر کے تمہیں تقویٰ کی راہ دکھائی ہے، جس کا فائدہ تمہیں دنیا اور آخرت؛ دونوں کی زندگی میں پہنچے گا۔ اسی طرح اللہ تبارک وتعالیٰ نے ایسے احکام بھی دے دیے جن کے نتیجے میں روزہ رکھنا آسان ہوجائے، سفر اور بیماری میں روزہ فوراً رکھنا معاف کردیا اور قضا کا حکم دے کر تمہیں روزے کی فضیلت سے محروم نہیں کیا، لہٰذا ان سب باتوں پر اللہ کی بڑائی بیان کرو اور اللہ کی تکبیر کہو۔

اس تکبیر کا ایک تو معنوی پہلو ہے اور وہ یہ کہ آدمی کو رمضان کے روزوں کے درمیان اور ہر وقت عبادت کرتے ہوئے اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرتے ہوئے، اللہ تعالیٰ کی کبریائی کا تصوّر ذہن میں رکھنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ ساری کائنات سے بڑے ہیں۔ اللہ اکبر کے معنیٰ یہی ہیں کہ کائنات میں اس سے بڑی کوئی ذات نہیں ہے، لہٰذا اس کے احکام واجبُ التعمیل ہیں اور اسی کے حکم کے مطابق انسان کو زندگی گزارنی چاہیے۔

اس کے ساتھ ہی بعض مفسرین[1] کے بقول ﴿وَ لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ﴾ میں جس تکبیر کا ذکر ہے، اس میں ایک لطیف اشارہ اس طرف بھی ہے کہ جب رمضان المبارک کا مہینہ پورا ہوجاتا ہے تو اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے لیے عید کی نماز مقرّر فرمائی ہے، اور وہ عید کی نماز ایسی ہے کہ اس میں چھ تکبیریں زیادہ ہوتی ہیں، لہٰذا کہا جارہا ہے کہ رمضان کے مہینے کی گنتی پوری کرلینے کے بعد پھر تم اس بات پر اللہ کی بڑائی بیان کرو کہ اللہ تعالیٰ نے تم کو ہدایت عطا فرمائی ﴿وَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۱۸۵﴾﴾ ''اور تا کہ تم اللہ تعالیٰ کے شکر گزار بندے بن جاؤ۔''

---

(۱) قال ابن عباس: "هو تكبيرات ليلة الفطر.": تفسير البغوي - طيبة (۱/۲۱۰)

• اللہ تعالیٰ انسان کے قریب ہیں

اس کے بعد اللہ تبارک وتعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ﴿وَ اِذَا سَاَلَكَ عِبَادِیْ عَنِّیْ﴾ اور اے پیغمبر! جب میرے بندے آپ سے میرے بارے میں پوچھیں تو آپ کہہ دیجیے کہ ﴿فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ﴾ تو میں قریب ہوں۔ اتنا قریب ہوں کہ ﴿اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ﴾ ''جب مجھے کوئی پکارتا ہے تو میں پکارنے والے کی پکار سنتا ہوں۔'' یہاں پر جو سلسلۂ کلام چلا آرہا ہے وہ رمضان کے روزوں سے متعلق ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس سیاقِ کلام میں خاص طور پر جو اس دعا مانگنے والے جملے کو ذکر فرمایا تو اس کی وجہ بظاہر یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس میں یہ بتلانا مقصود ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ رمضان کے مہینے میں خصوصی طور پر دعائیں سنتے ہیں اور انسان کے اتنے قریب ہوتے ہیں کہ انسان جب اللہ تبارک وتعالیٰ کو پکارے اور اس سے اپنی کوئی حاجت مانگے تو اللہ تبارک وتعالیٰ اس کی وہ حاجت پوری کردیتے ہیں، بشرطیکہ وہ اللہ تعالیٰ کی مشیت اور مصلحت کے مطابق ہو، اور اگر فرض کرو وہ حاجت مشیت ومصلحت کے مطابق نہ ہو، تو پھر اللہ تعالیٰ دنیا یا آخرت میں اس سے بہتر چیز اسے عطا فرمادیتے ہیں۔

﴿وَ اِذَا سَاَلَكَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ﴾ والے اس جملے میں ایک طرف تو رمضان کے مہینے میں اللہ تبارک وتعالیٰ سے خصوصی دعائیں کرنے کا اہتمام کرنے کی طرف اشارہ ہے، جبکہ دوسری طرف اس جملے سے شاید اس طرف بھی اشارہ ہو کہ یہ نہ سمجھنا کہ رمضان کا مہینہ گزر جانے کے بعد دعائیں قبول نہیں ہوں گی۔ بے شک رمضان کا مہینہ دعاؤں کی قبولیت کا خاص زمانہ ہے، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس کے بعد دعاؤں کی قبولیت کا دروازہ بند ہوگیا۔ اللہ تعالیٰ نے یہاں فرمادیا کہ دعائیں قبول کرنے والا تو میں ہی ہوں اور میں تم سے قریب ہوں، رمضان کے مہینے کی خصوصیت نہیں، بلکہ ہر وقت تمہارے قریب ہوں، لہٰذا جب تمہیں کوئی حاجت پیش آئے، تو تم بے شک میری طرف رجوع کرسکتے ہو اور میں پکارنے والے کی پکار سنوں گا۔

پھر آگے فرمایا: ﴿فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لِیْ﴾ ''لہٰذا وہ بھی میری بات دل سے قبول کریں،'' یعنی جب میں ان کی باتیں سنتا ہوں اور ان کی دعائیں قبول کرتا ہوں اور اُن کی خاطر میں نے یہ آسانیاں پیدا کی ہیں، تو پھر وہ بھی میری بات قبول کریں۔ جو تھوڑی بہت مشقت روزہ رکھنے یا کسی اور حکم کی تعمیل میں ہورہی ہو، تو اسے برداشت کرکے میرے احکام کی تعمیل کریں۔

﴿فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لِيْ﴾ کے بعد اللہ تبارک وتعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ﴿وَلْيُؤْمِنُوْا بِيْ﴾ ''اور مجھ پر ایمان لائیں۔'' اس جملے سے اس طرف اشارہ فرمادیا کہ میری باتوں کو قبول کرنا اور دل سے ان پر عمل کرنا یہ ایمان کا تقاضا ہے، اگرچہ ایمان پہلے بھی لائے ہوئے ہیں، لیکن اس ایمان کو پختہ کرنے کے لیے اور اس کے تقاضے پر عمل کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے یہاں پر یہ جملہ ارشاد فرمایا۔ اللہ تعالیٰ کی بات ماننے اور ایمان لانے کا مقصد یہ ہے کہ ﴿لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُوْنَ ﴿۱۸۶﴾﴾ ''تاکہ وہ راہِ راست پر آجائیں۔'' یہ راہِ راست کا حصول دونوں چیزوں کا نتیجہ ہے، یعنی جب اللہ تعالیٰ کی بات مانیں گے اور اس پر ایمان لائیں گے، تو اس کے نتیجے میں وہ راہِ راست پر آجائیں گے۔

• روزوں سے متعلق بعض سابقہ احکام میں تبدیلی

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے روزوں سے متعلق بعض متفرّق احکام بیان فرمائے ہیں۔ آگے جو آیت آرہی ہے، اس کا مطلب سمجھنے سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ جب شروع میں روزے فرض کیے گئے، تو اس میں مسلمانوں کو یہ حکم دیا گیا تھا کہ افطار کے بعد رات کو سونے سے پہلے پہلے تک کھانے پینے اور اپنی بیویوں کے ساتھ صحبت کی اجازت ہے، لیکن اگر رات کو سو جائیں، تو سونے کے بعد پھر کھانا پینا یا صحبت کرنا جائز نہیں رہتا تھا۔ اب بعض اوقات ایسا ہوا کہ کسی شخص نے معمولی سا افطار تو کرلیا، لیکن ابھی تک کھانا نہیں کھایا تھا کہ اسے نیند آگئی اور وہ سو گیا۔ (۱) اب اس حکم کی وجہ سے اسے ساری رات بھوکا رہنا پڑا اور بعض اوقات ایسا بھی ہوا کہ کسی کی آنکھ لگ گئی اور اس کے بعد پھر اسے اپنی بیوی سے حاجت پوری کرنے کی ضرورت پیش آئی، تو اس نے اپنی اہلیہ سے جماع کرلیا۔ (۲)

یہ صورتِ حال کچھ دن جاری رہی تو بعد میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہ حکم دے دیا کہ اب ساری رات تمہارے لیے حلال ہے، اس میں کھا پی بھی سکتے ہو اور اپنی بیویوں سے صحبت بھی کرسکتے ہو۔ اس کے لیے اللہ تعالیٰ نے اگلی آیت میں یہ فرمایا کہ ﴿اُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ﴾ تمہارے لیے حلال کر دیا گیا ہے روزوں کی رات میں ﴿الرَّفَثُ اِلٰى نِسَآئِكُمْ﴾ ''کہ تم اپنی بیویوں سے بے تکلف صحبت کرو۔'' ''رفث'' کا لفظ قرآنِ کریم میں متعدّد جگہوں پر آیا ہے اور اس کے لفظی معنیٰ ہیں کوئی بھی ایسی بات یا ایسا کام جس کا صریح

---

(۱) صحيح البخاري (۲۸/۳) (۱۹۱۵) كتاب الصوم باب قول الله جل ذكره ﴿أُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ ...﴾.

(۲) مسند أحمد (۸٦/۲۵) (۱۵۷۹۵).

ذکر کرتے ہوئے آدمی شرماتا ہو۔ یہاں پر اس آیت میں رفث سے میاں بیوی کا جنسی تعلق مراد ہے اور اس میں یہ بتا دیا گیا کہ اب ہم نے تمہارے لیے روزوں کی رات میں پابندی ختم کردی ہے، چنانچہ جب تم نے دن میں روزہ رکھا اور اس کے بعد پھر رات آئی تو اس رات میں تمہارے لیے اپنی بیویوں سے رفث کا ارتکاب کرنا، یعنی صحبت کرنا حلال کردیا گیا ہے۔

زوجین کے رشتے کو بیان کرتا ایک بلیغ جملہ اور متعدّد اصول

رمضان کی راتوں میں اپنی بیویوں سے صحبت کرنے کی اجازت دینے کے بعد پھر آگے اللہ تبارک و تعالیٰ نے ایک جملہ ارشاد فرمایا کہ ﴿هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَ اَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ﴾ ''تمہاری بیویاں تمہارے لیے لباس ہیں اور تم ان کے لیے لباس ہو۔'' یہ بڑا بلیغ اور وسیع مفہوم پر مشتمل جملہ ہے۔ اس میں میاں بیوی کے خصوصی تعلق کی طرف تو واضح اشارہ موجود ہے ہی کہ جب میاں بیوی اپنے اس مخصوص تعلق کے لیے ایک دوسرے سے ملتے ہیں، تو اس وقت وہ ظاہری لباس سے بعض اوقات بے نیاز ہوجاتے ہیں اور گویا ایسی صورت میں وہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لباس بن جاتے ہیں۔ اسی لیے فرمایا کہ وہ تمہارے لیے لباس ہیں اور تم ان کے لیے لباس ہو، لیکن اس بلیغ جملے میں اور بھی متعدّد مفہوم پوشیدہ ہیں اور میاں بیوی کے باہمی تعلقات کے بارے میں اس آیت میں بہت ہی اہم اسباق دیے گئے ہیں، جن کی کچھ تفصیل ذیل میں ذکر کی جاتی ہے:

• پہلا اصول: ایک دوسرے کے عیوب کی پردہ پوشی

جب یہ فرمایا گیا کہ ''تم ان کے لیے لباس ہو، اور وہ تمہارے لیے لباس ہیں،'' تو بظاہر اس سے اشارہ اس طرف بھی مقصود ہے کہ لباس جس کام کے لیے استعمال ہوتا ہے، میاں بیوی کو بھی ایک دوسرے کے لیے انہی مقاصد کا حامل ہونا چاہیے۔ مثلاً لباس کا سب سے پہلا مقصد پردہ پوشی ہوتا ہے، لہٰذا میاں بیوی کے درمیان بھی پردہ پوشی ہونی چاہیے۔ جس طرح لباس انسان کے اندرونی جسمانی حصے کو یا جسمانی عیب کو چھپاتا ہے، اسی طرح شوہر کو چاہیے کہ وہ بیوی کے عیب کو چھپائے، اور بیوی کو چاہیے کہ وہ شوہر کے عیب کو چھپائے، اِلّا یہ کہ کوئی شرعی تقاضا ہو تو وہ الگ بات ہے، لیکن عام حالات میں وہ ایک دوسرے کے ہم راز ہونے

چاہئیں اور ایک دوسرے کی برائی اور ایک دوسرے کے عیب کو چھپانا، ان کے ازدواجی تعلقات کے لیے مناسب، بلکہ ضروری ہے۔

• دوسرا اصول: ایک دوسرے کے لیے زینت کا ذریعہ

لباس کی ایک دوسری خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ وہ انسان کے لیے زینت کا سبب بنتا ہے، چنانچہ قرآنِ کریم میں ایک جگہ لباس کی لیے ''زینت'' ہی کا لفظ آیا ہے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ''يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ''(۱) ''اے آدم کی اولاد جب کبھی مسجد میں آؤ تو اپنی خوشنمائی کا سامان (یعنی جسم پر لباس) لے کر آؤ۔'' اس آیت میں زینت سے مراد لباس ہے۔ اللہ تعالیٰ نے لباس کے لیے زینت کا لفظ استعمال کر کے بتا دیا کہ لباس انسان کے لیے زینت اور خوشنمائی کا سبب ہے۔ اسی طرح ایک جگہ لباس کے لیے ''وَرِيْشًا''(۲) کا لفظ استعمال فرمایا ہے، جس کے معنیٰ یہ ہیں کہ ہم نے تمہارے لیے لباس اتارا ہے جو زینت کا ذریعہ ہے۔

سورۂ اعراف کی مذکورہ بالا آیات سے معلوم ہوا کہ لباس کا مقصد زینت بھی ہوتا ہے، لہٰذا جب قرآنِ کریم میں میاں بیوی دونوں کو ایک دوسرے کا لباس قرار دیا گیا ہے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ وہ دونوں ایک دوسرے کے لیے زینت کا سبب بھی ہیں۔ ان کی زندگی میں جو زینت اور حسن ہے، وہ ازدواجی زندگی سے پیدا ہوتا ہے، لہٰذا وہ ایک دوسرے کے لیے زینت کا سبب ہونے چاہئیں۔ میاں بیوی کو اس طرح رہنا چاہیے کہ وہ ایک دوسرے کے لیے زینت کا سبب بنیں اور ایسا طریقہ اختیار کریں کہ ان کے درمیان کوئی باہمی منافرت پیدا نہ ہو۔ بیوی کو چاہیے کہ وہ اپنے شوہر کے لیے زیب و زینت اختیار کرے اور مرد کو چاہیے کہ وہ بیوی کے سامنے خوش منظر ہو کر آئے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ:

> ''جس طرح میری بیوی میرے لیے سنگھار کرتی ہے، اسی طرح میں بھی اس کے لیے زیب و زینت کرتا ہوں۔''(۳)

---

(۱) سورۃ الأعراف (۷): آیت (۳۱)

(۲) سورۃ الأعراف (۷): آیت (۲۶)

(۳) عن ابن عباس قال: "إني لأحب أن أتزين للمرأة كما أحب أن تتزين لي المرأة؛ لأن الله يقول: ﴿وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ﴾." رواه ابن جرير، وابن أبي حاتم.- تفسير ابن كثير (۱/۶۱۰).

• تیسرا اصول: ایک دوسرے کے لیے عزت کا سبب

تیسری بات یہ ہے کہ لباس انسان کی عزت کا بھی سبب ہوتا ہے۔ اگر کوئی شخص بے لباس پھرتا ہو تو وہ ذلت اور رسوائی کا کام ہے، جبکہ لباس پہننا انسان کے لیے عزت و شرافت کا مظہر ہے۔ اسی طرح لباس سے انسان کی اپنی قدر و منزلت میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔ اگر کسی نے صاف ستھرا لباس پہنا ہے، تو اس کے لیے عزت کا سبب ہے، لیکن اگر اس نے بہت ہی خراب قسم کا اور میلا کچیلا لباس پہنا ہوا ہو تو وہ اس کے لیے ذلت کا باعث ہوتا ہے۔ اسی طرح میاں بیوی کو جب یہ کہا گیا کہ وہ ایک دوسرے کے لیے لباس ہیں، تو شاید اس میں اس بات کی طرف بھی اشارہ مقصود ہے کہ وہ ایک دوسرے کے لیے عزت کا سبب ہونے چاہئیں اور ان کے درمیان کے تعلقات اور آپس میں رویّہ ایسا ہونا چاہیے کہ جس سے دوسروں کے سامنے ان کی ذلت نہ ہو، لہٰذا لڑائی جھگڑا، تو تکار اور اس طرح کی کوئی اور ناچاقی جو ان کے لیے باعثِ ذلت ہو، اس سے پرہیز کرتے ہوئے دونوں میں سے ہر ایک دوسرے کی عزت اور اس کے وقار کا خیال رکھے اور کسی موقع پر اپنے شریکِ زندگی کو بے عزت نہ ہونے دے، اِلّا یہ کہ شریعت کا کوئی حکم ہی ایسا آجائے کہ جس کے نتیجے میں کسی کو بے عزت ہونا پڑے تو یہ الگ بات ہے۔

• چوتھا اصول: ایک دوسرے کی حفاظت کا ذریعہ

چوتھی بات یہ ہے کہ لباس انسان کی حفاظت کا بھی ذریعہ ہوتا ہے، چنانچہ قرآنِ کریم میں لباس ہی کے بارے میں فرمایا گیا:

وَّجَعَلَ لَكُمْ سَرَابِيْلَ تَقِيْكُمُ الْحَرَّ وَ سَرَابِيْلَ تَقِيْكُمْ بَاْسَكُمْ (۱)

اور تمہارے لیے ایسے لباس پیدا کیے جو تمہیں گرمی سے بچاتے ہیں، اور ایسے لباس جو تمہاری جنگ میں تمہیں محفوظ رکھتے ہیں۔

معلوم ہوا کہ لباس کا ایک اہم کام حفاظت بھی ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو ایسے لباس عطا کیے جو ان کے لیے گرمی اور سردی سے حفاظت کا ذریعہ ہیں، اسی طرح بعض لباس ایسے ہوتے ہیں جو لڑائی وغیرہ کے

---

(۱) سورۃ النحل (۱۶): آیت (۸۱)

دوران دوسروں کے حملے سے حفاظت کا کام کرتے ہیں۔ جب مذکورہ آیت میں اللہ تعالیٰ نے میاں بیوی کو ایک دوسرے کے لیے لباس قرار دیا، تو اس کا ایک مفہوم یہ بھی نکل سکتا ہے کہ جس طرح لباس انسان کی حفاظت کرتا ہے، اسی طرح وہ دونوں بھی ایک دوسرے کی حفاظت کا ذریعہ ہونے چاہئیں۔شوہر بیوی کی جان و مال اور اس کی عزت و آبرو کی حفاظت کرے اور بیوی شوہر کے جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت کرے، چنانچہ ایک حدیث میں بھی رسول اللہ ﷺ نے بیوی کے فرائض میں یہ بات بھی قرار دی ہے کہ وہ اپنے آپ کی بھی حفاظت کرے اور اپنے شوہر کے مال کی بھی حفاظت کرے۔(۱)

اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ جملہ: ﴿هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَ اَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ﴾ ''وہ تمہارے لیے لباس ہیں اور تم ان کے لیے لباس ہو۔'' یہ میاں بیوی کے تعلقات کے بارے میں ایک بہت ہی گراں قدر نصیحت پر مشتمل عظیم الشان جملہ ہے، جس میں میاں بیوی کے خوبصورت رشتے کی نزاکتوں اور ذمے داریوں کو بڑے بلیغ پیرائے میں بیان کیا گیا ہے۔

گناہ کا ارتکاب اپنی جان سے خیانت ہے

شروع میں جب رمضان المبارک میں رات کو سونے کے بعد بیویوں سے صحبت کی اجازت نہیں تھی، تو اس میں بعض دفعہ بعض حضرات غلطی میں مبتلا ہوگئے اور نادانی میں یا ہوسکتا ہے کہ کسی وقت اپنے نفس کے تقاضے سے مجبور ہوکر انہوں نے رات کے وقت میں اپنی بیویوں سے صحبت کرلی۔ اگلی آیت میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے انہی لوگوں کے بارے میں ارشاد فرمایا: ﴿عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَكُمْ﴾ ''اللہ کو علم تھا کہ تم اپنے آپ سے خیانت کر رہے تھے،'' یعنی یہ جو تم نے صحبت کا ارتکاب کیا یہ درحقیقت خود اپنی جان سے خیانت تھی کیونکہ جب انسان کوئی گناہ کرتا ہے تو اس کا نقصان بالآخر اس کی اپنی جان کو پہنچتا ہے اور جان اللہ تعالیٰ نے انسان کے پاس ایک امانت رکھی ہے اور اس جان کو کوئی نقصان پہنچانا، یہ اس امانت میں خیانت ہے۔

اس لیے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہمیں معلوم تھا کہ تم اپنے آپ سے خیانت کرر ہے تھے، یعنی تم نے

---

(۱) أخرجه ابن ماجه فی سننه (۱/۵۹۶) (۱۸۵۷): "وإن غاب عنها نصحته في نفسها وماله." وأخرجه الطبراني في "الكبير." (۸/۲۲۲) (۷۸۸۱)، والحديث ذكره الضياء المقدسي فی السنن والأحكام (۵/۹٤) (٥٤٦٠) وقال: "رواه ابن ماجه من روايته عن عثمان بن أبی العاتكة، عن علی بن يزيد عن القاسم، وقد تكلم فيهم."

کبھی کبھی اس حکم کی خلاف ورزی کا ارتکاب کیا تھا، ﴿فَتَابَ عَلَيْكُمْ﴾ تو اللہ تعالیٰ نے تم پر عنایت کی ﴿وَعَفَا عَنْكُمْ﴾ ''اور تمہاری غلطی معاف فرمادی۔'' چونکہ یہ ایک عارضی اور عبوری نوعیت کا حکم تھا جو اللہ تعالیٰ نے عطا فرمایا تھا اور حضراتِ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اس کی خلاف ورزی بحیثیتِ مجموعی نافرمانی کے قصد سے کبھی نہیں کرتے تھے، بلکہ کسی وقت بھول چوک کی وجہ سے یا کسی وقت کسی نفسانی خواہش سے مغلوب ہو کر یہ کام کر گزرے تھے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اب چونکہ یہ حکم ہی واپس لیا جارہا ہے تو اب جو پچھلے دنوں تم نے اس حکم کی کوئی خلاف ورزی کی تھی تو اسے ہم نے معاف کردیا۔

باہمی تعلقات سے اولاد کی طلب بھی مقصود ہونی چاہیے

جب سابقہ حکم کو ختم کرکے بیویوں سے ملنے کی اجازت دے دی گئی تو فرمایا: ﴿فَالْئٰنَ بَاشِرُوْهُنَّ﴾ اب تمہارے لیے جائز ہے کہ تم ان سے صحبت کرلیا کرو ﴿وَابْتَغُوْا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ﴾ ''اور جو راستہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے لکھ دیا ہے اسے تلاش کرو۔''

﴿وَابْتَغُوْا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ﴾ کے دو معنیٰ ہوسکتے ہیں، اور دونوں معنیٰ یہاں ممکن ہیں:

- ایک معنیٰ تو یہ کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے جو راستہ لکھ دیا ہے کہ دن کے وقت میں تو روزہ ہے، لیکن رات کے وقت میں تم کھا پی بھی سکتے ہو اور بیویوں سے صحبت بھی کرسکتے ہو تو اسے تم تلاش کرو، یعنی اس سے فائدہ اٹھاؤ۔
- اور دوسرے معنیٰ بعض حضراتِ مفسرین[1] نے یہ بیان کیے ہیں اور عین ممکن ہے کہ وہ بھی یہاں مراد ہوں، اور وہ یہ کہ ﴿مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ﴾ یعنی اللہ نے تمہارے لیے جو کچھ لکھ دیا ہے اس سے اولاد مراد ہے اور ﴿وَابْتَغُوْا﴾ کے معنی ہیں تلاش کرو، اور مقصد یہ ہے کہ جب صحبت کی جائے تو اس میں صرف جنسی لذت حاصل کرنا ہی مقصود نہ ہو، بلکہ اس میں اولاد کی طلب بھی مقصود ہو۔ اس بات کی تائید متعدّد دوسری آیات سے اور بعض احادیث سے بھی ہوتی ہے کہ آدمی کو صحبت میں محض اپنی خواہش کو پورا کرنا ہی مقصود نہ ہو، بلکہ نسلِ انسانی کی بقا اور

---

(۱) كما في التفسير المظهري (۱/۲۰٤): "تدل الاية على انه ان جامع رجل امرأته ينبغى ان يريد به الولد دون قضاء الشهوة فحسب..." الناشر: المكتبة الرشيدية الباكستان

نسلِ انسانی کے اضافے کی بھی نیت ہونی چاہیے، لہٰذا اس تفصیل کی روشنی میں ﴿وَابْتَغُوْا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ﴾ سے یہ معنیٰ بھی مراد ہوسکتے ہیں۔

سحری میں کب تک کھا پی سکتے ہیں؟

پھر فرمایا کہ جس طرح تمہیں رات کے وقت میں صحبت کی اجازت ہے، اسی طرح تمہارے لیے رمضان کی رات میں صبح صادق تک کھانے پینے کی بھی اجازت ہے، چنانچہ ﴿وَ كُلُوْا﴾ اور کھاؤ ﴿وَاشْرَبُوْا﴾ اور پیو ﴿حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ﴾ ''یہاں تک کہ صبح کی سفید دھاری (سفید لکیر) سیاہ دھاری سے ممتاز ہوکر تم پر واضح نہ ہوجائے۔'' یہاں پر اللہ تبارک و تعالیٰ نے رات کے اندھیرے کے دور ہونے اور صبح کے اجالے کے نمودار ہونے کو بیان کرنے کے لیے ایک استعارہ استعمال فرمایا ہے۔ رات کا جو وقت ہوتا ہے اس میں اُفق (آسمان کے کنارے) کے اوپر تاریکی اور اندھیرا چھایا ہوا ہوتا ہے، یہاں اسے سیاہ دھاری سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔ پھر جب صبحِ صادق ہوتی ہے تو جس جگہ افق کا کنارہ ہوتا ہے، وہاں سے چوڑائی میں روشنی ظاہر ہونی شروع ہوتی ہے، جو ایک دھاگے یا دھاری کی شکل میں ہوتی ہے، اسے سفید دھاری سے تعبیر کیا گیا ہے۔ وہ سفید دھاری صبحِ صادق کی دھاری ہوتی ہے، جو مشرق کے افق پر نمودار ہوتی ہے۔

اللہ تعالیٰ فرمارہے ہیں کہ جب تک وہ سفید دھاری، سیاہ دھاری سے بالکل ممتاز ہوکر تمہارے سامنے واضح طور سے نہ آجائے اس وقت تک تمہارے لیے کھانا پینا جائز ہے، یعنی صبحِ صادق ہونے کا جب تک یقین نہ ہوجائے اس وقت تک تمہارے لیے کھانا پینا جائز ہے، لیکن جب صبحِ صادق کا یقین ہوگیا کہ فلاں وقت میں صبح صادق ہوچکی ہے، تو اب مزید کھانا پینا حرام ہے۔ اسی لیے علمائے کرام نے فرمایا کہ اگر کسی شخص کو کسی وقت شک ہے کہ معلوم نہیں کہ ابھی صبحِ صادق طلوع ہوئی ہے یا نہیں اور اس شک کی حالت میں اس نے کھالیا تو اس سے روزہ نہیں ٹوٹتا، روزہ پھر بھی ہوجاتا ہے، لیکن اگر یقین ہو کہ صبحِ صادق ہوچکی ہے اور پھر بھی کوئی آدمی کھالے تو پھر وہ روزہ نہیں ہوتا۔ (۱)

---

(۱) المحيط البرهاني في الفقه النعماني (۳۸۳/۲): "وشك في طلوع الفجر، .....وإن أكل لا يكون مسيئاً، ولا قضاء عليه، إلا إذا كان أكبر رأيه أن الفجر طالع."

آج کل چونکہ افق کی دھاریوں کو دیکھنے کا سلسلہ خاص طور سے شہری زندگی میں مشکل ہو گیا ہے، بلکہ دیہاتی زندگی میں بھی روشنیاں ہونے کی وجہ سے پوری طرح اس کی پہچان نہیں ہوسکتی، تو اس مشکل کے حل کے لیے اللہ تعالیٰ نے جس حساب کے ساتھ سورج اور چاند کی گردشیں بنائی ہیں، اسی کے حساب سے ریاضی کے حسابات کے ذریعے جنتریاں، دائمی نقشے اور کلینڈر تیار کر لیے گئے ہیں، ان جنتریوں میں جو وقت لکھا ہوتا ہے، وہ عام طور سے صبحِ صادق کا صحیح وقت ہوتا ہے، لہٰذا جب وہ وقت ہوجائے تو اس کے بعد پھر کھانا پینا جائز نہیں، اس سے پہلے پہلے آدمی کھا پی سکتا ہے۔

اوقاتِ صلاۃ وصوم کے لیے جنتری کے استعمال میں ایک احتیاط

پھر فرمایا: ﴿ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى الَّيْلِ﴾ ''پھر روزوں کو پورا کرو رات تک،'' یعنی جب تک رات نہ آجائے، اس وقت تک روزہ افطار نہیں کر سکتے، بلکہ روزے کا وقت پورا کرنا ضروری ہے۔ یہاں پھر وہی معاملہ ہے کہ جب تک رات آنے کا یقین نہ ہوجائے اس وقت تک کچھ کھانا پینا جائز نہیں، کیونکہ دن تو یقینی طور پر چلا آرہا ہے، اگر رات میں شک ہے کہ پتہ نہیں رات شروع ہوئی ہے یا نہیں، یعنی سورج غروب ہوا یا نہیں، تو اس وقت کھانا جائز نہیں ہے، البتہ جب غروب ہونے کا یقین ہوجائے تو پھر اس کے بعد کھانا پینا جائز ہوتا ہے۔

یہاں پر بھی جنتریوں سے کام لیا جاسکتا ہے کہ جس سے یقین ہوجائے کہ اب سورج غروب ہوگیا ہے، البتہ جنتریوں میں اتنا خیال رکھنا چاہیے کہ جنتری اگر کسی شہر سے متعلق بنائی گئی ہو، تو وہ شہر کی کسی ایک خاص جگہ سے متعلق ہوتی ہے، جبکہ آدمی جس جگہ مقیم ہے یا جہاں اس کا گھر ہے وہ جگہ بعض اوقات جنتری کے لیے متعین کیے گئے اس خاص مقام سے کچھ فاصلہ پر ہوتی ہے، اس فاصلے پر ہونے کی وجہ سے بعض اوقات کچھ سیکنڈ کا یا بعض اوقات اس سے زیادہ کا بھی کچھ فرق ہوسکتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عام طور سے جنتریوں میں تو صرف منٹ لکھے ہوتے ہیں، سیکنڈ کا حساب نہیں ہوتا، حالانکہ روزانہ جو طلوع اور غروب ہوتا ہے اس میں بعض اوقات سیکنڈوں کا بھی فرق ہوتا ہے، لہٰذا چونکہ سیکنڈوں کا بھی فرق ہوسکتا ہے اس لیے بہتر یہ ہے کہ افطار میں یہ اہتمام کیا جائے کہ جنتریوں میں جو وقت لکھا گیا ہے اس میں ایک دو منٹ احتیاط شامل کر لی جائے، تاکہ اگر کوئی تھوڑا بہت فرق ہے تو وہ بھی ختم ہوجائے۔

حالتِ اعتکاف میں بیوی سے مباشرت

پھر فرمایا: ﴿وَلَا تُبَاشِرُوْهُنَّ وَاَنْتُمْ عٰكِفُوْنَ ۙ فِي الْمَسٰجِدِ﴾ ''اور تم ان (اپنی بیویوں) سے اس حالت میں مباشرت نہ کرو جب تم مسجدوں میں اعتکاف کی حالت میں ہو۔''

پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ روزے کے دنوں میں رات کے وقت کھانا پینا، بیوی سے مباشرت کرنا سب حلال ہے، اب یہاں بتایا گیا کہ حالتِ اعتکاف میں کھانے پینے کا تو وہی حکم ہے جو سب کے لیے ہے، لیکن اس حالت میں بیوی سے مباشرت کرنا رات میں بھی جائز نہیں۔ اعتکاف میں انسان مسجد میں ہوتا ہے، وہاں سے اسے ویسے ہی نکلنا جائز نہیں ہوتا تو اس لیے حکم دیا گیا کہ اس حالت میں مباشرت رات میں بھی جائز نہیں ہے۔(۱)

اللہ تعالیٰ کی مقرّر کردہ حدوں کی ضرورت و اہمیت

روزے میں کھانے پینے اور مباشرت کی ممانعت بیان کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ آخر میں فرماتے ہیں کہ ﴿تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ﴾ یہ اللہ کی مقرّر کی ہوئی حدود ہیں ﴿فَلَا تَقْرَبُوْهَا﴾ ''لہٰذا ان کے قریب بھی مت جانا'' یعنی ان کی خلاف ورزی کے قریب بھی مت جانا۔

''تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ'' والا یہ جملہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے قرآنِ کریم میں بہت سی جگہوں پر ارشاد فرمایا ہے اور یہ بڑا معنیٰ خیز جملہ ہے۔ معنیٰ خیز اس لیے ہے کہ انسانی زندگی میں ہر چیز کے اندر توازن ہونا ضروری ہے، ایک کام اگر اپنی صحیح حد میں کیا جائے تو وہ مفید بھی ہے اور اس سے بہت سی مصلحتیں بھی حاصل ہوتی ہیں، لیکن اگر آدمی اس حد سے آگے بڑھ جائے، تو وہی کام نقصان دہ ہو جاتا ہے۔

اسی طرح بعض اوقات کوئی حد ایسی ہے کہ کوئی کام اس سے اگر کم ہو جائے تو نقصان دہ ہو جاتا ہے۔ مثلاً کھانے کو ہی لے لیجیے کہ کھانا انسان کی ضرورت ہے، اس کے بغیر انسان زندہ نہیں رہ سکتا، لیکن ایک خاص حد ہے کہ اس حد تک وہ کھائے گا تو کھانا اس کے لیے فائدہ مند ہوگا اور اس کی جسمانی ترقی، صحت اور

---

(۱) اعتکاف کے احکام سے متعلق حضرت والا (حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب) دامت برکاتہم کا ایک وقیع رسالہ ''احکامِ اعتکاف'' کے نام سے شائع شدہ ہے۔ تفصیلی مسائل کے لیے اسے ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔ (راشد)

قوت کا سبب بنے گا، لیکن اگر اس حد سے زیادہ کھا لیا جائے تو وہی کھانا انسان کے لیے تکلیف اور بیماری کا سبب بن جائے گا۔ اسی طرح اگر کوئی شخص ضرورت سے کم کھائے، جتنا کھانا چاہیے، اس سے کم کھائے تو اس میں بھی انسان کو کمزوری لاحق ہوجائے گی اور وہ اپنے جسم کا حق ادا نہیں کرسکے گا۔

یہ بات تقریباً دنیا کے ہر کام میں ہے کہ ایک حد تک وہ کام فائدہ مند ہے، اس سے آگے بڑھ کر وہ نقصان دہ بن جاتا ہے اور اس سے کم رہ کر بھی نقصان دہ ہوجاتا ہے۔ اس لیے ہر چیز میں ایک توازن قائم ہونا ضروری ہے۔ اب توازن کیسے قائم کیا جائے؟ اور کون ہے جو یہ حد قائم کرے کہ یہاں تک تو یہ کام ٹھیک ہے اور اس سے آگے غلط ہے؟ اگر انسان اپنی عقل سے کام لینا چاہے تو بہت سی جگہوں پر تو واقعی عقل سے اسے یہ فائدہ حاصل ہوجاتا ہے، مثلاً اسے ایک حد معلوم ہوجاتی ہے کہ اس سے آگے بڑھنا مناسب نہیں۔ جیسے کھانے کے بارے میں سائنسی تحقیق کے ذریعے آدمی یہ پتہ لگا سکتا ہے کہ انسان کو ایک وقت میں کتنے وزن یا کتنی مقدار کا کھانا کھانا چاہیے، لیکن بہت سی چیزیں ایسی ہیں جن کی حدود عقل سے پتہ نہیں چلتیں تو ایسے مواقع پر اللہ تبارک وتعالیٰ جو احکام نازل فرماتے ہیں وہ ''حدودُ اللہ'' کہلاتے ہیں، یعنی اللہ تبارک وتعالیٰ نے حد مقرّر کردی ہے کہ فلاں کام تم اس حد تک کروگے تو تمہارے لیے فائدہ مند ہوگا اور اس سے زیادہ کروگے تو تمہارے لیے نقصان دہ ہوگا۔

• روزوں کے باب میں حدودُ اللہ کی مثال

روزے ہی کو لے لیجیے کہ روزے میں اللہ تعالیٰ نے یہ حد مقرّر کردی کہ صبح صادق سے پہلے پہلے تک کھانا جائز ہے، لیکن صبح صادق ہوتے ہی ناجائز ہوگیا۔ اسی طرح روزہ رکھنا اور کھانے پینے سے پرہیز کرنا غروبِ آفتاب تک تو فرض ہے، لیکن جونہی غروبِ آفتاب ہوتو پھر یہ حکم دیا گیا کہ اس کے بعد روزے کو جاری نہیں رکھنا چاہیے، پھر اسے ختم کردینا چاہیے۔

کسی آدمی کے دل میں یہ خیال پیدا ہوسکتا ہے کہ فرض کیجیے کسی آدمی کو صبحِ صادق کا یقین ہوگیا تھا اور صبحِ صادق ہونے کے بعد اس نے ایک دو منٹ بعد تک کھا لیا اور پھر جب افطار کیا، تو افطار میں دو منٹ تاخیر کردی تاکہ روزے کا دورانیہ پورا ہوجائے، تو بظاہر تو وقت برابر ہوگیا، کیونکہ اس نے دو منٹ تاخیر سے روزہ بند کیا اور پھر دو منٹ تاخیر سے ہی افطار کیا، اور جب دورانیہ برابر ہوگیا تو روزہ درست ہونا چاہیے، لیکن یہاں

شریعت کا حکم یہ ہوگا کہ یہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی خلاف ورزی ہے، کیونکہ شرعی احکام میں عقل دوڑانا اور عقل کے ذریعہ حدیں مقرر کرنا انسان کا کام نہیں ہے یہ اللہ تعالیٰ کی مقرر کی ہوئی حدیں ہیں اور اس حد کی خلاف ورزی انسان کے لیے کسی طرح بھی جائز نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی مقرر کی ہوئی حدوں کے بارے میں ارشاد فرمایا کہ ﴿فَلَا تَقْرَبُوْهَا﴾ ''ان کے قریب بھی مت جانا۔'' اس لیے کہ روزے کا اصل مقصود انسان کو اللہ تبارک وتعالیٰ کے حکم کی تابعداری کی عادت پر ڈالنا ہے۔ جب اللہ کا حکم آ گیا کہ کھاؤ تو کھانا ضروری، جب اللہ کا حکم آ گیا کہ کھانا چھوڑ دو تو کھانا چھوڑنا ضروری۔ اب اس میں منٹوں کا حساب کتاب نہیں ہے، بلکہ جونہی اللہ کا حکم آجائے کہ کھانا بند کردو تو اس کے بعد پھر ایک منٹ کی بھی گنجائش نہیں، اگر ایک منٹ کے بعد بھی کھانا جاری رکھا تو یہ اللہ تعالیٰ کے حکم اور اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ حد کی خلاف ورزی ہوگئی۔ اسی طرح اگر کسی نے غروبِ آفتاب کا یقین ہوجانے کے بعد اپنی طرف سے یہ سوچ کر کہ اگر میں غروبِ آفتاب کے بعد کچھ دیر مزید رُک کر کھانا کھاؤں تو بہتر ہے تاکہ مجھے زیادہ اجر ملے، کیونکہ مشقت زیادہ ہوگی تو اس پر ثواب بھی زیادہ ملے گا، لیکن ایسا کرنا جائز نہیں ہے، کیونکہ اس نے دین کے ایک حکم میں اپنی طرف سے اضافہ کردیا، اس اضافہ کے نتیجے میں اسے نہ صرف یہ کہ کوئی ثواب نہیں ملے گا، بلکہ گناہ بھی ہوگا۔

اسی لیے حدیث میں اس بات کی تاکید آئی کہ افطار میں جلدی کرنی چاہیے،[1] لہٰذا جب غروب آفتاب کا یقین ہوجائے اور کوئی شبہ باقی نہ رہے تو اس کے بعد افطار کرنے میں دیر نہیں کرنی چاہیے،[2] اس لیے کہ اس وقت اگر تم دیر کروگے تو وہ دیر کرنا خود اپنی طرف سے ہوگا اور اللہ تعالیٰ کی مقرر کی ہوئی جو حد ہے، اسے تم پار کرنے والے بن جاؤ گے۔ جس طرح اس حالت میں جبکہ صبحِ صادق ہوچکی ہے کھانا پینا حرام ہے، اسی طرح غروبِ آفتاب کے بعد اس قصد وارادے سے کہ میرا روزہ اور طویل ہوجائے، افطار کرنے میں دیر کرنا بھی حرام ہے، اس لیے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی مقرر کی ہوئی حدود ہیں جن کی پابندی کرنا ضروری ہے۔

---

(۱) كما في صحيح البخاري (۳/۳٦) (۱۹۵۷): "أن رسول الله ﷺ قال: "لا يزال الناس بخير ما عجلوا الفطر." كتاب الصوم، باب تعجيل الإفطار.

(۲) انظر: فتح الباري لابن حجر (٤/۱۹۹) الناشر: دار المعرفة بيروت.

روزے میں دن کے وقت تو کھانا کھانا، پانی پینا، صحبت کرنا منع ہے، لیکن رات کو اللہ تعالیٰ نے اجازت دے دی ہے کہ یہ سارے کام کیے جا سکتے ہیں، یہ ساری اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرّر کی ہوئی حدود ہیں، جن کی پابندی لازم ہے۔ بتانا دراصل یہ منظور ہے کہ دین نام ہے اتباع کا، نہ کھانے میں کچھ رکھا ہے، نہ فاقہ کرنے میں۔ جب اللہ تعالیٰ کا حکم ہو کہ مت کھاؤ، تو روزہ عبادت بن گیا، اور جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ کھاؤ، تو اب کھانا ہی عبادت ہے اور کھانے کو چھوڑنا گناہ ہے۔

• نماز کے باب میں حدود اللہ کی مثال

اللہ تعالیٰ کی مقرّر کی ہوئی یہ حدیں صرف روزوں کے بارے میں ہی نہیں، بلکہ زندگی کے دیگر بہت سے مسائل میں بھی یہ حدود مقرّر ہیں۔ مثلاً نماز ہی کو لے لیجیے، نماز کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ صبح کی نماز دو رکعت ہیں اور ظہر، عصر، عشاء کی نماز چار چار رکعتیں ہیں، مغرب کی تین رکعتیں ہیں، یہ اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی حدیں ہیں۔ اب کوئی شخص یہ چاہے کہ میں تین رکعتوں کے بجائے چار پڑھ لوں تو اس نے اس میں اضافہ کرلیا اور اللہ تعالیٰ کی حد کو توڑ دیا۔ اب اِس میں اِتباع نہ رہا، بلکہ اپنی طرف سے انسان نے ایک طریقہ گھڑ لیا اور اس کے مطابق چل پڑا۔

قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ جگہ جگہ فرماتے ہیں: ﴿تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ﴾ ''یہ اللہ تعالیٰ کی مقرّر کی ہوئی حدیں ہیں۔'' کہیں میراث کے احکام بیان کرتے ہوئے درمیان میں فرمایا کہ ''یہ اللہ تعالیٰ کی مقرّر کی ہوئی حدیں ہیں۔''(۱) اور کہیں طلاق کے معاملات بیان کرتے ہوئے آخر میں فرمایا کہ ''یہ اللہ کی مقرّر کی ہوئی حدود ہیں، لہٰذا ان سے تجاوز نہ کرو۔''(۲) معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی مقرّر کی ہوئی حدود کا تعلق دین کے ہر ہر شعبے کے ساتھ ہے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے جس کام کی جو حد مقرّر فرمادی ہے، بندے کی حیثیت سے ہمارا فرض بنتا ہے کہ ان حدود کی پابندی کریں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ﴿فَلَا تَقْرَبُوْهَا﴾ ''لہٰذا اس کے قریب بھی مت

---

(۱) سورۃ النساء (۴): آیت (۱۳)

(۲) سورۃ البقرۃ (۲): آیت (۲۲۹)

جانا،'' یعنی اس کی خلاف ورزی کے قریب بھی مت جانا، کیونکہ قریب جانے میں حد شکنی کا احتمال ہے۔اسی لیے فقہاء نے فرمایا کہ روزے کی حالت میں کلی کرنے میں اس قدر مبالغہ کرنا مکروہ ہے، جس سے پانی اندر جانے کا خطرہ پیدا ہوجائے۔[1] روزے کی حالت میں کلی کرتے ہوئے اگر اس قدر مبالغہ کیا جائے گا تو اس بات کا احتمال ہے کہ پانی حلق میں چلا جائے، اس لیے اس راستے کو بھی بند کردیا گیا۔ ﴿كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ﴾ اسی طرح اللہ اپنی نشانیاں لوگوں کے سامنے کھول کھول کر بیان کرتا ہے۔ ﴿لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ۱۸۷﴾ ''تاکہ وہ تقویٰ اختیار کریں،'' یعنی یہ سارے جو احکام دیے جارہے ہیں، اُن کا مقصود یہ ہے کہ تمہارے دلوں میں اللہ تعالیٰ کا تقویٰ پیدا ہو، اللہ تعالیٰ کے سامنے جوابدہی کا احساس پیدا ہو۔ یہی وہ احساس ہے جو تمہیں زندگی میں غلط راستوں پر جانے سے روکتا رہے گا۔

آیت نمبر ۱۸۸

وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوْا بِهَآ اِلَى الْحُكَّامِ لِتَاْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۱۸۸ ع ۲۳ ۶ ۷

اور آپس میں ایک دوسرے کا مال ناحق طریقوں سے نہ کھاؤ، اور نہ ان کا مقدمہ حاکموں کے پاس اس غرض سے لے جاؤ کہ لوگوں کے مال کا کوئی حصہ جانتے بوجھتے ہڑپ کرنے کا گناہ کرو۔ ۱۸۸

ناجائز طریقے سے مال کھانے کی ممانعت پر مشتمل اصولی ہدایات

اس آیتِ کریمہ میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے ناجائز طریقے سے مال حاصل کرنے اور اسے استعمال کرنے کی مذمّت (برائی) بیان فرمائی ہے اور اسے حرام قرار دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان کے دل میں جو غلط خواہشات پیدا ہوتی ہیں اُن میں ایک بہت بڑی غلط خواہش یہ ہے کہ مجھے کسی نہ کسی طریقے سے مال حاصل ہو جائے اور میں زیادہ سے زیادہ امیر بن جاؤں۔ اس خواہش کے نتیجے میں بعض اوقات وہ تمام حدوں کو

---

(۱) المحيط البرهاني في الفقه النعماني (۳۸۹/۲): "ويكره المبالغة في المضمضة"، الفصل السادس فيما يكره للصائم-

پھلانگ جاتا ہے اور ناجائز اور حرام طریقوں سے مال حاصل کرنے کی فکر کرتا ہے۔ اس لیے روزوں کے بیان کے بعد اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہ بات ارشاد فرما دی کہ روزوں کا جو مقصد تھا کہ تمہارے دل میں تقویٰ، خدا کا خوف اور آخرت کی فکر پیدا ہو اور اپنے نفس پر قابو پانے کی عادت پڑ جائے، تو اس کا مظاہرہ صحیح معنیٰ میں اس وقت ہوگا جب تم مال کو حاصل کرنے کے وقت یہ دیکھو گے کہ کون سا مال حلال ہے اور کون سا حرام ہے؟ کون سے مال سے میں فائدہ اٹھا سکتا ہوں اور کون سے مال سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا؟

• معاملات کی اہمیت عبادات سے بھی زیادہ

یہاں یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ اس آیت سے پہلے اللہ تبارک وتعالیٰ نے روزے کے احکام دیے ہیں جن کا تعلق عبادات سے ہے اور اس کے بعد فوراً جو احکامات آئے ہیں وہ حج کے ہیں اور اس کے بعد پھر قتال، یعنی جہاد کے احکام آرہے ہیں۔ ان تمام احکام کا تعلق ان عبادتوں سے ہے جو بذاتِ خود اور براہِ راست عبادتیں ہیں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان عبادات کے بیان کے بیچ میں یہ آیت رکھی ہے۔ اس کا شانِ نزول کچھ بھی ہو، لیکن قرآنِ کریم کی موجودہ ترتیب میں یہ آیت روزے اور حج کے درمیان آئی ہے اور اس آیت کا تعلق آپس کے معاملات سے ہے۔

اس سے شاید اس طرف بھی اشارہ مقصود ہو کہ بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اگر ہم نے ظاہری عبادتوں کو انجام دے لیا تو بس اللہ تعالیٰ کا حق ادا ہوگیا اور اب اس کے بعد ہمارے معاملات، ہماری خرید وفروخت، ہمارے مال حاصل کرنے کے طریقے اور ہمارے روزگار کمانے کے وسائل، یہ سب کچھ ہم جس طرح اختیار کرنا چاہیں اختیار کر سکتے ہیں، یہ ہماری اپنی صوابدید پر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس غلط فہمی کو دور کرنے کے لیے عبادتوں کا ذکر کرتے ہوئے بیچ میں یہ آیت عطا فرمائی، جس میں بتایا کہ جتنی اہمیت اس بات کو حاصل ہے کہ تم عبادتیں اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق اور نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سُنّت کے مطابق ادا کرو، اتنی ہی اہمیت، بلکہ اس سے بھی شاید کچھ زیادہ اہمیت اس بات کی ہے کہ تم جو کما رہے ہو یا استعمال کر رہے ہو وہ حلال ہو اور اس میں کسی دوسرے بندے کا حق غصب نہ کیا گیا ہو۔ اسی لیے اسلام کے دو بنیادی ارکان؛ روزوں اور حج کے بیچ میں اللہ تبارک وتعالیٰ آپس کے معاملات سے متعلق یہ آیت یہاں پر لائے ہیں۔

- **دوسروں کا مال کھانے کی ممانعت کا بلیغ انداز**

اس آیت کا بنیادی مفہوم ناجائز طریقوں سے مال حاصل کرنے کی ممانعت کرنا ہے، لیکن اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس کے لیے جو الفاظ استعمال فرمائے ہیں، وہ بڑے قابلِ غور ہیں، چنانچہ فرمایا: ﴿وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ﴾ ''اور آپس میں ایک دوسرے کا مال ناحق طریقے سے نہ کھاؤ'' یہاں پر اس آیت کا لازمی اور مفہومی ترجمہ کیا گیا ہے، ورنہ لفظی ترجمہ یہ ہوگا کہ ''مت کھاؤ اپنے مال آپس میں باطل (یعنی ناجائز) طریقے سے۔'' یہاں بات کا جو مقصود ہے اس کا تقاضا یہ تھا کہ یہاں پر یہ کہا جاتا کہ ''دوسروں کا مال ناحق طریقے سے قبضے میں لے کر مت کھاؤ'' لیکن یہ کہنے کے بجائے فرمایا: ﴿اَمْوَالَكُمْ﴾ یعنی ''تمہارے اپنے جو اموال ہیں وہ آپس میں باطل طریقے سے نہ کھاؤ۔''

اللہ تعالیٰ نے جو تعبیر اختیار فرمائی ہے، اس میں بظاہر ایک تو اس طرف اشارہ ہے کہ اگر دوسرے آدمی کے کسی مال میں تم ناجائز تصرف کررہے ہو یا اسے ناجائز طریقے سے حاصل کر رہے ہو، تو درحقیقت اس کا نتیجہ خود تمہارے اپنے ذاتی حلال مال کو نقصان پہنچنے کی صورت میں نکلے گا۔ اگر تم دوسرے انسان کی کسی ملکیت والے مال پر ناجائز قبضہ کرنا چاہتے ہو یا ناجائز طریقے سے اسے حاصل کرنا چاہتے ہو، تو بالآخر اس کا انجام یہ ہوگا کہ تمہارا اپنا مال بھی خطرے میں پڑ جائے گا، جو کہ تم نے حلال طریقے سے کمایا ہوا ہے۔ کیونکہ جب کوئی شخص کسی دوسرے کے مال میں ناجائز تصرف کرتا ہے، تو وہ ایک غلط رسم شروع کرتا ہے، اب اگر یہ رسم چل پڑی تو دوسرے اس کے مال میں بھی ایسا ہی ناجائز تصرف کریں گے۔

اگر معاشرے میں یہ وبا عام ہوجائے تو اس وبا کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ فرض کیجیے ایک شخص نے کسی دوسرے سے رشوت لے کر اپنے مال میں ایک ہزار کا اضافہ کرلیا، لیکن یہی شخص جب دوسرے کسی شخص کے پاس جائے گا یا جب اسے کوئی سرکاری کام پڑے گا، تو وہاں پر اسے رشوت دینی ہوگی اور بعض اوقات یہ بھی ہوسکتا ہے کہ جتنی رشوت اس نے لی تھی، اس سے زیادہ اسے دینی پڑ جائے، تو اس طرح اس نے جہاں دوسرے کا مال کھایا، وہیں اس کے مال کا بھی نقصان ہوگیا۔

ان الفاظ میں ایک دوسرا اشارہ اس طرف بھی ہوسکتا ہے کہ جب تم کسی دوسرے کے مال پر ناجائز قبضہ کرنا چاہتے ہو یا ناجائز طریقے سے اسے حاصل کرنا چاہتے ہو، تو ذرا یہ سوچو کہ اگر تمہارے ساتھ وہی معاملہ کیا جائے، یعنی دوسرا شخص تمہارا کوئی مال اپنے ناجائز مقصد کے لیے، ناجائز طریقے سے غصب کرے یا

زبردستی تم سے چھینے تو تمہارا کیا حال ہوگا؟ جب تم اپنے مال کے بارے میں یہ سمجھتے ہو کہ کسی کو اس پر ناجائز قبضہ نہیں کرنا چاہیے تو دوسرے کے مال کے بارے میں بھی یہی سمجھو اور اسے ناجائز طریقے سے مت حاصل کرو۔

ویسے تو مال اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے اور پیچھے وصیت کے احکام سے متعلق جو آیت گزری ہے،[1] وہاں مال کے لیے ''خیر'' کا لفظ استعمال کیا گیا تھا، یعنی وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے دی گئی ایک بھلائی اور اچھی چیز ہے، لیکن اس اچھی چیز کو حاصل کرنے کے لیے تمہارے اوپر یہ لازم ہے کہ تم اس بات کو دیکھو کہ وہ چیز حق اور جائز طریقے سے حاصل ہورہی ہے یا ناحق اور ناجائز طریقے سے؟ اگر جائز طریقہ ہے تو ٹھیک ورنہ اس سے اجتناب لازم ہے۔ نبیِ کریم سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی تعلیمات کا ایک بہت بڑا حصہ اس آیت کی تفسیر میں اور یہ بتانے میں خرچ کیا ہے کہ کون سا طریقہ حلال اور کون سا حرام ہے؟

• حلال وحرام کی تعیین کے لیے وحیِ الٰہی کی ضرورت

اتنی بات تو اصولی طور پر ہر انسان - چاہے وہ مسلمان ہو یا غیر مسلم - جانتا ہے اور سمجھ سکتا ہے کہ مال حاصل کرنے کے کچھ طریقے جائز، یعنی اچھے اور معقول ہیں اور کچھ طریقے ناجائز، یعنی غلط اور برے ہیں۔ بعض طریقوں کے بارے میں ساری دنیا کا کوئی بھی معقول انسان یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ جائز طریقہ ہے، مثلاً چوری اور ڈاکے کا طریقہ، اسے کون کہے گا کہ جائز یا حلال ہے یا اچھی بات ہے؟ اسی طرح دوسرے کا مال زبردستی غصب کرلینا اور چھین لینا، اسے کون کہے گا کہ یہ کوئی اچھا طریقہ ہے؟

لہٰذا معلوم ہوا کہ بعض طریقے تو ایسے ہیں جن کے بارے میں ہر وہ انسان جس میں ذرا بھی سمجھ بوجھ ہو وہ سمجھ سکتا ہے کہ یہ طریقہ باطل یا ناحق ہے اور اس طریقے سے مال حاصل کرنا جائز نہیں ہے، لیکن مال حاصل کرنے کے بہت سے طریقے ایسے بھی ہیں جن کے بارے میں ہر انسان محض اپنی سمجھ سے یہ فیصلہ نہیں کرسکتا کہ یہ طریقہ میرے لیے یا انسانیت کے لیے بحیثیتِ مجموعی جائز ومفید ہے یا نہیں؟ یہی وہ مقام ہے جہاں تنہا انسان کی عقل کام نہیں دے سکتی۔ اگر آپ مختلف معاشروں کا مطالعہ کریں، تو کسی معاشرے میں کسی طریقے کو جائز اور دوسرے معاشرے میں اسی کو ناجائز قرار دیا گیا ہوتا ہے، انسانوں کی سوچ اور صحیح غلط کے حوالے سے

---

(۱) سورۃ البقرۃ (۲): آیت (۱۸۰)

ان کے الگ الگ معیارات کے سبب ان کے درمیان اختلافات پیدا ہوتے رہتے ہیں، ایک چیز کو ایک شخص درست قرار دیتا ہے تو دوسرا غلط قرار دیتا ہے۔

اب مثال کے طور پر سود کو لیجیے، سود لینے کو بہت سے معاشروں میں بالکل جائز اور درست سمجھا جاتا ہے۔ خود قرآنِ کریم میں ذکر ہے کہ جو مشرکینِ مکّہ تھے وہ سود کی حرمت اور ممانعت پر اعتراض کیا کرتے تھے کہ یہ بھی تو طریقۂ تجارت کا ایک حصہ ہے، وہ کہا کرتے کہ ''بیع بھی تو سود ہی کی طرح ہوتی ہے،''[1] ان کی عقل انہیں یہ کہہ رہی تھی کہ یہ طریقہ جائز ہے۔ اسی طرح وہ جوا کھیلتے تھے اور ان کے ہاں جُوا کھیلنے کے مختلف طریقے رائج تھے، جیسا کہ آج بھی دنیا میں بہت سے طریقے رائج ہیں اور ان کے بارے میں کہا جاتا ہے، اِن طریقوں میں کوئی حرج نہیں، کیونکہ باہمی رضا مندی سے ایک دوسرے کے ساتھ معاملہ کیا جا رہا ہے جو کہ درست ہے۔ یہی وہ موقع ہے جہاں عقل کو وحی کی رہنمائی کی ضرورت پیش آتی ہے اور اللہ تبارک وتعالیٰ نبیِ کریم سرورِ دوعالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیمات کے ذریعے لوگوں کو یہ بتاتے ہیں کہ فلاں طریقہ حلال اور فلاں طریقہ حرام ہے۔

• صاحبِ وحی کے ذریعے جائز و ناجائز معاملات کی تعلیم

اللہ تبارک وتعالیٰ نے قرآنِ کریم اور نبیِ کریم سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیمات کے ذریعے لوگوں کی رہنمائی کی اور بتایا کہ مال کمانے کا کون سا طریقہ درست ہے اور کون سا باطل اور ناحق ہے؟ چنانچہ ناحق طریقوں میں سود کا لین دین، قمار کا لین دین، رشوت کا لین دین اور وہ تمام ناجائز اور حرام یا فاسد اور باطل معاملات شامل ہیں، جن کی تفصیل نبیِ کریم سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے احادیث میں بیان فرمائی اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی احادیث کی روشنی میں فقہائے کرام نے اس کی تفصیلات فقہ کی کتابوں میں مدوّن کی ہیں۔ نبیِ کریم سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے احادیثِ مبارکہ میں وہ بنیادی اصول متعین فرما دیے، جن کی روشنی میں قیامت تک کے موجودہ اور نئے پیش آنے والے معاملات اور کاروبار کی جدید صورتوں کو پرکھا جا سکتا ہے۔

• حرام مال کی نحوست اور حلال کی برکات

اگر حرام طریقے سے کوئی مال حاصل کیا جائے یا کھایا جائے تو وہ بے برکتی اور نحوست پیدا کرتا ہے جس کا

---

(۱) سورۃ البقرۃ (۲): آیت (۲۷۵)

ذکر قرآنِ کریم میں اور سنت میں مختلف مقامات پر آیا ہے۔ حدیث میں نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ حرام مال کھانے والے کی دعا بھی قبول نہیں ہوتی۔ (۱) اسی طرح ایک اور حدیث میں فرمایا کہ:

''وہ جسم ہرگز جنت میں داخل نہ ہوگا جو حرام کمائی سے پروان چڑھا ہو۔'' (۲)

جبکہ اس کے مقابلے میں اگر کوئی مال حلال طریقے سے کھایا جاتا ہے تو اس سے اللہ تبارک وتعالیٰ کی رضا مندی حاصل ہوتی ہے اور اس میں برکتیں ہوتی ہیں۔ حلال کھانے میں برکت یہ ہے کہ اسے کھانے کے نتیجے میں آدمی کے دل میں نیک جذبات پیدا ہوتے ہیں، چنانچہ قرآنِ کریم میں فرمایا کہ:

يٰٓاَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبٰتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا (۳)

اے پیغمبرو! حلال اور پاکیزہ چیزوں میں سے کھاؤ اور نیک عمل کرو۔

مفسرینِ کرام (۴) نے فرمایا کہ حلال اور پاک چیزیں کھانے کا ایک نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان کے دل میں نیکی کرنے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے، اور حرام خوری کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس سے انسان کے دل میں فسق و فجور کے، بدکاریوں کے اور گناہوں کے جذبات پیدا ہوتے ہیں، لہٰذا اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہ اصولی ہدایت عطا فرمائی کہ باطل طریقے سے ایک دوسرے کا مال نہ کھاؤ، اس میں ہر ناجائز طریقہ شامل ہوگیا۔

• حرام مال کے لیے جھوٹا مقدمہ کئی گناہوں کا مجموعہ

پھر آگے اللہ تبارک وتعالیٰ نے ناجائز اور حرام طریقے سے مال کھانے کی ایک خاص صورت، اس کی خصوصی اہمیت کی وجہ سے بیان فرمائی، چنانچہ باری تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿وَتُدْلُوْا بِهَآ اِلَى الْحُكَّامِ﴾ ''اور نہ

---

(۱) كما في صحيح مسلم (۲/۷۰۳) (۱۰۱۵): "...ثم ذكر الرجل يطيل السفر أشعث أغبر، يمد يديه إلى السماء، يا رب، يا رب، ومطعمه حرام، ومشربه حرام، وملبسه حرام، وغذي بالحرام، فأنى يستجاب لذلك؟" كتاب الزكاة، باب قبول الصدقة من الكسب الطيب وتربيتها.

(۲) كما في سنن الترمذي (۲/۵۱۳) (٦١٤): "إنه لا يربو لحم نبت من سحت إلا كانت النار أولى به." الحديث حسنه الترمذي وقال الهيثمي في "المجمع" (۵/۲٤۷): "رواه أحمد والبزار.....ورجالهما رجال الصحيح."

(۳) سورة المؤمنون (۲۳): آیت (۵۱)

(۴) انظر: تفسير ابن كثير (٥/٤١٥).

ان کا مقدّمہ حاکموں کے پاس لے جاؤ۔'' جس کا حاصل یہ ہے کہ ناجائز مال کو حاصل کرنے کا مقدّمہ حاکموں کے پاس اس غرض سے نہ لے کر جاؤ کہ لوگوں کے مال کا کوئی حصہ جانتے بوجھتے ہوئے ہڑپ کرنے کا گناہ کرو، یعنی یہ تو ہے ہی ناجائز کہ آدمی دوسرے کا مال ناجائز طریقے سے ہڑپ کرے، لیکن اس گناہ میں اور اضافہ اس طرح ہو جاتا ہے کہ بعض اوقات لوگ اپنے اس مال کو جائز مال قرار دینے کے لیے، اس کا مقدّمہ کسی حاکم کے پاس لے جاتے ہیں اور اس حاکم کو کچھ رشوت دے دلا کر اپنے حق میں فیصلہ لے لیتے ہیں۔ اس آیتِ مبارکہ میں اس عمل سے منع کیا گیا ہے، کیونکہ اس میں کئی گناہ جمع جاتے ہیں؛

۱۔ ناجائز اور حرام مال کے حاصل کرنے کا گناہ۔

۲۔ حاکم کو رشوت دینے کا گناہ۔

۳۔ رشوت کا سبب بننے کا گناہ، کیونکہ یہ شخص جو حاکم کو رشوت دے کر اپنے حق میں غلط فیصلہ نکلوا رہا ہے تو یہ حاکم کو بھی رشوت لینے کے گناہ میں مبتلا کر رہا ہے اور یہ اس کے گناہ کے لیے سبب بن رہا ہے۔

گویا اس گناہ کے اندر تین مختلف شاخیں ہیں اور اس طرح یہ بہت سے گناہوں کا مجموعہ بن جاتا ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا کہ لوگوں سے قبضہ کیے ہوئے اموال کا مقدّمہ حاکموں کے پاس اس غرض سے نہ لے کر جاؤ، ﴿لِتَاْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۸۸﴾﴾ ''تاکہ لوگوں کے مال کا کوئی حصہ جانتے بوجھتے ہوئے ہڑپ کرنے کا گناہ کرو۔''

• خوفِ خدا کے بغیر کوئی قانون مؤثر نہیں

ناجائز مال کو حاصل کرنے کا مقدّمہ حاکموں کے پاس لے جانے سے اس لیے منع کیا گیا کہ اس سے رشوت کا چلن عام ہوگا اور اللہ بچائے جب معاشرے میں رشوت کا بازار گرم ہوجائے تو پھر کوئی قانون، کوئی قاعدہ اپنی جگہ صحیح سلامت نہیں رہ سکتا۔ جتنے قاعدے اور قوانین بنتے ہیں وہ معاشرے کی مصلحت اور اسے نفع پہنچانے کے لیے بنتے ہیں، لیکن اگر رشوت کا بازار گرم ہوجائے تو کتنا ہی اچھا قانون ہو، جب وہ قانون بکنے لگے، پیسے دے کر لوگ اس قانون کو خریدنے لگیں، تو پھر کوئی قانون، کوئی قاعدہ اس غلط نتیجے سے انسان کو بچا

نہیں سکتا، جس کے روکنے کے لیے وہ قانون بنا ہے۔

اسی لیے اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے جتنے بھی احکام دیے گئے ہیں، ہر ایک کے ساتھ اللہ کے خوف اور آخرت کی فکر کی تلقین عطا فرمائی گئی ہے، اور یہ تلقین اسی لیے فرمائی گئی ہے کہ تم جتنا ہی اچھا قانون بنا لو، جب تک اللہ تعالیٰ کا خوف اور آخرت کی فکر دل میں نہیں ہوگی، اس وقت تک اس قانون کے نتائج حاصل نہیں ہو سکتے۔ اللہ کا خوف اور آخرت کی فکر اللہ تعالیٰ کے سامنے جھکنے سے، روزے سے اور حج سے پیدا ہوتی ہے، جس کا ذکر آگے آرہا ہے۔ اس ساری تفصیل سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ اس آیتِ مبارکہ کا گزشتہ آیات اور آگے آنے والی آیات کے ساتھ بڑا گہرا تعلق اور ربط ہے، جس کی وجہ سے اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہاں پر اس آیت کو رکھا ہے۔

آیت نمبر ۱۸۹ تا ۱۹۵

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ ؕ قُلْ هِيَ مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ ؕ وَلَيْسَ الْبِرُّ
بِاَنْ تَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰى ۚ وَاْتُوا الْبُيُوْتَ
مِنْ اَبْوَابِهَا ۪ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۱۸۹﴾ وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ
الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ﴿۱۹۰﴾
وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ وَاَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ حَيْثُ اَخْرَجُوْكُمْ وَالْفِتْنَةُ
اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ ۚ وَلَا تُقٰتِلُوْهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتّٰى يُقٰتِلُوْكُمْ
فِيْهِ ۚ فَاِنْ قٰتَلُوْكُمْ فَاقْتُلُوْهُمْ ؕ كَذٰلِكَ جَزَآءُ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۹۱﴾ فَاِنِ انْتَهَوْا
فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۹۲﴾ وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ
الدِّيْنُ لِلّٰهِ ؕ فَاِنِ انْتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ اِلَّا عَلَى الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۹۳﴾ اَلشَّهْرُ
الْحَرَامُ بِالشَّهْرِ الْحَرَامِ وَالْحُرُمٰتُ قِصَاصٌ ؕ فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ

فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ ۪ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۹۴﴾ وَاَنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ ۛ وَاَحْسِنُوْا ۛ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۹۵﴾

ملع

لوگ آپ سے نئے مہینوں کے چاند کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ آپ انہیں بتا دیجیے کہ یہ لوگوں کے (مختلف معاملات کے) اور حج کے اوقات متعین کرنے کے لیے ہیں اور یہ کوئی نیکی نہیں ہے کہ تم گھروں میں اُن کی پشت کی طرف سے داخل ہو، بلکہ نیکی یہ ہے کہ انسان تقویٰ اختیار کرے، اور تم گھروں میں ان کے دروازوں سے داخل ہوا کرو، اور اللہ سے ڈرتے رہو تاکہ تمہیں فلاح حاصل ہو۔ ﴿۱۸۹﴾ اور اُن لوگوں سے اللہ کے راستے میں جنگ کرو جو تم سے جنگ کرتے ہیں، اور زیادتی نہ کرو۔ یقین جانو کہ اللہ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ ﴿۱۹۰﴾ اور تم ان لوگوں کو جہاں پاؤ قتل کرو اور انہیں اس جگہ سے نکال باہر کرو جہاں سے انہوں نے تمہیں نکالا تھا۔ اور فتنہ قتل سے زیادہ سنگین بُرائی ہے۔ اور تم ان سے مسجدِ حرام کے پاس اُس وقت تک لڑائی نہ کرو جب تک وہ خود اس میں تم سے لڑائی شروع نہ کریں۔ ہاں اگر وہ تم سے اس میں لڑائی شروع کردیں تو تم انہیں قتل کرسکتے ہو۔ ایسے کافروں کی سزا یہی ہے۔ ﴿۱۹۱﴾ پھر اگر وہ باز آجائیں تو بے شک اللہ بہت بخشنے والا، بڑا مہربان ہے۔ ﴿۱۹۲﴾ اور تم ان سے لڑتے رہو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دِین اللہ کا ہوجائے۔ پھر اگر وہ باز آجائیں تو (سمجھ لو کہ) تشدّد سوائے ظالموں کے کسی پر نہیں ہونا چاہیے۔ ﴿۱۹۳﴾ حرمت والے مہینے کا بدلہ حرمت والا مہینہ ہے، اور حرمتوں پر بھی بدلے کے اَحکام جاری ہوتے ہیں، چنانچہ اگر کوئی شخص تم پر کوئی زیادتی کرے تو تم بھی ویسی ہی زیادتی اس پر کرو جیسی زیادتی اس نے تم پر کی ہو، اور اللہ سے ڈرتے رہو اور اچھی طرح سمجھ لو کہ اللہ انہی کا ساتھی ہے جو اس کا خوف دِل میں رکھتے ہیں۔ ﴿۱۹۴﴾ اور اللہ کے راستے میں مال خرچ

کرو، اور اپنے آپ کو خود اپنے ہاتھوں ہلاکت میں نہ ڈالو، اور نیکی اختیار کرو۔ بے شک اللہ نیکی کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔ (۱۹۵)

چاند کے گھٹنے بڑھنے کی حکمت و مصلحت

یہ آیاتِ کریمہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے یا دوسرے لوگوں کے سوالات کے جواب میں نازل فرمائی ہیں، اور ان کا آغاز اس طرح ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ﴿يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ﴾ ''لوگ آپ سے نئے مہینوں کے چاند کے بارے میں پوچھتے ہیں۔''

''أهلّة'' ہلال کی جمع ہے اور ہلال مہینے کے نئے چاند کو کہا جاتا ہے۔اس سے معلوم ہو رہا ہے کہ یہ آیات اس وقت نازل ہوئیں، جب کچھ لوگوں نے مہینے کے نئے چاند کے بارے میں کچھ سوال کیے تھے۔ ایک سوال تو بعض روایتوں(۱) میں یہ آتا ہے کہ کسی نے پوچھا تھا کہ یہ چاند کے گھٹنے بڑھنے کی حکمت کیا ہے؟ یعنی ایک طرف تو سورج ہے جو ہر روز اپنے اسی سائز پر رہتا ہے جس سائز کے مطابق ہمیں وہ نظر آتا ہے، لیکن چاند کا معاملہ یہ ہے کہ وہ سورج کی طرح نہیں ہے، بلکہ اس کے سائز میں کمی زیادتی ہمیں نظر آتی رہتی ہے۔

اگرچہ یہ بات اہلِ عرب کو بھی معلوم تھی کہ چاند کے سائز اور اس کی روشنی کا بڑھنا اور گھٹنا، یہ درحقیقت سورج کے مقابلے میں آنے کی وجہ سے ہوتا ہے اور جتنا زیادہ سورج کی روشنی اس تک پہنچتی ہے اتنا اس کا حجم بھی بڑھ جاتا ہے، لیکن پوچھنے کا مقصد بظاہر یہ تھا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے چاند کا جو یہ نظام بنا رکھا ہے کہ وہ شروع میں چھوٹا سا نظر آتا ہے، پھر بڑھتا چلا جاتا ہے، یہاں تک کہ مکمل دائرے کی شکل میں نظر آنے لگتا ہے اور پھر بعد میں کم ہوجاتا ہے یہاں تک کہ کھجور کی سوکھی شاخ کی مانند رہ جاتا ہے تو اس کی حکمت کیا ہے؟ اس کا فائدہ کیا ہے؟ جبکہ سورج میں یہ صورتِ حال نہیں ہے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس کے جواب میں یہ بات ارشاد فرمائی کہ ﴿قُلْ﴾ اے نبی! آپ یہ کہہ دیجیے

---

(۱) قال القاضي ثناء الله في التفسير المظهري (۱/ ۲۱۰): ''نزلت في معاذ بن جبل وثعلبة بن غنم الانصاريين قالا يا رسول الله ما بال الهلال يبدو دقيقا ثم يزيد حتى يمتلي نورا ثم يعود دقيقا كما بدأ لا يكون على حال واحد- كذا ذكر البغوي- وأخرجه أبو نعيم وابن عساكر في تاريخ دمشق من طريق السدى الصغير عن ابن عباس- واخرج ابن أبي حاتم من طريق العوفى عنه قال سأل الناس عن الأهلة فنزلت-''

یا آپ انہیں بتا دیجیے ﴿هِيَ مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ﴾ ''یہ لوگوں کے (مختلف معاملات کے) اور حج کے اوقات متعین کرنے کے لیے ہے،'' یعنی اللہ تعالیٰ نے اس چاند کو لوگوں کے مختلف معاملات کو طے کرنے اور حج کے اوقات متعین و معلوم کرنے کے لیے بنایا ہے اور اس میں یہ نظام رکھا ہے کہ وہ گھٹتا اور بڑھتا رہتا ہے۔ گویا دوسرے الفاظ میں یہ کہہ لیا جائے کہ اس کے ذریعے مہینے کی تاریخ متعین ہوتی ہے۔ جب چاند پہلی بار مہینے کے اندر طلوع ہوتا ہے اور چھوٹا سا ہوتا ہے، تو وہ گویا مہینے کی پہلی تاریخ ہوجاتی ہے۔ اس کے بعد پھر اس کے اندر اضافہ ہوتا جاتا ہے اور یہاں تک کہ پھر آخری دنوں میں وہ چاند ہماری آنکھوں سے غائب ہوجاتا ہے۔

ان آیات میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے چاند کا فائدہ بتایا اور اس کی حکمت بیان فرمائی کہ اس کے بڑھنے گھٹنے سے لوگوں کو اپنے اوقات اور مہینوں کے تعین کا ایک اچھا ذریعہ حاصل ہوجاتا ہے۔ اسی طرح یہ چاند حج کے لیے بھی ایک میقات کا کام کرتا ہے۔ اسی چاند کو دیکھ کر یہ پتہ چلتا ہے کہ ذوالحجہ کا مہینہ داخل ہوگیا اور اس کی ۹ تاریخ کو حج ہوگا۔ یہ بات چاند سے ہی پتہ چلتی ہے۔

اشہرِ حرم معلوم کرنے کا ذریعہ بھی چاند ہے

یہاں پر اللہ تبارک وتعالیٰ نے جو یہ بات فرمائی کہ مہینوں کا آغاز چاند کے ذریعے ہوتا ہے اس میں دو چیزیں خاص طور پر اہمیت رکھتی تھیں:

- ایک تو حج کا موسم، کہ حج کے ایّام اس سے متعین ہوتے تھے، جس کی تفصیل بیان کی جاچکی ہے۔
- اور دوسرے یہ کہ بعض مہینے ایسے ہیں کہ جن میں اللہ تعالیٰ نے جنگ کرنے کو منع کیا ہے کہ اس میں کوئی جنگ نہیں کی جاسکتی اور انہیں ''اشہرِ حرم'' یا حرام مہینے بھی کہا جاتا ہے۔ جس کی تفصیل آگے خود قرآنِ کریم کے اندر آئے گی کہ چار مہینے ایسے ہیں جن کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہ حرمت عطا فرمائی ہے کہ اُن میں کسی بھی قسم کی لڑائی یا جنگ جائز نہیں ہے،[1] تو ان مہینوں کا

---

(۱) ''اشہرِ حرم'' چار مہینے ہیں۔ ذیقعدہ، ذی الحجہ، محرم، یہ تین مہینے تو مسلسل ہیں۔ چوتھا مہینہ رجب کا ہے۔ اسلام سے پہلے بھی ان مہینوں میں جنگ کو حرام سمجھا جاتا تھا۔ اور مشرکینِ مکہ بھی اس کے پابند تھے۔ ابتداءِ اسلام میں بھی سنہ ۷ ھ تک یہی قانون نافذ تھا۔ اس کے بعد یہ حرمتِ قتال منسوخ کرکے عام قتال کی اجازت باجماعِ اُمت دے دی گئی۔ (معارف القرآن۔ جلد ۱۔ صفحہ ۴۷۳)

پتہ بھی درحقیقت چاند نکلنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اب مثلاً ذو القعدہ کا مہینہ شروع ہوگیا، تو ذو القعدہ کا مہینہ ''اشہرِ حرم'' میں سے ہے اور اس میں لڑائی کرنا جائز نہیں ہے۔

چاند کے انہی دو مقاصد کے پیشِ نظر اور اس مناسبت سے اللہ تبارک وتعالیٰ نے آگے ایک تو حج کے کچھ احکام بیان فرمائے ہیں اور پھر لڑائی کے کچھ احکام، یعنی جہاد کے کچھ احکام بیان فرمائے ہیں جو اشہرِ حرم میں منع ہوتا ہے اور دوسرے مہینوں کے اندر اس کی اجازت ہوجاتی ہے۔

حج سے متعلق اہلِ جاہلیت کی ایک رسم کی تردید

چنانچہ پہلے تو حج کے ایک مسئلے کا ذکر فرمایا ہے جو اہلِ جاہلیت میں ایک رسم کے طور پر چلا ہوا تھا اور اسلام نے آکر اسے ختم کیا، وہ یہ کہ ان کا معمول یہ تھا کہ اگر کسی شخص نے حج کا اِحرام باندھ لیا اور اِحرام باندھنے کے بعد گھر سے نکل گیا اور پھر کسی ضرورت سے واپس گھر میں جانا پڑا، تو وہ یہ کہتے تھے کہ گھر کے عام دروازے سے داخل ہونا ناجائز ہے، بلکہ اگر داخل ہونا ہو تو گھر کے پچھلے حصے سے داخل ہونا چاہیے، چنانچہ وہ ایسا ہی کیا کرتے تھے۔ حالانکہ حج کے احکام میں ایسا کوئی حکم اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہیں تھا اور ان لوگوں نے یہ خواہ مخواہ کی ایک رسم بنا رکھی تھی۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس کی تردید کرتے ہوئے فرمایا: ﴿وَلَيْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا﴾ ''اور یہ کوئی نیکی نہیں ہے کہ تم گھروں میں ان کی پشت کی طرف سے داخل ہو،'' کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ایسا کوئی حکم نہیں دیا، اگر اللہ تعالیٰ نے کوئی حکم دیا ہوتا تو بے شک نیکی کی بات ہوتی، لیکن جب اللہ تعالیٰ نے کوئی حکم نہیں دیا تو تم نے اپنی طرف سے یہ رسم بنائی ہے، تو اس کی کوئی بنیاد نہیں، یہ بے بنیاد اور غلط رسم ہے۔

کام کو معروف طریقہ کے مطابق انجام دینا مطلوب ہے

یہ آیتِ کریمہ اگرچہ براہِ راست تو اس خاص واقعہ سے متعلق ہے جس میں اہلِ عرب اِحرام باندھنے کے بعد اپنے گھروں میں سامنے سے داخل ہونے کے بجائے پیچھے سے داخل ہوتے تھے، لیکن اس کے الفاظ کے عموم میں یہ بات بھی داخل ہے کہ جب آدمی کوئی بھی کام کرے تو جو اس کا معروف طریقہ ہے، اسی کے طریقے کے مطابق اسے انجام دینا چاہیے۔ اس کو گھما پھرا کر یا کسی بالواسطہ طریقے سے انجام دینا درست نہیں،

کام کا جو معروف طریقہ ہے اسی کو اختیار کرنا چاہیے، چنانچہ فرمایا: ﴿وَ لٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰى﴾ ''لیکن نیکی یہ ہے کہ انسان تقویٰ اختیار کرے،'' نیز فرمایا: ﴿وَ اْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا﴾ اور تم گھروں میں ان کے دروازوں سے داخل ہوا کرو ﴿وَ اتَّقُوا اللّٰهَ﴾ اور اللہ سے ڈرتے رہو ﴿لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝۱۸۹﴾ ''تاکہ تمہیں فلاح حاصل ہو۔''

اس آیت سے یہ مسئلہ بھی نکل آیا کہ جس چیز کو شریعتِ اسلام نے ضروری یا عبادت نہ سمجھا ہو، اسے اپنی طرف سے ضروری یا عبادت سمجھ لینا جائز نہیں۔ اسی طرح جو چیز شرعاً جائز ہو، اسے گناہ سمجھنا بھی گناہ ہے۔ ان لوگوں نے ایسا ہی کر رکھا تھا کہ گھر کے دروازوں سے داخل ہونا جو شرعاً جائز تھا، اس کو گناہ قرار دے دیا۔ اور مکان کی پشت سے دیوار توڑ کر آنا جو شرعاً ضروری نہیں تھا، اس کو ضروری سمجھا، اسی بات پر ان لوگوں کو تنبیہ کی گئی۔

اشہرِ حُرم میں قتال جائز ہونے کی ایک صورت

آگے پھر اللہ تعالیٰ نے جہاد کے بارے میں بھی کچھ احکام عطا فرمائے ہیں، اور جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا، بعض خاص مہینوں میں لڑائی منع تھی اور ان مہینوں کا تعلق بھی چاند سے تھا، یعنی ان کا پتہ بھی چاند سے چلتا تھا، تو اس لحاظ سے جہاد کے احکام کا ذکر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَ قَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ﴾ اور ان لوگوں سے اللہ کے راستے میں جنگ کرو جو تم سے جنگ کرتے ہیں ﴿وَ لَا تَعْتَدُوْا﴾ ''اور زیادتی نہ کرو۔'' زیادتی نہ کرنے کی وجہ یہ بیان فرمائی کہ ﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ۝۱۹۰﴾ ''یقین جانو کہ اللہ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔''

مفسرین نے فرمایا ہے[1] کہ یہ آیات اس وقت نازل ہوئی تھیں، جب مکّہ مکرمہ کے مشرکین نے نبی کریم سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے صحابہ کو صلحِ حدیبیہ کے موقع پر عمرہ ادا کرنے سے روک دیا تھا اور یہ معاہدہ کیا تھا کہ وہ اگلے سال آکر عمرہ کریں گے، جب اگلے سال ذیقعدہ ۷ھ میں عمرے کا ارادہ کیا گیا تو کچھ صحابۂ کرام کو یہ خطرہ ہوا کہ کہیں مشرکین عہد شکنی کرکے ہم سے لڑائی شروع نہ کردیں، اگر ایسا ہوا تو

---

(۱) أسباب النزول للواحدی (ص: ۵۵)

مسلمانوں کو یہ مشکل پیش آئے گی کہ حدودِ حرم میں اور خاص طور پر ذیقعدہ کے مہینے میں جو حرام مہینوں میں شامل ہے، وہ لڑائی کیسے کریں گے؟ جبکہ حدودِ حرم میں اور اس مہینے میں جنگ ناجائز ہے۔ ان آیات کے ذریعے اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہ وضاحت فرمادی کہ اپنی طرف سے تو جنگ نہ کی جائے، لیکن کفار جب معاہدہ توڑ کر خود جنگ شروع کردیں، تو ایسی صورت میں مسلمانوں کے لیے جنگ جائز ہے۔ اگر وہ حدودِ حرم اور محترم مہینے کی حرمت کا بھی لحاظ نہ رکھیں اور حملہ آور ہوجائیں تو پھر مسلمانوں کے لیے اپنے دفاع کی خاطر ان کی زیادتی کا بدلہ لینا بھی درست ہے۔

چنانچہ اس سیاق میں اللہ تعالیٰ فرما رہے ہیں کہ جو لوگ تم سے قتال کا ارادہ کررہے ہیں تو تم ان سے اللہ کے راستے میں قتال کرو، جنگ کرو، البتہ تم اپنی طرف سے زیادتی نہ کرو، پھر فرمایا: ﴿وَ اقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ﴾ ''اور تم ان لوگوں کو جہاں پاؤ قتل کرو،'' یعنی اس صورت میں اگر وہ معاہدہ توڑ کر تمہارے اوپر حملہ آور ہوجائیں تو پھر تمہیں بھی کھلی اجازت ہے کہ ایسے حملہ آوروں کو جہاں بھی پاؤ انہیں قتل کرو ﴿وَ اَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ حَيْثُ اَخْرَجُوْكُمْ﴾ ''اور انہیں اس جگہ سے نکال باہر کرو جہاں سے انہوں نے تمہیں نکالا تھا۔''

جب نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم مکّہ مکرمہ میں مقیم تھے تو کفار نے ظلم وستم کا نشانہ بنا کر اور ان پر زندگی تنگ کر کے انہیں اس بات پر مجبور کیا تھا کہ وہ مکّہ مکرمہ چھوڑ کر کہیں نہ کہیں ہجرت کرجائیں۔ جس کی وجہ سے بعض صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم حبشہ کی طرف ہجرت کر گئے تھے اور نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور بہت سے صحابہ مدینہ منوّرہ کی طرف ہجرت کرکے چلے گئے تھے۔ چونکہ انہی مشرکین نے ان حضرات کو مکّہ مکرمہ سے باہر نکالا تھا، تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اگر یہ لوگ معاہدہ کی خلاف ورزی کرتے ہوئے جنگ پر آمادہ ہوجائیں، تو پھر تم ان کے اس عمل کا بدلہ بھی لے سکتے ہو، ان کو قتل بھی کرسکتے ہو اور انہیں اس شہر سے، یعنی مکّہ مکرمہ سے باہر بھی نکال سکتے ہو، جس سے انہوں نے تمہیں باہر نکالا تھا۔

فتنہ انگیزی قتل سے بھی زیادہ سنگین برائی

کسی کے دل میں خیال پیدا ہوسکتا ہے کہ یہ جو قتل کرنے کا حکم دیا جارہا ہے کہ ''انہیں جہاں بھی پاؤ انہیں قتل کردو،'' تو کسی انسان کو تو قتل کرنا اچھی بات نہیں ہے۔ اس کے جواب میں آگے اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَ الْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ﴾ ''اور فتنہ قتل سے زیادہ سنگین برائی اور زیادہ بری بات ہے۔'' اس میں

کوئی شک نہیں کہ کسی انسان کو ناحق قتل کرنا بہت ہی سنگین جرم ہے، لیکن اگر فتنہ کا سدِّباب اس کے بغیر نہ ہوسکتا ہو تو پھر فتنے کے مقابلے میں قتل کر دینا اُھون (ہلکا) ہے اور فتنہ اس کے مقابلے میں زیادہ سنگین برائی ہے۔

یہاں قرآنِ کریم نے لفظ ''فتنہ'' استعمال کیا ہے اور یہ بڑا وسیع اور ہمہ گیر مفہوم رکھتا ہے اور اسے قرآنِ کریم میں بھی مختلف معنوں میں استعمال کیا گیا ہے، ان میں سے ایک معنیٰ ظلم اور تشدّد کے بھی ہیں، یعنی جب کوئی شخص دوسرے پر ظلم اور تشدد کرے تو اسے بھی ''فتنہ'' کہا جاتا ہے۔ ان آیات کے سیاق و سباق سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہاں فتنے سے مراد وہی ظلم اور تشدّد ہے اور اس ظلم وتشدّد سے مراد یہ ہے کہ جب مسلمان مکّہ مکرمہ میں مقیم تھے تو کفار نے انہیں طرح طرح سے ستایا تھا اور تشدّد کا نشانہ بنایا تھا۔ انہیں تپتے ہوئے پتھروں پر کپڑے اتار کر لٹا دیا جاتا تھا، ان کے جسموں پر کوڑے برسائے جاتے تھے، اور نہ جانے انہیں تکلیف پہنچانے کے کیا کیا طریقے ان لوگوں نے اختیار کیے ہوئے تھے، یہ سارے ظلم اور تشدّد کے طریقے فتنے کے اندر داخل ہیں۔

یہاں مقصد یہ ہے کہ اگرچہ کسی کو قتل کرنا اپنی ذات میں کوئی اچھی بات نہیں، لیکن چونکہ فتنہ اس کے مقابلے میں زیادہ سخت برائی ہے، لہٰذا اگر فتنے کا سدِّباب کسی کو قتل کیے بغیر ممکن نہ ہو تو وہاں قتل کے سوا کوئی اور چارۂ کار نہیں ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتے ہیں کہ مشرکینِ مکّہ نے مسلمانوں کو اپنے دین پر عمل کرنے سے روکنے کے لیے ان پر بدترین تشدّد روا رکھا ہوا تھا، ایک تو مسلمانوں کو ظلم وتشدد کا نشانہ بنایا اور پھر مسلمان جب پُرامن طریقے سے عمرہ کرنے کے لیے آنا چاہتے تھے تو انہیں روکا اور پھر جو معاہدہ کیا تھا، اب اگر اس کی عہد شکنی بھی کریں اور مسلمانوں کے اوپر حملہ کردیں تو اس سے زیادہ بڑا فتنہ کیا ہوگا؟ لہٰذا وہ فتنہ جو انہوں نے مسلمانوں سے روا رکھا ہوا تھا، وہ زیادہ سنگین برائی ہے بنسبت اس کے کہ انہیں قتل کر دیا جائے۔ یہی مطلب ہے: ﴿وَالْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ﴾ کا، یعنی کہ فتنہ قتل سے بھی زیادہ سنگین برائی ہے۔

اپنے دفاع کے لیے حدودِ حرم میں قتال کی اجازت

بعض حضراتِ صحابہ رضی اللہ عنہم کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا تھا کہ اگر ان لوگوں نے عہد شکنی کرتے ہوئے ہم پر حملہ کر دیا تو ہمارے لیے بڑی مشکل ہوجائے گی، کیوں کہ اگر انہوں نے اس وقت حملہ کیا جب ہم حدودِ حرم

میں داخل ہو چکے ہوں، تو ہمارے لیے ان کا جواب دینا بھی مشکل ہو جائے گا، کیوں کہ حدودِ حرم کے اندر تو کسی بھی حال میں، کسی بھی زمانے میں لڑائی کرنا اور جنگ کرنا جائز نہیں ہوتا، اور نہ کسی جانور کا شکار کرنا جائز ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے حدودِ حرم میں کسی انسان کو قتل کرنا تو اور زیادہ ناجائز اور حرام ہوگا، لہٰذا ہم مسجدِ حرام یا حدودِ حرم کے آس پاس ان کے ساتھ کیسے قتال کریں گے؟

اس کا جواب اللہ تعالیٰ نے یہ ارشاد فرمایا: ﴿وَلَا تُقٰتِلُوْهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ﴾ اور تم مسجدِ حرام کے پاس اس وقت تک ان سے لڑائی نہ کرو ﴿حَتّٰى يُقٰتِلُوْكُمْ فِيْهِ﴾ جب تک وہ خود اس میں تم سے لڑائی شروع نہ کریں، ﴿فَاِنْ قٰتَلُوْكُمْ فَاقْتُلُوْهُمْ﴾ ہاں! اگر وہ تم سے لڑائی شروع کر دیں تو تم انہیں قتل کر سکتے ہو۔ ﴿كَذٰلِكَ جَزَآءُ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۹۱﴾﴾ ''ایسے کافروں کی جزا یہی ہے،'' یعنی کہ جب وہ حدودِ حرم کے تقدّس کا خیال نہیں رکھ رہے تو پھر دفاعی طور پر اپنی جان بچانے کے لیے اور اپنے دین کے تحفظ کے لیے ان سے لڑائی کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اسی سے یہ بات بھی معلوم ہوگئی کہ حدودِ حرم میں اگرچہ لڑائی کرنا جائز نہیں ہے اور حرام ہے، لیکن اگر کوئی شخص کسی پر حملہ آور ہو جائے اور کسی کو جنگ پر مجبور کر دے تو پھر مسلمان کے لیے جائز ہے کہ وہ حدودِ حرم کے اندر بھی دفاع کرے۔ (۱) ﴿فَاِنِ انْتَهَوْا﴾ ''پھر اگر وہ باز آجائیں،'' یعنی شروع میں تو انہوں نے لڑائی شروع کی تھی اور پھر آپ نے اس کے جواب میں اپنا دفاع بھی کیا اور اپنے دفاع میں ان پر حملہ بھی کیا، لیکن اگر وہ بعد میں باز آجائیں تو ﴿فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۹۲﴾﴾ ''بے شک اللہ تعالیٰ بہت بخشنے والا، بڑا مہربان ہے۔''

''فَاِنِ انْتَهَوْا''، ''اگر وہ باز آجائیں'' کے معنیٰ یہی ہیں کہ وہ اسلام لے آئیں، یعنی نہ صرف یہ کہ قتل و غارت گری بند کر دیں، بلکہ ایمان بھی قبول کر لیں تو پھر اس صورت میں اللہ تبارک وتعالیٰ ان کے پچھلے گناہوں کو معاف فرما دیں گے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا یہ اصول ہے کہ اگر کوئی شخص ایمان لے آئے تو کفر کے زمانے میں اس نے جو بداعمالیاں کی ہیں وہ معاف ہو جاتی ہیں۔ (۲)

---

(۱) حدودِ حرم میں قتل و قتال سے متعلق مزید تفصیل کے لیے دیکھیے ''آسان تفسیرِ قرآن'' جلدِ اوّل سورۃ البقرۃ، آیت نمبر: ۱۲۵، عنوان: ''بیت اللہ: سراپا امن اور سلامتی کی جگہ۔''

(۲) كما في صحيح مسلم (۱۱۲/۱) (۱۲۱): "أن الإسلام يهدم ما كان قبله." كتاب الإيمان، باب كون الإسلام يهدم ما قبله وكذا الهجرة والحج.

جہاد کا مقصد کسی کو اسلام پر مجبور کرنا نہیں ہوتا

پھر آگے اللہ تبارک وتعالیٰ نے جہاد کا حکم دیتے ہوئے ایک اور اہم حکم بیان فرمایا: ﴿وَ قٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ﴾ ''اور تم ان سے لڑتے رہو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے۔'' فتنہ سے متعلق یہ جملہ پچھلی آیت میں بھی آیا ہے اور وہاں اس کی تشریح گزر چکی ہے۔ اب یہاں پر آگے اضافہ یہ ہے کہ ﴿وَّ يَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ﴾ ''اور یہاں تک کہ دین اللہ کا ہوجائے۔'' یہاں یہ بات سمجھنے کی ہے کہ شرعاً جہاد کا اصل مقصد کسی کو اسلام پر مجبور کرنا نہیں ہے، کیونکہ خود قرآنِ کریم کی آیت آگے آنے والی ہے کہ جس میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ:

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ (۱)

دین کے معاملے میں کوئی زبردستی نہیں ہے۔

ہاں! یہ آدمی کا اپنا کام ہے کہ وہ اپنی عقل سے سوچ کر دینِ برحق کو اختیار کرے، تاہم کسی کو تلوار کے زور سے اسلام لانے پر مجبور نہیں کیا جاسکتا۔

کفار کے لیے جزیرۂ عرب کا حکم دوسروں خطوں سے مختلف ہے

اگر عام حالات میں کوئی شخص کفر پر ہی اصرار کرے اور اسلام قبول نہ کرنا چاہے تو وہ جزیہ دے کر اسلامی حکومت کے قوانین کی اطاعت کر کے اپنے مذہب پر قائم رہ سکتا ہے، اسے اسلامی ریاست میں اپنے مذہب پر قائم رہنے کی آزادی بھی ہوتی ہے اور اس کے حقوق کی حفاظت بھی اسلامی حکومت پر لازم ہو جاتی ہے، لیکن جزیرۂ عرب کا حکم اللہ تبارک وتعالیٰ نے مختلف رکھا ہے، اس کی تفصیل یہ ہے کہ۔ جیسا کہ پیچھے سورۂ بقرہ میں ہی بیان کیا جا چکا ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے خانہ کعبہ کی تعمیر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ذریعہ کروائی تھی اور اس کا مقصد یہ تھا کہ لوگ خدائے واحد کی عبادت کریں، لیکن بعد کے لوگوں نے اس مقصد کو ختم کردیا اور اس بیت اللہ کو اللہ تعالیٰ کی عبادت کے بجائے بتوں کی عبادت کا ذریعہ بنادیا اور اس میں بے شمار بت رکھ دیے۔

---

(۱) سورۃ البقرۃ (۲): آیت (۲۵۶)

جب نبیِ کریم سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مبعوث فرمایا گیا تو اس کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ کعبہ اور اس کی حدود کا وہ علاقہ جو بت پرستی کا گڑھ بن گیا ہے، اس سے بت پرستی کو ختم کر کے ان لوگوں کے اقتدار کا خاتمہ کیا جائے جنہوں نے کعبے پر ناجائز تسلّط جما کر اس میں بت رکھ دیے ہیں اور بُت پرستی کی تبلیغ کو ہی اپنا شعار بنالیا ہے، لہٰذا بیت اللہ کے اصل مقصد کے پیشِ نظر کم از کم بیت اللہ اور اس کے مضافات کا جو علاقہ ہے، یعنی پورا جزیرۂ عرب، وہ کفر اور شرک سے خالی ہوجانا چاہیے۔

جزیرۂ عرب میں کوئی کافر نہیں رہ سکتا

لہٰذا جزیرۂ عرب کا حکم اللہ تبارک وتعالیٰ نے دوسرے مقامات کے مقابلے میں مختلف رکھا ہے، پچھلے انبیائے کرام علیہم السلام کے زمانوں میں ان لوگوں کو عذابِ عام کے ذریعہ ہلاک کیا گیا تھا جنہوں نے ان انبیائے کرام کی بات نہیں سُنی، لیکن سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی برکت سے وہ عذابِ عام تو موقوف کردیا گیا، لیکن یہ حکم دیا گیا کہ جزیرۂ عرب میں کوئی کافر مستقل شہری کی حیثیت میں نہیں رہ سکتا، یہاں رہنے والے کے پاس صرف تین ہی راستے ہیں:

۱۔ یا تو اسلام قبول کرلے۔

۲۔ یا جزیرۂ عرب سے باہر چلا جائے۔

۳۔ یا پھر جنگ میں قتل ہوجائے یا جنگ کے لیے تیار ہوجائے۔

اس لیے اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہاں جزیرۂ عرب کے معاملے میں خاص طور پر یہ فرمایا کہ ان سے لڑتے رہو، یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور پورا کا پورا دین اللہ کا ہوجائے اور اللہ کے دین کا اس جزیرۂ عرب میں غلبہ ہوجائے۔

لہٰذا پیچھے جو آیتِ کریمہ آئی تھی: ﴿وَالْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ﴾ وہاں ہم نے فتنے کے معنیٰ عرض کیے تھے کہ دوسرے مشرکین کی طرف سے مسلمانوں کو ظلم وستم کا نشانہ بنانا اور انہیں طرح طرح سے ستانا، لیکن یہاں ﴿وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ﴾ میں فتنہ کے ظلم وتشدد والے معنیٰ بھی ہیں، یعنی ان سے قتال کرتے رہو یہاں تک کہ ان کا ظلم وتشدد ختم ہوجائے، اور بہت سے مفسرین[1] نے یہاں پر فتنہ سے کفر

---

(۱) دیکھیے: التفسير الكبير أو مفاتيح الغيب (۲۸۹/۵)

اور شرک بھی مراد لیا ہے، یعنی ان سے قتال کرتے رہو یہاں تک کہ کفر و شرک کا فتنہ اس جزیرۂ عرب میں باقی نہ رہے۔

چنانچہ نبیِ کریم سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب اس دنیا سے تشریف لے گئے تو پورے جزیرۂ عرب پر اسلام ہی کا پرچم لہرا رہا تھا، اور نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ وصیت بھی فرمائی تھی کہ جو یہود و نصاریٰ وہاں باقی ہیں انہیں بھی جزیرۂ عرب سے نکلنا ہوگا۔[1] اس لیے اللہ تعالیٰ نے یہ فرمادیا کہ جب دین اللہ کا ہوجائے اس وقت تک جہاد جزیرۂ عرب میں جاری رہے گا۔ پھر فرمایا: ﴿فَاِنِ انْتَهَوْا﴾ ''پھر اگر وہ باز آجائیں،'' یعنی اپنی لڑائی سے بھی باز آجائیں اور کفر و شرک سے بھی باز آجائیں تو ﴿فَلَا عُدْوَانَ اِلَّا عَلَى الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۹۳﴾﴾ ''(سمجھ لو) کہ تشدّد اور زیادتی سوائے ظالموں کے کسی پر نہیں ہونی چاہیے۔'' اگر وہ کفر و شرک اور لڑائی سے باز آجائیں تو آخرت میں رحمت و مغفرت کے مستحق ہونے کے ساتھ ساتھ دنیا میں یہ قانون بنایا جا رہا ہے کہ ظالموں اور بے انصافی کرنے والوں کے سوا سزا کی سختی کسی پر نہیں ہوا کرتی، جب یہ لوگ اسلام لے آئے تو بے انصاف نہ رہے، لہٰذا اب ان پر سزائے قتل کی سختی نہ رہی۔

حرمت والے مہینوں میں دفاعی مسائل کا حل

پھر آگے اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس اشکال کا جواب دیا ہے جو بعض صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے ذہن میں آرہا تھا کہ کہ کچھ مہینے ایسے ہیں جن کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے حرمت عطا کی ہے، ان میں جنگ کرنا حرام ہے اور اس میں لڑائی نہیں کی جاسکتی۔ اب اگر ان میں کافر لوگ ہم پر حملہ کر دیں تو اگر ہم لڑتے ہیں تو حرمت والے مہینے کی بے حرمتی ہوتی ہے اور اگر نہیں لڑتے تو وہ لوگ ہم پر غلبہ پاسکتے ہیں، تو اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿اَلشَّهْرُ الْحَرَامُ بِالشَّهْرِ الْحَرَامِ﴾ ''حرمت والے مہینے کا بدلہ حرمت والا مہینہ ہے،'' یعنی جب کوئی دوسرا شخص اس میں جارحیت کر کے تمہارے اوپر حملہ کر رہا ہے، تو پھر اسی مہینے کے اندر تم بھی اس کا جواب دے سکتے ہو، اور پھر فرمایا: ﴿وَ الْحُرُمٰتُ قِصَاصٌ﴾ ''اور حرمتوں پر بھی بدلے کے احکام جاری ہوتے ہیں،'' یعنی جو شخص مہینے کی حرمت پامال کر کے تم سے لڑائی کرے، تو تم بھی اس سے بدلہ لے سکتے ہو اور جو ان حُرمتوں کی رعایت رکھے گا تو تم بھی اس سے رِعایت رکھو۔

---

(۱) كما في صحيح البخاري (٤/ ٩٩) (٣١٦٨):..... " فأمرهم بثلاث، قال: "أخرجوا المشركين من جزيرة العرب...." كتاب الجزية، باب إخراج اليهود من جزيرة العرب.

ظلم کی حد تک بدلہ لینے کی اجازت اور زیادتی کی ممانعت

پھر فرمایا: ﴿فَمَنِ اعْتَدٰی عَلَیْکُمْ﴾ چنانچہ کوئی شخص اگر تم پر کوئی زیادتی کرے ﴿فَاعْتَدُوْا عَلَیْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰی عَلَیْکُمْ﴾ ''تو تم بھی ویسی ہی زیادتی اس پر کرو جیسی زیادتی اس نے تم پر کی تھی۔''

یہ ایک اصول بتادیا کہ حرمت کے مہینوں میں بدلہ اسی وقت لے سکتے ہو جب واقعۃً کوئی شخص زیادتی کر رہا ہو، اور زیادتی کا بدلہ لیتے وقت بھی اس بات کو مدِنظر رکھنا ضروری ہے کہ جتنی زیادتی اپنے دفاع کے لیے ضروری ہے اتنی ہی زیادتی تم کرسکتے ہو اور جتنی اس نے کی ہے اس سے زیادہ نہیں کرسکتے۔ اللہ تعالیٰ نے یہاں پر بھی یہ اصول ارشاد فرمایا ہے اور قرآنِ کریم میں دیگر کئی مقامات پر بھی یہی مضمون آیا ہے اور وہاں بھی یہی اصول بتایا گیا کہ اگر کوئی شخص دوسرے پر کوئی ظلم کرتا ہے تو مظلوم کو اپنا بدلہ لینے کا حق حاصل ہے، لیکن وہ بدلہ اسی حد تک ہونا چاہیے جس حد تک اس پر ظلم ہوا ہے۔ اس سے آگے بڑھ کر کوئی اقدام کرنا اور غصے میں یا انتقام کے جوش میں آکر، اس نے جتنی تکلیف پہنچائی ہے، اسے اس سے زیادہ تکلیف پہنچا دینا، یہ حدود سے تجاوز ہے اور یہ کسی کے لیے بھی جائز نہیں ہے، یہاں تک کہ کافروں کے ساتھ بھی ایسا کرنا جائز نہیں۔

آیت کے آخر میں فرمایا: ﴿وَاتَّقُوا اللّٰهَ﴾ اور اللہ سے ڈرو ﴿وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِیْنَ ﴿۱۹۴﴾﴾ ''اور اچھی طرح سمجھ لو کہ اللہ تعالیٰ انہی کا ساتھی ہے جو اس کا خوف دل میں رکھتے ہیں،'' یعنی مذکورہ احکام پر عمل پیرا ہونے میں اللہ سے ڈرتے رہو کہ کسی امر میں قانون اور شرعی حد سے تجاوز نہ ہونے پائے، یقیناً اللہ تعالیٰ ان ڈرنے والوں کے ساتھ ہوتے ہیں، نیز اگر کسی جگہ پر تمہیں دشمنوں کا غلبہ نظر آتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرو اور اللہ تعالیٰ کے احکام کی پابندی کرتے رہو، ضرور اللہ تعالیٰ کی نصرت وحمایت اور مدد تمہارے ساتھ ہوگی۔

اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنے کی ممانعت

پھر آخر میں فرمایا: ﴿وَاَنْفِقُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ﴾ ''اور اللہ کے راستے میں اپنا مال خرچ کرو۔'' یہ اس لیے فرمایا کہ جب جہاد ہوتا ہے تو جہاد کے اندر، جہاں جان کی قربانی دینی ہوتی ہے وہیں مال کی بھی قربانی دینی پڑتی ہے اور جہاد کے لیے بہت کچھ خرچ بھی کرنا پڑتا ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے جہاد کے احکام بیان کرنے کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کرنے کو بھی ذکر فرمایا، تاکہ مسلمان خوشدلی سے اللہ کے

راستے میں مال خرچ کریں۔

﴿وَ لَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ﴾ ''اور اپنے آپ کو خود اپنے ہاتھوں ہلاکت میں نہ ڈالو'' یہ ایک ایسا جملہ ارشاد فرمایا گیا ہے جس کا مفہوم بہت وسیع ہے۔ اس میں یہ بات تو داخل ہے ہی کہ اگر کوئی انسان خودکشی کرلے اور اپنے آپ کو ہلاک کرڈالے، تو یہ عمل بھی اس آیت کی رو سے بالکل حرام ہے۔ اسی طرح کوئی بھی ایسا اقدام کرنا جس کے نتیجے میں ہلاکت کا گمانِ غالب ہو، اس آیت سے اس کی ممانعت بھی معلوم ہوتی ہے، لیکن اللہ کے راستے میں مال خرچ کرنے کے سیاق و سباق میں اس کا مفہوم یہ ہے کہ اگر تم اللہ کے راستے میں مال خرچ کرکے جہاد نہیں کروگے، تو پھر بالآخر یہ ہوگا کہ دشمن تم پر غالب آجائے گا، گویا تم نے اپنے ہاتھوں ہلاکت مول لے لی۔ اگر اللہ تعالیٰ کے دیے ہوئے مال کو اس کے بتائے ہوئے طریقے پر خرچ نہیں کروگے تو اس کا انجام بالآخر تمہارے لیے ہلاکت و بربادی کی صورت میں ظاہر ہوگا۔

نیز بعض حضرات[1] نے یہ بھی فرمایا کہ اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے راستے میں مال خرچ کرنے میں بھی حد سے تجاوز نہ کرو، بلکہ اتنا ہی خرچ کرو جتنا شریعت نے تمہیں حکم دیا ہے، ہر انسان کے ذمہ اس کی اپنی جان کے اور اس کے بیوی بچوں کے بھی حقوق ہوتے ہیں، لہٰذا اگر اللہ کے راستے میں خرچ کرنا ہو تو اتنا خرچ کرو کہ اپنی اور ان کی ضروریات کے لیے باقی رہ جائے۔ اسی کو رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں فرمایا کہ:

خَيْرُ الصَّدَقَةِ عَنْ ظَهْرِ غِنًى [2]

بہتر صدقہ وہ ہے جسے دینے کے بعد آدمی مالدار رہے یا اپنے پیچھے مالداری چھوڑ جائے۔

یعنی صدقہ کرنے کے بعد بھی انسان کے پاس اتنا مال رہ جائے کہ وہ اس سے اپنا اور اپنے بیوی بچوں کا پیٹ پال سکے، لہٰذا ﴿وَ لَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ﴾ کے اندر یہ مفہوم بھی داخل ہے کہ ایسا نہ ہو کہ اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کرنے کے جوش میں تم اتنا خرچ کرجاؤ کہ پھر بالآخر تمہیں ہلاکت کا سامنا کرنا

---

(۱) انظر: البحر المحيط في التفسير (۲/۲۵۱).

(۲) صحيح البخاري (۲/۱۱۲) (۱۴۲۷) كتاب الزكاة، باب لا صدقة إلا عن ظهر غنى.

پڑ جائے، ایسا بھی نہیں کرنا چاہیے۔ ﴿وَ اَحْسِنُوْا﴾ ''اور نیکی اختیار کرو،'' مثلاً اس موقع پر اللہ کے راستے میں خوشی کے ساتھ اور اچھی نیت کے ساتھ خرچ کر کے خوب نیکیاں کماؤ ﴿اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ۝۱۹۵﴾ ''بے شک اللہ نیکی کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔''

آیت نمبر ۱۹۶ تا ۲۰۳

وَاَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلّٰهِ ؕ فَاِنْ اُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ ۚ وَلَا
تَحْلِقُوْا رُءُوْسَكُمْ حَتّٰى يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحِلَّهٗ ؕ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ
بِهٖۤ اَذًى مِّنْ رَّاْسِهٖ فَفِدْيَةٌ مِّنْ صِيَامٍ اَوْ صَدَقَةٍ اَوْ نُسُكٍ ۚ فَاِذَاۤ
اَمِنْتُمْ ۪ فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ اِلَى الْحَجِّ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ ۚ فَمَنْ
لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ فِي الْحَجِّ وَسَبْعَةٍ اِذَا رَجَعْتُمْ ؕ تِلْكَ
عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ ؕ ذٰلِكَ لِمَنْ لَّمْ يَكُنْ اَهْلُهٗ حَاضِرِي الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ
وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝۱۹۶ اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ ع ۲۴ ۸ ۸
مَّعْلُوْمٰتٌ ۚ فَمَنْ فَرَضَ فِيْهِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ ۙ وَلَا جِدَالَ
فِي الْحَجِّ ؕ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ يَّعْلَمْهُ اللّٰهُ ؕ وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ
التَّقْوٰى ۫ وَاتَّقُوْنِ يٰۤاُولِي الْاَلْبَابِ ۝۱۹۷ لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا
فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ فَاِذَاۤ اَفَضْتُمْ مِّنْ عَرَفٰتٍ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ
الْحَرَامِ ۪ وَاذْكُرُوْهُ كَمَا هَدٰىكُمْ ۚ وَاِنْ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الضَّآلِّيْنَ ۝۱۹۸
ثُمَّ اَفِيْضُوْا مِنْ حَيْثُ اَفَاضَ النَّاسُ وَاسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ
رَّحِيْمٌ ۝۱۹۹ فَاِذَا قَضَيْتُمْ مَّنَاسِكَكُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ اٰبَآءَكُمْ اَوْ اَشَدَّ

وقف النبی صلی اللہ علیہ وسلم

ذِكْرًا ؕ فَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ﴿۲۰۰﴾ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿۲۰۱﴾ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ نَصِيْبٌ مِّمَّا كَسَبُوْا ؕ وَاللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ﴿۲۰۲﴾ وَاذْكُرُوا اللّٰهَ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ ؕ فَمَنْ تَعَجَّلَ فِيْ يَوْمَيْنِ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۚ وَمَنْ تَاَخَّرَ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۙ لِمَنِ اتَّقٰى ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ﴿۲۰۳﴾

اور حج اور عمرہ اللہ کے لیے پورا پورا ادا کرو، ہاں اگر تمہیں روک دیا جائے تو جو قربانی میسر ہو (اللہ کے حضور پیش کردو)۔ اور اپنے سر اس وقت تک نہ منڈواؤ جب تک قربانی اپنی جگہ نہ پہنچ جائے۔ ہاں اگر تم میں سے کوئی شخص بیمار ہو یا اس کے سر میں کوئی تکلیف ہو تو روزوں یا صدقے یا قربانی کا فدیہ دے۔ پھر جب تم امن حاصل کرلو، تو جو شخص حج کے ساتھ عمرے کا فائدہ بھی اٹھائے وہ جو قربانی میسر ہو (اللہ کے حضور پیش کرے) ہاں اگر کسی کے پاس اس کی طاقت نہ ہو تو وہ حج کے دنوں میں تین روزے رکھے اور سات (روزے) اس وقت جب تم (گھروں کو) لوٹ جاؤ۔ اس طرح یہ کل دس روزے ہوں گے یہ حکم ان لوگوں کے لیے ہے جن کے گھر والے مسجدِ حرام کے پاس نہ رہتے ہوں، اور اللہ سے ڈرتے رہو اور جان رکھو کہ اللہ کا عذاب بڑا سخت ہے۔ ﴿۱۹۶﴾ حج کے چند متعین مہینے ہیں، چنانچہ جو شخص ان مہینوں میں (احرام باندھ کر) اپنے اوپر حج لازم کرلے تو حج کے دوران نہ وہ کوئی فحش بات کرے نہ کوئی گناہ، نہ کوئی جھگڑا اور تم جو کوئی نیک کام کرو گے اللہ اسے جان لے گا، اور (حج کے سفر میں) زادِ راہ ساتھ لے جایا کرو، کیونکہ بہترین زادِ راہ تقویٰ ہے، اور اے عقل والو! میری نافرمانی سے ڈرتے رہو۔ ﴿۱۹۷﴾ تم پر اس بات میں کوئی گناہ نہیں ہے کہ تم (حج کے دوران تجارت یا مزدوری کے ذریعے) اپنے پروردگار کا فضل تلاش کرو۔ پھر

جب تم عرفات سے روانہ ہو تو مشعرِ حرام کے پاس (جو مزدلفہ میں واقع ہے) اللہ کا ذکر کرو، اور اس کا ذکر اسی طرح کرو جس طرح اس نے تمہیں ہدایت کی ہے، جبکہ اس سے پہلے تم بالکل ناواقف تھے۔ (۱۹۸) اس کے علاوہ (یہ بات بھی یاد رکھو کہ) تم اسی جگہ سے روانہ ہو جہاں سے عام لوگ روانہ ہوتے ہیں، اور اللہ سے مغفرت مانگو، بے شک اللہ بہت بخشنے والا، بڑا مہربان ہے۔ (۱۹۹) پھر جب تم اپنے حج کے کام پورے کر چکو، تو اللہ کا اس طرح ذکر کرو جیسے تم اپنے باپ دادوں کا ذکر کیا کرتے ہو، بلکہ اس سے بھی زیادہ ذکر کرو اب بعض لوگ تو وہ ہیں جو (دعا میں بس) یہ کہتے ہیں کہ: ''اے ہمارے پروردگار! ہمیں دنیا میں بھلائی عطا فرما'' اور آخرت میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہوتا۔ (۲۰۰) اور انہی میں سے وہ بھی ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ: ''اے ہمارے پروردگار! ہمیں دنیا میں بھی بھلائی عطا فرما اور آخرت میں بھی بھلائی، اور ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچا لے۔ (۲۰۱) یہ وہ لوگ ہیں جنہیں اپنے اعمال کی کمائی کا حصہ (ثواب کی صورت میں) ملے گا، اور اللہ جلد حساب لینے والا ہے۔ (۲۰۲) اور اللہ کو گنتی کے (ان چند) دنوں میں (جب تم منیٰ میں مقیم ہو) یاد کرتے رہو۔ پھر جو شخص دو ہی دن میں جلدی چلا جائے اس پر بھی کوئی گناہ نہیں ہے اور جو شخص (ایک دن) بعد میں جائے اس پر بھی کوئی گناہ نہیں یہ (تفصیل) اس کے لیے ہے جو تقویٰ اختیار کرے اور تم سب تقویٰ اختیار کرو، اور یقین رکھو کہ تم سب کو اسی کی طرف لے جا کر جمع کیا جائے گا۔ (۲۰۳)

حج سے متعلق متعدّد مسائل کا بیان

ان آیات میں حج سے متعلق کچھ احکام بیان کیے گئے ہیں، اور جیسا کہ پیچھے گزر چکا ہے، پہلے سورۂ بقرہ کی آیت نمبر ۱۸۹: ﴿قُلْ هِيَ مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ﴾ کے ذیل میں حج کا ذکر آیا تھا، پھر بیچ میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے جہاد کا حکم اور جہاد سے متعلق کچھ ہدایات اس لیے عطا فرمائی تھیں کہ اس وقت مسلمانوں کو یہ اندیشہ تھا کہ اگر حج کے لیے نکلیں گے تو راستے میں کہیں دشمن ہمارے مقابلے پر نہ آجائے، اس لیے اس کی

مناسبت سے جہاد کے کچھ احکام بیان فرمائے گئے۔ اب آیت نمبر ۱۹۶ سے ۲۰۳ تک (یعنی - وَ اَتِمُّوا الْحَجَّ وَ الْعُمْرَةَ لِلّٰهِ - سے لے کر - فَمَنْ تَعَجَّلَ فِيْ يَوْمَيْنِ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ - تک) آٹھ آیات مسلسل حج و عمرہ کے احکام و مسائل سے متعلق ہیں اور ان میں ذرا تفصیل کے ساتھ حج و عمرہ کے احکام بیان فرمائے جارہے ہیں۔

اِحرام کے بعد مجبوری پیش آنے کی صورتوں کے احکام

حج سے متعلق احکام ذکر کرتے ہوئے پہلے فرمایا: ﴿وَ اَتِمُّوا الْحَجَّ وَ الْعُمْرَةَ لِلّٰهِ﴾ ''اور حج اور عمرہ اللہ کے لیے پورا پورا ادا کرو۔'' مطلب یہ ہے کہ جب کوئی شخص حج یا عمرے کا احرام باندھ لے، تو جب تک حج یا عمرے کے اعمال پورے نہ ہوجائیں، احرام کھولنا جائز نہیں ہوتا، البتہ اگر کسی کو ایسی مجبوری پیش آجائے کہ احرام باندھنے کے بعد مکّہ مکرمہ تک پہنچنا ممکن ہی نہ رہے، جیسا کہ خود نبیِ کریم سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ صورت پیش آئی تھی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم عمرے کا احرام باندھ کر مدینہ منوّرہ سے روانہ ہوئے، لیکن جب حدیبیہ کے مقام پر پہنچے تو مشرکینِ مکّہ نے آگے بڑھنے سے روک دیا اور جنگ پر آمادہ ہوگئے۔

اسی موقع پر یہ اگلی آیتیں نازل ہوئی ہیں اور ان میں ایسی صورتِ حال کا یہ حل بتایا گیا ہے کہ جب آگے بڑھنا ممکن نہ رہے، تو قربانی کر کے اِحرام کھولا جاسکتا ہے، چنانچہ اسی حکم کو بیان کرتے ہوئے فرمایا: ﴿فَاِنْ اُحْصِرْتُمْ﴾ ''اگر تمہیں روک دیا جائے،'' یعنی تمہیں کوئی ایسی صورت پیش آجائے کہ جس کی بنا پر تم مکّہ مکرمہ جانے سے رک جاؤ اور تمہارے لیے وہاں تک پہنچنا ممکن نہ رہے تو ایسی صورت میں ﴿فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ﴾ ''جو قربانی میسر ہو،'' وہ اللہ کے سامنے پیش کردو۔

سر منڈوا کر حلال ہونے کی شرائط

جب کسی عذر کی وجہ سے مکّہ مکرمہ پہنچنا ممکن نہ رہے تو یہ میسّر قربانی اللہ تعالیٰ کے حضور پیش کرنے کا حکم دینے کے ساتھ ساتھ یہ حکم بھی دے دیا کہ ﴿وَ لَا تَحْلِقُوْا رُءُوْسَكُمْ حَتّٰى يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحِلَّهٗ﴾ ''اور تم اپنے سر نہ منڈواؤ جب تک کہ قربانی اپنی جگہ تک نہ پہنچ جائے۔''

سر منڈوانا درحقیقت احرام ختم کرنے سے کنایہ ہے۔ اور اس کی تفصیل یہ ہے کہ حج یا عمرے کے ارکان مکمل کرنے کے بعد احرام کھولا جاتا ہے اور احرام کھولنے کے لیے عام طور پر جو سُنّت طریقہ ہے وہ یہ ہے کہ یا تو سروں کو منڈوایا جاتا ہے، یا سروں کے بال کم کیے جاتے ہیں۔ جب آدمی احرام کی حالت شروع کرتا ہے تو اس کے اوپر بہت سی پابندیاں عائد ہوتی ہیں، ان پابندیوں میں سے ایک قسم کی پابندی یہ ہے کہ وہ اپنے جسم کے کسی حصے کے بال نہیں توڑ سکتا، ناخن نہیں کاٹ سکتا، خوشبو استعمال نہیں کرسکتا، سلا ہوا کپڑا استعمال نہیں کرسکتا، ایسے جوتے استعمال نہیں کرسکتا جس میں پاؤں کی بیچ کی ہڈی ظاہر نہ ہوتی ہو، اس طرح کی بہت سی پابندیاں انسان پر احرام کی حالت میں عائد ہوتی ہیں۔

جب احرام کھلتا ہے تو عام طریقے سے تو اسی وقت کھلتا ہے جب آدمی نے اگر عمرے کی نیت کی ہو تو اس نے عمرے کے افعال پورے کرلیے ہوں اور اگر حج کر رہا ہے تو حج کے اندر یوم النحر، یعنی دس ذی الحجہ کو جب رمی کر کے فارغ ہوجائے اور پھر قربانی بھی کرچکا ہو تو وہ احرام کھول سکتا ہے، لیکن اگر کوئی غیر معمولی صورتِ حال پیش آجائے تو پھر حج وعمرہ کیے بغیر بھی احرام کھولا جاسکتا ہے، جیسا کہ اسی آیت میں باری تعالیٰ فرمارہے ہیں کہ اگر تمہیں آگے جانے سے اس طرح روک دیا جائے کہ تمہارے لیے مکّہ مکرمہ پہنچنا ممکن نہ ہو، تو ایسی صورت میں قربانی کرکے سر کو منڈوا سکتے ہو اور حلال ہوسکتے ہو، لیکن سر کو منڈوانے کے لیے یہ قید لگادی کہ اس وقت تک سر نہ منڈواؤ جب تک کہ وہ قربانی کا جانور اپنی جگہ تک نہ پہنچ جائے، اپنی جگہ پہنچنے سے مراد یہ ہے کہ وہ جانور حدودِ حرم میں پہنچ جائے۔

خلاصہ یہ کہ جب کوئی شخص میقات سے احرام باندھ کر چلا اور راستے میں کوئی رکاوٹ پیش آگئی جس کی وجہ سے وہ آگے نہ بڑھ سکا، تو پھر اس کے ذمے ہے کہ کوئی جانور یہاں سے بھیج دے یا حدودِ حرم میں رہنے والے کسی شخص کو مامور کردے کہ وہ اس کی طرف سے قربانی ادا کرے اور جب وہاں پر جانور قربان ہوجائے تو پھر اس کے لیے جائز ہے کہ وہ سر منڈوا دے اور سر منڈوا کر اپنا احرام کھول دے۔ تاہم ایسی صورتِ حال میں احرام کھولنے کے بعد جس حج یا عمرے کا احرام باندھا تھا اس کی قضا بھی ضروری ہے، جیسا کہ واقعۂ حدیبیہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضراتِ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کو عمرہ ادا کرنے سے روک دیا گیا تھا اور پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عمرے کی قضا اگلے سال فرمائی۔

حالتِ احرام میں بیماری یا عذر کی وجہ سے سر منڈوانے کا حکم

آگے فرمایا: ﴿فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا﴾ ہاں اگر تم میں سے کوئی شخص بیمار ہو ﴿اَوْ بِهٖٓ اَذًى مِّنْ رَّاْسِهٖ﴾ ''یا اس کے سر میں کوئی تکلیف ہو۔'' اب یہاں بیچ میں سر منڈوانے سے متعلق اللہ تعالیٰ نے ایک اور حکم کا بھی ذکر فرمایا، اور وہ صرف اس صورت کے ساتھ خاص نہیں ہے کہ کوئی رکاوٹ پیش آئی ہو اور آدمی سر منڈوا رہا ہو، بلکہ عام احرام کی حالت سے بھی متعلق ہے۔ فرض کیجیے کہ کوئی آدمی حج یا عمرہ کرنے کے لیے نکلا ہے اور اس نے باقاعدہ احرام باندھا ہے، لیکن احرام ہی کی حالت میں کوئی ایسی بیماری لاحق ہوگئی جس کے نتیجے میں اسے سر منڈانا ضروری ہوگیا تو وہ اب کیا کرے؟

ایک روایت [1] میں آتا ہے کہ حضرت کعب بن عُجرہ رضی اللہ عنہ جو کہ احرام کی حالت میں تھے، ان کے سر میں اچانک جوئیں بہت زیادہ ہوگئی تھیں، اور احرام کی حالت میں سر منڈوانا جائز نہیں ہوتا۔ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں دیکھا تو پوچھا کہ کیا تمہارے سر کی جوئیں تمہیں تکلیف پہنچا رہی ہیں؟ تو انہوں نے کہا ہاں یارسول اللہ! تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں کہا کہ تم قرآنِ کریم کے اس حکم پر عمل کرو جو یہاں آیا ہے، یعنی: ﴿فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا﴾ تم میں سے اگر کوئی بیمار ہو ﴿اَوْ بِهٖٓ اَذًى مِّنْ رَّاْسِهٖ﴾ ''یا اس کے سر میں کوئی تکلیف ہو۔'' تکلیف سے اشارہ اس کیفیت کی طرف بھی ہے جو حضرت کعب بن عجرہ رضی اللہ عنہ کو پیش آئی تھی، یعنی ان کے سر میں جوئیں بہت زیادہ ہوگئی تھیں۔ ایسے بیمار یا عذر والے شخص کے بارے میں فرمایا: ﴿فَفِدْيَةٌ مِّنْ صِيَامٍ اَوْ صَدَقَةٍ اَوْ نُسُكٍ﴾ یعنی پھر وہ شخص فدیہ دے، فدیہ کیا ہے؟ یا تو روزے رکھے یا صدقہ کرے یا قربانی پیش کرے۔

ان تین فدیوں میں سے کوئی ایک فدیہ اختیار کر کے وہ اپنا سر منڈوا سکتا ہے۔ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے احادیث [2] میں اس کی تفصیل بیان کی ہے کہ اگر روزے رکھنے ہیں تو تین روزے رکھے، یا روزوں کے بجائے چھ مسکینوں کو صدقہ الفطر کے برابر صدقہ دے یا ایک بکری قربان کرے، تینوں میں سے کوئی ایک طریقہ اختیار کیا جاسکتا ہے، اس صورت میں سر منڈوایا جاسکتا ہے اور پھر احرام کی حالت میں دوسرے معاملات بھی جاری رہ سکتے ہیں۔

---

(۱) كما في صحيح البخاري (۱۰/۳) (۱۸۱٤) ابواب المحصر، باب قول الله تعالى: ﴿فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا...﴾

(۲) المصدر السابق.

حج کی تین اقسام اور ان کے احکام

پھر آگے فرمایا: ﴿فَاِذَآ اَمِنْتُمْ﴾ ''پھر جب تم امن حاصل کرلو۔'' اوپر اس صورت میں قربانی کا حکم بیان ہوا تھا جب کسی شخص کو دشمن نے روک دیا ہو۔ اب یہ بتایا جارہا ہے کہ قربانی امن کے عام حالات میں بھی واجب ہوسکتی ہے، مثلاً جب کوئی شخص حج کے ساتھ عمرہ بھی جمع کرے، یعنی قران یا تمتع کا احرام باندھے تو اس پر بھی قربانی واجب ہوتی ہے۔ عام طور پر مسلمانوں کو یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ حج کرنے کے تین طریقے ہیں:

- ایک طریقہ یہ ہے کہ آدمی شروع ہی سے صرف حج کا احرام باندھ کر جائے، عمرہ کو حج کے ساتھ جمع نہ کیا جائے، اس قسم کے حج کا نام ''افراد'' ہے۔ اس قسم کے احرام کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جب سے احرام باندھا، وہ افعالِ حج پورے کرنے تک باقی رہے گا، یعنی جب حج کے تمام معاملات پورے ہوگئے، اور جمرۂ عقبہ کی رمی کرلی تو اس کے بعد پھر وہ آدمی حلال ہوسکتا ہے۔
- دوسرے دو طریقے یہ ہیں کہ آدمی نے ایک ہی سفر میں اور ایک ہی روانگی میں دو چیزوں کی نیت کی ہو، یعنی یہ نیت کی ہے کہ وہ عمرہ بھی کرے گا اور حج بھی کرے گا، چنانچہ اگر یہ نیت ہو کہ میں عمرہ کرنے کے بعد احرام کھول دوں گا، اور پھر مکّہ مکرمہ میں رہوں گا اور پھر جب حج کا وقت آئے گا تو میں دوبارہ احرام باندھ کر حج کے لیے روانہ ہوجاؤں گا، گویا حج اور عمرے دونوں کے الگ الگ احرام ہوں گے، تو اسے اصطلاح میں ''تمتع'' کہتے ہیں۔
- اور اگر نیت یہ ہو کہ میں ابھی سے جو احرام باندھ رہا ہوں، وہ عمرے اور حج دونوں کا احرام ہے اور عمرہ کرنے کے بعد میں احرام کو کھولوں گا نہیں، بلکہ احرام کی حالت میں رہوں گا، یہاں تک کہ میں حج کرلوں اور پھر حج کے بعد اکٹھا احرام کھولوں گا تو اسے ''قِران'' کہتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے یہاں پر ان آیات میں حج وعمرہ کو جمع کرنے کے دونوں طریقوں کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ ﴿فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ اِلَى الْحَجِّ﴾ ''جو شخص حج کے ساتھ عمرے کا فائدہ بھی اٹھائے۔'' یہاں تمتع کے لغوی معنی مراد ہیں، یعنی فائدہ اٹھانا، مطلب یہ کہ جو شخص یہ فائدہ اٹھائے کہ وہ صرف ایک ہی سفر میں عمرہ بھی کرے اور حج بھی کرے، تو اس پر واجب ہے کہ دونوں عبادتوں کو جمع کرنے کا شکرانہ ادا کرے۔ اور شکرانہ

یہ ہے کہ ﴿فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ﴾ ''جو قربانی اسے میسر ہو وہ پیش کرے۔'' اس کا مطلب یہ نکلا کہ اگر کسی نے حجِ افراد کا احرام باندھا ہے، یعنی صرف حج کا احرام باندھا ہے تو اس صورت میں اس پر قربانی واجب نہیں، وہ بغیر قربانی کے بھی حلال ہوسکتا ہے۔لیکن اگر حجِ تمتع کا یا قِران کا احرام باندھا ہے اور ایک ہی سفر میں پہلے عمرہ کرتا ہے اور پھر حج کرتا ہے تو اس صورت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تمہیں کوئی قربانی کرنی ہوگی۔

تمتُّع یا قِران میں قربانی کی استطاعت نہ ہونے کا حکم

اب سوال پیدا ہوا کہ بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ انہوں نے حجِ قِران یا حجِ تمتع کی نیت کی ہوئی ہوتی ہے اور حج اور عمرہ دونوں ادا کیے ہیں، لیکن ان کے پاس اتنی استطاعت نہیں ہوتی کہ وہ کوئی جانور قربان کرسکیں تو ان کے لیے کیا حکم ہوگا؟ چنانچہ اس کا طریقہ اللہ تعالیٰ نے اگلے جملے میں ارشاد فرمایا کہ ﴿فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ﴾ یعنی جس شخص کے پاس قربانی کرنے کی طاقت نہ ہو تو ﴿فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ فِي الْحَجِّ﴾ ''وہ حج کے دنوں میں تین روزے رکھے۔'' وہ روزے حج کے دنوں میں اس طرح رکھے کہ زیادہ سے زیادہ نو ذی الحجہ تک تین روزے پورے ہوجائیں ﴿وَسَبْعَةٍ اِذَا رَجَعْتُمْ﴾ اور سات روزے گھر واپس آنے کے بعد رکھے ﴿تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ﴾ ''اس طرح یہ کل دس روزے ہوجائیں گے۔''

تمتُّع یا قِران کی اجازت صرف آفاقی کے لیے ہے

تمتع یا قِران کے ذریعے حج اور عمرہ دونوں کو جمع کرنا صرف ان لوگوں کے لیے جائز ہے جو باہر سے حج کے لیے آئیں، چنانچہ فرمایا: ﴿ذٰلِكَ لِمَنْ لَّمْ يَكُنْ اَهْلُهٗ حَاضِرِي الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ﴾ ''یہ حکم ان لوگوں کے لیے ہے، جن کے گھر والے مسجدِ حرام کے پاس نہ ہوں،'' یعنی یہ جو ہم نے حکم دیا ہے کہ ایک ہی سفر میں حج اور عمرہ دونوں کا احرام باندھا جاسکتا ہے اور دونوں ادا کیے جاسکتے ہیں یا دوسرے الفاظ میں یہ جو تمتع اور قِران کرنے کی اجازت دی گئی ہے تو یہ صرف ان لوگوں کے لیے ہے جن کے گھر والے مسجدِ حرام کے پاس نہ رہتے ہوں۔ مراد یہ کہ وہ مسجدِ حرام کے آس پاس یا حدودِ حرم میں مقیم نہ ہوں، بلکہ حدودِ میقات کے اندر بھی نہ رہتے ہوں۔

خلاصہ یہ ہے کہ تمتع اور قِران صرف وہ لوگ کرسکتے ہیں جن کو اصطلاح میں ''آفاقی'' کہا جاتا ہے، یعنی جو میقات مقرر ہیں، وہ لوگ ان سے باہر رہنے والے ہوں، جیسے ہم پاکستان میں رہتے ہیں، لہٰذا اگر ہم حج و عمرہ کے لیے جائیں گے تو آفاقی کہلائیں گے۔ میقات سے باہر رہنے والے آفاقی لوگ اگر حج کریں تو اس میں تمتع اور قران کرسکتے ہیں، لیکن جو لوگ مکّہ مکرمہ ہی میں رہنے والے ہیں یا مکّہ مکرمہ کے پاس جو قریبی بستیاں ہیں، ان کے اندر رہتے ہیں تو ان کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ تمتع یا قران کریں، ان کے لیے وہ پہلا طریقہ ہی مقرّر ہے، یعنی کہ وہ صرف اِفراد کرسکتے ہیں۔ حدودِ میقات کے اندر رہنے والوں کے لیے حج وعمرہ، دونوں کو اشہرِ حج میں جمع کرنے سے منع کیا گیا ہے، کیونکہ ان کے لیے حج کے مہینوں کے بعد دوبارہ عمرے کے لیے سفر کرنا مشکل نہیں، جبکہ میقات کی حدود سے باہر سے آنے والوں کے لیے، اس طرح حج وعمرہ کے جمع کرنے کو جائز رکھا گیا ہے، کیونکہ دور دراز سے عمرے کے لیے سفر کرنا ان کے لیے آسان نہیں ہوتا۔

اللہ کا خوف؛ دینی احکام پر عمل پیرا ہونے کا ذریعہ

پھر آگے فرمایا: ﴿وَاتَّقُوا اللّٰهَ﴾ ''اور اللہ سے ڈرتے رہو'' یہ اللہ تعالیٰ کا قرآنِ کریم میں ایک معمول ہے کہ جب کوئی حکم عطا فرماتے ہیں یا کوئی قانون جاری فرماتے ہیں تو ساتھ ہی یہ جملہ اکثر و بیشتر ارشاد فرماتے ہیں کہ ''وَاتَّقُوا اللّٰهَ'' اللہ سے ڈرتے رہو، تقویٰ اختیار کرو، ﴿وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿۱۹۶﴾﴾ ''اور خوب جان لو کہ اللہ تعالیٰ کا عذاب بڑا سخت ہے۔''

یہ جملے اس لیے ارشاد فرمائے جاتے ہیں کہ حکم تو جاری کردیا گیا ہے، لیکن اس حکم پر عمل اس وقت تک ممکن نہیں ہوتا اور آدمی کو اس وقت تک اس کی توفیق نہیں ہوتی جب تک کہ اس کے دل میں اللہ تبارک وتعالیٰ کی بڑائی کا، اس کے سامنے جوابدہی کا اور یومِ آخرت کا استحضار اور دھیان نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ بچائے، اگر یہ دھیان ختم ہوجائے تو پھر اللہ تعالیٰ کے دیے ہوئے بڑے سے بڑے حکم کو بھی انسان چھوڑ دیتا ہے اور اس کی حق تلفی کر بیٹھتا ہے۔

یہاں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ حج اور عمرے کا جو طریقہ مقرّر کیا گیا ہے، اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈر کر اُسے ٹھیک ٹھیک ادا کرنے کا اہتمام کیا جائے اور اس کے لیے ضروری ہے کہ حج یا عمرے پر روانہ ہونے سے پہلے کتابوں کی مدد سے یا کسی مستند عالم سے پوچھ پوچھ کر عمل کیا جائے۔

حج کے خاص مہینے اور افعالِ حج کی انجام دہی کے ایام

پچھلی آیت میں بتایا گیا تھا کہ جو کوئی حج یا عمرے کا احرام باندھ لے تو اس پر لازم ہے کہ اس کے احکام پورے ادا کرے، ان دونوں میں عمرے کے لیے تو کوئی تاریخ اور مہینہ مقرر نہیں ہے، سال بھر میں جب چاہیں کر سکتے ہیں، تاہم حج کے لیے مہینے اور اس کے افعال و اعمال کے لیے خاص تاریخیں اور اوقات مقرر ہیں، انہی مہینوں اور انہی تاریخوں میں وہ اعمال انجام دیے جا سکتے ہیں۔

حج کے مہینوں کے حوالے سے اگلی آیت میں فرمایا: ﴿اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ﴾ ''کہ حج کے چند متعین مہینے ہیں،'' اور حدیث[1] میں اس کی تفسیر آئی ہے کہ اس سے مراد شوال ذیقعدہ اور ذی الحج، یہ تین مہینے ہیں۔ حج کے افعال ذوالحجہ میں شروع ہوتے ہیں، سات ذی الحجہ کو امام حج کا خطبہ دیتا ہے اور پھر آٹھویں تاریخ کو لوگ منیٰ روانہ ہوتے ہیں اور نویں تاریخ کو عرفات میں وقوف کرتے ہیں، پھر رات کو مزدلفہ آتے ہیں۔ دسویں تاریخ میں پھر جمرات کی رمی ہوتی ہے اور پھر وہ رمی تین دن جاری رہتی ہے اور تین دن کی رمی کے بعد حج کے افعال ختم ہوتے ہیں، لہٰذا اس لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو حج کے جو افعال ہیں وہ سات ذوالحجہ سے لے کر بارہ یا تیرہ ذی الحج تک جاری رہتے ہیں۔

اگرچہ حج کے افعال تو ذوالحجہ کے مہینے میں ہی انجام دیے جاتے ہیں، لیکن یہ جو کہا گیا کہ حج کے متعین مہینے (شوال، ذیقعدہ اور ذی الحجہ) ہیں، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ حج کی نیت سے یا حج اور عمرے کی نیت سے آدمی ان مہینوں میں سے کسی مہینے میں بھی احرام باندھ سکتا ہے، مثلاً کوئی شخص شوال شروع ہونے کے بعد کسی بھی وقت اِحرام باندھ سکتا ہے اور اِحرام باندھ کر وہ حج یا عمرے کے لیے جا سکتا ہے۔

حج کا احرام باندھنے والوں کے لیے ہدایات

اب آگے اللہ تبارک و تعالیٰ حج کا احرام باندھنے والوں کے لیے کچھ آداب و احکام اور ہدایات بیان

---

(۱) كما في المعجم الأوسط (۲/۱۶۳) (۱۵۸٤): عن أبي أمامة قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم في قوله عز وجل: ﴿اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ﴾ [البقرة:۱۹۷]: "شوال، وذو القعدة، وذو الحجة"-باب من اسمه أحمد. وذكره الهيثمي في "المجمع" (۳/۲۱۸) (۵۳۲۹) وقال: "رواه الطبراني في الصغير والاوسط، وفيه حصين بن مخارق، قال الطبراني كوفي ثقة، وضعفه الدار قطني، وبقية رجاله موثوقون."

فرمارہے ہیں، چنانچہ فرمایا: ﴿فَمَنْ فَرَضَ فِيْهِنَّ الْحَجَّ﴾ ''جو شخص ان مہینوں میں اپنے اوپر حج لازم کرلے۔'' ''لازم کرنے'' کے معنیٰ یہ ہیں کہ احرام باندھ لے، کیونکہ جب انسان احرام باندھ لیتا ہے تو گویا اس نے اپنے ذمے حج کو لازم کرلیا اور ان پابندیوں کو لازم کرلیا جو اِحرام کی حالت میں ضروری ہوتی ہیں، لہٰذا جس نے احرام باندھ لیا ﴿فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ ۙ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ﴾ ''تو وہ حج کے دوران نہ کوئی فحش بات کرے، نہ کوئی گناہ، نہ کوئی جھگڑا۔''

''فَلَا رَفَثَ'' رفث کا لفظ پیچھے روزوں کے سیاق میں بھی گزرا ہے اور اس کے معنیٰ یہ ہوتے ہیں کہ کوئی بھی ایسی بات کہنا، کوئی ایسا کلمہ بولنا یا کوئی ایسا عمل کرنا جس کا ذکر کرتے ہوئے عام طور پر انسان شرماتا ہے، وہ سب چیزیں رفث میں داخل ہیں، لہٰذا اس میں یہ بتادیا کہ جب احرام کی حالت شروع ہوگئی تو اگر سفر میں کسی کے ساتھ بیوی بھی ہے تو وہ اعمال جو بیوی کے ساتھ عام طور پر دوسروں کے سامنے انجام نہیں دے سکتا یا اس کا ذکر کرتے ہوئے شرماتا ہے، وہ سارے اعمال اس صورت میں منع ہوجاتے ہیں، یعنی صحبت کرنا بھی جائز نہیں اور صحبت کے علاوہ جو میاں بیوی کے درمیان پیار محبت کے بعض ایسے اعمال ہوتے ہیں جو تنہائی میں ہی انجام دیے جاتے ہیں، دوسروں کے سامنے ان کا ذکر کرنا بھی آدمی شرم کے خلاف سمجھتا ہے، مثلاً بوس وکنار وغیرہ، وہ بھی احرام کی اس حالت میں ناجائز ہوجاتے ہیں، جب تک احرام کھل نہ جائے تب تک اس قسم کا کوئی کام کرنا جائز نہیں ہے۔ اس کے علاوہ زبان سے کوئی ایسا کلمہ کہنا جو فحش نوعیت کا ہو وہ بھی حالتِ احرام میں منع ہے، یہ تمام امور ﴿فَلَا رَفَثَ﴾ کے مفہوم میں داخل ہیں۔

پھر فرمایا: ﴿وَلَا فُسُوْقَ﴾ ''اور نہ کوئی گناہ ہو'' گناہ تو ویسے بھی حرام ہوتا ہے، یعنی اگر حالتِ احرام نہ ہو تب بھی گناہ کا کام جائز نہیں ہوتا، لیکن اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہاں خاص طور پر اس لیے فرمایا کہ جب تم حج کرنے نکلے ہو تو اللہ تعالیٰ کی ایک عظیم عبادت انجام دینے جارہے ہو، لہٰذا اس حالت میں اپنے آپ کو گناہوں سے بچانے کا خاص اہتمام کرو، ورنہ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ایک طرف تو تم حج کرنے جارہے ہو اور دوسری طرف اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کررہے ہو۔ وہ حج کیسے قبول ہوگا جس میں اللہ تبارک وتعالیٰ کی نافرمانی کی جارہی ہو؟

حج کے موقع پر جھگڑے سے بچنے کی خصوصی تلقین

آگے فرمایا: ﴿وَ لَا جِدَالَ فِی الْحَجِّ﴾ ''اور حج کے دوران کوئی جھگڑا نہ ہو۔'' اس کی خاص طور پر ہدایت اس لیے فرمادی کہ حج کا سفر ایک ایسا سفر ہوتا ہے جس میں بسا اوقات بہت سے ساتھی مل کر سفر کرتے ہیں اور اگر مل کر نہ بھی کر رہے ہوں، تب بھی مختلف مقامات پر بڑا اجتماع ہوتا ہے۔ اس میں ذرا ذرا سی بات پر بعض اوقات ناگواریاں پیش آجاتی ہیں اور ان ناگواریوں کے نتیجے میں جھگڑا کھڑا ہوجاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرما رہے ہیں کہ جب حج کرنے کے لیے نکلے ہو تو پھر اپنے نفس پر قابو بھی حاصل کرو اور اگر اپنے کسی ساتھی سے کوئی ناگواری پیش آرہی ہے تو اس ناگواری کو بھی برداشت کرنے کی پوری کوشش کرو، غرض حج کی حالت میں لڑائی جھگڑے سے ہر حال میں بچو۔

حجرِ اسود کا بوسہ مستحب جبکہ کسی کو تکلیف پہنچانا حرام

یہاں یہ بات بھی سمجھ لینی چاہیے کہ دورانِ حج وعمرہ بعض لوگ حجرِ اسود تک پہنچنے کی کوشش میں دوسرے لوگوں کو دھکے دیتے ہیں یا کہنیاں مارتے ہیں، تو یہ بالکل ناجائز اور حرام کام ہے۔ یہ بالکل جہالت کی بات ہے کہ آدمی اللہ تعالیٰ کی ایک عظیم عبادت، فرض یا نفل حج ادا کرنے کے لیے جارہا ہے، اور کسی دوسرے مسلمان بھائی کو تکلیف پہنچائے۔ حجرِ اسود کا بوسہ لینا زیادہ سے زیادہ مستحب ہے، بے شک اس کی بھی فضیلت ہے، لیکن کسی مسلمان کو کوئی ادنیٰ تکلیف پہنچانا گناہِ کبیرہ ہے، لہٰذا حجرِ اسود کا بوسہ لینے کی فضیلت حاصل کرنے کے لیے کسی کو تکلیف پہنچانا، گویا ایسا ہی ہے جیسے کسی مستحب عمل کو انجام دینے کے لیے گناہِ کبیرہ کا ارتکاب کیا جائے۔

حج کے مبارک ایام کو غنیمت سمجھیں

احرام کے ممنوعات اور محظورات بیان فرمانے کے بعد پھر آگے اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس بات کی طرف متوجہ فرمایا کہ حج کے دوران صرف اتنی بات نہیں ہے کہ گناہوں سے اپنے آپ کو بچائے رکھو، یہ تو بہت ضروری ہے ہی، لیکن یہ حج کا موقع ایسا ہے کہ اس میں جتنے نیک کام تم کرسکتے ہو، اگر کرلو گے تو یہ تمہارے لیے آخرت کا بہت بڑا ذخیرہ بنے گا، لہٰذا اسی حوالے سے فرمایا: ﴿وَ مَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَیْرٍ﴾ اور تم جو نیک کام

بھی کروگے ﴿يَّعْلَمْهُ اللّٰهُ﴾ ''اللہ اسے جان لے گا'' یعنی اس موقع کو غنیمت سمجھو، حج کے اوقات اللہ تبارک وتعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہیں جو تمہیں ملے ہیں، انہیں بے کار اور غفلت میں ضائع کرنے سے بچو اور ان میں جتنی نیکیاں کر سکتے ہو، وہ کرو۔

ان نیکیوں میں ساری نفلی عبادتیں بھی آگئیں، جیسے کوئی شخص ان دنوں کو نفلی نمازوں، نفلی طواف، اللہ کا ذکر کرنے اور درود شریف پڑھنے میں استعمال کرے یا اسی طرح دوسرے لوگوں کی مدد کرنے میں استعمال کرے۔ یہ جتنی بھلائیاں ہیں، انہیں اس زمانے میں خاص طور پر ادا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں خاص طور پر ''خیر'' کا لفظ استعمال فرمایا کہ نیکی اور بھلائی کا جو کام بھی تم کروگے اللہ تعالیٰ اسے جان لے گا۔

اسی طرح یہاں یہ بھی بتا دیا گیا کہ تم کہیں یہ بھی نہ سمجھ بیٹھنا کہ تم اگر کوئی ایسا کام کروگے جو ناجائز ہو اور اس کے اوپر تمہارا مؤاخذہ نہ ہوگا یا تمہاری گرفت نہ ہوگی، ایسا نہیں ہوسکتا، کیونکہ اللہ تعالیٰ تمہارے ہر عمل کو دیکھ رہا ہے، لہٰذا شروع سے لے کر آخر تک جتنے کام انجام دو، وہ قاعدے کے مطابق انجام دو اور جن احکام کا تمہیں پابند کیا گیا ہے ان احکام کو پوری طرح بجالاؤ۔

حج میں تقویٰ کا زادِ راہ اختیار کرنے کی ہدایت

پھر اگلا جملہ ارشاد فرمایا: ﴿وَ تَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى﴾ اور (حج کے سفر میں) زادِ راہ ساتھ لے جایا کرو، کیونکہ بہترین زادِ راہ تقویٰ ہے۔ ﴿تَزَوَّدُوْا﴾ کا لفظ تزوُّد سے نکلا ہے اور ''تزوُّد'' زاد سے نکلا ہے، زاد اس سامان کو کہتے ہیں جو انسان سفر کے وقت اپنے ساتھ رکھتا ہے اور اسی سے اردو میں ''زادِ راہ'' کہا جاتا ہے، یعنی راستے کا سامان۔ زاد سے زیادہ تر کھانے پینے کی چیزیں مراد ہوتی ہیں، لہٰذا تزوُّد کے معنیٰ ہوئے سفر پر جاتے ہوئے کھانے پینے کی چیزیں ساتھ رکھنا۔ اب یہاں پر آگے اللہ تبارک وتعالیٰ نے تقویٰ کا لفظ ذکر فرمایا ہے کہ سب سے بہترین سامان تقویٰ ہے۔ اب اس اعتبار سے اس لفظ ﴿تَزَوَّدُوْا﴾ کے دو الگ الگ مفہوم ہو سکتے ہیں کیونکہ قرآنِ کریم جو الفاظ استعمال فرماتا ہے، عموماً اس میں بڑے وسیع معانی پنہاں ہوتے ہیں۔

پہلا مفہوم تو یہ ہے کہ یہاں پر ﴿تَزَوَّدُوْا﴾ کے بعد تقویٰ کا لفظ محذوف مانا جائے اور اس صورت میں

مطلب یہ بنے گا کہ تم تقویٰ کا زادِ راہ ساتھ لے کر جاؤ، یعنی حج کے دوران تمہارا دھیان اور تمہاری فکر اللہ تعالیٰ کی طرف ہونی چاہیے، کیونکہ ﴿فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى﴾ ''بے شک بہترین زادِ راہ تقویٰ ہی ہے۔'' اور تقویٰ کا حاصل یہ ہے کہ انسان کا دھیان اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ رہے اور وہ ہر لمحہ اسی کی طرف رجوع کرتا رہے۔ اس کا ظاہری مفہوم تو یہی ہے کہ تم تقویٰ کو اپنا زادِ راہ بناؤ، اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع اور انابت کا اہتمام کرو۔ ﴿وَاتَّقُوْنِ يٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ ﴿۱۹۷﴾﴾ ''اور اے عقل والو! میری نافرمانی سے ڈرتے رہو۔''

حج میں کھانے پینے کا سامان ساتھ لے جانا توکّل کے منافی نہیں

اس ظاہری معنی کے ساتھ ساتھ اس جملے کا ایک دوسرا مفہوم بھی ہے، اور اس مفہوم کے مطابق اس آیتِ کریمہ میں بعض لوگوں کے ایک غلط طرزِ عمل کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، جس کا ذکر صحیح بخاری کی ایک حدیث [1] میں بھی آیا ہے۔ حدیث میں یہ مذکور ہے کہ بعض لوگ ایسے تھے جو جب حج کے لیے نکلتے تو یہ سمجھتے تھے کہ حج چونکہ اللہ تعالیٰ کی ایک عاشقانہ عبادت ہے، لہٰذا ہم اپنے ساتھ کوئی زادِ راہ یا کھانے پینے کی چیزیں لے کر نہیں جائیں گے، بلکہ اللہ پر توکّل اور بھروسہ کرتے ہوئے نکل کھڑے ہوں گے اور اسی حالت میں وہاں پر پہنچیں گے، لہٰذا وہ اپنے ساتھ کوئی توشہ لے جانا یا کھانے پینے کی چیزیں ساتھ رکھنا حج کے اخلاص کے منافی سمجھتے تھے اور یہ سمجھتے تھے کہ توکّل کا تقاضا یہی ہے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس آیت میں ان کی طرف بھی اشارہ فرمادیا اور ان کے اس عمل کی تردید کرتے ہوئے فرمایا: ﴿وَتَزَوَّدُوْا﴾ ''اور تم زادِ راہ ساتھ رکھو،'' یعنی کھانے پینے کی چیزیں اپنے ساتھ رکھا کرو، اور یہ بھی بتادیا کہ حج کے سفر میں کھانے پینے کا کوئی سامان ساتھ رکھنا کوئی گناہ کی بات یا توکّل کے منافی نہیں ہے، کیونکہ توکّل کے معنیٰ یہ ہیں کہ جو ظاہری اسباب اللہ تعالیٰ نے کسی کام کے لیے بنائے ہیں، انسان اُن اسباب کو اپنی پوری کوشش کے ساتھ اختیار کرے اور پھر یہ عقیدہ رکھے کہ ان اسباب میں بذاتِ خود کوئی تاثیر نہیں ہے، بلکہ اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے فضل وکرم سے ہی ان اسباب کے اندر تاثیر پیدا فرمائیں گے، یہی توکّل کی حقیقت ہے۔

---

(۱) كما في صحيح البخاري (۲/۱۳۳) (۱۵۲۳): عن ابن عباس رضي الله عنهما، قال: ''كان أهل اليمن يحجون ولا يتزودون، ويقولون: نحن المتوكلون، فإذا قدموا مكة سألوا الناس، فأنزل الله تعالى: ﴿وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى﴾ ''كتاب الحج، باب قول الله تعالى: ﴿وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى﴾.

''توکّل'' یعنی اللہ تعالیٰ پر بھروسہ رکھنے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ انسان ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جائے اور کوئی سبب اختیار نہ کرے اور پھر بھی یہ سمجھے کہ میں توکّل کر رہا ہوں، چنانچہ ہوتا یہ تھا کہ جو لوگ اس طرح نام نہاد توکّل کی وجہ سے روانہ ہوتے تھے اور اپنے ساتھ کھانے پینے کا سامان نہیں رکھتے تھے، انہیں جب سفر کے دوران کچھ بھوک لگتی یا پریشانی ہوتی اور کھانے پینے کا سامان نہ ہوتا، تو راستے میں بعض جگہ لوگوں کے سامنے دستِ سوال دراز کرتے تھے اور پھر جب مکّہ پہنچتے تو لوگوں سے چیزیں مانگ رہے ہوتے تھے، اس طرح وہ خود بھی تکلیف اٹھاتے تھے اور دوسروں کو بھی پریشان کرتے تھے۔

ان کے اس طرزِ عمل کے حوالے سے اللہ تعالیٰ فرمارہے ہیں کہ یہ کیا توکّل ہوا کہ تم زادِ راہ تو ساتھ لے کر نکلے نہیں اور لوگوں سے مانگنا شروع کردیا؟ اسی لیے اللہ تعالیٰ فرمارہے ہیں کہ تم توشہ ساتھ رکھو، سامان ساتھ رکھو اور اپنی حد تک جو اسباب ہیں انہیں اختیار کرو، البتہ یہ بات ذہن میں رہنی چاہیے کہ ﴿فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى﴾ ''بہترین توشہ تقویٰ ہے۔'' ظاہری توشہ تو یہ ہے جو تم اپنے ساتھ لے کر جارہے ہو اور باطنی توشہ یہ ہے کہ تمہارے دل میں تقویٰ ہو اور اسی تقویٰ کا ایک تقاضا یہ بھی ہے کہ کسی کے سامنے دستِ سوال دراز نہ کرنا پڑے۔

سفرِ حج کے دوران تجارت اور مزدوری کا حکم

آگے اللہ تعالیٰ نے حج سے متعلق مزید احکام بیان کرتے ہوئے فرمایا: ﴿لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ﴾ ''تم پر اس بات میں کوئی گناہ نہیں ہے کہ تم (حج کے دوران تجارت یا مزدوری کے ذریعے) اپنے پروردگار کا فضل تلاش کرو۔''

اس آیت کا پسِ منظر یہ ہے کہ زمانۂ جاہلیت میں اہلِ عرب نے جس طرح تمام معاملات کو اور عبادات کو بگاڑ کر طرح طرح کی بے ہودہ رسمیں ان میں شامل کردی تھیں اور عبادات کو بھی کھیل تماشا بنا دیا تھا، اسی طرح حج کے کاموں میں بھی طرح طرح کی بے ہودگیاں شامل کرلی تھیں، چنانچہ جب حج کے دوران منیٰ کے اندر اجتماع ہوتا تھا تو اس میں ان کے خاص خاص بازار لگتے تھے، نمائشیں ہوتی تھیں اور اس موقع کو تجارتوں کے فروغ کا ذریعہ بنایا جاتا تھا۔ اسی طرح وہاں مشاعرے ہوا کرتے تھے اور ان مشاعروں میں ایک قبیلہ اپنے آباء و اجداد کا ذکر کرکے ان کی تعریفیں کرتا تھا، ان پر فخر کرتا تھا تو دوسرا قبیلہ اس کے مقابلے میں اپنے

آباء واجداد کا ذکر کر کے ان پر فخر کیا کرتا تھا، یہ سارے مشغلے حج کے دوران انجام دیے جاتے تھے۔

جب اسلام آیا تو اللہ تعالیٰ نے اِن ساری بے ہودہ رسموں کو ختم کر دیا اور اُن کے بہت سے وہ طریقے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے طریقے سے مختلف تھے یا ان کو بگاڑ کر بنائے گئے تھے، انہیں ختم کر دیا گیا، چنانچہ وہ جو میلے لگایا کرتے تھے وہ ختم ہو گئے، ان کی بجائے اللہ تعالیٰ کے ذکر کی صدائیں گونجنے لگیں اور ہر ایک شخص اللہ تعالیٰ کے ذکر میں مشغول رہنے لگا۔ اس وقت حضراتِ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین جو رسولِ کریم سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیمات پر مرمٹنے والے لوگ تھے، ان کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ شاید ایامِ حج میں، یعنی حج کے دوران کوئی بھی تجارت کرنا یا مزدوری کر کے کچھ کما لینا، یہ بھی جاہلیت کی نشانی ہے، لہٰذا شاید اسلام میں اس کی بھی ممانعت ہو گئی ہو یا ممانعت ہو جائے گی۔

چنانچہ ایک روایت میں ہے کہ ایک صاحب حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے پاس آئے اور یہ سوال کیا کہ ہمارا پیشہ پہلے سے یہ ہے کہ ہم اونٹ کرائے پر چلاتے ہیں، کچھ لوگ ہمارے اونٹ حج کے لیے کرائے پر لے جاتے ہیں، ہم ان کے ساتھ جاتے ہیں اور حج بھی کرتے ہیں، کچھ لوگ کہتے ہیں کہ تمہارا حج نہیں ہوگا، تو کیا ہمارا حج نہیں ہوگا؟ اس پر حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا:

> ”ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تھا، اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے وہی سوال کیا تھا جو تم نے مجھ سے کیا ہے تو نبیِ کریم سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خاموش رہے اور اسے اس وقت کوئی جواب نہ دیا، یہاں تک کہ یہ آیت نازل ہوئی ﴿لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ﴾ یعنی تمہارے لیے اس بات میں کوئی گناہ نہیں ہے کہ تم حج کے دوران تجارت یا مزدوری کے ذریعے اپنے پروردگار کا فضل تلاش کرو۔“(۱)

اس آیت نے یہ بتا دیا کہ حج کے سفر کا اصل مقصد تو اگرچہ حج کے افعال انجام دینا ہے اور اللہ تعالیٰ کی

---

(۱) كما في سنن أبي داود (۲/۱۴۲) (۱۷۳۳) كتاب المناسك، باب الكري، والحديث سكت عنه أبو داود. وقال المنذري في "مختصره" (۱/۵۰۶): "أبو أمامة هذا لا يعرف اسمه روى عنه العلاء بن المسيب والحسن بن عمرو الفقيمي وقال أبو زرعة الرازي: كوفي لا بأس به." وقال الحاكم في "المستدرك" (۱/۶۱۸) (۱۶۴۷): "هذا حديث صحيح الإسناد، ولم يخرجاه."

رضا مقصود ہے، لیکن اگر ضمنی طور پر کوئی شخص کوئی چیز بیچ دے یا خرید لے یا کوئی مزدوری کا کام کرلے تو اس سے حج خراب نہیں ہوتا، یعنی حج فاسد نہیں ہوتا، بلکہ پھر بھی حج ہوجاتا ہے۔ صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ حج ہوجاتا ہے، بلکہ فرمادیا کہ ﴿لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ﴾ ''تمہارے اوپر اس میں کوئی گناہ نہیں ہے'' کہ حج کے دوران تم اس قسم کی کوئی سرگرمی اختیار کرو، یعنی حج کے دوران ضمنی طور پر بیع وشراء یا مزدوری انجام دے کر اگر کچھ نفع کمانا چاہو تو کما سکتے ہو، اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ البتہ یہ ضرور یاد رہے کہ حج کے دوران حتی الامکان تمہارا زیادہ تر وقت اللہ تعالیٰ کی عبادتوں میں صرف ہونا چاہیے۔

تجارت و ملازمت کو اللہ کا فضل قرار دینے کی حکمتیں

یہاں ایک دوسری بات بڑی اہم ہے جو ہمیں ہمیشہ پیشِ نظر رکھنی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے مذکورہ بالا آیت، یعنی ﴿لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ﴾ میں تجارت اور محنت و مزدوری کے لیے ''فضل'' کا لفظ استعمال فرمایا ہے۔ براہِ راست تجارت یا ملازمت نہیں کہا، یعنی یہ نہیں فرمایا کہ تمہارے لیے اس میں کوئی حرج نہیں ہے کہ تم حج کے دوران تجارت یا ملازمت کرو، بلکہ اس کے بجائے یہ فرمایا کہ ''اس میں کوئی حرج نہیں ہے کہ تم اپنے پروردگار کا فضل تلاش کرو۔''

یہاں پر تجارت اور روزگار حاصل کرنے کی جدو جہد کو اللہ تعالیٰ نے ''رب کا فضل'' تلاش کرنے سے تعبیر کیا ہے۔ قرآن کریم میں کچھ اور مقامات پر بھی یہ تعبیر اختیار کی گئی ہے، مثلاً سورۂ جمعہ میں کہا گیا کہ جب جمعہ کی نماز پوری ہوجائے تو زمین میں منتشر ہوجاؤ:

وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ [1]

اور اللہ کا فضل تلاش کرو۔

یعنی تجارت وغیرہ کے ذریعے روزی حاصل کرو۔ قرآنِ کریم کی اس اصطلاح میں بڑے عظیم معانی پوشیدہ ہیں اور یہ لفظ اختیار کرکے بہت ساری غلط فہمیوں کو دور کرنے کے ساتھ ساتھ بہت سارے اہم پہلوؤں کی طرف بھی توجہ دلائی گئی ہے، جن میں سے خاص طور پر دو باتوں کی طرف توجہ دلانا ضروری ہے۔

---

(۱) سورۃ الجمعۃ (۶۲): آیت (۱۰)

• رزق عقل سے نہیں بلکہ رب کے فضل سے ملتا ہے

سب سے پہلی بات تو یہ کہ بعض اوقات جب آدمی تجارت کرتا ہے یا ملازمت کرتا ہے اور اس کے نتیجے میں اسے کچھ روزی ملتی ہے تو ایک نادان انسان یہ سمجھ بیٹھتا ہے کہ مجھے جو کچھ ملا ہے وہ میری قوتِ بازو کے نتیجے میں ملا، میرے علم اور ہنر کے نتیجے میں ملا اور میں نے اپنی کوشش کے ذریعے کمایا۔ اسے یہ دھیان نہیں ہوتا کہ کوشش اگرچہ اس نے کی ہے، لیکن اس کوشش میں تاثیر تو اللہ تعالیٰ نے ہی پیدا کی ہے، اور اللہ تعالیٰ کے فضل کے بغیر اس کی کوشش کا بارآور (فائدہ مند) ہونا ممکن نہیں تھا۔

دکاندار کے بس میں اتنا ہی تو ہے کہ وہ اپنی دکان کھول کر بیٹھ جائے یا اس کے اندر کچھ سامان ایسا جمع کرلے جو لوگوں کے لیے دلچسپی کا باعث ہو، لیکن دکان میں گاہک بھیجنا کس کا کام ہے؟ لوگوں کو اس دکان کی طرف کس نے متوجہ کیا؟ اللہ تعالیٰ ہی گاہکوں کے دل میں ڈالتے ہیں کہ فلاں دکان سے جاکر چیز خرید لیں۔ اگر آدمی دکان کھول کے بیٹھ جائے اور سارا دن بیٹھا رہے، لیکن گاہک نہ آئے تو روزی کہاں سے ملے گی؟

اسی طرح فرض کیجیے کوئی شخص ملازمت کر کے پیسہ کما رہا ہے تو بے شک اس نے محنت کی ہے، جس کا اسے صلہ مل رہا ہے، لیکن اس ملازمت کا ملنا، پھر جس نے اسے ملازم رکھا ہے اس کے دل کو اس بات پر آمادہ کرنا کہ یہ اسے ملازم رکھے اور پھر اسے اس کی محنت کا صحیح صحیح اور مناسب صلہ دے، یہ سارے کام تو اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے ہی ہوتے ہیں، پھر ملازمت کے دوران انسان اپنے ہاتھ پاؤں کے ذریعے سے جو کوشش کر رہا ہے تو یہ ہاتھ پاؤں خود تو کہیں بازار سے خرید کر نہیں لے آیا تھا، ان ہاتھ پاؤں میں طاقت اس نے خود تو پیدا نہیں کی تھی، یہ اللہ تعالیٰ ہی ہے جو انسان کے ہاتھ پاؤں میں طاقت پیدا کر دیتا ہے۔ پھر انسان جو تدبیریں اپنی تجارت کے فروغ کے لیے یا اپنی ملازمت کے حصول کے لیے سوچتا ہے، آخر اپنے دماغ سے ہی سوچتا ہے، کیا یہ دماغ وہ خود اپنی قوتِ بازو کے بل پر کہیں سے لے آیا تھا؟ یہ دماغ تو اللہ تعالیٰ کا ہی پیدا کیا ہوا ہے، وہی دل و دماغ میں تدبیریں ڈالتا ہے اور ان تدبیروں کے مطابق انسان ہاتھ پاؤں چلا کر کوشش کرتا ہے۔

پس اگر دیکھا جائے تو اگرچہ ہم لوگ جو کچھ بھی کماتے ہیں وہ بظاہر ہماری کوششوں کا ایک ثمرہ ہوتا ہے، لیکن یہ کوششیں اللہ تعالیٰ کے فضل کے بغیر نہ انجام دی جاسکتی ہیں اور نہ ان کوششوں میں تاثیر پیدا ہوسکتی ہے،

سو اسی لیے اللہ تعالیٰ جہاں تجارت اور ملازمت یا روزی کمانے کا ذکر فرماتے ہیں تو ہمیشہ اسے ''اللہ کا فضل'' سے تعبیر فرماتے ہیں۔

• تجارت و ملازمت شریعت کے مطابق کرنے کی ہدایت

تجارت و ملازمت اور روزگار کے لیے ''فضل'' کا لفظ استعمال کرنے میں دوسرا اہم پہلو یہ ہے کہ جب یہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے تو پھر اللہ تعالیٰ کے احکام کے مطابق ہی ہونا چاہیے، یعنی جس طریقے سے اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنا فضل تلاش کرنے کا حکم دیا ہے کہ کون سی بیع جائز ہے کون سی ناجائز ہے؟ کون سی ملازمت جائز ہے اور کون سی ناجائز ہے؟ روزی حاصل کرنے کا کون سا طریقہ حلال ہے اور کون سا حرام ہے؟ یہ سارے طریقے اللہ تعالیٰ نے بتائے ہوئے ہیں، لہٰذا جب یہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے تو پھر اسے اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق ہی تلاش کرنا چاہیے۔ اگر انسان اللہ تعالیٰ کے احکامات کی خلاف ورزی کر کے رزق تلاش کرے گا تو یہ اللہ تعالیٰ کا فضل تلاش کرنے کے صحیح مفہوم کی نمائندگی نہیں کر رہا ہوگا۔

بہرحال! اس آیتِ کریمہ نے یہ بتادیا کہ تم حج کے دوران بھی اللہ تعالیٰ کا فضل تلاش کرسکتے ہو، ضرورت کے موقع پر تجارت بھی کرسکتے ہو اور ملازمت بھی کرسکتے ہو یا روزی کمانے کا کوئی اور طریقہ بھی اختیار کرسکتے ہو۔

مزدلفہ میں اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے کی ہدایت

پھر آگے فرمایا: ﴿فَاِذَآ اَفَضْتُمْ مِّنْ عَرَفٰتٍ﴾ جب تم عرفات سے روانہ ہو (کر مزدلفہ میں آجاؤ) ﴿فَاذْكُرُوا اللّٰهَ﴾ تو اللہ کا ذکر کرو ﴿عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ﴾ ''مشعرِ حرام کے پاس۔''

۹ ذی الحجہ کی تاریخ جو عرفہ کا دن کہلاتا ہے، اس دن حاجی حج کا سب سے بڑا رکن ''وقوفِ عرفات'' انجام دیتے ہیں۔ عرفات میں وقوف کے حوالے سے حکم یہ ہے کہ حُجاج غروبِ آفتاب کے بعد وہاں سے روانہ ہوجائیں، اسے ''اِفاضہ'' سے تعبیر کیا ہے۔ ''مشعرِ حرام'' ایک جگہ ہے جو مزدلفہ میں واقع ہے، وہاں آج کل ایک مسجد بنی ہوئی ہے، اور ''اس کے پاس'' کا مطلب یہ ہے کہ مزدلفہ کی پوری وادی ایسی ہے جہاں رہ کر آدمی اللہ تعالیٰ کا ذکر کرے۔ وہاں رات گزارنا بھی سُنّت ہے اور صبح کو طلوعِ آفتاب سے پہلے نمازِ فجر کے بعد

وقوف کرنا، یعنی کھڑے ہوکر اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنا، اللہ تعالیٰ سے دعائیں کرنا واجب ہے۔ یہاں پر اسی کا ذکر ہورہا ہے کہ تم مشعرِ حرام کے پاس اللہ تعالیٰ کا ذکر کرو۔

اللہ کے ذکر میں منقول و ماثور طریقے ہی اصل ہیں

آگے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَاذْكُرُوْهُ كَمَا هَدٰىكُمْ﴾ اور اس کا ذکر اسی طرح کرو جس طرح اس نے تمہیں ہدایت کی ہے ﴿وَ اِنْ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الضَّآلِّيْنَ ۝۱۹۸﴾ ''جب کہ اس سے پہلے تم بالکل ناواقف تھے۔''

جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا، جاہلیت کے زمانے میں لوگ مزدلفہ میں وقوف تو کرتے تھے، لیکن وہاں پر بجائے اس کے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کا ذکر کیا جائے یا زیادہ تر وقت اللہ تعالیٰ کے ذکر میں صرف کیا جائے، وہ وہاں پر مشاعرے منعقد کرتے تھے اور مشاعروں میں اپنے آباء و اجداد کے مفاخر (قابلِ فخر باتیں) بیان کرتے اور ان کی شان میں قصیدے پڑھا کرتے تھے۔ اسی طرح اور بھی کچھ بے ہودہ رسمیں وہاں پر انجام دی جاتی تھیں۔ اللہ تعالیٰ اسی طرف اشارہ فرمارہے ہیں کہ وہاں پر جاکر یہ بے ہودہ رسمیں ختم کرکے اللہ تعالیٰ کا ذکر کرو اور ذکر بھی ایسا کرو جیسی اللہ تعالیٰ نے تمہیں ہدایت دی ہے، جبکہ اس سے پہلے تم لوگ گمراہ اور ناواقف تھے۔

اس سے یہ معلوم ہوا کہ اللہ کا ذکر کرنا بے شک بہت بڑی نیکی ہے اور اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم میں جگہ جگہ اس کا حکم بھی دیا ہے، لیکن وہ ذکر اسی وقت تک نیکی ہے جب تک وہ ذکر اس طریقے کے مطابق کیا جائے جس طریقے سے اللہ تعالیٰ نے ہدایت دی ہے۔ اور یہ بات ہر مسلمان کو معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ہدایت ہم تک یا تو قرآنِ کریم کے ذریعے پہنچی ہے یا نبیِ کریم سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے پہنچی ہے، لہٰذا قرآن و سُنّت میں ذکر کا جو طریقہ بیان کیا گیا ہے بے شک وہی طریقہ اعلیٰ درجے کی عبادت ہے، لیکن اگر کوئی شخص اپنی طرف سے کوئی طریقہ گھڑ کر اس کی طرف چل پڑے تو عبادت اور فضیلت کا وہ مقام اُسے حاصل نہیں ہوسکتا، جو قرآن وسُنّت سے مأثور (منقول) طریقے کے ذریعے حاصل ہوسکتا ہے۔

حج کے حوالے سے نسلی امتیاز پر مشتمل ایک رسم کی تردید

یہاں پر اللہ تبارک وتعالیٰ نے ذکر کا جو حکم دیا تھا یہ وہ ذکر ہے جو مزدلفہ میں کرنا مقصود ہے، پھر مزدلفہ سے روانہ ہو کر حجاج منیٰ جایا کرتے تھے، لیکن بیچ میں عہدِ جاہلیت کے اندر مروّج ایک غلط رسم کی اصلاح کے بارے میں اللہ تعالیٰ متوجہ فرما رہے ہیں۔ وہ رسم یہ تھی کہ یہ لوگ جب حج کے لیے جاتے تھے تو جیسا کہ ہر مسلمان جانتا ہے حج کا سب سے بڑا رکن عرفات میں وقوف کرنا ہے جو ۹ ذی الحجہ کو انجام پاتا ہے، لیکن کفّارِ عرب میں جو لوگ بیت اللہ کے ارد گرد رہنے والے تھے ان میں قریش بھی تھے، بنو کنانہ بھی تھے اور بعض دیگر قبائل بھی تھے اور ان تمام قبائل کے مجموعے کو ''حُمس'' کہا جاتا تھا۔

ان لوگوں کا طریقہ یہ تھا کہ جب ساری دنیا عرفات میں وقوف کرنے کے لیے جا رہی ہوتی تو اس وقت انہوں نے اپنے لیے ایک امتیاز یہ رکھا ہوا تھا کہ وہ عرفات نہیں جاتے تھے اور کہتے تھے کہ ہم مزدلفہ میں ہی وقوف کریں گے۔ مزدلفہ میں ان کا وقوف کرنے کا مطلب و مقصد یہ تھا کہ چونکہ ہم بیت اللہ کے مجاور اور پاسبان ہیں، لہٰذا ہمیں یہ امتیاز حاصل ہے کہ ہم حدودِ حرم سے باہر نہ نکلیں۔ عرفات حدودِ حرم سے باہر ہے اور مزدلفہ حدودِ حرم کے اندر ہے، لہٰذا یہ لوگ مزدلفہ ہی کی حد تک محدود رہتے ہوئے وہیں پر وقوف کرتے تھے اور عرفات نہیں جایا کرتے تھے۔ عام لوگوں کو نویں تاریخ کا دن عرفات میں گزارنے کے بعد رات کو مزدلفہ کے لیے روانہ ہونا پڑتا تھا، مگر اپنے آپ کو خانہ کعبہ کا مجاور سمجھنے والے یہ قبائل شروع میں ہی مزدلفہ میں موجود ہوتے تھے اور انہیں عرفات سے نہیں آنا پڑتا تھا۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے اگلے جملے میں ان کی اس رسم کی تردید کرتے ہوئے فرمایا: ﴿ثُمَّ اَفِيْضُوْا مِنْ حَيْثُ اَفَاضَ النَّاسُ﴾ ''پھر تم اسی جگہ سے روانہ ہو جہاں سے عام لوگ روانہ ہوتے ہیں،'' یعنی عام لوگوں کے ساتھ عرفات سے روانگی اختیار کرو۔ انہیں حکم دیا گیا کہ مزدلفہ میں رہ کر عام لوگوں کو عرفات بھیج دینے کے بجائے تمہیں بھی عرفات جانا چاہیے اور وہیں سے عام لوگوں کے ساتھ روانہ ہو کر واپس مزدلفہ آنا چاہیے۔

انسانی مساوات کا عظیم سبق

اس طرح اللہ تبارک وتعالیٰ نے ایک اہم اصول کی طرف بھی اشارہ فرما دیا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی عبادت میں تمام انسان برابر ہیں، کسی کو کسی پر کوئی فوقیت یا فضیلت حاصل نہیں۔ سب اللہ کے بندے ہیں اور

سب اللہ تبارک وتعالیٰ کی عبادت کرنے والے ہیں، لہٰذا کسی بھی فریق، کسی گروہ، کسی قبیلے یا کسی جماعت کے لیے یہ ہرگز جائز نہیں ہے کہ وہ اپنے لیے کوئی امتیاز پیدا کرے اور عام مسلمانوں سے ہٹ کر اپنا کوئی الگ طریقہ مقرر کرے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے انسانی مساوات کا یہ عظیم سبق اس آیتِ کریمہ میں دیتے ہوئے فرمایا کہ تم اسی جگہ سے روانہ ہو جہاں سے عام لوگ روانہ ہوتے ہیں۔ ﴿وَاسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ﴾ ''اور اللہ سے مغفرت مانگو'' غالباً اس کا اشارہ اس طرف ہے کہ پچھلے دنوں میں تم سے جو یہ بات سرزد ہوئی ہے کہ تم عرفات میں وقوف کرنے کے بجائے مزدلفہ میں ہی ٹھہر گئے تھے تو اپنے اس فعل پر اب اللہ تعالیٰ سے مغفرت طلب کرو کہ ہم نے یہ غلط طریقہ اختیار کیا ہوا تھا اور اب ہم صحیح طریقہ اختیار کر رہے ہیں اور اے اللہ! ہم اپنے پچھلے طرزِ عمل پر آپ سے معافی مانگتے ہیں، ﴿اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۹۹﴾﴾ ''بے شک اللہ بہت بخشنے والا، بڑا مہربان ہے،'' اس لیے وہ تمہیں معاف بھی کردے گا، اور تم پر رحم بھی فرمائے گا۔

آباء و اجداد کے کارناموں پر فخر کے بجائے ذکر کا حکم

جاہلیت میں جب اہلِ عرب کو منیٰ میں خالی وقت ملتا تھا تو ان کا طریقہ یہ ہوتا تھا کہ وہ وہاں مشاعرے منعقد کرتے تھے اور مشاعروں میں ہر قبیلہ اپنے آباء واجداد کو یاد کیا کرتا تھا، ان کی فضیلتیں بیان کرتا اور ان کی تعریفیں کیا کرتا تھا۔ ان کا سارا وقت اسی بات میں گزر جاتا تھا کہ ایک قبیلہ آیا اور اس نے اپنے آباء و اجداد کی فضیلت و تعریف میں قصیدے پڑھے، پھر دوسرا قبیلہ آیا اور اس نے اپنے آباء و اجداد کی تعریف میں قصیدے پڑھے، اس طرح یہ وقت گزارا جاتا تھا۔

اللہ تعالیٰ انہیں اس بے ہودہ شغل کے بجائے اپنے ذکر کا اہتمام کرنے کی تلقین کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ﴿فَاِذَا قَضَيْتُمْ﴾ جب تم پورے کرچکو ﴿مَّنَاسِكَكُمْ﴾ ''حج کے کام،'' اور اس سے مراد واجب کام ہیں، یعنی وہ کام جو حج میں ضروری ہیں، مثلاً عرفات کا وقوف، مزدلفہ کا وقوف اور رمیِ جمرات وغیرہ۔ جب تم ان سے فارغ ہوجایا کرو تو ﴿فَاذْكُرُوا اللّٰهَ﴾ ''اللہ تبارک وتعالیٰ کا ذکر کیا کرو۔'' مثلاً منیٰ کے دنوں میں جو حاجی منیٰ میں مقیم رہتے ہیں، ان کے لیے وہاں کی جو واجب عبادت ہے وہ جمرات کی رمی ہے۔ رمیٔ جمرات کے بعد منیٰ کے اندر سارا وقت خالی گزرتا ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتے ہیں کہ اس وقت کو خالی گزارنے کے بجائے اللہ تعالیٰ کے ذکر میں صرف کرنے کی کوشش کرو، جتنا زیادہ سے زیادہ ہوسکے، اللہ تعالیٰ کا ذکر کیا کرو۔

پھر آگے فرمایا: ﴿كَذِكْرِكُمْ اٰبَآءَكُمْ﴾ اور (اللہ تعالیٰ کو) ایسا یاد کرو جیسا تم اپنے آباء و اجداد کو یاد کیا کرتے تھے ﴿اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًا﴾ ''یا اس سے بھی زیادہ۔'' اللہ تبارک وتعالیٰ فرمارہے ہیں کہ اب آباء و اجداد کا ذکر کرنے کے بجائے اللہ تعالیٰ کا ذکر کرو۔ اگر آباء و اجداد مسلمان تھے تو ان کے حق میں بھی فائدہ مند یہی ہوگا۔ محض ان کی تعریف سے تو انہیں کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا۔ اگر فائدہ حاصل ہوگا تو وہ اسی طرح ہوگا کہ تم اللہ کا ذکر کرو اور ان کے حق میں دعا کرو، نیز اللہ تعالیٰ کا ذکر بھی اس طرح کرو جیسے تم اپنے آباء واجداد کا ذکر کیا کرتے تھے یا اس سے بھی زیادہ ذکر کرو۔

اس آیتِ مبارکہ نے عرب کی ایک جاہلانہ رسم اور فالتو مشغلے کو مٹا کر مسلمانوں کو ہدایت کی کہ یہ ایام اور یہ مقام اللہ تعالیٰ کے ذکر اور اس کی عبادت کے لیے مخصوص ہیں، ان میں ذکرُ اللہ اور عبادت کے جو فضائل و برکات ہیں، وہ پھر ہاتھ نہ آئیں گے، اس لیے انہیں غنیمت سمجھنا چاہیے اور حج کی توفیق ہوجانے پر شکر بجا لانا چاہیے۔

آخرت سے بے فکری مومن کا شیوہ نہیں

کچھ لوگوں کی یہ عادت تھی کہ وہ ایامِ حج میں اگرچہ ذکر اللہ اور دعاؤں کا اہتمام تو کرتے تھے، لیکن ان کی تمام تر دعائیں صرف دنیاوی حاجات اور دنیا کی راحت وعزت اور دولت کے حصول کے لیے ہوتی تھیں، آخرت کی طرف ان کا کوئی دھیان نہیں ہوتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے بندوں کو اس طرزِ عمل کی اصلاح اور دعا کا طریقہ سکھانے کی غرض سے فرمایا: ﴿فَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ﴾ اب بعض لوگ تو وہ ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ ﴿رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا﴾ اے ہمارے پروردگار! ہمیں دنیا میں بھلائی عطا فرما ﴿وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ۝۲۰۰﴾ ''اور آخرت میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہوتا۔''

اس میں اس بات کی طرف اشارہ کیا جارہا ہے کہ بعض لوگ ایسے ہیں جو اللہ تعالیٰ سے دعا تو مانگتے ہیں، لیکن دعا میں ان کی ساری آرزوں، تمناؤں اور امنگوں کا محور دنیاوی زندگی ہوتی ہے اور وہ اللہ تعالیٰ سے صرف دنیا ہی کی بھلائی مانگتے ہیں۔ انہیں آخرت کی کوئی فکر نہیں ہوتی، وہ صرف اتنا کہتے ہیں کہ یا اللہ ہمیں دنیا کے اندر اچھائی عطا فرما، جبکہ ان کے مقابلے میں دوسری قسم کے لوگ وہ ہیں جو دنیا اور آخرت دونوں کی بھلائی کے طلب گار ہیں، چنانچہ فرمایا: ﴿وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ﴾ اور ان میں سے کچھ ایسے ہیں جو

کہتے ہیں ﴿رَبَّنَآ﴾ اے ہمارے پروردگار! ﴿اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً﴾ ہمیں دنیا میں بھی بھلائی عطا فرما ﴿وَّ فِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً﴾ اور آخرت میں بھی بھلائی عطا فرما، ﴿وَّ قِنَا عَذَابَ النَّارِ ۝۲۰۱﴾ ''اور ہمیں دوزخ سے بچالے۔''

اس آیتِ کریمہ میں یہ بتا دیا گیا کہ صرف دنیا کی راحتوں، لذتوں اور دنیا کے مقاصد کے لیے ہی اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے رہنا اور آخرت کے بارے میں کچھ فکر نہ کرنا، ایک مومن کا شیوہ نہیں ہوسکتا، یہ کافر لوگ ہوتے ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ:

اِنْ هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَ نَحْيَا[1]

زندگی تو ہماری اس دنیوی زندگی کے سوا کوئی اور نہیں ہے۔ (یہیں) ہم مرتے اور جیتے ہیں۔

کافر تو بے شک یہ کام کریں، کیونکہ ان کے ذہن میں آخرت کا کوئی تصوّر نہیں ہے، لیکن ایک مومن جس کا یہ ایمان ہے کہ اس دنیا کے بعد ایک نہ ختم ہونے والی زندگی، یعنی آخرت کی زندگی آنے والی ہے، اس کا کام یہ ہے کہ جس طرح وہ دنیا کی بھلائی مانگتا ہے اسی طرح آخرت کی بھلائی بھی مانگے، اور یہ کہے کہ ''اے اللہ! مجھے دنیا کی بھی بھلائی عطا فرما اور آخرت میں بھی بھلائی عطا فرما۔''

دنیا و آخرت دونوں کی بھلائی مطلوب و مقصود ہے

یہاں اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ دنیا کی بھلائی نہ مانگو، بلکہ یہ فرمایا کہ دنیا کی بھلائی کے ساتھ آخرت کی بھلائی بھی مانگو، اگرچہ دیکھا جائے تو آخرت کی بھلائی کو یقیناً دنیا کی بھلائی پر فوقیت حاصل ہے، کیونکہ دنیا کی زندگی تو مرتے ہی ختم ہوجائے گی اور آخرت کی زندگی اَبدی اور ہمیشہ رہنے والی ہے، اسے کبھی فنا نہیں ہے۔ اس لیے کہا گیا ہے کہ:

اِعْمَلْ لِدُنْيَاكَ بِقَدْرِ مَقَامِكَ فِيْهَا، وَاعْمَلْ لِاٰخِرَتِكَ بِقَدْرِ بَقَائِكَ فِيْهَا[2]

---

(۱) سورۃ المؤمنون (۲۳): آیت (۳۷)

(۲) ذكره أبو نعيم في حلية الأولياء (٥٦/٧) من قول سفيان الثوري رحمه الله.

دنیا کے لیے اتنا کام کرو جتنا دنیا میں رہنا ہے اور آخرت کے لیے اتنا کام کرو جتنا آخرت میں رہنا ہے۔

لیکن اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس آیت میں یہ سکھادیا کہ دنیا کی بھلائی بھی مانگو اور آخرت کی بھلائی بھی مانگو، اور ساتھ ہی ان لوگوں کی بھی تردید کردی جو دنیا کی بھلائی کو سرے سے کوئی اہمیت ہی نہیں دیتے اور انہوں نے ترکِ دنیا کا رویّہ اختیار کر رکھا ہے۔ جیسے رہبانیت کا طریقہ تھا کہ جب تک دنیا کی راحتیں اور دنیا کے اسباب کو ترک کر کے آدمی جنگل میں بیٹھ کر اللہ تعالیٰ کے لیے وقف نہ ہوجائے، تب تک وہ اللہ کا قرب حاصل نہیں کرسکتا۔ اس آیت میں ان کی بھی تردید کردی گئی کہ یہ طریقہ بھی غلط ہے۔ دنیا بھی اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی ہے اور اس میں اللہ تعالیٰ نے تمہیں دنیا برتنے کے لیے بھیجا ہے، دنیا کی چیزیں تمہارے لیے پیدا کی گئی ہیں اور اس کی بھلائی مانگنا کوئی بری بات نہیں، اس لیے یقیناً اس کی بھلائی مانگو، لیکن آخرت کو فراموش نہ کرو، جیسا کہ سورۂ قصص میں اللہ تعالیٰ نے قارون سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

وَلَا تَنْسَ نَصِيْبَكَ مِنَ الدُّنْيَا (۱)

اور دنیا میں سے بھی اپنے حصے کو نظر انداز نہ کرو

لیکن ساتھ ساتھ یہ بھی فرمایا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے تمہیں جو کچھ دے رکھا ہے، اس کے ذریعے آخرت والا گھر بنانے کی کوشش کرو اور آخرت کو فراموش نہ کرو۔ اسی طریقے سے اللہ تعالیٰ نے یہاں یہ تاکید فرمائی کہ وہاں جب دعائیں مانگو تو آخرت کے لیے بھی مانگو اور دنیا کے لیے بھی مانگو۔ پھر فرمایا: ﴿أُولَٰئِكَ لَهُمْ نَصِيْبٌ مِّمَّا كَسَبُوْا﴾ ''یہ وہ لوگ ہیں جنہیں اپنے اعمال کی کمائی کا حصہ ثواب کی صورت میں ملے گا،'' یعنی جو لوگ اس طرح کی دعائیں کرتے ہیں کہ دنیا کی بھی بھلائی مانگتے ہیں اور آخرت کی بھی بھلائی بھی مانگتے ہیں، ان کو اپنے اعمال کی کمائی کا حصہ، یعنی ثواب ملے گا۔ ﴿وَاللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ﴿۲۰۲﴾﴾ ''اور اللہ جلد حساب لینے والا ہے،'' کیوں کہ قیامت میں حساب ہوگا اور قیامت نزدیک آتی جارہی ہے، اس لیے جب حساب کتاب جلدی ہونے والا ہے تو وہاں کی بہتری کو مت بھولو اور آخرت کی بھلائی کے لیے بھی دعائیں کرتے رہو۔

---

(۱) سورۃ القصص (۲۸): آیت (۷۷)

سیاقِ قرآنی میں ''اللہ جلد حساب لینے والا ہے'' کا مفہوم

اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم میں ''وَاللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ'' یعنی ''اللہ جلد حساب لینے والا ہے۔'' یہ جملہ کئی جگہ پر ارشاد فرمایا ہے۔اس کے ایک معنیٰ تو یہ ہیں کہ حساب کا دن قریب ہے جو بہت جلدی آنے والا ہے، اور اس کے دوسرے معنیٰ یہ بھی ہیں کہ اللہ جب حساب لیں گے تو کوئی شخص یہ نہ سوچے کہ اربوں، کھربوں انسانوں کے اعمال کا حساب کتاب لینے میں تو بہت وقت لگے گا، کیونکہ اللہ تعالیٰ کے لیے حساب لینا کوئی مسئلہ نہیں ہے، بلکہ وہ بہت جلدی حساب لے لیں گے۔

یہ جملہ بعض جگہ تو اس سیاق میں آتا ہے کہ کسی غلط کار کو اس کی غلط کاری پر متنبہ کرنے کے لیے فرمایا جاتا ہے کہ تم یہ نہ بھولو کہ اللہ تعالیٰ جلد ہی تم سے حساب لے گا۔اس وقت اس کا مقصود اس بات پر متنبہ کرنا ہوتا ہے کہ اپنے اعمال کو دیکھ بھال کر انجام دو اور اپنی بداعمالیوں سے باز آجاؤ، ورنہ عنقریب تمہارے حساب کا دن آنے والا ہے،[1] جبکہ بعض جگہ یہ جملہ اہلِ ایمان کو آخرت میں ملنے والے اجر کے سیاق میں آتا ہے۔[2] اس وقت اس کا مقصد تسلی دینا ہوتا ہے، کیونکہ دنیا میں عبادت یا طاعت انجام دینے میں بعض اوقات انسان کو مشقت معلوم ہوتی ہے تو اس کی وجہ سے وہ یہ سوچنے لگتا ہے کہ ابھی تو دنیا میں مشقت ہی اٹھا رہا ہوں اور آخرت کی جزا تو ایک وعدۂ فردا ہے کہ کل کو جب انتقال ہوجائے گا اور دوسری زندگی شروع ہوگی، تو پھر ان مشقتوں کا اجر عطا ہوگا، چنانچہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مومنین کو ان الفاظ کے ساتھ تسلی دی جاتی ہے کہ یہ کوئی اتنا لمبا چوڑا معاملہ نہیں ہے، بلکہ ﴿وَاللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ﴾ اللہ تبارک وتعالیٰ حساب جلدی لے لے گا، اور وہ اتنی جلدی ہوسکتا ہے کہ جونہی تمہاری موت آئے گی تو حساب کتاب کا مرحلہ شروع ہوجائے گا۔جیسا کہ ایک روایت میں کہا گیا ہے کہ:

مَنْ مَاتَ فَقَدْ قَامَتْ قِيَامَتُهُ[3]

جو شخص مرگیا تو اس کی قیامت اسی دن شروع ہوگئی۔

---

(۱) مثلاً: ﴿وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَاِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ﴾ [آلِ عمران: ۱۹]

(۲) مثلاً: ﴿اُولٰٓئِكَ لَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ﴾ [آلِ عمران: ۱۹۹]

(۳) رسائل ابن أبي الدنيا (٤٤٧/٥) (١٧٣) وذكره العراقي في تخريج الإحياء (١٢٣١/٢) وقال بإسناد ضعيف.

اور اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے اہلِ ایمان کو جو اجر ملنا ہے، اس اجر کا آغاز بھی موت کے وقت کے بعد سے شروع ہوجاتا ہے اور برزخ کی زندگی میں بھی اللہ تبارک وتعالیٰ انہیں اپنے انعامات سے نوازتے رہتے ہیں، یہاں پر بھی ﴿وَاللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ﴾ کا یہ جملہ اسی تسلی کے مفہوم میں آیا ہے۔

منیٰ میں ایک دن کم یا زیادہ گزارنا

پھر آگے فرمایا: ﴿وَاذْكُرُوا اللّٰهَ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ﴾ ''اور اللہ تعالیٰ کو گنتی کے چند دنوں میں یاد کرتے رہو۔'' گنتی کے دنوں سے مراد یہاں پر وہ دن ہیں جو حج کے دوران منیٰ میں گزارے جاتے ہیں، یعنی دسویں تاریخ، گیارہویں تاریخ، اور بارھویں تاریخ۔ دسویں تاریخ میں تو بہت سارے کام ہوتے ہیں، اور دس تاریخ کا دن گزرنے کے بعد جو اگلی رات آرہی ہوتی ہے وہ بھی منیٰ میں گزارنا مسنون ہے۔ پھر گیارہ تاریخ کا دن گزارنا، پھر گیارہ تاریخ کی رات گزارنا، اس طرح منیٰ کے اندر دو راتیں تو قیام ہونا ہی ہونا ہے، لیکن ساتھ ہی یہ بھی فرمایا: ﴿فَمَنْ تَعَجَّلَ فِيْ يَوْمَيْنِ﴾ جو شخص ان دو دنوں میں جلدی سے چلا جائے، یعنی بارہ تاریخ کے دن میں رمی کرنے کے بعد چلا جائے، بارہ تاریخ کے بعد کی رات وہاں نہ گزارے تو ﴿فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ﴾ ''اس پر بھی کوئی گناہ نہیں،'' کیونکہ اس نے دو راتیں گزار لیں۔ اب بارہ تاریخ کی رمی کر کے چلا گیا تو اس پر کوئی گناہ نہیں۔

﴿وَمَنْ تَاَخَّرَ﴾ ''اور اگر کسی شخص نے کچھ دیر کی،'' یعنی ایک رات مزید منیٰ کے اندر ٹھہرا اور تیرہ تاریخ کی بھی رمی کر کے روانہ ہوا، تو اس نے وہاں گویا تین راتیں گزاریں، (ایک دس تاریخ کے بعد والی رات، اور ایک گیارہ تاریخ کے بعد والی رات، اور ایک بارہ تاریخ کے بعد والی رات) تو ﴿فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ﴾ ''اس پر بھی کوئی گناہ نہیں۔'' البتہ ساتھ میں فرمادیا کہ ﴿لِمَنِ اتَّقٰى﴾ ''جو تقویٰ اختیار کرے،'' اس کے لیے دونوں باتوں میں سے کوئی گناہ نہیں، یعنی بارہ تاریخ کو بھی چلا جائے، یا تیرہ تاریخ کو چلا جائے۔ اصل بات ہے کہ اس کے دل میں اللہ تعالیٰ کے سامنے حاضری کا احساس ہونا چاہیے، جس کا نام تقویٰ ہے۔ اگر اس کے دل میں تقویٰ موجود ہو تو پھر کوئی بات نہیں۔

اشارہ اس طرف ہے کہ منیٰ کا قیام دو دن تو مسنون ہے اور اس میں رمی کرنا بھی واجب ہے، یعنی گیارہ تاریخ کو بھی اور بارہ تاریخ کو بھی، لیکن تیسرے دن، یعنی تیرہ تاریخ کو رمی کرنا واجب نہیں ہے، اور نہ اس

سے پہلے والی رات وہاں پر گزارنا واجب ہے، لہٰذا اگر بارہ تاریخ کو آدمی جانا چاہے تو جاسکتا ہے اور تیرہ تاریخ کو جانا چاہے تو رمی کر کے تیرہ تاریخ کو بھی جاسکتا ہے، دونوں طریقے اللہ تعالیٰ نے جائز قرار دیے ہیں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب حج کے لیے تشریف لے گئے تھے، تو آپ نے تیرہ تاریخ تک قیام فرمایا اور پھر تیرہ تاریخ کو مکّہ روانہ ہوئے۔ اسی پر حج کے افعال ختم ہوجاتے ہیں، بس ایک طوافِ وداع باقی رہ جاتا ہے، جب آدمی گھر لوٹنے لگے تو اس وقت طوافِ وداع کرنا اس کے ذمے واجب ہے، اس کے بعد کوئی اور رکن یا واجب ذمہ میں باقی نہیں رہ جاتا۔

﴿وَاتَّقُوا اللّٰهَ﴾ اور اللہ سے ڈرتے رہو ﴿وَاعْلَمُوْٓا﴾ اور یاد رکھو کہ ﴿اَنَّكُمْ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ۝۲۰۳﴾ ''تم سب کو اسی کی طرف لے جا کر جمع کیا جائے گا۔'' اور اس کے بعد تم سب کا حساب ہونے والا ہے۔ احکامِ حج کے اختتام پر تقویٰ کی تاکید میں ایک راز یہ بھی ہے کہ حج ایک بڑی عبادت ہے اس کے ادا کرنے کے بعد شیطان عموماً انسان کے دل میں اپنی بڑائی اور بزرگی کا خیال ڈالتا ہے جو اس کے تمام عمل کو بیکار کردینے والا ہے، اس لیے خاتمۂ کلام میں فرمایا کہ جس طرح حج سے پہلے اور حج کے اندر اللہ تعالیٰ سے ڈرنا اور اس کی اطاعت کرنا لازم ہے، اسی طرح حج کے بعد بھی اس سے زیادہ اللہ تعالیٰ سے ڈرنے کا اور گناہوں سے پرہیز کا اہتمام کرتے رہو کہ کہیں یہ کری کرائی عبادت ضائع نہ ہوجائے۔[1]

آیت ۲۰۴ تا ۲۰۷

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّعْجِبُكَ قَوْلُهٗ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيُشْهِدُ اللّٰهَ عَلٰى مَا فِيْ قَلْبِهٖ ۙ وَهُوَ اَلَدُّ الْخِصَامِ ۝۲۰۴ وَاِذَا تَوَلّٰى سَعٰى فِي الْاَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيْهَا وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ ۭ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ ۝۲۰۵ وَاِذَا قِيْلَ لَهُ اتَّقِ اللّٰهَ اَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْاِثْمِ فَحَسْبُهٗ جَهَنَّمُ ۭ وَلَبِئْسَ الْمِهَادُ ۝۲۰۶ وَمِنَ

(۱) معارف القرآن، ج ۲ ص: ۴۹۵

النَّاسِ مَنْ يَّشْرِيْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ ﴿۲۰۷﴾

اور لوگوں میں ایک وہ شخص بھی ہے کہ دنیوی زندگی کے بارے میں اس کی باتیں تمہیں بڑی اچھی لگتی ہیں، اور جو کچھ اس کے دل میں ہے اس پر وہ اللہ کو گواہ بھی بناتا ہے، حالانکہ وہ (تمہارے) دشمنوں میں سب سے زیادہ کٹر ہے۔ ﴿۲۰۴﴾ اور جب اٹھ کر جاتا ہے، تو زمین میں اس کی دوڑ دھوپ اس لیے ہوتی ہے کہ وہ اس میں فساد مچائے اور فصلیں اور نسلیں تباہ کرے، حالانکہ اللہ فساد کو پسند نہیں کرتا۔ ﴿۲۰۵﴾ اور جب اس سے کہا جاتا ہے کہ اللہ کا خوف کر، تو نخوت اسے گناہ پر اور آمادہ کر دیتی ہے، چنانچہ ایسے شخص کو تو جہنم ہی راس آئے گی اور یقین کرو وہ بہت برا بچھونا ہے۔ ﴿۲۰۶﴾ اور (دوسری طرف) لوگوں میں وہ شخص بھی ہے جو اللہ کی خوشنودی کی خاطر اپنی جان کا سودا کر لیتا ہے، اور اللہ (ایسے) بندوں پر بڑا مہربان ہے۔ ﴿۲۰۷﴾

منافقین اور مومنین مخلصین کا فرق

پچھلی آیات میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے ذکر کیا تھا کہ حج کے دوران جو لوگ دعائیں مانگتے ہیں، ان میں سے کچھ لوگ تو وہ ہیں جو صرف دنیا کی خاطر دعائیں مانگتے ہیں اور عام طور سے یہ وہ لوگ ہیں جو آخرت پر ایمان ہی نہیں رکھتے جیسے کافر لوگ تھے، اور دوسری قسم ان لوگوں کی بیان فرمائی تھی جو دنیا کی بھی بھلائی چاہتے ہیں اور آخرت کی بھی بھلائی چاہتے ہیں اور دونوں کی دعائیں مانگتے ہیں وہ مومن تھے۔

اب اسی مناسبت سے اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی مزید دو قسمیں بیان فرمائی ہیں۔ ایک قسم ان منافقین کی ہے جن کو آخرت کا کوئی دھیان یا فکر نہیں ہے، لہٰذا نہ صرف یہ کہ وہ کفر اختیار کیے ہوئے ہیں، بلکہ نفاق کا معاملہ کرتے ہیں۔ وہ بظاہر دکھانا چاہتے ہیں کہ ہم مسلمان ہیں یا بہت اچھے آدمی ہیں، لیکن حقیقت میں ان کے اندر کفر بھرا ہوا ہوتا ہے۔ وہ لوگوں کو تکلیفیں بھی پہنچاتے ہیں اور دنیا کے اندر فساد بھی پھیلاتے ہیں، اور دوسری قسم مومنین مخلصین کی ہوتی ہے، جن کا تذکرہ آگے آرہا ہے۔

منافقین کا فساد فی الارض والا طرزِ عمل

منافقین سے متعلق ایک واقعہ روایات[1] میں آتا ہے کہ اخنس بن شریق نام کا ایک بڑا فصیح و بلیغ شخص مدینہ منوّرہ آیا تھا، اور اس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آکر بڑی چکنی چپڑی باتیں کی تھیں، اور اللہ کو گواہ بنا کر اپنے ایمان لانے کا اظہار کیا تھا، لیکن جب واپس گیا تو راستے میں اس نے مسلمانوں کی کھیتیاں جلادیں اور ان کے مویشیوں کو ذبح کرڈالا۔

یہ آیات اسی پسِ منظر میں نازل ہوئی تھیں، البتہ اپنے الفاظ کے عموم کے لحاظ سے یہ ہر قسم کے منافقوں پر پوری اترتی ہیں، چنانچہ فرمایا: ﴿وَ مِنَ النَّاسِ﴾ اور لوگوں میں سے ایک وہ بھی ہے کہ ﴿مَنْ يُّعْجِبُكَ قَوْلُهٗ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا﴾ ''جس کی باتیں دنیاوی زندگی میں تمہیں بہت اچھی لگتی ہیں،'' یعنی اس کی باتیں بڑی اعلیٰ درجے کی ہیں، بہت فصاحت و بلاغت سے گفتگو کرتا ہے اور وہ دنیاوی غرض ہی کی خاطر اللہ تبارک وتعالیٰ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اپنی فصاحت و بلاغت کا مظاہرہ کرتا ہے، ﴿وَ يُشْهِدُ اللّٰهَ عَلٰى مَا فِيْ قَلْبِهٖ﴾ ''اور وہ اس بات پر جو اس کے دل میں ہے، اللہ کو بھی گواہ بناتا ہے،'' یعنی کہتا ہے کہ جو میں کہہ رہا ہوں وہ میرے دل کی بات ہے، میں اللہ کو گواہ بنا کر یہ کہہ رہا ہوں، ﴿وَ هُوَ اَلَدُّ الْخِصَامِ ۝۲۰۴﴾ ''حالانکہ وہ تمہارے دشمنوں میں سب سے زیادہ کٹر اور سخت ہے۔'' وہ حقیقت میں بڑا دشمن ہے، لیکن ظاہراً تمہارے سامنے چکنی چپڑی باتیں کررہا ہے۔

﴿وَ اِذَا تَوَلّٰى﴾ اور جب اٹھ کر جاتا ہے تو ﴿سَعٰى فِي الْاَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيْهَا﴾ زمین میں اس کی دوڑ دھوپ اس لیے ہوتی ہے کہ اس میں فساد مچائے، ﴿وَ يُهْلِكَ الْحَرْثَ وَ النَّسْلَ﴾ اور فصلیں اور نسلیں تباہ کرے۔ ﴿وَ اللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ ۝۲۰۵﴾ ''اور اللہ تبارک وتعالیٰ فساد کو پسند نہیں کرتا۔'' اس شخص کی اس کیفیت کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے خاص طور پر ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ منافقین کا حال یہ ہوتا ہے کہ زبان سے تو ان کی باتیں بڑی اعلیٰ درجے کی ہوتی ہیں، لیکن ان کے اندر کفر بھرا ہوا ہوتا ہے اور وہ ایمان نہیں رکھتے۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ان منافقین کی ایک سب سے بڑی خرابی تو یہی ہے کہ وہ حقیقت میں ایمان

---

(۱) قال ابن عباس رضی اللہ عنہ: ''نزلت في أخنس بن شريق، وكان رجلاً حلو الكلام، حلو المنظر، يلقي رسول الله ﷺ على ما يحب وينطوي بقلبه على ما يكره.'' تفسير البغوي (۲/۴۳۹) دار إحياء التراث، وكذا في أسباب النزول للواحدي (ص ۵۳۷).

رکھتے اور ظاہر یہ کرتے ہیں کہ ہم ایمان لائے ہوئے ہیں، اور ان کی دوسری خرابی یہ ہے کہ وہ زمین میں فساد مچاتے ہیں۔ یہاں پر ﴿وَ يُهْلِكَ الْحَرْثَ وَ النَّسْلَ﴾ کہا گیا۔ ''حرث'' کہتے ہیں کھیتی کو اور ''نسل'' کہتے ہیں آل و اولاد کو، جس میں نسلِ انسانی بھی شامل ہے اور مویشیوں کی نسل بھی۔ اللہ تعالیٰ نے یہاں پر ان کا کھیتیوں اور نسلوں کا تباہ کرنے کا وصف بیان کرکے اس طرف اشارہ فرمادیا کہ جس طرح اللہ تبارک وتعالیٰ پر ایمان لانا ضروری ہے، اسی طرح بے گناہ کسی کی جان لینا، چاہے وہ انسان ہو یا جانور، اور چاہے وہ کھیتی ہو یا باغ، اسے بلا وجہ اجاڑنا یہ فساد فی الارض (زمین کے اندر فساد پھیلانا) ہے اور اللہ تبارک وتعالیٰ اسے کسی بھی طرح پسند نہیں فرماتا۔

منافقانہ روِش پر منافقین کی ہٹ دھرمی

بعض لوگ تو ایسے ہوتے ہیں کہ اگر انہیں کوئی شخص ان کی کسی غلطی پر متنبہ کرے تو وہ اپنی غلطی تسلیم کرلیتے ہیں، اپنی اصلاح کا عزم و ارادہ ظاہر کرتے ہیں اور اصلاح پر آمادہ ہوتے ہیں، لیکن یہ منافقین ایسے لوگ ہیں کہ ان کے سامنے کتنی ہی وعظ ونصیحت کرلی جائے اور ان سے کتنے ہی مشفقانہ انداز میں بات کرلی جائے، لیکن یہ اپنی غلطی تسلیم کرنے کے بجائے اس پر اڑے رہتے ہیں۔

اُن کے اسی طرزِ عمل کو بیان کرتے ہوئے فرمایا: ﴿وَ اِذَا قِيْلَ لَهُ اتَّقِ اللّٰهَ﴾ جب اس سے کہا جاتا ہے کہ تم اللہ کا خوف کرو، اللہ سے ڈرو، ﴿اَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْاِثْمِ﴾ ''تو نخوت اسے گناہ پر اور زیادہ آمادہ کر دیتی ہے۔'' اس کے دل میں جو اپنی عزت ہے جسے ہم اردو میں نخوت کہتے ہیں، وہ نخوت وتکبر اور اپنی اچھائی کا گھمنڈ اُسے اور زیادہ گناہ پر آمادہ کردیتے ہیں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿فَحَسْبُهٗ جَهَنَّمُ﴾ ''چنانچہ ایسے شخص کو تو جہنم ہی راس آئے گی'' اس کے لفظی معنیٰ یہ ہوں گے کہ ''اس کے لیے جہنم ہی کافی ہے۔'' اللہ تبارک وتعالیٰ جب اسے جہنم میں ڈالیں گے تو سب پتہ چل جائے گا کہ اس کی عزت کیا تھی اور نخوت کیا تھی؟ ﴿وَ لَبِئْسَ الْمِهَادُ ﴿۲۰۶﴾﴾ ''یقین کرو کہ وہ دوزخ بہت برا بچھونا ہے،'' بہت برا ٹھکانا ہے۔

منافقین کی حالت سے حاصل شدہ اسباق

اس آیتِ کریمہ میں ہم سب کو جو سبق ملتا ہے وہ یہ کہ اس شخص کی طرح نہ ہونا چاہیے جو فساد بھی مچاتا ہے اور جب اس کی غلطی پر اسے متنبہ کیا جاتا ہے تو نہ صرف یہ کہ اسے ماننے کے لیے تیار نہیں ہوتا، بلکہ نخوت

میں مبتلا ہوکر مزید گناہ کا ارتکاب کرنے لگتا ہے، اللہ تعالیٰ اس انجام سے ہر مسلمان کو محفوظ رکھے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان اس دنیا میں آیا ہے تو اس سے غلطیاں بھی ہوتی ہیں اور گناہ بھی سرزد ہوجاتے ہیں، لیکن بہترین غلطی کرنے والا وہ ہے جو تنبیہ کرنے کے بعد اور متنبہ ہونے کے بعد اپنی غلطی کو تسلیم کرلے اور اس کی اصلاح کی فکر میں لگ جائے۔ وہ شخص اللہ تعالیٰ کو بہت مبغوض (ناپسند) ہے جو اپنی غلطی سمجھ میں آجانے کے باوجود اس پر اڑا رہے اور سینہ زوری کرے۔ ایک حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

كُلُّ ابْنِ آدَمَ خَطَّاءٌ وَخَيْرُ الخَطَّائِينَ التَّوَّابُونَ(۱)

ہر انسان خطا کار ہے اور خطا کرنے والوں میں سب سے بہتر وہ ہیں جو توبہ کرلیتے ہیں، جو اللہ کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

منافقین کے مقابلے میں مومنینِ مخلصین کا احوال

منافقین کے اس طرزِ عمل کے مقابلے میں اگلی آیت میں مخلص مومنین کا حال ذکر کرتے ہوئے باری تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِيْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ﴾ ''اور لوگوں میں وہ شخص بھی ہے جو اللہ کی خوشنودی کی خاطر اپنی جان کا سودا کرلیتا ہے،'' یعنی اللہ تبارک وتعالیٰ کے دین کے لیے اپنی جان بیچ دیتا ہے، یا اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے اپنی جان کی بازی بھی لگا دیتا ہے۔ ﴿وَاللّٰهُ رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ ۝۲۰۷﴾ ''اور اللہ (ایسے) بندوں پر بہت مہربان ہے۔''

اگرچہ یہاں قرآنِ کریم میں ایک عمومی بات کہی گئی ہے، لیکن مفسرین(۲) نے بیان کیا ہے کہ یہ آیات متعدّد صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں نازل ہوئی ہیں جنہوں نے اپنی جان کا سودا ایمان سے کیا اور ان میں ایک نمایاں واقعہ حضرت صہیب رومی رضی اللہ عنہ کا ہے کہ جب وہ مکّہ مکرمہ سے ہجرت کی غرض سے مدینہ منوّرہ کے لیے روانہ ہوئے تو راستے میں کفارِ قریش کی ایک بڑی جماعت نے ان کا راستہ روک لیا۔ یہ دیکھ کر

---

(۱) سنن الترمذي (٤ / ٦٥٩) (٢٤٩٩)أبواب صفة القيامة والرقائق والورع عن رسول الله ﷺ. وقال: "هذا حديث غريب لا نعرفه الا من حديث علي بن مسعدةعن قتادة." وقال الحافظ ابن حجر في بلوغ المرام: (٤٩٦/١)أخرجه الترمذي وابن ماجه وسنده قوي.

(۲) زادالمسیر فی علم التفسیر (۱۷۲/۱) دار الکتاب العربی، بیروت، لبنان

حضرت صہیب رومی رضی اللہ عنہ اپنی سواری سے اتر کر کھڑے ہوگئے اور ان کے ترکش میں جتنے تیر تھے، سب نکال کر قریش کی اس جماعت سے خطاب کر کے فرمایا کہ:

''اے قبیلۂ قریش! تم سب جانتے ہو کہ میں تیر اندازی میں تم سب سے زیادہ ماہر ہوں، میرا تیر کبھی خطا نہیں جاتا۔ اب میں اللہ کی قسم کھاتا ہوں کہ تم میرے پاس اس وقت تک نہیں پہنچ سکو گے جب تک کہ میرے ترکش میں ایک تیر بھی باقی ہے۔ جب تیر ختم ہوجائیں گے تو پھر میں تلوار سے کام لوں گا، جب تک مجھ میں دم رہے گا تم سے لڑتا رہوں گا، لیکن اگر تم اپنے نفع کا سودا چاہتے ہو تو میں تمہیں اپنے مال کا پتہ دیتا ہوں جو میں مکّہ مکرمہ میں چھوڑ کر آیا ہوں وہ فلاں جگہ پر رکھا ہوا ہے، تم وہ مال لے لو اور میرا راستہ چھوڑ دو (تاکہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں مدینہ منوّرہ پہنچ سکوں)۔''

اس پر قریش کی جماعت راضی ہوگئی، اور حضرت صہیب رومی رضی اللہ عنہ نے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچ کر یہ سارا واقعہ سنایا تو اس پر نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دو مرتبہ یہ جملہ ارشاد فرمایا:

رَبِحَ الْبَيْعُ أَبَا يَحْيَى، رَبِحَ الْبَيْعُ أَبَا يَحْيَى![1]

اے ابویحییٰ! تمہارا بیوپار بڑا نفع بخش رہا، اے ابویحییٰ! تمہارا بیوپار بڑا نفع بخش رہا۔

یعنی انہوں نے جو اپنا مال دے کر ہجرت کا راستہ پورا کیا اور مدینہ منوّرہ پہنچے، تو اُن سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تمہاری بیع بہت نفع بخش ثابت ہوئی۔ نبیِ کریم سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کے بعد یہ آیتِ کریمہ نازل ہوئی تھی۔ بعض حضراتِ مفسرین نے کچھ دوسرے صحابۂ کرام کے بھی ایسے ہی واقعات کو آیت کا شانِ نزول بتایا ہے۔[2]

---

(۱) المستدرك على الصحيحين للحاكم (۳/۴۵۲) (۵۷۰۶) وقال الحاكم: "هذا حديث صحيح الإسناد ولم يخرجاه، ووافقه الذهبي في التلخيص. ومسند اسحاق بن راهويه كما في "المطالب" (۱۶/۳۷۸) (۴۰۳۰) وقال الحافظ ابن حجر: "هذا حديث صحيح إن كان أبو عثمان سمعه من صهيب، وقد رواه جعفر بن سليمان الضبعي عن عوف عن أبي عثمان عن صهيب رضي الله عنه، قال لما أردت... فذكره نحوه، فصح اتصاله، ولله الحمد." طبع دار العاصمة.

(۲) ملاحظہ کیجیے تفسیرِ مظہری، جلد:۱ صفحہ:۲۴۵۔ دار الکتب العلمیہ، بیروت

بہرحال! قرآنِ کریم کا اسلوب یہ ہے کہ شانِ نزول کچھ بھی ہو، وہ ایک عمومی انداز اختیار کرتا ہے، یہاں بھی یہی انداز اختیار کیا گیا اور اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو اللہ تبارک وتعالیٰ کے ہاتھوں اپنی جان بیچ چکے ہیں، یعنی جنہوں نے جنت کے عوض اپنی جان کا سودا کرلیا ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور اس جنت کے طلب گار ہیں جو اللہ تبارک وتعالیٰ کی رضا کا مظہر ہے۔ اس کے لیے اگر ہمیں جان بھی دینی پڑے تو ہم جان دینے کے لیے بھی تیار ہیں، اگر مال خرچ کرنا پڑے تو مال خرچ کرنے کو بھی تیار ہیں۔ ایسے ہی لوگوں کی تعریف کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے یہ بات ارشاد فرمائی ہے کہ ﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِيْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ﴾ اور (دوسری طرف) لوگوں میں وہ شخص بھی ہے جو اللہ کی خوشنودی کی خاطر اپنی جان کا سودا کرلیتا ہے، ﴿وَاللّٰهُ رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ ۝۲۰۷﴾ ''اور اللہ (ایسے) بندوں پر بڑا مہربان ہے۔''

آیت نمبر ۲۰۸ تا ۲۱۲

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً ۠ وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ۭ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ۝۲۰۸ فَاِنْ زَلَلْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَاۗءَتْكُمُ الْبَيِّنٰتُ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝۲۰۹ هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيَهُمُ اللّٰهُ فِيْ ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ وَالْمَلٰۗىِٕكَةُ وَقُضِيَ الْاَمْرُ ۭ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ۝۲۱۰ سَلْ بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ كَمْ اٰتَيْنٰهُمْ مِّنْ اٰيَةٍۢ بَيِّنَةٍ ۭ وَمَنْ يُّبَدِّلْ نِعْمَةَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَاۗءَتْهُ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝۲۱۱ زُيِّنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَيَسْخَرُوْنَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۘ وَالَّذِيْنَ اتَّقَوْا فَوْقَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ وَاللّٰهُ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَاۗءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ۝۲۱۲

اے ایمان والو! اسلام میں پورے کے پورے داخل ہوجاؤ اور شیطان کے نقشِ قدم پر نہ چلو۔ یقین جانو وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔ ۲۰۸ پھر جو روشن دلائل تمہارے پاس آچکے ہیں، اگر تم ان کے بعد بھی (راہِ راست سے) پھسل گئے تو یاد رکھو کہ اللہ اقتدار میں بھی کامل ہے، حکمت میں بھی کامل۔ ۲۰۹ یہ (کفار ایمان لانے کے لیے) اس کے

سوا کس بات کا انتظار کر رہے ہیں کہ اللہ خود بادل کے سائبانوں میں ان کے سامنے آموجود ہو، اور فرشتے بھی (اس کے ساتھ ہوں) اور سارا معاملہ ابھی چکا دیا جائے؟ حالانکہ آخر کار سارے معاملات اللہ ہی کی طرف تو لوٹ کر رہیں گے۔ (۲۱۰) بنی اسرائیل سے پوچھو ہم نے انہیں کتنی ساری کھلی نشانیاں دی تھیں؟ اور جس شخص کے پاس اللہ کی نعمت آچکی ہو، پھر وہ اسے بدل ڈالے، تو (اسے یاد رکھنا چاہیے کہ) اللہ کا عذاب بڑا سخت ہے۔ (۲۱۱) جن لوگوں نے کفر اپنا لیا ہے، ان کے لیے دنیوی زندگی بڑی دلکش بنا دی گئی ہے، اور وہ اہلِ ایمان کا مذاق اُڑاتے ہیں، حالانکہ جنہوں نے تقویٰ اختیار کیا ہے وہ قیامت کے دن ان سے کہیں بلند ہوں گے، اور اللہ جس کو چاہتا ہے بے حساب رزق دیتا ہے۔ (۲۱۲)

اسلام میں پورے کے پورے داخل ہونے کی تلقین اور اس کی تشریح

پیچھے منافقین کا ذکر آیا تھا اور یہ بتایا گیا تھا کہ وہ لوگ دنیوی زندگی کی ہوس میں اللہ تبارک وتعالیٰ کے دین کو دل سے قبول نہیں کر رہے، اب آگے اللہ تبارک وتعالیٰ خود مخلص مسلمانوں سے خطاب فرماتے ہیں کہ جس طرح منافقین کا حال یہ ہے کہ وہ زبان سے تو ایمان کا اظہار کرتے ہیں، لیکن عملاً اور حقیقتاً وہ مومن نہیں ہیں، اسی طرح مسلمانوں کو یہ تاکید کی جارہی ہے کہ اگرچہ وہ زبان اور دل سے ایمان لاچکے ہیں، لیکن صرف اتنی بات کو کافی نہ سمجھیں، بلکہ اس کے احکام پر بھی پوری طرح عمل پیرا ہوں اور اس معاملے میں اللہ تبارک وتعالیٰ کی پوری طرح اطاعت کرنے کا اہتمام کریں۔ اگلی آیت میں یہی بات بیان کی گئی ہے کہ ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً﴾ ''اے ایمان والو! داخل ہوجاؤ اسلام میں پورے کے پورے۔''

صورتِ حال یہ ہے کہ اسلام صرف عقائد اور عبادات کا نام نہیں ہے، بلکہ وہ زندگی کے ہر شعبے میں ہمارے طرزِ عمل کی رہنمائی کرتا ہے۔ اگر اختصار سے کام لیا جائے، تو وہ حقوق اللہ اور حقوق العباد دونوں کے مجموعے کا نام ہے، اور یہ حقوق پانچ مختلف شعبوں میں تقسیم ہیں:

۱۔ عقائد: جو توحید، رسالت، آخرت اور ان کی صحیح تشریحات پر مشتمل ہیں۔

۲۔ عبادات: جن میں نماز، روزہ، زکوٰۃ، صدقات، حج اور قربانی وغیرہ سب شامل ہیں۔

۳۔معاملات: جن میں خرید وفروخت، نکاح وطلاق کے قانونی احکام، ملازمت، کرایہ داری اور تمام تجارتی اور سیاسی معاملات داخل ہیں۔

۴۔معاشرت: یعنی ایک ساتھ زندگی گزارتے ہوئے ایک دوسرے کے ساتھ کس قسم کا برتاؤ رکھنا چاہیے، اس کی تفصیلات اور اس سے متعلق احکام۔

۵۔اخلاق: یعنی انسان کی طبیعت میں کس قسم کے اوصاف ہونے چاہئیں، مثلاً اخلاص، تواضع، ایثار، بردباری، نرم خوئی، خیر خواہی وغیرہ، اور کس قسم کے اوصاف نہیں ہونے چاہئیں، مثلاً ریا کاری، شہرت طلبی، تکبر، خودغرضی، سخت مزاجی، حسد وغیرہ۔

اسلام ان تمام احکام پر عمل کرنے کا نام ہے۔ اب ہوتا یہ ہے کہ بعض اوقات انسان عقائد اور عبادات کو درست رکھنے کا تو خیال رکھتا ہے اور انہیں ذوق وشوق سے انجام دیتا ہے، لیکن جب بازار میں جا کر تجارت یا کاروبار کرنا ہو، تو اس میں شریعت کا دھیان نہیں رکھتا، دھوکہ دینے، ملاوٹ کرنے، سود اور قمار کے سودے کرنے سے اُسے کوئی باک نہیں ہوتا، اسی طرح بیوی بچوں کے حقوق ادا کرنے میں کوتاہی کرتا ہے، ملازمت میں اپنی ذمہ داری ادا نہیں کرتا، تو گویا وہ یہ سمجھتا ہے کہ دین صرف عبادتوں میں منحصر ہے۔ مسجد سے نکل کر میں جو چاہوں کروں اُس سے میرے مسلمان ہونے پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اسلام میں پورا پورا داخل نہیں ہوا۔

دوسری طرف بہت سے لوگ اپنے معاملات میں تو سچے اور کھرے ہوتے ہیں، کسی کو دھوکہ نہیں دیتے، مخلوق کی خدمت کرتے ہیں، لیکن عبادتوں سے بالکل بے پروا ہوتے ہیں۔ نمازیں جائیں تو جائیں، روزہ رکھیں یا نہ رکھیں، چونکہ وہ حقوق العباد ادا کر رہے ہیں، اس لیے سمجھتے ہیں کہ اصل اسلام پر تو ہم عمل کر رہے ہیں۔ حالانکہ عبادات کو چھوڑ کر یا عقائد خراب کر کے وہ اسلام میں پورے کے پورے داخل نہیں ہوئے۔ اسلام وہی ہے جو عقائد کی درستگی کے ساتھ عبادات، معاملات، معاشرت اور اخلاق تک ہر چیز کو ساتھ لے کر چلے۔ ''اسلام میں پورے کے پورے داخل ہونے'' کا یہی مطلب ہے۔

اہلِ ایمان کو اسلام میں داخل ہونے کا حکم اور اس کی تفصیل

اس آیتِ کریمہ میں یہ بات بڑی معنیٰ خیز ہے کہ یہاں ﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا﴾ کے ذریعے ان لوگوں

سے خطاب کیا جارہا ہے جو پہلے سے ایمان لاچکے ہیں، کیوں کہ منافقین یا کفار سے کہیں بھی ﴿يَاأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا﴾ کہہ کر خطاب نہیں کیا گیا، لہٰذا معلوم ہوا کہ یہ خطاب اہلِ ایمان سے ہے اور ان سے کہا جارہا ہے کہ ﴿ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً﴾ ''تم اسلام میں پورے کے پورے داخل ہوجاؤ۔'' یہاں ''السِّلْم'' کے معنی اسلام ہی ہیں۔ اہلِ ایمان کو اسلام میں داخل ہونے کا حکم دینے سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اسلام کا مفہوم ایمان سے زیادہ وسیع ہے۔ ایمان تو صرف اسے کہتے ہیں کہ آدمی اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر، یومِ آخرت پر اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی تعلیمات پر دل سے ایمان لے آئے کہ وہ سچ ہیں، اور زبان سے اپنے ایمان لانے کا اظہار بھی کردے، لیکن اسلام اس سے آگے ایک اور بات کا تقاضا کرتا ہے اور وہ ہے مکمل اطاعت اور مکمل فرمانبرداری۔

عربی زبان میں ''اسلام'' کے لفظی معنیٰ جھک جانے یا اپنے آپ کو کسی کے آگے جھکا دینے کے ہوتے ہیں۔ اسی لیے یہ لفظ اطاعت، تابعداری اور فرمانبرداری کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے اور قرآنِ کریم میں یہ کئی جگہ اسی معنیٰ میں آیا ہے۔ جیسا کہ پیچھے گزرا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ''اَسْلِمْ'' یعنی تم اللہ تعالیٰ کے حکم کے آگے جھک جاؤ، تو انہوں نے جواب میں یہی کہا کہ ''اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ'' ''میں ربُّ العالمین کے حکم کے آگے جھک گیا۔'' اور جھکنے کے معنیٰ یہ ہیں کہ انسان اللہ تعالیٰ اور رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام احکام پر بے چون وچرا عمل کرے، اس فکر میں نہ رہے کہ اس حکم کی مصلحت سمجھ میں آئے گی تو عمل کروں گا، ورنہ نہیں کروں گا، کیونکہ یہ جُھکنا نہیں اکڑنا ہے۔

دنیا کے قانون میں بھی یہی معاملہ ہوتا ہے۔ فرض کیجیے کہ جب دنیا کے کسی ملک میں کوئی قانون نافذ ہوگیا تو ہر شہری کا یہ فرض سمجھا جاتا ہے کہ وہ اس قانون کی پابندی کرے۔ اگر اس موقع پر کوئی پلٹ کر یہ کہنے لگے کہ میں تو اس وقت قانون کی پابندی کروں گا جب مجھے اس کی حکمت اور مصلحت بتائی جائے، حکمت ومصلحت سمجھے بغیر میں اس قانون پر عمل نہیں کروں گا، تو وہ قانون کا باغی تصور ہوگا، حالانکہ یہ قانون انسانوں کا بنایا ہوا ہوتا ہے اور انسانی عقل ہی کے ذریعے اسے بنایا جاتا ہے، لیکن اس کے بارے میں بھی کسی کو یہ چون وچرا کرنے کی مجال نہیں ہوتی، بلکہ کہا جاتا ہے کہ جو قانون نافذ ہے اس پر عمل کرنا تمہارا فرض ہے، اس کی مصلحت اور حکمت پوچھنا تمہارا کام نہیں ہے۔

جب انسانوں کے بنائے ہوئے قانون کے بارے میں یہ عالمگیر طرزِ عمل دنیا بھر میں جاری ہے تو

اللہ ﷻ نے جو قانون بنایا ہو، اس کے بارے میں یہ کہنا کہ پہلے ہمیں حکمت اور مصلحت بتائی جائے پھر ہم اس پر عمل کریں گے، یہ پرلے درجے کی ناانصافی اور نادانی ہے اور یہ طرزِ عمل اسلام کے مفہوم کے منافی ہے۔ اسی لیے اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس آیتِ مبارکہ میں فرمایا کہ اے مسلمانو! تم ایمان تو لے آئے ہو، لیکن اسلام میں بھی داخل ہوجاؤ، یعنی اسلام کو اس طرح قبول کرلو کہ جو بھی حکم آئے اس کے تابعدار بن جاؤ، چاہے اس کی حکمت اور مصلحت تمہاری سمجھ میں آرہی ہو یا نہ آرہی ہو۔ اس کی مزید تشریح پیچھے سورۂ بقرہ کی آیت نمبر ۱۳۱ میں بھی گزر چکی ہے، اسے ملاحظہ فرمالیا جائے۔

اُدْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً والی آیت کا شانِ نزول

مفسرینِ کرام نے اس آیت کی تفسیر میں شانِ نزول کے طور پر ایک واقعہ بھی ذکر کیا ہے[1] اور وہ یہ کہ حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ، جو ایک بڑے جلیل القدر صحابی ہیں۔ یہ اسلام لانے سے پہلے یہودی تھے، بلکہ یہودیوں کے بڑے عالم سمجھے جاتے تھے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان پر اسلام کی حقانیت واضح کی اور جب نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات آپ کے سامنے آئے تو یہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے فضل وکرم سے مسلمان ہوگئے۔ مسلمان ہونے کے بعد ان کے دل میں یہ خیال آیا کہ یہودیت کے بعض احکام ایسے ہیں کہ میں اسلام لانے کے بعد بھی اگر انہیں جاری رکھوں تو بظاہر کوئی حرج کی بات معلوم نہیں ہوتی۔

ان کے ذہن میں یہ خیال آیا کہ یہودیت کے مذہب میں ہفتے کے دن کی تعظیم کی جاتی ہے اور اسلام میں جمعے کے دن کی تعظیم کی جاتی ہے، لیکن جہاں اسلام نے جمعے کے دن کی تعظیم کا حکم دیا ہے، وہاں ہفتے کے دن کی بے حرمتی یا بے تعظیمی کرنے کو تو نہیں کہا، لہٰذا اگر میں جمعے کے دن کی بھی تعظیم کروں اور ہفتے کے دن کی بھی تعظیم کروں تو اس سے بظاہر کسی اسلامی حکم کی خلاف ورزی لازم نہیں آئے گی۔ اسی طرح اسلام میں اونٹ کا گوشت کھانا حلال کیا گیا، یہودیوں کے مذہب میں اونٹ کا گوشت کھانا حلال نہیں تھا، وہ اس سے پرہیز کرتے تھے تو انہوں نے سوچا کہ اسلام کے اندر اگرچہ اونٹ کا گوشت کھانا حلال ہے، لیکن فرض و واجب

---

(۱) أخرج الواحدی فی أسباب النزول (ص ٦٧) من طريق عبد الغني بن سعيد عن موسى بن عبد الرحمان الصنعاني عن ابن جريج عن عطاء عن ابن عباس رضی اللہ عنہما ...، طبع دار الاصلاح وذكر الحافظ ابن حجر في "العجاب" (ص ٥٢٩) وقال "تقدم أن عبد الغني واهٍ"، طبع دار ابن جوزي.

نہیں ہے کہ ہر صورت میں اونٹ کا گوشت کھانا ہے، لہٰذا اگر میں اسلام لانے کے بعد بھی اونٹ کے گوشت کو چھوڑے رکھوں تو بظاہر اس میں اسلام کے کسی حکم کی خلاف ورزی لازم تو نہیں آتی۔

چنانچہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان کے اس خیال کی اصلاح اس آیت کے ذریعے فرمائی اور بتا دیا کہ پورے کے پورے اسلام میں داخل ہونا ضروری ہے اور اسی کا ایک حصہ یہ بھی ہے کہ جو بات اسلام میں قابلِ رعایت نہیں، اس کی رعایت دین ہونے کی حیثیت سے نہ کی جائے، یعنی یہ صحیح ہے کہ اسلام نے ہفتے کے دن کی بے حرمتی کرنے کا حکم نہیں دیا، لیکن اگر کوئی شخص اس کی تعظیم اس نیت سے کرے کہ یہ بھی میرے دین کا حصہ ہے تو وہ بدعت بن جاتی ہے اور اسلام کے تقاضے کے خلاف ہوجاتا ہے۔ اسی طرح گوشت کھانا بے شک کوئی واجب نہیں، فرض نہیں، لیکن کوئی شخص اگر اسے اس بنا پر ترک کرے کہ اس کا ترک کرنا دینی اعتبار سے مستحسن (پسندیدہ) ہے تو یہ بھی دین کی خلاف ورزی ہوگی۔

اس سے آپ یہ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اسلام میں پورے کے پورے داخل ہونے کے مفہوم میں کتنی وسعت ہے اور اس کے اندر یہ بات بھی داخل ہے کہ جس چیز کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے یا اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی سُنّت کے ذریعے قابلِ تعظیم قرار نہیں دیا، یا جس کے بارے میں کوئی خصوصی حکم نازل نہیں فرمایا، اسے آپ اپنی طرف سے دین کا ایک حصہ سمجھ کر قابلِ تعظیم قرار دینے لگیں یا دین کا ایک حصہ سمجھ کر کسی چیز سے پرہیز کرنے لگیں تو یہ بھی اسلام میں پورے کے پورے داخل ہونے کے منافی ہے۔

شیطان کی پیروی سے بچنے کی تلقین

جہاں بھی انسان اسلام کے کسی حکم سے انحراف کرے گا یا اسے نہیں مانے گا یا اس پر عمل نہیں کرے گا یا اس کی پوری پوری تابعداری نہیں کرے گا، تو درحقیقت پھر وہ اللہ اور اس کے رسول کی اور اسلام کی نہیں، بلکہ شیطان کی پیروی کر رہا ہوگا۔ اس لیے فرمایا: ﴿وَّلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ﴾ ''اور تم شیطان کے نقشِ قدم کی پیروی نہ کرو۔'' اس کا کام تو یہی ہے کہ وہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے حکم کے آگے اپنی عقل لڑاتا ہے، جیسا کہ جب اللہ تعالیٰ نے اسے حکم دیا تھا کہ آدم کو سجدہ کرو تو اس نے اللہ کے حکم کو ماننے کے بجائے اپنی عقلی دلیل چلانے کی کوشش کی اور کہا کہ آدم کو تو نے مٹی سے پیدا کیا اور مجھے آگ سے پیدا کیا، لہٰذا میں اس کے آگے سجدہ کیوں کروں؟

اللہ تبارک و تعالیٰ کے حکم کے آگے ''کیوں'' کا سوال پیدا ہونا، یہ اسلام میں داخل ہونے کے منافی ہے، اور اللہ تعالیٰ کے احکامات کے سامنے عقلی گھوڑے دوڑانا، یہ شیطان کا طرزِ عمل ہے، لہٰذا اس لیے فرمایا گیا کہ تم شیطان کے نقشِ قدم پر نہ چلو، بلکہ جو حکم دیا گیا ہے اسے دل و جان سے بجالاؤ اور اس کی حکمت و مصلحت تلاش کرنے کی فکر میں نہ پڑو۔ ﴿اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿۲۰۸﴾﴾ ''یقین جانو کہ وہ شیطان تمہارا کھلا دشمن ہے،'' لہٰذا وہ جب بھی تمہیں کوئی بات سجھائے گا تو وہ آخر کار تمہاری دشمنی کی ہی بات ہوگی، وہ تمہاری خیر خواہی کی بات نہیں ہوسکتی۔

راہِ حق سے اعراض کرنے والوں کا انجام

پھر فرمایا: ﴿فَاِنْ زَلَلْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْكُمُ الْبَيِّنٰتُ﴾ پھر جو روشن دلائل تمہارے پاس آچکے ہیں اگر تم ان کے بعد بھی راہِ راست سے پھسل گئے تو ﴿فَاعْلَمُوْٓا﴾ پھر یہ یاد رکھو ﴿اَنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۰۹﴾﴾ ''کہ اللہ تعالیٰ کا اقتدار بھی کامل ہے اور حکمت بھی کامل ہے۔''

یہاں مسلمانوں کو فرمایا جارہا ہے کہ تمہیں یہ جو حکم دیا گیا ہے کہ تم اسلام میں پورے کے پورے داخل ہوجاؤ تو اس حکم کی تعمیل میں اگر تم پھسل گئے، یعنی اللہ تعالیٰ کے حکم کو ماننے کے بجائے تم نے شیطانی روِش اختیار کرلی تو بس یہ یاد رکھنا کہ اللہ تعالیٰ بڑا صاحبِ اقتدار ہے، بڑا غالب ہے اور حکیم ہے، یعنی حکمت والا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے یہاں اپنی دو صفتیں ذکر فرمائی ہیں؛ ایک صاحبِ اقتدار ہونا اور ایک حکمت والا ہونا۔ اس سے اشارہ اس طرف ہے کہ چونکہ اللہ تعالیٰ صاحبِ اقتدار ہیں اور اس کا اقتدار بڑا کامل ہے، لہٰذا وہ تمہاری اس لغزش کے اوپر تمہیں سزا دینے کی پوری قدرت رکھتا ہے اور چونکہ وہ حکمت والا ہے اور اس کی حکمت بھی کامل ہے، اس لیے اگر وہ تمہاری سزا کچھ عرصے کے لیے مؤخر کردیتا ہے تو اس مؤخر ہونے سے یہ نہ سمجھنا کہ سزا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم ہوگئی یا ہمیں سزا نہیں ملے گی۔ اللہ تعالیٰ بعض اوقات کسی کو اس لیے تاخیر سے سزا دیتے ہیں کہ ان کی حکمت کا تقاضا یہی ہوتا ہے کہ کچھ دیر میں سزا دی جائے، لہٰذا یہ نہ سمجھنا کہ ایسی صورت میں تم سزا سے بچ جاؤ گے۔

ایمان بالغیب اور ایمان بالمشاہدہ کا فرق

اب آگے اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان لوگوں کا بیان کیا ہے جن کے پاس واضح اور روشن دلائل آچکے ہیں اور وہ یہ سب کچھ آجانے کے باوجود مسلسل کفر اور عناد کے راستے پر ڈٹے ہوئے ہیں اور حضورِ اقدس نبیِ کریم سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے طرح طرح کے مطالبات کرتے رہتے ہیں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ فرمارہے ہیں کہ ان لوگوں کے پاس جو دلائل آچکے ہیں کیا وہ انہیں مطمئن کرنے کے لیے کافی نہیں ہیں؟ نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سچائی اور حقانیت پر ناقابلِ انکار دلائل قائم ہوچکے ہیں، خود نبیِ کریم سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتِ اقدس کے ذریعے اللہ تبارک وتعالیٰ نے بہت سے معجزات دکھا دیے ہیں اور یہ قرآنِ کریم بذاتِ خود ایک معجزہ ہے، تو اب کیا انہیں بس اسی بات کا انتظار ہے کہ بادلوں کے سائبانوں میں سے اللہ تبارک وتعالیٰ خود ان کے سامنے آجائیں اور اس کے فرشتے بھی اس کے ساتھ ہوں؟ چنانچہ فرمایا: ﴿هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ﴾ یہ کفار ایمان لانے کے لیے اس کے سوا کس بات کا انتظار کررہے ہیں کہ ﴿اَنْ يَّاْتِيَهُمُ اللّٰهُ﴾ اللہ تبارک وتعالیٰ خود ان کے پاس آجائیں ﴿فِيْ ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ﴾ بادل کے سائبانوں میں ﴿وَالْمَلٰٓئِكَةُ﴾ ''اور فرشتے بھی آجائیں۔''

اللہ تبارک وتعالیٰ اس جملے کو ارشاد فرما کر اس حقیقت کی نشاندہی فرمارہے ہیں کہ اصل ایمان وہی معتبر ہوتا ہے جو ایمان بالغیب ہو۔ اسی ایمان بالغیب کی قیمت ہے کہ آدمی اپنی عقل اور سمجھ کو استعمال کر کے اللہ تبارک وتعالیٰ پر، اس کے بھیجے ہوئے پیغمبروں پر اور انہیں دی گئی کتابوں پر ایمان لائے، اگر اللہ تعالیٰ کو آنکھوں سے دیکھ لیا یا اس کے فرشتوں کو آنکھوں سے دیکھ لیا، تو آنکھوں سے دیکھنے کے بعد تو پھر ''عام انسانوں'' کے لیے ایمان کی کوئی قیمت نہیں رہ جاتی، اس لیے کہ وہ ایمان بالمشاہدہ ہوگیا ہے، ایمان بالغیب نہ رہا۔

یہاں میں نے ''عام انسانوں'' اس لیے کہا کہ انبیاء علیہم السلام کو ایک مخصوص مدت کے بعد غیب کی چیزیں دکھا دی جاتی ہیں، چونکہ انہیں پیغمبری کے فرائض ادا کرنے ہوتے ہیں جس کے لیے ان پر وحی نازل ہوتی ہے، اس لیے غیب کی بہت سی باتیں ان کے مشاہدے میں آجاتی ہیں، لیکن یہ بھی اس بات کا نتیجہ ہوتا ہے کہ نبوّت سے پہلے وہ ایسا ایمان بالغیب رکھتے ہیں جو کوئی عام آدمی بھی نہیں رکھتا۔ کفر وشرک کے ماحول میں گھرے ہوئے ہونے کے باوجود وہ اللہ تعالیٰ کی توحید اور اس کی قدرتِ کاملہ پر غیر متزلزل ایمان رکھتے ہیں۔ اس

وقت تک انہوں نے غیب کی کوئی چیز یقینی طور پر نہیں دیکھی ہوتی، اس کے باوجود ان کا ایمان نہایت مستحکم ہوتا ہے، اس لیے وہ ایمان بالغیب کی شرط پوری کر چکے ہوتے ہیں۔ پھر جب اللہ تعالیٰ انہیں نبوّت عطا فرماتے ہیں، تو یہ بھی ان کے ایمان بالغیب کا انعام ہوتا ہے، کیونکہ ان کے ذریعے ایسے لوگوں کی رہنمائی کرنا مقصود ہوتا ہے جو گمراہی میں پڑے ہوتے ہیں، چنانچہ وہ ان کو بتاتے ہیں کہ یہ باتیں میں براہ راست دیکھ کر یا سُن کر آیا ہوں، لیکن عام انسانوں کے لیے یہ ساری دنیا جس امتحان اور آزمائش کے لیے بنائی گئی ہے وہ یہی آزمائش ہے کہ انسان کو اللہ تعالیٰ نے جو سمجھ عطا فرمائی ہے اس سمجھ کو کام میں لاکر اور جن انبیائے کرام کو اللہ تعالیٰ نے ایمان بالغیب کی نعمت عطا کرنے کے بعد غیب کی باتیں دکھادی یا بتادی ہیں، ان کی رہنمائی سے وہ اللہ تعالیٰ، اس کی توحید اور احکام پر ایمان لے آئے۔

اگر آدمی آنکھوں سے اللہ تبارک وتعالیٰ کا مشاہدہ کرلے یا اللہ تعالیٰ کے فرشتوں کا مشاہدہ کرلے تو پھر امتحان تو کچھ نہ ہوا، یہی وجہ ہے کہ ایمان اس وقت تک معتبر ہے جب تک کہ موت کے مناظر سامنے نہ آجائیں، یعنی انسان کی روح قبض نہ ہوجائے، لیکن جب نزع کی کیفیت طاری ہوگئی اور موت کے مناظر سامنے آگئے تو اس وقت تو انسان کے سامنے اور اس کے مشاہدے میں عالمِ برزخ کے مناظر آجاتے ہیں، لہٰذا اس وقت کے ایمان کا کوئی اعتبار نہیں ہوتا، چنانچہ فرعون بھی اس وقت ایمان لے آیا تھا جب غرق ہونے لگا تھا۔ جب موت کے منظر سامنے آگئے تو اس وقت اس نے کہا تھا کہ میں ایمان لے آتا ہوں، لیکن اللہ تعالیٰ نے اسے مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

آٰلْـٰٔنَ وَقَدْ عَصَيْتَ قَبْلُ وَكُنْتَ مِنَ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿۹۱﴾ (۱)

اب ایمان لاتا ہے؟ حالانکہ اس سے پہلے نافرمانی کرتا رہا اور مسلسل فساد ہی مچاتا رہا۔

یہاں زیرِ تشریح آیت میں اللہ تبارک وتعالیٰ یہی فرمارہے ہیں کہ جب تمہارے سامنے سارے معجزات، سارے دلائل آچکے ہیں تو اب تمہیں اس کے سوا اور کس بات کا انتظار ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ خود اور اس کے فرشتے تمہارے سامنے آجائیں، اور اگر بالفرض ایسا ہوتو ﴿وَقُضِيَ الْاَمْرُ﴾ ''پھر تو سارا معاملہ چکا ہی دیا جائے گا'' کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کی سنت ہے کہ جب اللہ تبارک وتعالیٰ غیب کے معاملات کو آنکھوں سے دکھادیتے ہیں تو پھر اس کے بعد ایمان معتبر نہیں ہوتا، اس کے بعد پھر سارا معاملہ چکا دیا جاتا ہے اور سارا قصہ

(۱) سورۃ یونس (۱۰): آیت (۹۱)

ختم ہوجاتا ہے، اور ایسا اسی وقت ہوگا جب یہ کائنات ختم کرکے جزا وسزا کا مرحلہ آئے گا، ''معاملہ چکانے'' سے یہاں یہی مراد ہے۔

پچھلی جو امتیں گزری ہیں، انبیائے کرام علیہم السلام انہیں عذاب سے ڈراتے رہے کہ اللہ تعالیٰ کا عذاب آجائے گا، لہٰذا مان لو حق راستے پر آجاؤ، مگر جب وہ مان کر نہ دیے اور عذاب آنکھوں کے سامنے آگیا تو اس کے نتیجے میں اس وقت انہیں ہلاک ہی ہونا پڑا، پھر ایسے موقع پر ان کا ایمان معتبر نہیں ہوسکتا تھا۔ یہاں پر بھی اللہ تعالیٰ فرمارہے ہیں کہ اگر بالفرض اللہ تبارک وتعالیٰ اپنی قدرت سے اپنا دیدار کرا دے اور تمہارے سامنے فرشتوں کو بھیج دے کہ تم انہیں اچھی طرح آنکھوں سے دیکھ لو، تو تب بھی اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ﴿قُضِيَ الْاَمْرُ﴾ پھر سارا معاملہ چکا دیا جائے گا، پھر تمہارے پاس کوئی گنجائش باقی نہ رہے گی، پھر تو ایک ہی راستہ ہوگا کہ تمہیں ہلاک کردیا جائے ﴿وَ اِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ۝۲۱۰﴾ ''اور اللہ ہی کی طرف تمام معاملات لوٹ کر رہیں گے،'' یعنی اب اگر تم اس وقت ایمان نہیں لا رہے اور اس پر تمہیں فوری طور سے کسی سزا کا سامنا نہیں کرنا پڑ رہا تو آخر کار تمام معاملات اللہ کے پاس جائیں گے اور وہی اس دن کا فیصلہ کرے گا۔

حق سے رُوگردانی کرنے والے بنی اسرائیل کی مثال

پیچھے جن منافقین کا ذکر آیا تھا، وہ عام طور سے بنی اسرائیل ہی سے تعلق رکھتے تھے اور ان کے ساتھ ان کا اٹھنا بیٹھنا بھی تھا۔ اس لیے آگے اللہ تبارک وتعالیٰ نے خاص طور پر یہ فرمادیا کہ اگر تمہیں اس بات کا یقین نہ ہو کہ واضح دلائل آجانے کے بعد حق کی مخالفت کرنا موجبِ سزا ہے تو بنی اسرائیل سے پوچھ لو، جن کے بزرگوں اور آباء واجداد کو ایسی ہی مخالفت پر سزاؤں کا سامنا کرنا پڑا تھا، لہٰذا فرمایا: ﴿سَلْ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ﴾ بنی اسرائیل کے لوگوں سے پوچھو ﴿كَمْ اٰتَيْنٰهُمْ مِّنْ اٰيَةٍۭ بَيِّنَةٍ﴾ ''ہم نے انہیں کتنی واضح اور کھلی ہوئی نشانیاں دیں تھیں،'' یعنی کھلے کھلے معجزات ان کے سامنے آئے تھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عصا (لاٹھی) کے معجزات تم نے دیکھے، اسی طرح بعد میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بھی کتنی واضح دلیلیں اور کتنے واضح معجزے عطا کیے گئے تھے، لیکن لوگوں نے ان نشانیوں کے مشاہدے کے باوجود اپنی جھٹلانے کی روش جاری رکھی اور کفر پر ہی ڈٹے رہے، چنانچہ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے آخر کار انہیں اپنے عذاب میں پکڑ لیا۔

اسی کو آگے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ﴿وَ مَنْ يُّبَدِّلْ نِعْمَةَ اللّٰهِ﴾ اور جو شخص اللہ کی نعمت کو تبدیل

کرے ﴿مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُ﴾ ''اس کے بعد کہ وہ نعمت اس شخص کے پاس آچکی ہو۔'' اس نعمت سے مراد وہی حق کے روشن دلائل ہیں جن کا ذکر اوپر آیت میں آیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حق کے ان دلائل کو نعمت قرار دیا ہے، کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے کہ وہ لوگوں پر دلائل واضح کر دیتے ہیں، لہٰذا اس نعمت کا تقاضا تو یہ تھا کہ حق کو تسلیم کر لیا جاتا، لیکن ان لوگوں نے ایسا نہیں کیا، چنانچہ فرمایا کہ اگر ان دلائل کے آنے کے بعد انہیں تسلیم کرنے کے بجائے تم جھٹلانے ہی کی روِش پر قائم رہتے ہو تو یہ اللہ کی نعمت کو بدلنا ہے اور جو شخص اللہ کی نعمت کو تبدیل کرے تو اسے یاد رکھنا چاہیے کہ ﴿فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿۲۱۱﴾﴾ ''اللہ تعالیٰ کا عذاب بڑا سخت ہے۔''

دنیاوی زندگی کی محبت گمراہی کا سبب

پھر آگے اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہ لوگ جو اپنے کفر میں مست ہیں اور اپنے کفر کو انہوں نے اپنی زندگی کا مطمحِ نظر اور اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ دنیا کی رنگینیوں میں مگن ہیں، جب انہوں نے کفر اختیار کر لیا اور اللہ تبارک وتعالیٰ سے غافل ہو کر اس بات سے بے پروا ہو گئے کہ کسی وقت ہمیں اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنے اعمال کی جوابدہی بھی کرنی ہے، تو پھر اسی دنیاوی زندگی کی لذتوں اور راحتوں کو انہوں نے اپنا مقصدِ زندگی بنا لیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی اس ضد اور ہٹ دھرمی کے نتیجے میں ان کا ذہن بھی اسی طرف لگا دیا ہے کہ یہ دنیاوی زندگی کو بڑا دلکش سمجھتے ہیں اور اسی کی بھلائی کی فکر میں رہتے ہیں، چنانچہ فرمایا: ﴿زُيِّنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا﴾ ''جن لوگوں نے کفر اپنا لیا ہے، ان کے لیے دنیوی زندگی کو مزیّن بنا دیا گیا ہے۔''

ایک طرف تو ان کی تنگ نظری کا حال یہ ہے کہ ان کی نظر دنیاوی زندگی سے آگے نہیں جاتی اور دوسری طرف ان کا حال یہ ہے کہ ﴿وَ يَسْخَرُوْنَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ ''اور یہ ایمان والوں کا مذاق بھی اڑاتے ہیں۔'' جو ایمان والے اپنی دنیوی زندگی میں آخرت کو بہتر بنانے کی کوشش کر رہے ہیں اور اس کے نتیجے میں کچھ محنت و مشقت اٹھاتے ہیں، تو یہ ان کا مذاق اڑاتے ہیں کہ دیکھو یہ اپنی دنیوی زندگی کو کس طرح ضائع کر رہے ہیں۔ باری تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہ لوگ یہاں تو مذاق اڑا رہے ہیں ﴿وَالَّذِيْنَ اتَّقَوْا فَوْقَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ﴾ ''حالانکہ جنہوں نے تقویٰ اختیار کیا ہے (اور یہ کافر ان کا مذاق اڑا رہے ہیں) وہ قیامت کے دن

ان سے اونچے درجات پر ہوں گے۔'' اس وقت انہیں پتہ چلے گا کہ جن لوگوں کا ہم نے مذاق اڑایا تھا، انہیں اللہ تعالیٰ نے ہم سے کتنا اونچا مقام و مرتبہ عطا فرمایا ہے۔

مال و دولت کی فراوانی حق پر ہونے کی دلیل نہیں

کفار کے دنیاوی زندگی ہی کو سب کچھ سمجھنے اور مسلمانوں کا مذاق اڑانے کا ذکر کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ﴿وَاللّٰهُ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿۲۱۲﴾﴾ ''اور اللہ تبارک وتعالیٰ جس کو چاہتا ہے بے حساب رزق دیتا ہے۔'' یہ جملہ درحقیقت کفار کے اس باطل دعوے کا جواب ہے جو وہ کبھی کہا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ چونکہ ہمیں خوب رزق دے رہا ہے، اس لیے یہ اس بات کی علامت ہے کہ وہ ہمارے عقائد اور اعمال سے ناراض نہیں ہے، اگر وہ ناراض ہوتا تو ہمارا رزق بند کر دیتا، لہٰذا جو کچھ ہم کر رہے ہیں وہ ٹھیک کر رہے ہیں۔

ان کے اس باطل دعویٰ کا جواب اللہ تعالیٰ نے یہ دیا ہے کہ دنیا میں رزق کی فراوانی کسی کے حق پر ہونے کی دلیل نہیں ہوتی۔ دنیوی رزق کے لیے اللہ تعالیٰ کے نزدیک الگ معیار مقرر ہے، اور اللہ تعالیٰ اپنی حکمت اور معیار کے مطابق جس کو چاہتا ہے بے حساب رزق دے دیتا ہے، خواہ وہ کافر ہی کیوں نہ ہو۔

فرعون، نمرود، قارون، یہ سب بڑے بڑے کافر تھے، لیکن اللہ تبارک وتعالیٰ نے دنیوی رزق کے لحاظ سے انہیں بہت کچھ عطا کیا ہوا تھا، لہٰذا محض یہ بات کہ تمہیں رزق بہت مل رہا ہے اور تمہارے پاس دنیاوی ساز و سامان بہت ہے، یہ اس بات کی دلیل نہیں ہوسکتی کہ تم حق پر ہو، بلکہ تم نے جو کفر کی روش اختیار کر رکھی ہے، اس کی وجہ سے جب آخرت میں پہنچو گے تو تمہاری یہ دولت کچھ کام نہیں آسکے گی۔

آیت نمبر ۲۱۳ تا ۲۱۴

كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً ۟ فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ ۪ وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ؕ وَمَا اخْتَلَفَ فِيْهِ اِلَّا الَّذِيْنَ اُوْتُوْهُ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ بَغْيًۢا

بَيْنَهُمْ ۚ فَهَدَى اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ مِنَ الْحَقِّ بِاِذْنِهٖ ؕ وَ اللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۲۱۳﴾ اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ ؕ مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَآءُ وَالضَّرَّآءُ وَزُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ ؕ اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ ﴿۲۱۴﴾

(شروع میں) سارے انسان ایک ہی دین کے پیرو تھے، پھر (جب ان میں اختلاف ہوا تو) اللہ نے نبی بھیجے جو (حق والوں کو) خوشخبری سناتے، اور (باطل والوں کو) ڈراتے تھے، اور ان کے ساتھ حق پر مشتمل کتاب نازل کی، تاکہ وہ لوگوں کے درمیان ان باتوں کا فیصلہ کریں جن میں ان کا اختلاف تھا، اور (افسوس کی بات یہ ہے کہ) کسی اور نے نہیں، بلکہ خود انہوں نے جن کو وہ کتاب دی گئی تھی، روشن دلائل آجانے کے بعد بھی، صرف باہمی ضد کی وجہ سے اسی (کتاب) میں اختلاف نکال لیا، پھر جو لوگ ایمان لائے اللہ نے انہیں اپنے حکم سے حق کی ان باتوں میں راہِ راست تک پہنچایا جن میں انہوں نے اختلاف کیا تھا اور اللہ جسے چاہتا ہے راہِ راست تک پہنچا دیتا ہے۔ ﴿۲۱۳﴾ (مسلمانو!) کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ تم جنت میں (یونہی) داخل ہوجاؤ گے، حالانکہ ابھی تمہیں اس جیسے حالات پیش نہیں آئے جیسے ان لوگوں کو پیش آئے تھے جو تم سے پہلے ہوگزرے ہیں۔ ان پر سختیاں اور تکلیفیں آئیں اور انہیں ہلا ڈالا گیا، یہاں تک کہ رسول اور ان کے ایمان والے ساتھی بول اٹھے کہ ''اللہ کی مدد کب آئے گی؟'' یاد رکھو! اللہ کی مدد نزدیک ہے۔ ﴿۲۱۴﴾

ابتداء میں سب انسان ایک ہی دین کے پیروکار تھے

پچھلی آیتوں میں منافقین اور کفار کا ذکر تھا کہ انہوں نے روشن دلائل آنے کے باوجود، دنیاوی مفادات

کی خاطر کفر کا رویّہ اختیار کیا ہوا ہے۔ اب اللہ تبارک وتعالیٰ اگلی آیت میں یہ فرما رہے ہیں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے جب انسانوں کو پیدا کیا تھا تو اس وقت ان کے درمیان عقیدے اور مسلک کے لحاظ سے کوئی اختلاف نہیں تھا، جب حضرت آدم علیہ السلام اور ان کی اہلیہ محترمہ حضرت حوا، اللہ تبارک وتعالیٰ کے حکم سے دنیا میں اترے اور ان کی اولاد پیدا ہوئی تو ان سب کا عقیدہ ایک تھا، وہ سب ایک ہی دین کے پیروکار تھے۔ یہ ایک عقیدہ کب تک رہا؟ اس کے بارے میں کوئی بات یقین سے کہنا مشکل ہے، البتہ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ادریس علیہ السلام کے دنیا میں تشریف لانے تک یہی صورت رہی تھی، یعنی سب ایک ہی دین کے پیرو تھے، سب اللہ کو ایک مانتے تھے، سب اللہ تبارک وتعالیٰ کے سامنے آخرت میں جوابدہی کے معتقد تھے، بعد میں پھر رفتہ رفتہ اختلافات پیدا ہوئے۔

اسی بات کو بیان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَّاحِدَةً﴾ ''(شروع میں) سارے انسان ایک ہی امّت تھے۔'' اور اُمّت کے ایک ہونے کے معنیٰ یہ کہ سب کا دین ایک تھا، اگرچہ عربی زبان میں ''اُمّة'' کا لفظ کسی بھی جماعت کے مجموعے پر دلالت کرتا ہے اور لغوی اعتبار سے کسی بھی گروہ کو ''اُمّة'' کہا جاسکتا ہے، لیکن یہاں پر اللہ تبارک وتعالیٰ نے جس معنیٰ میں اسے استعمال کیا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ ''ایک ایسی قوم وملت یا ایسا گروہ جو عقیدے کے اعتبار سے ایک دوسرے کے ساتھ وحدت رکھتا ہو،'' لہٰذا یہاں ﴿كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَّاحِدَةً﴾ کے معنی یہ ہوئے کہ سب لوگوں کا دین وعقیدہ ایک تھا اور ان کے عقیدے اور دین میں کوئی اختلاف نہیں تھا۔

پھر یہاں ایک جملہ محذوف ہے، کیونکہ وہ ہر انسان سلسلۂ کلام سے خود بخود سمجھ سکتا ہے، اور وہ یہ کہ سب کا دین ایک ہونے کے بعد پھر ان کے نظریات میں اختلاف پیدا ہوگیا۔

صحیح عقائد کی تعیین کے لیے انبیائے کرام علیہم السلام کی بعثت

جب اختلاف کی وجہ سے لوگوں کے دین الگ الگ ہوگئے تو ﴿فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ﴾ ''پھر اللہ نے انبیائے کرام کو بھیجا،'' تاکہ وہ اس اختلاف کا صحیح فیصلہ کرکے یہ بات طے کریں کہ اصل عقیدہ کیا تھا اور کون سا عقیدہ درست ہے؟ ﴿مُبَشِّرِيْنَ﴾ ''جو خوشخبری سنانے والے تھے،'' یعنی جو صحیح عقیدے کی پیروی کرنے والوں اور صحیح اعمال اختیار کرنے والوں کو جنت کی خوشخبری سنانے والے تھے۔ ﴿وَمُنْذِرِيْنَ﴾ ''اور

ڈرانے والے تھے،'' یعنی غلط عقیدے اور غلط روِش اختیار کرنے والے لوگوں کو عذاب سے آگاہ کرنے والے اور ڈرانے والے تھے۔

﴿وَ اَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ﴾ ''اور ان کے ساتھ حق پر مشتمل کتاب نازل کی،'' یعنی اللہ تعالیٰ نے انبیائے کرام کے ساتھ، لوگوں کے لیے حق پر مشتمل آسمانی کتاب بھیجی، کیونکہ انسانوں کے درمیان آپس میں اختلاف ہورہا تھا، وہ اپنی رائے اور عقل کے ذریعے مختلف راہیں اختیار کیے ہوئے تھے اور کوئی شخص دوسرے کی بات کو ماننے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اس کا فیصلہ اسی طرح ہوسکتا تھا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ اپنی طرف سے کوئی کتاب نازل فرمائیں اور کوئی پیغمبر بھیجیں جو انہیں بتلائے کہ صحیح راستہ کیا ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے یہ ایسی کتاب نازل فرمائی جو ﴿بِالْحَقِّ﴾ کی صفت کی حامل تھی، یعنی حق بات پر مشتمل تھی ﴿لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ﴾ تاکہ وہ فیصلہ کردے لوگوں کے درمیان ﴿فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ﴾ ''ان معاملات میں جن میں ان کا اختلاف ہورہا تھا۔''

یہ کتاب اس غرض سے آئی کہ لوگ جن مختلف راستوں میں بٹ گئے تھے اور انہوں نے جو مختلف عقیدے اختیار کرلیے تھے، ان کے درمیان حق بات کا فیصلہ کرے۔ اس بات کا تقاضا تو یہ تھا کہ جو لوگ مختلف راستوں پر چل رہے ہیں، وہ اس روشن کتاب کے آجانے کے بعد اپنی پچھلی راہوں اور پچھلے عقیدوں کو چھوڑ کر اس حق کی پیروی کرتے، لیکن ہوا یہ کہ اس کتاب کے آجانے کے بعد بھی انہوں نے اس کتاب ہی سے اختلاف کرنا شروع کردیا اور کہنا شروع کردیا کہ ہم اس کتاب کو نہیں مانتے۔

آگے اللہ تعالیٰ ان کے خود اس کتاب سے اختلاف کرنے کے بارے میں فرماتے ہیں کہ ﴿وَ مَا اخْتَلَفَ فِيْهِ اِلَّا الَّذِيْنَ اُوْتُوْهُ﴾ ''اور کسی اور نے اختلاف نہیں کیا سوائے خود ان کے جن کو وہ کتاب دی گئی تھی۔'' یہ ایک طرح سے گویا افسوس کا سا کلمہ ہے کہ باوجود اس حق کے آجانے کے افسوس ہے کہ اختلاف بھی انہی لوگوں نے کیا جن کو وہ کتاب دی گئی تھی، اور یہ اختلاف کب کیا؟ ﴿مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ﴾ ''ان کے پاس روشن دلائل آجانے کے بعد،'' یعنی جب کہ ان کے پاس اس کتاب کی حقانیت کے اور نبی کی سچائی کے دلائل آچکے تھے، اور انہوں نے مختلف معجزات آنکھوں سے دیکھ لیے تھے۔ اس کے باوجود وہ اختلاف کے راستے پر گامزن رہے اور اس کی وجہ یہ تھی کہ ﴿بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ﴾ ''وہ آپس کی ضد کی وجہ سے اختلاف کررہے تھے،'' یعنی بات یہ نہیں تھی کہ ان پر حق واضح نہیں ہوا تھا، حق تو واضح ہوچکا تھا، لیکن چونکہ

انہوں نے اپنے عقیدے، اپنے مسلک اور اپنے طریقِ کار کو اپنی انا کا مسئلہ بنا لیا تھا، لہٰذا اب اگر حق کی کوئی بات انہیں کہی جاتی تو انہیں اس بات میں اپنی ہیٹی (رسوائی) اور کمزوری محسوس ہوتی تھی کہ ہم اپنی پچھلی بات سے واپس آئیں، لہٰذا وہ آپس کی ضد اضدی کی وجہ سے اختلاف کرتے رہے۔

ایک طرف تو یہ لوگ تھے، دوسری طرف اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ﴿فَهَدَى اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ مِنَ الْحَقِّ بِاِذْنِهٖ﴾ ''پھر جو لوگ ایمان لائے انہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے حکم سے حق کی ان باتوں میں راہِ راست تک پہنچایا جن باتوں میں انہوں نے اختلاف کیا تھا'' یعنی انہیں اللہ تعالیٰ نے اس کتاب کے ذریعے اختلافی امور میں صحیح راستے کی ہدایت دے دی۔ پھر اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿وَاللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۲۱۳﴾﴾ ''اور اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے اسے سیدھے راستے کی ہدایت دے دیتا ہے۔''

یہاں وہ بات یاد کر لیجیے جو سورۂ فاتحہ اور سورۂ بقرہ کے شروع میں بیان کی گئی ہے کہ ہدایت کے ایک معنیٰ تو یہ ہوتے ہیں کہ کسی کو صحیح راستہ دکھا دیا جائے، پھر اس کی مرضی ہے کہ وہ اسے اختیار کرے یا نہ کرے، اس قسم کی ہدایت تو اللہ تعالیٰ ہر ایک کو دیتا ہے، چاہے وہ مومن ہو یا کافر، لیکن ہدایت کے دوسرے معنیٰ یہ ہوتے ہیں کہ صرف راستہ ہی نہ دکھائے بلکہ ہاتھ پکڑ کر منزل تک پہنچا دے، اس قسم کی ہدایت انہی کو دی جاتی ہے جنہیں اس کی طلب ہو اور وہ واقعی منزل تک پہنچنا چاہتے ہوں۔ یہاں ہدایت کی یہ دوسری قسم مراد ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی کو ہدایت دینا چاہے تو دے دیتا ہے۔

کفار کے ہاتھوں ستائے مسلمانوں کے لیے تسلّی کا مضمون

یہاں تک تو ان کافروں اور منافقوں کا ذکر تھا جنہوں نے حق سے منہ موڑا اور اس کی مخالفت کی، اب اگلی آیت میں مسلمانوں سے خطاب ہے۔ مسلمانوں سے خطاب اس لیے کیا گیا ہے کہ پیچھے کفار کی جس روِش اور منافقین کے جس طرزِ عمل کا ذکر آیا ہے اس میں یہ بات بھی داخل ہے کہ وہ ایک طرف تو حق کا انکار کرتے تھے اور دوسری طرف جو لوگ حق کو قبول کر کے ایمان لا چکے تھے، وہ انہیں طرح طرح کی اذیتوں سے دوچار کرتے تھے اور تکلیفیں پہنچایا کرتے تھے، اللہ تبارک وتعالیٰ مسلمانوں کو تسلی دیتے ہیں کہ ان مصیبتوں اور تکلیفوں سے گھبرانا تمہارا شیوہ نہیں ہونا چاہیے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے تمہارے لیے جنت کا جو انعام رکھا ہے

وہ اتنا سستا نہیں ہے کہ بغیر کسی معمولی مشقت کے تم اس میں داخل ہوجاؤ، بلکہ اس کے لیے کچھ مصائب و آلام اور امتحانات سے گزرنا پڑے گا جس طرح کہ تم سے پہلے کے اہلِ ایمان کو مختلف قسم کی شدید تکلیفیں پہنچائی گئیں، چنانچہ فرمایا: ﴿اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ﴾ کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ تم جنت میں یوں ہی داخل ہوجاؤ گے؟ ﴿وَ لَمَّا يَاْتِكُمْ﴾ حالانکہ ابھی تمہارے پاس اس جیسے حالات پیش نہیں آئے ﴿مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ﴾ جیسے ان لوگوں کو پیش آئے تھے جو تم سے پہلے گزرے ہیں ﴿مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَآءُ وَ الضَّرَّآءُ﴾ ''ان پر سختیاں اور تکلیفیں آئیں۔''

''اَلْبَاْسَآءُ'' کے معنیٰ ہیں سختی، اور ''اَلضَّرَّآءُ'' کے معنیٰ ہیں کسی بھی قسم کی تکلیف۔ انہیں طرح طرح کی سختیاں، طرح طرح کی مصیبتیں اور طرح طرح کی تکلیفیں پہنچائی گئیں، ﴿وَ زُلْزِلُوْا﴾ ''اور انہیں ہلا ڈالا گیا،'' یعنی ان مصیبتوں اور تکلیفوں کی شدت کی وجہ سے بعض اوقات وہ ہل اٹھے اور ﴿حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ﴾ یہاں تک کہ خود رسول اور ان کے ایمان والے ساتھی یہ بول پڑے ﴿مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ﴾ ''اللہ کی مدد کب آئے گی؟'' تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ ﴿۲۱۴﴾﴾ ''یاد رکھو! اللہ کی مدد نزدیک ہے،'' یعنی یہ جو تم سمجھتے ہو کہ بعض اوقات اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے مدد آنے میں دیر ہوتی ہے، یہ دیر تمہارے اپنے حساب سے ہوتی ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ کے یہاں دیر نہیں ہوتی، اگر تم ان تکلیفوں، مصیبتوں اور پریشانیوں پر صبر کرکے اپنے موقف پر قائم رہو، تو اللہ تبارک وتعالیٰ پھر تمہاری مدد فرماتے ہیں، چاہے وہ تمہیں دیر میں نظر آتی ہو، لیکن حقیقت میں اللہ تعالیٰ کے نزدیک وہ قریب ہے۔

انفاق کا مفہوم اور اس کے مصارف

آیت نمبر ۲۱۵

يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ؕ قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ وَالْيَتٰمٰى وَ الْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ؕ وَ مَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ﴿۲۱۵﴾

لوگ آپ سے پوچھتے ہیں کہ وہ (اللہ کی خوشنودی کے لیے) کیا خرچ کریں؟ آپ کہہ دیجیے کہ جو مال بھی تم خرچ کرو وہ والدین، قریبی رشتے داروں، یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کے لیے ہونا چاہیے، اور تم بھلائی کا جو کام بھی کرو، اللہ اس سے پوری طرح باخبر ہے۔ (۲۱۵)

• انفاق کا لغوی و اصطلاحی مفہوم

پیچھے یہ بات گزر چکی ہے کہ پہلے اللہ تبارک وتعالیٰ نے تقویٰ کا حکم عطا فرمایا تھا اور پھر اس تقویٰ کے مختلف شعبے بیان فرمائے۔ تقویٰ کے مختلف شعبوں کے درمیان کفار اور منافقین کا ضمنی طور پر تذکرہ آیا۔ اب پھر دوبارہ اللہ تبارک وتعالیٰ تقویٰ کے مختلف شعبوں کا بیان شروع فرمارہے ہیں، اور ان آیات میں اللہ تبارک وتعالیٰ کی خوشنودی کی خاطر کوئی مال خرچ کرنے کا ذکر فرمایا گیا ہے۔

قرآنِ کریم نے کئی مقامات پر ''انفاق'' کا لفظ استعمال کیا ہے جس کے لفظی معنیٰ مال خرچ کرنے کے ہیں، چنانچہ مال کو کسی بھی کام میں خرچ کیا جائے، لفظی اعتبار سے اسے انفاق ہی کہیں گے، جیسے اگر روپے کے ذریعے کوئی چیز خریدی گئی ہے تو اسے بھی انفاق کہا جائے گا، لیکن عام طور سے قرآنِ کریم میں جہاں انفاق کا لفظ آیا ہے تو اس سے مراد وہ خرچ ہے جو اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کی خاطر کیا جائے۔ سورۂ بقرہ کی بالکل ابتداء میں ''وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ'' فرمایا گیا تھا، یعنی ''یہ وہ نیک لوگ ہیں جو ہمارے دیے ہوئے رزق میں سے خرچ کرتے ہیں۔'' وہاں پر بھی خرچ کرنے سے مراد یہ ہے کہ وہ اپنی ضروریات کے علاوہ دوسرے نیک کاموں کے اندر اپنے مال کو خرچ کرتے ہیں، یہاں پر بھی انفاق سے وہی مراد ہے۔

• اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کرنے کے مصارف

باری تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ﴾ ''لوگ آپ سے پوچھتے ہیں کہ وہ کیا خرچ کریں؟'' یعنی اللہ کی خوشنودی کے لیے کتنا خرچ کریں؟ تو اس کے جواب میں ﴿قُلْ﴾ آپ یہ کہہ دیجیے کہ ﴿مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ﴾ جو مال بھی تم خرچ کرو، وہ ﴿فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ﴾ ''والدین کی خدمت میں، غریب رشتے داروں کی خدمت میں، یتیموں کی خدمت میں اور

مسکین لوگ جو نادار ہیں، ان کی مدد کے لیے اور مسافروں کی مدد کے لیے'' خرچ کرنا چاہیے اور ساتھ ہی پھر یہ بھی فرمایا: ﴿وَ مَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ﴿۲۱۵﴾﴾ ''اور تم بھلائی کے جو کام بھی کرو، اللہ اس سے پوری طرح باخبر ہے'' اور وہ اس پر ثواب دے گا۔

• مال کو صحیح مصرف میں خرچ کرنے کی تلقین

یہاں پہلی بات تو یہ سوچنے کی ہے کہ ﴿مَاذَا يُنْفِقُوْنَ﴾ کے ذریعے بظاہر سوال تو اس بات کا تھا کہ وہ کیا خرچ کریں؟ کتنی مقدار میں خرچ کریں؟ لیکن جواب میں براہِ راست مال کی مقدار کا ذکر کرنے کے بجائے مال کو خرچ کرنے کے مصارف کا ذکر فرمایا گیا ہے کہ کہاں خرچ کرنا چاہیے اور جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ کتنا خرچ کرنا چاہیے تو اس کے لیے تین آیتوں کے بعد اللہ تبارک و تعالیٰ نے پھر دوبارہ اسی مضمون کو ظاہر فرمایا ہے۔ اِس کی وضاحت اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ یہ جو آیتِ کریمہ ہے: ﴿يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ﴾ اس کے پسِ منظر کے طور پر مفسرین نے یہ[1] ذکر کیا ہے کہ حضرت عمرو بن جموح رضی اللہ عنہ نے نبیِ کریم سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے یہ سوال کیا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم میں انفاق کا بہت زیادہ ذکر فرمایا ہے اور اس کی بڑی فضیلت بیان فرمائی ہے، تو اب ان کا سوال یہ تھا کہ:

مَا نُنْفِقُ مِنْ اَمْوَالِنَا وَأَيْنَ نَضَعُهَا؟

ہم کیا مال خرچ کریں، یعنی کتنا خرچ کریں؟ اور اسے کہاں خرچ کریں؟

ان کے سوال میں یہ بھی تھا کہ کتنا خرچ کریں؟ اور یہ بھی تھا کہ کہاں خرچ کریں؟ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اِس جگہ اُن کے سوال کے دوسرے جز کو زیادہ وضاحت کے ساتھ بیان فرمایا اور بتایا کہ مال کہاں کہاں خرچ کرنا ہے۔ جہاں تک ان کے سوال کے پہلے جز کا تعلق تھا کہ کتنا خرچ کریں تو اس کے بارے میں صرف اتنا اشارہ کردیا کہ ﴿وَ مَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ﴾ کہ تم بھلائی کا جو کام بھی کروگے یا بھلائی کے کسی بھی کام میں خرچ کروگے ﴿فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ﴿۲۱۵﴾﴾ ''تو اللہ تعالیٰ اسے خوب جانتا ہے اور ان شاء اللہ تمہیں اس کی بہترین جزا عطا فرمائے گا۔''

---

(۱) أخرجه ابن المنذر كما فى الدر المنثور للسيوطى (۲/ ۵۰۲) طبع دار هجر، وذكره المناوي في الفتح السماوي (۱/ ۲۵۲) وسكت عن إسناده، طبع دار العاصمة.

یہاں اللہ تبارک وتعالیٰ کا ﴿مَاذَا يُنْفِقُوْنَ﴾ یعنی کیا خرچ کریں؟ کے جواب میں مصارف کا بیان فرمانا کہ کہاں کہاں خرچ کرو، یہ درحقیقت اس طرف اشارہ ہے کہ مصرف کی بڑی اہمیت ہے۔ اللہ تعالیٰ کے راستے میں کوئی مال خرچ کرنے کے معاملے میں بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ بس ہم پیسے نکال دیں یا ہمارے سر سے یہ بلا ٹل جائے، ان کو اس بات کا دھیان نہیں ہوتا کہ کسی صحیح مصرف پر خرچ کریں یا ایسی جگہ خرچ کریں جہاں واقعۃً ضرورت بھی ہو، جہاں اللہ تبارک وتعالیٰ کو خرچ کرنا پسند بھی ہو اور اس پر اجر وثواب بھی ملے، لہٰذا ''کتنا خرچ کرنا چاہیے؟'' سے پہلے اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس بات کو واضح کرنا زیادہ اہم قرار دیا کہ ''کہاں خرچ کرنا چاہیے؟''

اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتے ہیں کہ پہلے ان مصارف کو اچھی طرح سمجھ لو کہ جہاں خرچ کرنے سے اللہ تبارک وتعالیٰ کی خوشنودی حاصل ہوتی ہے، اس کے بعد جہاں تک یہ بات ہے کہ کتنا خرچ کرنا چاہیے تو یہ تمہاری ہمت پر ہے ﴿وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ﴿۲۱۵﴾﴾ ''اور تم جو بھلائی بھی کرو گے تو اللہ تعالیٰ اسے بہتر جانتا ہے۔''

پھر آگے تین آیتوں کے بعد اللہ تعالیٰ نے دوبارہ یہی سوال دہرایا کہ ﴿وَيَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ﴾ اور اس میں خرچ کرنے کی مقدار کا بھی براہِ راست ذکر فرمادیا ہے جس کی تفصیل ان شاء اللہ تین آیتوں کے بعد آئے گی۔

• والدین پر خرچ کرنے کی تاکید اور اہمیت

یہاں زیرِ تشریح آیت میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے کل پانچ مصارف کا ذکر فرمایا ہے، ان مصارف کی تفصیل میں جانے سے پہلے یہاں یہ سمجھ لینا چاہیے کہ یہ سارا ذکر نفلی انفاق کا ہو رہا ہے، زکوٰۃ کا یہاں ذکر نہیں ہے۔ ''زکوٰۃ'' کے لیے اللہ تعالیٰ نے الگ مصارف بیان فرمائے ہیں اور وہ ان شاء اللہ آئندہ سورۂ توبہ میں آئیں گے، لیکن یہاں پر جو ذکر ہو رہا ہے وہ اس بات کا ہے کہ کوئی شخص نفلی طور پر اللہ تعالیٰ کے راستے میں مال خرچ کرنا چاہتا ہے تو اس کے کیا کیا مصارف ہو سکتے ہیں؟

چنانچہ سب سے پہلے فرمایا: ﴿فَلِلْوَالِدَيْنِ﴾ یعنی والدین کو دو۔ والدین کو زکوٰۃ تو نہیں دی جاسکتی اگرچہ وہ مستحق ہی کیوں نہ ہوں۔ اسی طرح اگر والدین اپنی اولاد کو زکوٰۃ دینا چاہیں تو وہ بھی زکوٰۃ نہیں دے سکتے۔

اس لیے کہ والدین اور اولاد میں ایسا رشتہ ہوتا ہے کہ اگر وہ ایک دوسرے کو کچھ دیں تو یہ ایسا ہی ہے کہ جیسے ایک شخص نے ایک جیب سے پیسے نکال کر دوسری جیب میں ڈال دیے، لہٰذا والدین کو زکوٰۃ تو نہیں دی جاسکتی، تاہم زکوٰۃ کے علاوہ والدین کی جو خدمت بھی کی جائے، مثلاً ان کو کوئی ہدیہ یا تحفہ پیش کرنا، ان کی کوئی ضرورت پوری کردینا، بیمار ہوں تو ان کی دوا کا انتظام کرنا، یہ سارے کے سارے ﴿فَلِلْوَالِدَيْنِ﴾ میں داخل ہیں اور ان پر صدقے کا ثواب ملے گا۔

نفلی صدقات کے مصارف میں اللہ تعالیٰ نے والدین کو مقدّم فرما کر اس بات کی طرف اشارہ فرمادیا کہ والدین پر خرچ کرتے ہوئے بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں یہ جو خرچ کررہے ہیں یہ کوئی ثواب کا کام نہیں ہے یا یہ ہماری دنیا داری کا کام ہے، تو یہ بات درست نہیں، بلکہ صحیح بات یہ ہے کہ والدین پر خرچ کرنا اور ایسا خرچ کرنا جس سے انہیں راحت ملے، یہ انسان کے لیے بہت زیادہ اجر وثواب کا باعث ہے۔

رشتے داروں پر خرچ کرنے میں دوہرا ثواب

پھر دوسرا مصرف ﴿وَالْاَقْرَبِيْنَ﴾ فرمایا گیا، یعنی قریبی رشتے دار۔ قریبی رشتے داروں کو مال دینا، ان کے اوپر پیسے خرچ کرنا، ان کی ضروریات پوری کرنا، ان کی حاجتیں رفع کرنا اور مشکل مواقع پر ان کے کام آنا، یہ ساری باتیں رشتے داروں کے ساتھ حسنِ سلوک سے تعلق رکھتی ہیں اور اس کا بڑا اجر وثواب ہے۔ صدقہ صرف یہی نہیں ہے کہ آپ کسی اجنبی کو پیسے دے دیں، بلکہ اگر اپنے قریبی رشتے داروں کی مدد کی جائے تو یہ بھی صدقہ کی بہترین شکل ہے۔ رشتے داروں پر خرچ کرنے کو حدیث [1] میں دوہرے اجر وثواب کا باعث قرار دیا گیا ہے، کیوں کہ اس میں صدقے کا ثواب بھی ملتا ہے اور ساتھ ساتھ صلہ رحمی کا ثواب بھی شامل ہوجاتا ہے۔

اور یہ جو دوسرے رشتے دار ہیں ان میں صرف دو رشتوں کے علاوہ باقی سب کو زکوٰۃ بھی دی جاسکتی ہے، ایک باپ بیٹے اور ماں بیٹے ان کے درمیان آپس میں زکوٰۃ نہیں دی جاسکتی اور دوسرے شوہر اور بیوی ایک دوسرے کو زکوٰۃ نہیں دے سکتے۔ باقی جتنے بھی رشتے ہیں وہ چاہے بھائی ہو، بہن ہو، چچا ہو، پھوپھی ہو،

---

(۱) سنن الترمذی (۳۸/۳) (٦٥٨) ابواب الزكاة، باب ماجاء فی الصدقة علی ذي القرابة. قال الترمذي حديث حسن. ورواه النسائي في سننه (۹۲/٥) (۲٥۸۲) وقال ابن الملقن في البدر المنير (٤۱۲/۷) هذا الحديث صحيح.

جتنے بھی رشتے دار ہیں اگر وہ صاحبِ نصاب نہیں ہیں اور مستحقِ زکوٰۃ ہیں تو انہیں زکوٰۃ بھی دی جاسکتی ہے اور زکوٰۃ کے علاوہ دوسرے صدقات بھی انہیں دیے جاسکتے ہیں۔

یتیم و مسکین اور مسافر کی مدد کرنے کا حکم

پھر فرمایا: ﴿وَالْيَتٰمٰى﴾ یعنی جو بچے یتیم رہ گئے ہوں اور ان کی کفالت کرنے والا کوئی نہ ہو یا یہ کہ وہ حاجت مند ہوں تو ان کے اوپر خرچ کرنا بھی بہت بڑی عظیم فضیلت کی چیز ہے۔ ﴿وَ الْمَسٰكِيْنِ﴾ یعنی مساکین کو دو۔ مساکین مسکین کی جمع ہے اور ''مسکین'' کا ترجمہ اردو میں ''نادار'' سے کرنا مناسب ہے، یعنی ایسے لوگ جن کے پاس ایسا کچھ نہیں ہے جو ان کی ضروریات کے لیے کافی ہو تو ان پر خرچ کرنا بھی بڑی فضیلت کی چیز ہے۔ یہ دو مصارف بھی ایسے ہیں کہ ان میں زکوٰۃ بھی ادا کی جاسکتی ہے اور نفلی صدقات بھی دیے جاسکتے ہیں۔

﴿وَابْنِ السَّبِيْلِ﴾ ''اور مسافر،'' یعنی مسافر پر خرچ کرنا فضیلت کی بات ہے۔ یہ صورت پچھلے زمانوں میں زیادہ پیش آیا کرتی تھی، کیونکہ ان میں سفر عام طور سے پیدل یا گھوڑوں اور اونٹوں پر ہوا کرتے تھے۔ لمبے سفر کے دوران بعض اوقات انسان کے پاس پیسے اور زادِ راہ ختم ہوجاتا تھا، اگرچہ اس کے وطن میں اس کے پاس مال موجود ہوتا، لیکن سفر کے دوران وہ بے چارہ محتاج ہوجایا کرتا تھا۔ ایسے شخص کو زکوٰۃ میں سے بھی دیا جاسکتا ہے اور صدقات میں سے بھی اس کی مدد کی جاسکتی ہے۔ یہ انفاق فی سبیل اللہ کا ایک اہم حصہ ہے۔

ہر وہ کام جس سے مخلوقِ خدا کو نفع پہنچے، صدقہ ہے

پھر آخر میں فرمادیا: ﴿وَ مَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ﴾ اور تم بھلائی کا جو کام بھی کرو، ﴿فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ﴿۲۱۵﴾﴾ ''اللہ اس سے پوری طرح باخبر ہے،'' یعنی تم جتنا بھی خرچ کرو گے اور جو بھی بھلائی کرو گے تو اللہ تعالیٰ اسے جانتا ہے، لہٰذا کتنا خرچ کرنا چاہیے یہ اپنی ہمت کے مطابق دیکھو اور پھر جتنا خرچ کرسکتے ہو اسے ان مصارف کے اوپر خرچ کرنے کی کوشش کرو۔

یہاں پر اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کرنے کے تمام مصارف بیان نہیں فرمائے گئے ہیں، بلکہ یہاں ان میں سے چند اہم چیزوں کا ذکر فرمایا گیا ہے، ورنہ کوئی بھی ایسا کام کہ جس سے دوسروں کو فائدہ پہنچے، وہ

انفاق فی سبیل اللہ کے اندر داخل ہے۔ اگر کوئی شفا خانہ تعمیر کرتا ہے، کوئی کنواں کھدواتا ہے، کوئی مسجد بناتا ہے، کوئی مدرسہ بناتا ہے، غرض ہر وہ کام جس سے دوسرے لوگوں کو فائدہ پہنچے، سب انفاق فی سبیل اللہ کے اندر داخل ہے، اور ان مصارف میں خرچ کرنے سے بھی اجر و ثواب حاصل ہوگا۔

آیت نمبر ۲۱۶ تا ۲۱۸

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـًٔا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسٰٓى اَنْ تُحِبُّوْا شَيْـًٔا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ ۗ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۱۶﴾ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيْهِ ۗ قُلْ قِتَالٌ فِيْهِ كَبِيْرٌ ۗ وَصَدٌّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَكُفْرٌۢ بِهٖ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۙ وَاِخْرَاجُ اَهْلِهٖ مِنْهُ اَكْبَرُ عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَالْفِتْنَةُ اَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ ۗ وَلَا يَزَالُوْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ حَتّٰى يَرُدُّوْكُمْ عَنْ دِيْنِكُمْ اِنِ اسْتَطَاعُوْا ۗ وَمَنْ يَّرْتَدِدْ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَيَمُتْ وَهُوَ كَافِرٌ فَاُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِى الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۚ وَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۱۷﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۙ اُولٰٓئِكَ يَرْجُوْنَ رَحْمَتَ اللّٰهِ ۗ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۲۱۸﴾

ع ۲۶ ۲ ۱۰

تم پر (دشمنوں سے) جنگ کرنا فرض کیا گیا ہے اور وہ تم پر گراں ہے، اور یہ عین ممکن ہے کہ تم ایک چیز کو برا سمجھو، حالانکہ وہ تمہارے حق میں بہتر ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ تم ایک چیز کو پسند کرو، حالانکہ وہ تمہارے حق میں بری ہو، اور (اصل حقیقت تو) اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔ ﴿۲۱۶﴾ لوگ آپ سے حرمت والے مہینے کے بارے میں پوچھتے ہیں کہ اس میں جنگ کرنا کیسا ہے؟ آپ کہہ دیجیے کہ اس میں جنگ کرنا بڑا گناہ ہے، مگر لوگوں کو اللہ کے راستے سے روکنا، اس کے خلاف کفر کی روش اختیار کرنا، مسجدِ حرام

پر بندش لگانا اور اس کے باسیوں کو وہاں سے نکال باہر کرنا اللہ کے نزدیک زیادہ بڑا گناہ ہے، اور فتنہ قتل سے بھی زیادہ سنگین چیز ہے۔ اور یہ (کافر) تم لوگوں سے برابر جنگ کرتے رہیں گے، یہاں تک کہ اگر ان کا بس چلے تو یہ تم کو تمہارا دین چھوڑنے پر آمادہ کردیں اور اگر تم میں سے کوئی شخص اپنا دین چھوڑ دے، اور کافر ہونے کی حالت ہی میں مرے تو ایسے لوگوں کے اعمال دنیا اور آخرت دونوں میں اکارت ہوجائیں گے، ایسے لوگ دوزخ والے ہیں، وہ ہمیشہ اسی میں رہیں گے۔ ﴿۲۱۷﴾ (اس کے برخلاف) جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے ہجرت کی اور اللہ کے راستے میں جہاد کیا، تو وہ بے شک اللہ کی رحمت کے اُمیدوار ہیں، اور اللہ بہت بخشنے والا، بڑا مہربان ہے۔ ﴿۲۱۸﴾

جہاد کی مشروعیت اور فرضیت کی تفصیل

جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا، یہاں سورۂ بقرہ میں تقویٰ کے مختلف شعبوں کا بیان ہورہا ہے۔ اس سے پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے ''انفاق فی سبیل اللہ'' کو تقویٰ کے ایک شعبے اور نیکی کے طور پر بیان فرمایا تھا اور اب یہاں جو آیتیں ذکر کی گئی ہیں ان میں تقویٰ کے دوسرے اہم تقاضے: ''قتال'' یعنی جہاد کا ذکر ہے، جس کا مطلب ہے دشمنوں سے جنگ کرنا۔ گویا اللہ تعالیٰ کے راستے میں مال خرچ کرنے کا حکم دینے کے بعد اب اللہ تعالیٰ کے راستے میں جان قربان کرنے کی بات کی جارہی ہے، بلکہ بسا اوقات جنگ کے لیے بھی مال خرچ کرنا پڑتا ہے، اس لیے پہلے اُس کا ذکر فرمایا گیا ہے، اس کے بعد جہاد کا بیان ہے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے پہلے تو یہ فرمایا: ﴿كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ﴾ ''تم پر (دشمنوں سے) جنگ کرنا فرض کیا گیا ہے، اور وہ تم پر گراں ہے۔'' یہاں یہ سمجھ لینا چاہیے کہ قتال ہر صورت میں فرض نہیں ہے، بلکہ یہ فرض اس وقت ہوتا ہے جب مسلمانوں کے ملک پر کوئی غیر مسلم حملہ آور ہوجائے اور اس وقت میں جو امیرِ مملکت ہو وہ تمام لوگوں سے کہے کہ اس کا مقابلہ کرنے کے لیے سب لوگ نکلیں، تو اس وقت ہر شخص کے ذمے ''قتال'' فرض ہوجاتا ہے اس کے سوا جو دوسری صورتیں ہوتی ہیں، ان سب میں وہ ہر شخص کے ذمے فرض نہیں ہوتا۔

یہاں پر ﴿كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ﴾ میں دونوں معنیٰ ممکن ہیں، یا تو یہ اس صورت کا بیان ہے جب دشمن نے حملہ کر دیا اور امیرِ مملکت نے تمام باشندوں کو لڑائی میں شریک ہونے کا حکم دیا، جس کو اصطلاح میں ''نفیرِ عام'' کہتے ہیں، ایسی صورت میں اس سے مراد یہ ہوگا کہ ہر شخص کے ذمے جہاد فرضِ عین ہے۔ یا یہ عام حالات کا بیان ہے، ایسی صورت میں یہاں فرضِ کفایہ مراد ہوگا، کیونکہ فرضِ کفایہ بھی ایک فرض ہوتا ہے، اس کا حاصل یہ ہے کہ کچھ لوگ اگر وہ فرضِ کفایہ ادا کر دیں تو باقی لوگوں کی طرف سے وہ خود بخود ادا ہو جاتا ہے، لیکن اگر کوئی بھی نہ کرے تو سب گناہ گار ہوتے ہیں۔

ان آیات میں اللہ تعالیٰ کا یہ فرمانا کہ ﴿كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ﴾ ''تمہارے ذمے قتال فرض قرار دیا گیا ہے۔'' یہ مدنی زندگی کی بات ہے، کیونکہ مکی زندگی میں تو مسلمانوں کو یہ کہا گیا تھا کہ اگر کافر تمہیں مار بھی رہے ہوں تو مار کھاتے رہو اور جواب میں تلوار نہ اٹھاؤ، ان کا جواب بھی مت دو، وہاں صبر کی تلقین کی گئی تھی۔ مدینہ منوّرہ میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے جہاد فرض کیا اور اس کے مختلف مواقع آتے رہے، مختلف مواقع پر دشمنوں نے بھی حملہ کیا، جس کے دفاع میں نبی کریم سرورِ دو عالم ﷺ نے بھی حملے کیے اور اس طرح اس حکم پر عمل ہوتا رہا۔

جہاد کے حسن لغیرہٖ ہونے کی تفصیل

جہاد کی فرضیت بتانے کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ یہ بھی فرما رہے ہیں کہ ﴿وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ﴾ یعنی یہ قتال کا حکم تمہیں گراں معلوم ہوتا ہے۔ گراں معلوم ہونے کی وجہ یہ ہے کہ یہ ایک حقیقت ہے کہ کسی انسان کو قتل کرنا یا کسی انسان کے خلاف تلوار اٹھانا کوئی خوشگوار کام نہیں ہے اور اسی لیے اسلام میں جہاد ''حسن لعینہٖ'' نہیں ہے، بلکہ ''حسن لغیرہٖ'' ہے، یعنی یہ اپنی ذات میں کوئی اچھی بات یا اچھا کام نہیں ہوتا کہ آدمی دوسروں پر تلوار چلائے، لیکن کچھ اور اسباب ایسے ہوتے ہیں جس کی وجہ سے تلوار اٹھانا ناگزیر ہو جاتا ہے، اور اگر آدمی تلوار نہ اٹھائے تو اس سے وہ خود، اس کی قوم اور اس کا دین و مذہب خطرے میں پڑ جاتا ہے، لہٰذا اسی بات کے پیشِ نظر جہاد کو مشروع اور دین کا ایک اہم رکن قرار دیا گیا ہے۔

زندگی کو خوشگوار بنانے کا ایک زرّیں اصول

جنگ کا حکم گراں معلوم ہونے کی ایک وجہ تو یہی معلوم ہوئی کہ انسانوں کے اوپر تلوار اٹھانا کوئی خوشگوار بات نہیں ہے، اور اس کی دوسری وجہ یہ ہے کہ جب آدمی جہاد میں جاتا ہے تو اسے بہت سی مشقتیں پیش آتی ہیں، خطرات سے دوچار ہونا پڑتا ہے، بہت سی محنتیں کرنی پڑتی ہیں، اس لحاظ سے بھی یہ حکم مشکل اور گراں ہے، لیکن یہاں اللہ تبارک وتعالیٰ آگے ایک بڑا زرّیں اصول بیان فرمارہے ہیں جو ہماری ساری زندگی میں بڑا کارآمد ہے، اور وہ یہ کہ ﴿وَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـًٔا﴾ اور یہ عین ممکن ہے کہ تم ایک چیز کو بُرا سمجھو ﴿وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ﴾ ''حالانکہ وہ تمہارے حق میں بہتر ہو۔''

اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہمیں اپنی زندگی کو خوشگوار بنانے کا یہ بڑا خوبصورت اصول عطا فرمایا ہے، اگر اس پر غور کرلیا جائے تو زندگی آسان ہو جائے۔ یہاں بتانا یہ مقصود ہے کہ یہ نہ سمجھو کہ زندگی کے اندر تمہیں ہمیشہ خوشگوار واقعات ہی پیش آتے رہیں گے، ایسا ممکن نہیں، اس میں ناگوار باتیں بھی آئیں گی اور خاص طور پر دین کے احکام پر عمل کرنے میں بعض اوقات مشقّت اور محنت بھی اٹھانی پڑے گی، بعض اوقات اپنی خواہشات کو بھی کچلنا پڑے گا۔ یہ سب چیزیں تمہیں بظاہر بری لگتی ہیں، لیکن حقیقت کے اعتبار سے وہ تمہارے لیے بہت بہتر ہیں اور دنیا اور آخرت میں ان کا انجام تمہارے حق میں اچھا ہے۔

اسی طرح فرمایا: ﴿وَعَسٰٓى اَنْ تُحِبُّوْا شَيْـًٔا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ﴾ ''اور یہ بھی ممکن ہے کہ تم کسی چیز کو پسند کرو، حالانکہ وہ تمہارے حق میں بہت بری ہو۔'' جتنے بھی گناہ کے کام ہیں وہ بعض اوقات انسان کو پسند آتے ہیں، لیکن حقیقت میں وہ اس کے لیے برے ہوتے ہیں، اسی طرح ناجائز طریقے سے مال کمانا بظاہر دیکھنے میں انسان کو بڑے فائدے کا کام معلوم ہوتا ہے، لیکن حقیقت میں وہ اس کے لیے برا ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کے اس ارشاد کا حاصل یہ ہے کہ انسان کو محض اپنی نفسانی خواہشات کے پیچھے نہیں چلنا چاہیے کہ جس چیز کو نفسانی خواہشات اچھا کہیں اسے اچھا سمجھے اور جس کو برا کہیں اسے برا سمجھے، بلکہ اچھے اور برے کا فیصلہ تو درحقیقت وہی کرسکتا ہے جس نے اس کائنات کو پیدا کیا اور جو کائنات کے اندر موجود تمام اشیاء کا خالق و مالک ہے، وہی جانتا ہے کہ کس وقت تمہارے لیے کون سا عمل بہتر ہے؟

اسی طرح زندگی کے مختلف مراحل پر انسان کو جائز کاموں میں بھی ناگواریاں پیش آتی ہیں، تمہارے ارادے کچھ اور تھے، لیکن ہو کچھ اور گیا۔ تم نے ایک منصوبہ بنا کر اس کی تیاری کرلی تھی، اس لیے تمہیں تو یہی

پسند تھا کہ تمہارا منصوبہ کامیاب ہو، لیکن اللہ تعالیٰ کی مشیت سے وہ کامیاب نہیں ہوا۔ اس موقع پر تقدیر کا شکوہ کرنے کے بجائے یہ امید رکھو کہ ان شاء اللہ انجام کار اسی میں بہتری ہوگی۔ بعض اوقات وہ بہتری بعد میں آنکھوں سے بھی نظر آجاتی ہے اور بعض اوقات نظر نہیں آتی، لیکن اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے کہ تمہاری بہتری کس میں تھی؟ تم اپنی خواہشات کے محدود دائرے میں رہ کر اپنے لیے اچھے بُرے کا فیصلہ کرتے ہو، لیکن حقیقی فیصلہ اُس کا ہے جس کے علم کے آگے ماضی، حال اور مستقبل کی کوئی چیز پوشیدہ نہیں، وہ جانتا ہے کہ جس چیز کو تم پسند کر رہے ہو درحقیقت وہ تمہارے مستقبل کے لیے مفید نہیں۔ اس لیے وہ ایسا فیصلہ فرماتا ہے جو تمہیں برا لگ رہا ہوتا ہے، لیکن حقیقت میں وہ اچھا ہوتا ہے۔

یہ اصول بیان کرکے بتادیا گیا کہ جہاد و قتال میں اگرچہ بظاہر جان و مال کا نقصان نظر آرہا ہے، لیکن جب حقائق سامنے آئیں گے تو کھلے گا کہ یہ نقصان ہرگز نقصان نہیں تھا، بلکہ سراسر نفع اور دائمی راحت کا سامان تھا۔

حرمت والے مہینوں میں قتال پر کفار کا اعتراض

اگلی آیات جہاد سے متعلق ایک خاص واقعے کے پسِ منظر میں آئی ہیں، واقعہ یہ ہوا تھا کہ اسلام سے پہلے بھی چار مہینے ایسے تھے جن کو خود قرآنِ کریم نے ''اشہرِ حرم''، یعنی حرمت والے مہینے کہا ہے (جن کی کچھ تفصیل پیچھے آیت ۱۹۴ میں گزر چکی ہے۔) اور زمانۂ جاہلیت میں بھی قریش کے لوگ اور قبائلِ عرب سب ان مہینوں میں جنگ کرنے سے اجتناب کرتے تھے اور یہ سمجھتے تھے کہ یہ مہینے حرمت والے ہیں۔ اگرچہ اس میں بھی انہوں نے یہ گڑبڑ کر رکھی تھی کہ جب دل چاہتا مہینوں کا حساب آگے پیچھے کردیا کرتے تھے جس کا ذکر آگے آئے گا، لیکن بحیثیتِ مجموعی ان حرمت والے مہینوں میں وہ لڑائی کو بند کردیتے تھے۔

ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ صحابۂ کرام سفر پر تھے اور سفر کے دوران ان کی کچھ مشرکین سے جھڑپ ہوگئی، جس کے نتیجے میں مشرکین میں سے ایک آدمی جس کا نام ''عمرو بن الحضرمی'' تھا وہ مسلمانوں کے ہاتھوں مارا گیا۔ اتفاق سے یہ واقعہ جمادی الثانیہ کی ۲۹ تاریخ کی شام کو پیش آیا، لیکن شام کے ایسے وقت میں پیش آیا جب یہ معلوم نہیں تھا کہ آج چاند نظر آیا ہے یا نہیں۔ اگر چاند نظر آگیا تو اگلے دن سے رجب کا مہینہ شروع ہوجانا تھا اور رجب کا مہینہ حرمت والے مہینوں میں داخل تھا۔ مسلمانوں کو پتہ نہیں تھا کہ رجب کا مہینہ شروع ہوا ہے یا نہیں؟ چونکہ یہ جھڑپ راستے میں ہوئی تھی اور وقت بھی شام کا تھا تو اس وجہ سے وہ آدمی اس خیال کے تحت

مارا گیا کہ گویا ابھی حُرمت کا مہینہ، یعنی رجب کا مہینہ شروع نہیں ہوا، لیکن جب وہ شخص قتل ہوگیا تو اس کے بعد اچانک رجب کا چاند نظر آ گیا، جس سے معلوم ہوا کہ رجب کا مہینہ شروع ہو چکا ہے۔ (۱)

اس پر مشرکین نے مسلمانوں کے خلاف ایک طوفان مچادیا کہ یہ لوگ حرمت والے مہینوں کا بھی پاس نہیں کررہے ہیں۔ یہ آیت ان کے اس پروپیگنڈے کے پسِ منظر میں نازل ہوئی، چنانچہ فرمایا: ﴿يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيْهِ﴾ لوگ آپ سے حرمت والے مہینے کے بارے میں پوچھتے ہیں کہ اس میں جنگ کرنا کیسا ہے؟ تو ﴿قُلْ﴾ آپ یہ کہہ دیجیے کہ ﴿قِتَالٌ فِيْهِ كَبِيْرٌ﴾ ''حرمت والے مہینے میں لڑائی کرنا بڑا گناہ ہے،'' لہٰذا یہ تو طے شدہ بات ہے کہ اس میں لڑائی کرنا منع ہے۔

اب اس کے بعد جہاں تک اس شخص کے قتل ہونے کا تعلق ہے، تو اوّل تو مسلمانوں کو معلوم ہی نہیں تھا کہ رجب کا مہینہ شروع ہو چکا ہے یا نہیں؟ یہ قتل غلط فہمی میں ہوا، جان بوجھ کر حرمت والے مہینے میں قتل نہیں کیا گیا۔ نیز صحیح بات یہ ہے کہ بظاہر اس وقت تک ان حرمت والے مہینوں میں قتال کے جائز یا ناجائز ہونے سے متعلق ابھی تک کوئی واضح ہدایت مسلمانوں کے سامنے موجود نہیں تھی، ان مہینوں کی حرمت کے حوالے سے اہلِ عرب میں ایک رواج اور دستور ضرور چلا آرہا تھا کہ وہ ان مہینوں میں باہمی قتل وقتال اور جنگ وجدل کو جائز نہیں سمجھتے تھے، لیکن کیا واقعۃً اللہ تعالیٰ نے اس میں قتال کرنا حرام کردیا تھا؟ یہ بات ابھی واضح نہیں تھی، لہٰذا اوّل تو یہ حکم واضح نہیں ہوا تھا، دوسرے یہ بات بھی واضح نہیں تھی کہ رجب کا مہینہ واقعی شروع ہو چکا ہے یا نہیں؟ اچانک بغیر کسی سابق تیاری کے ایک جھڑپ ہوگئی اور اس لڑائی میں ایک آدمی مارا گیا، تو اس کی وجہ سے مسلمانوں کو مطعون کرنا کہ تم نے حرمت والے مہینے کا پاس نہیں کیا، اول تو یہ بات غلط تھی۔

دوسری بات یہ کہ آگے اللہ تبارک وتعالیٰ ان مشرکین کے بارے میں یہ فرمارہے ہیں کہ تم حرمت والے مہینے کے اندر کسی ایک آدمی کے مارے جانے پر تو اتنا واویلا مچارہے ہو، لیکن اس سے بڑے بڑے بہت ہی سنگین جرائم ہیں جن میں تم خود مبتلا ہو، چنانچہ فرمایا: ﴿وَصَدٌّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ﴾ ''اور اللہ تعالیٰ کے راستے سے لوگوں کو روکنا،'' جیسا کہ مشرکین کرتے تھے ﴿وَكُفْرٌۢ بِهٖ﴾ اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ کفر کی روش اختیار کرنا ﴿وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ﴾ ''اور مسجدِ حرام پر بندش لگانا،'' یعنی مسلمانوں کو مسجدِ حرام میں داخل ہونے سے روکنا،

---

(۱) دیکھیے: تفسیر ابن کثیر (۱/۵۷۳-۵۷۴).

اسی طرح ﴿وَ اِخْرَاجُ اَهْلِهٖ مِنْهُ﴾ ''اور اس کے باشندوں کو وہاں سے نکال باہر کرنا'' جیسا کہ مسلمانوں کو مشرکین نے مکّہ مکرمہ سے اور مسجدِ حرام سے نکالا تھا۔ یہ سارے کے سارے جرائم جو تم کر رہے ہو ﴿اَكْبَرُ عِنْدَ اللّٰهِ﴾ ''یہ اللہ کے نزدیک کہیں زیادہ بڑے اور سنگین گناہ ہیں۔''

﴿وَ الْفِتْنَةُ اَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ﴾ ''اور فتنہ قتل کے مقابلے میں زیادہ سنگین چیز ہے'' یہ جملہ پہلے بھی گزر چکا ہے اور یہاں پھر دہرایا گیا ہے۔ وہاں پر میں نے تشریح میں عرض کیا تھا[1] کہ فتنے کے بہت سے معنیٰ آتے ہیں اور ان میں سے ایک معنیٰ یہ بھی ہیں کہ کسی کو تکلیف پہنچا کر اسے شدید صدمے اور آزمائش میں مبتلا کرنا، جیسا کہ مشرکینِ عرب مسلمانوں کے ساتھ بڑی سختی کے ساتھ پیش آتے تھے اور مسلمانوں کو انہوں نے بہت زیادہ تنگ کیا ہوا تھا، لہٰذا وہ فتنہ بھی مراد ہوسکتا ہے اور اسی طرح اس سے مراد کفر و شرک بھی ہوسکتا ہے، بہرحال! یہ سب عمرو بن الحضرمی کے قتل سے زیادہ سنگین گناہ ہیں۔

اسلام کو چھوڑنے والے کے لیے دنیا و آخرت کا نقصان

اب اللہ تبارک وتعالیٰ روئے سخن مسلمانوں کی طرف کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ﴿وَ لَا يَزَالُوْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ﴾ ''اور یہ کافر تم سے برابر جنگ کرتے ہی رہیں گے'' یہ تمہارا پیچھا نہیں چھوڑیں گے ﴿حَتّٰى يَرُدُّوْكُمْ عَنْ دِيْنِكُمْ اِنِ اسْتَطَاعُوْا﴾ ''یہاں تک کہ اگر ان کا بس چلے تو یہ تمہیں زبردستی جنگ کر کر کے اپنا دین چھوڑنے پر آمادہ کردیں'' لیکن ان شاء اللہ کوئی مسلمان جو ایک مرتبہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے فضل و کرم سے اسلام قبول کرلیتا ہے اور دل و جان سے قبول کرلیتا ہے تو پھر وہ عام طور سے اسلام کو چھوڑ کر جاتا نہیں۔ اگرچہ اللہ تعالیٰ نے ساتھ ساتھ یہ بھی بتا دیا ہے کہ اگر کسی نے ایسا کیا کہ وہ ان کے ڈراوے میں آکر یا ان کی ترغیب اور لالچ میں آکر اپنا دین چھوڑے گا تو اس کا انجام کیا ہوگا؟ چنانچہ فرمایا: ﴿وَ مَنْ يَّرْتَدِدْ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ﴾ اور اگر تم میں سے کوئی شخص اپنا دین چھوڑ دے ﴿فَيَمُتْ وَ هُوَ كَافِرٌ﴾ اور پھر کافر ہونے کی حالت ہی میں مرے ﴿فَاُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ﴾ تو ایسے لوگوں کے اعمال اکارت ہوجائیں گے، ﴿فِي الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ﴾ دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی ﴿وَ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۱۷﴾﴾ ''اور ایسے لوگ دوزخ والے ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔''

---

(۱) دیکھیے پیچھے (سورۃ البقرۃ کی) آیت نمبر: (۱۹۱) کی تشریح

سارے قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ کا یہ خاص اسلوب اور طریقہ ہے کہ جب کبھی کافروں کا یا ان کے برے انجام کا ذکر آتا ہے تو اللہ تعالیٰ ساتھ ہی مومنوں کے اچھے انجام کا ذکر بھی فرماتے ہیں۔ اسی طرح یہاں بھی جہاں ان لوگوں کا ذکر کیا جو مرتد ہوجائیں، تو ساتھ ہی فرمایا: ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ یقین رکھو کہ جو لوگ ایمان لائے ﴿وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا﴾ اور جنہوں نے ہجرت کی ﴿وَجٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ﴾ اور جنہوں نے اللہ کے راستے میں جہاد کیا ﴿اُولٰٓئِكَ يَرْجُوْنَ رَحْمَتَ اللّٰهِ﴾ تو وہ بے شک اللہ کی رحمت کے امیدوار ہیں ﴿وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۲۱۸﴾﴾ ''اور اللہ بہت بخشنے والا بڑا مہربان ہے،'' چنانچہ اللہ تعالیٰ اس غلطی کو معاف فرما دیں گے اور ایمان و ہجرت کی وجہ سے تم پر رحمت کریں گے۔

آیت نمبر ۲۱۹ تا ۲۲۰

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ ۭ قُلْ فِيْهِمَآ اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ ۡ وَاِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا ۭ وَيَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۬ ۭ قُلِ الْعَفْوَ ۭ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ ﴿۲۱۹﴾ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۭ وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْيَتٰمٰى ۭ قُلْ اِصْلَاحٌ لَّهُمْ خَيْرٌ ۭ وَاِنْ تُخَالِطُوْهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ ۭ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ ۭ وَلَوْ شَاۗءَ اللّٰهُ لَاَعْنَتَكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۲۰﴾

لوگ آپ سے شراب اور جوے کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ آپ کہہ دیجیے کہ ان دونوں میں بڑا گناہ بھی ہے، اور لوگوں کے لیے کچھ فائدے بھی ہیں، اور ان دونوں کا گناہ ان کے فائدے سے زیادہ بڑھا ہوا ہے، اور لوگ آپ سے پوچھتے ہیں کہ وہ (اللہ کی خوشنودی کے لیے) کیا خرچ کریں؟ آپ کہہ دیجیے کہ ''جو تمہاری ضرورت سے زائد ہو۔'' اللہ اسی طرح اپنے احکام تمہارے لیے صاف صاف بیان کرتا ہے تاکہ تم غور و فکر سے کام لو۔ ﴿۲۱۹﴾ دنیا کے بارے میں بھی اور آخرت کے بارے میں بھی، اور لوگ آپ سے یتیموں کے بارے میں پوچھتے ہیں، آپ کہہ دیجیے کہ ان کی

بھلائی چاہنا نیک کام ہے، اور اگر تم ان کے ساتھ مل جل کر رہو تو (کچھ حرج نہیں کیونکہ) وہ تمہارے بھائی ہی تو ہیں، اور اللہ خوب جانتا ہے کہ کون معاملات بگاڑنے والا ہے اور کون سنوارنے والا، اور اگر اللہ چاہتا تو تمہیں مشکل میں ڈال دیتا۔ یقیناً اللہ کا اقتدار بھی کامل ہے، حکمت بھی کامل۔ (۲۲۰)

شراب اور جوے کی حرمت کے تدریجی احکام

سورۂ بقرہ میں تقویٰ کے مختلف شعبوں کا ذکر ہورہا ہے، تقویٰ جن چیزوں کا تقاضا کرتا ہے اور جن معاملات میں تقویٰ کا مظاہرہ ہوتا ہے، ان کا ایک ایک کرکے بیان چل رہا ہے اور خاص طور پر ان معاملات کا خصوصی ذکر فرمایا گیا ہے جن کی اُس دور کے معاشرے میں زیادہ ضرورت تھی، اور جن کے بارے میں سوالات بھی کیے جاتے تھے، چنانچہ اسی سلسلے میں ایک سوال نقل کرتے ہوئے فرمایا: ﴿يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ﴾ ''لوگ آپ سے شراب اور جوے کے بارے میں پوچھتے ہیں۔''

یہ آیت ایسے موقع پر نازل ہوئی ہے جب شراب کی بالکل واضح حرمت کا اعلان کرنا ابھی پیشِ نظر نہیں تھا، کیونکہ اہلِ عرب صدیوں سے شراب کے عادی چلے آتے تھے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس کی حرمت کے اعلان میں تدریج سے کام لیا، اس کی پوری تفصیل سورۂ مائدہ کی آیت نمبر ۹۰ اور ۹۱ کے ذیل میں آئے گی۔ ان شاء اللہ

اس آیت میں فی الحال شراب اور جوے کی حرمت کا واضح حکم دینے کے بجائے محض ایک اشارہ دے دیا کہ ان کے نتیجے میں برائیاں اور گناہ زیادہ پیدا ہوتے ہیں، اگرچہ کچھ فوائد بھی ہیں، اس سے ایک سلیم العقل خود یہ سمجھ سکتا تھا کہ انہیں چھوڑنا ہی بہتر ہے، لیکن بالکل دوٹوک الفاظ میں یہ نہیں فرمایا کہ شراب چھوڑ دو۔ بالآخر سورۂ مائدہ کی آیت نمبر ۹۰ اور ۹۱ میں اللہ تعالیٰ نے شراب کو ''ناپاک'' اور ''شیطانی عمل'' قرار دے کر اس سے مکمل پرہیز کرنے کا صاف صاف حکم دے دیا اور اس طرح اسے حرام قرار دے دیا گیا۔

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا شراب اور جوے سے متعلق سوال

اوپر ذکر کردہ تفصیل کے مطابق سورۂ بقرہ کی یہ آیات حرمتِ شراب کے ایک درمیانے عرصے سے متعلق

ہیں اور ان میں جو بات ذکر کی گئی ہے اس کی تفصیل یہ ہے کہ جاہلیت میں بہت سے لوگ شراب اور جوے کو نہ صرف یہ کہ کوئی برائی کا کام نہیں سمجھتے تھے بلکہ اسے وہ ایک لحاظ سے اچھا ہی سمجھتے تھے اور اس کی وجہ یہ تھی کہ قحط کے زمانے میں جبکہ غریب لوگ روٹی کو ترس رہے ہوتے تھے، بعض اوقات وہ کچھ ایسی محفلیں منعقد کرتے تھے جن میں شرابیں پی جاتی تھیں اور اونٹ ذبح کیے جاتے تھے۔ پھر اس اونٹ کے گوشت میں جُوا کھیلا جاتا تھا اور اس کے نتیجے میں جو گوشت کسی کو حاصل ہوتا، وہ گوشت غریبوں میں تقسیم کر دیتا تھا۔

ان کی اس محفل میں شراب بھی پی جارہی ہوتی تھی، اور جوے کے ذریعے گوشت بھی تقسیم کیا جارہا ہوتا تھا۔ چونکہ جتنا گوشت جوے میں جیتا جاتا، اُسے غریبوں میں تقسیم کیا جاتا تھا، اس لیے اس سے غریبوں کو کچھ فائدہ بھی پہنچتا تھا کہ غریب لوگ قحط کے زمانے میں ان کی تقریبات کے نتیجے میں کچھ گوشت وغیرہ حاصل کرلیتے تھے، تاہم یہ سارا کام شراب اور جوے کی محفلیں منعقد کر کے کیا جاتا۔ اب اس موقع پر صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے دلوں میں یہ خیال پیدا ہورہا تھا کہ ایک طرف تو قرآنِ کریم کی طرف سے کچھ اشارے ایسے آرہے ہیں کہ یہ شراب کوئی اچھی چیز نہیں ہے، اور دوسری طرف یہ لوگ شراب اور جوے سے غریبوں کی مدد کا ایک مفید کام لیتے ہیں۔

اس پسِ منظر میں حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا گیا، اللہ تعالیٰ اس سوال کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ﴿يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَ الْمَيْسِرِ﴾ لوگ آپ سے شراب اور جوے کے بارے میں پوچھتے ہیں ﴿قُلْ﴾ آپ جواب میں کہہ دیجیے کہ ﴿فِيْهِمَآ اِثْمٌ كَبِيْرٌ﴾ ان دونوں میں بڑا گناہ بھی ہے ﴿وَّ مَنَافِعُ لِلنَّاسِ﴾ ''اور لوگوں کے لیے کچھ فوائد بھی ہیں،'' لیکن ساتھ ہی یہ فرمادیا کہ ﴿وَ اِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا﴾ ''کہ ان کا گناہ ان کے نفع سے زیادہ ہے۔''

''اثم'' کے لفظی معنیٰ گناہ کے ہیں، لیکن اگر یہ کہا جاتا کہ ''هما اثمان'' یعنی یہ دونوں کام گناہ ہیں، تو شراب کا براہِ راست گناہ ہونا طے ہوجاتا، لیکن اس کے بجائے ﴿فِيْهِمَآ اِثْمٌ كَبِيْرٌ﴾ فرمایا گیا جس کے معنیٰ یہ ہیں کہ ''ان دونوں میں بڑا گناہ ہے۔'' مطلب یہ ہے کہ (اگرچہ فی الحال یہ خود گناہ نہ ہوں) لیکن ان کے نتیجے میں بڑے گناہ ہوسکتے ہیں، مثلاً انسان نشے کی حالت میں کسی پر بلا وجہ حملہ بھی کرسکتا ہے، اس کا مال بھی چرا سکتا ہے، فحش باتیں اور فحش کام بھی کرسکتا ہے۔ اسی طرح جوے کے نتیجے میں دشمنیاں پیدا ہوجاتی ہیں، لڑائیاں ہوسکتی ہیں، انسان جوے کے شوق میں اپنے گھر کا سارا سامان لُٹا کر بیوی بچوں کے حقوق ضائع کرسکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے شراب اور جوے کے ان نقصانات کا تو ذکر فرمایا، لیکن براہِ راست اُسے حرام یا گناہ نہیں کہا۔ اس سے دو فائدے حاصل ہوئے؛ ایک یہ کہ اس کے برے نتائج لوگوں کے سامنے آگئے اور اس کے جو فائدے بیان کیے جارہے تھے کہ اس کے ذریعے ہم غریبوں کی مدد کر رہے ہیں، یہ بتادیا گیا کہ تھوڑے بہت فائدے تو ہر چیز میں ہوتے ہیں، ان میں بھی ہیں، لیکن ان کے ذریعے جن گناہوں میں مبتلا ہونے کا اندیشہ ہے، وہ نقصانات میں کہیں زیادہ ہیں۔ اس طرح اس آیت سے بہت سے صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین تو اُسی وقت سمجھ گئے کہ شراب کو اللہ تعالیٰ نے بہت سے گناہوں کا ذریعہ قرار دے دیا ہے، اس لیے اس سے پرہیز ہی کرنا چاہیے، چنانچہ انہوں نے اسی وقت شراب چھوڑ دی، اگرچہ باقاعدہ حرمت کا حکم ابھی نہیں آیا تھا۔ اور دوسرا فائدہ یہ حاصل ہوا کہ ان آیات میں یہ اصول بھی بتادیا گیا کہ وہ چیز جس کے نقصانات زیادہ ہوں، اگرچہ اس میں کچھ فوائد بھی ہوں تو اس سے پرہیز ہی کرنا چاہیے۔

خیراتی کاموں کے لیے گانے بجانے کی محفلیں سجانا

اہلِ عرب غریبوں کے فائدے کے لیے شراب اور جوے کی جو محفلیں سجاتے تھے، یہ کچھ اسی قسم کی بات ہے جیسے آج کل ہمارے معاشرے میں غریبوں کی امداد کے لیے رقص و سرود کی محفلیں منعقد کی جاتی ہیں، یا سینما کے شو منعقد کیے جاتے ہیں، تاکہ لوگ آکر دیکھیں اور پیسے دیں، پھر ان پیسوں کے ذریعے کسی غریب کی مدد کی جائے اور کسی مصیبت زدہ کی فریاد رسی کی جائے۔ قرآنِ کریم کے اس بیان سے یہ پتہ چل رہا ہے کہ اس طرح کرنا کوئی نیک کام نہیں ہے۔

اگر آدمی کوئی گناہ یا ناجائز کام اس مقصد سے کرے، تاکہ اس کے ذریعے کوئی پیسے حاصل ہوں اور پیسوں کو کسی مصرفِ خیر میں خرچ کیا جائے، تو یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے اور قرآنِ کریم نے اس کی مذمت فرمائی ہے۔ یہ کون سی نیکی ہے کہ غریبوں کی امداد کے لیے ناچنے گانے کے پروگرام منعقد کیے جائیں جن میں لوگ ناجائز لذت حاصل کرنے کے لیے آئیں اور جب تک انہیں ان کی مرضی کی لذت فراہم نہ کی جائے، وہ غریبوں کی مدد کے لیے تیار نہ ہوں؟

خرچ کرنے کی مقدار سے متعلق رہنمائی

اس کے بعد لوگوں کا ایک دوسرا سوال مذکور ہے: ﴿وَ يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ﴾ ''اور لوگ آپ سے

پوچھتے ہیں کہ کیا خرچ کریں؟'' یعنی اللہ کے راستے میں کیا خرچ کریں؟ جہاں ایک طرف جوے کی برائی بیان فرمائی گئی، وہیں اس سے متصل انفاق فی سبیل اللہ کی بات کی گئی، جس سے بتانا یہ مقصود ہے کہ جوا تو فضول خرچی، اسراف اور پیسے اڑانے کا ایک شیطانی عمل ہے جبکہ اس کے برعکس اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کرنا، اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر کسی غریب کی مدد کرنا، کوئی صدقۂ جاریہ پیدا کردینا، کوئی شفا خانہ بنادینا، کوئی مدرسہ بنادینا، کوئی مسجد بنادینا، یہ سارے بھلائی کے کام اللہ تعالیٰ کو پسند ہیں۔

یہاں پر ﴿وَ يَسْـَٔلُوْنَكَ مَا ذَا يُنْفِقُوْنَ﴾ کے ذریعے لوگوں کے ذہنوں میں جو ایک تردّد تھا وہ دور فرمادیا۔ حافظ ابن جریر طبری رحمہ اللہ نے اس آیت کی تفسیر میں مختلف روایتیں نقل کی ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ بعض لوگ جب قرآنِ کریم کے اندر انفاق کی فضیلت پڑھتے تھے اور یہ سنتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کے راستے میں مال خرچ کرنا بڑا ثواب کا کام ہے اور آدمی ایک پیسہ بھی خرچ کرے تو اس کا اجر سات سو گنا زیادہ ملتا ہے، اور یہ بھی فرمایا گیا تھا کہ جب تک تم اپنی محبوب چیزیں اللہ کے راستے میں خرچ نہیں کروگے، اس وقت تک نیکی کا اعلیٰ درجہ تمہیں حاصل نہیں ہوسکتا، جیسا کہ آگے آنے والا ہے، تو یہ احکام سننے کے نتیجے میں بہت سے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین نے یہ کیا کہ اپنے گھر کا سارا ساز وسامان اور جو کچھ نقدی، کپڑے یا سامان تھا وہ سارے کا سارا صدقہ کردیا، نتیجہ یہ ہوا کہ اس صدقہ کرنے کے بعد خود انہیں اور ان کے بیوی بچوں کو فاقہ کشی کی نوبت آگئی، انہوں نے یہ نہ دیکھا کہ ہمیں اپنے بیوی بچوں کا خرچ پہلے نکالنا چاہیے، تاکہ ان کا حق پہلے ادا ہوجائے، پھر دوسرے لوگوں کا خیال کیا جائے۔ اس طرف توجہ دیے بغیر انہوں نے اس طرح خرچ کرلیا تھا، تو اس کے جواب میں یہ آیتِ کریمہ نازل ہوئی۔

خرچ کرنے کے معاملے میں شرعی حدود

﴿وَ يَسْـَٔلُوْنَكَ مَا ذَا يُنْفِقُوْنَ﴾ اور لوگ آپ سے پوچھتے ہیں کہ وہ کیا خرچ کریں؟ تو ﴿قُلِ الْعَفْوَ﴾ ''آپ کہہ دیجیے کہ جو ضرورت سے زائد ہو وہ خرچ کرو۔'' ''العفو'' کے معنیٰ ہیں ''جو ضرورت سے زیادہ ہو،'' یعنی خرچ کرنے کی ایک آخری حد بتادی گئی کہ ٹھیک ہے اللہ تعالیٰ کے راستے میں مال خرچ کرنا بڑے ثواب کا کام ہے، لیکن یہ اس وقت تک ہے جب تک اس سے کسی کا واجب حق پامال نہ ہو۔ بیوی بچوں کا انسان کے ذمے واجب حق ہے۔ اگر انہیں تو فاقے سے مار دیا، اور دوسرے غریبوں کو کھلا دیا تو یہ کوئی نیکی کا

کام نہیں ہے۔ (۱) لہٰذا فرمایا کہ جو ضرورت سے زائد ہو وہ اللہ کے راستے میں خرچ کرو۔ ضرورت سے زائد ہونے کا مطلب یہی ہے کہ اپنے اور اپنے بیوی بچوں کی ضرورت سے جو فاضل ہو اس میں سے جتنا چاہو خرچ کرو، لیکن اتنا خرچ کرنا جس سے اپنی ضرورت کا پیسہ بھی باقی نہ رہے تو یہ جائز نہیں ہے، کیونکہ اس میں بیوی بچوں کی حق تلفی ہے۔

یہاں یہ بات سمجھ لینے کی ہے کہ بعض لوگ اس کا مطلب یہ سمجھتے ہیں کہ انسان کی ضرورت سے زائد جو کچھ ہو وہ سارے کا سارا خرچ کرنا لازمی بلکہ فرض ہے، جس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر وہ سارا خرچ نہ کریں تو گناہ گار ہوں گے۔ یہ نقطۂ نظر بھی درست نہیں ہے، اس لیے کہ پیچھے حافظ ابن جریر طبری کی روایت کے حوالے سے جو پسِ منظر بیان کیا گیا، اس سے معلوم ہو رہا ہے کہ صورتِ حال یہ نہیں تھی کہ لوگ خرچ نہیں کر رہے تھے اور انہیں یہ کہا جا رہا ہے کہ تم ضرورت سے زائد سارا مال خرچ کرو، بلکہ صورتِ حال یہ تھی کہ لوگ خرچ کر رہے تھے، اور حد سے زیادہ کر رہے تھے، تو انہیں حد کا پابند بنایا گیا ہے کہ ضرورت سے زائد جو کچھ ہو، وہ بے شک خرچ کرو جتنا چاہو کرو، لیکن ضرورت کی مقدار کو اپنے پاس رکھنا ضروری ہے، چنانچہ حدیث میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

خَيْرُ الصَّدَقَةِ مَا كَانَ عَنْ ظَهْرِ غِنًى (۲)

بہترین صدقہ وہ ہے جو اپنے پیچھے بھی غنا چھوڑ کر جائے۔

یعنی صدقہ کرنے کے بعد بھی آدمی دوسروں کا اس طرح محتاج نہ ہو کہ ان کا دست نگر بن جائے، بلکہ اللہ کے راستے میں خرچ کرنے کے باوجود خود انسان اپنی ضروریات کو پورا کرسکتا ہو، ایسا صدقہ ہی بہترین صدقہ ہے۔

پھر یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ اس میں صرف زکوٰۃ ادا کرنے کا حکم نہیں ہے، وہ توکّل ڈھائی فی صد ہوتی

---

(۱) بعض صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے جو مروی ہے کہ بعض مواقع پر انہوں نے اپنا سارا مال لاکر حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کردیا جیسا کہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے غزوۂ تبوک کے موقع پر کیا، تو اس میں صورتِ حال یہ تھی کہ ان کے تمام گھر والے اس ایثار پر راضی تھے اور اس کے نتیجے میں اگر معاشی تنگی کا سامنا کرنا پڑتا تو اُسے بھی خوشی سے برداشت کرنے کے لئے تیار تھے، یہ ایک استثنائی صورت ہے جو بہت افضل ہے، لیکن ہر مسلمان اس کا مکلّف نہیں ہے۔ (محمد تقی عثمانی)

(۲) صحيح البخاري (۲/۱۱۲) (۱٤۲٦) كتاب الزكاة، باب لا صدقة إلا عن ظهر غنى.

ہے، بلکہ اس حکم کے ذریعے اس بات کی ترغیب دینا بھی مقصود ہے کہ اگرچہ زکوۃ ادا کرنے کے بعد باقی مال تمہارے لیے حلال ہوجاتا ہے، لیکن اگر وہ تمہاری اور تمہارے بیوی بچوں کی ضرورت سے زیادہ ہے، تو اُسے بھی کسی کارِ خیر میں خرچ کرتے رہو، تاکہ تمہارے لیے آخرت کا ذخیرہ بنتا رہے اور ایسا نہ کرو کہ زکوۃ ادا کرنے کے بعد یہ طے کرکے بیٹھ جاؤ کہ فرض تو ادا کر ہی دیا ہے، اس کے بعد میں اللہ تعالیٰ کے راستے میں کچھ اور خرچ نہیں کروں گا۔

﴿كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ﴾ اسی طرح اللہ تعالیٰ تمہارے لیے نشانیاں بیان کرتا ہے ﴿لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ ﴿٢١٩﴾﴾ ”تاکہ تم غور کرو۔“ کن معاملات میں غور کرو؟ ﴿فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ﴾ ”دنیا کے معاملے میں بھی اور آخرت کے معاملے میں بھی،“ یعنی اللہ تعالیٰ اس طرح اپنے احکام کو صاف صاف بیان کرتا ہے تاکہ تمہیں اس کا علم ہوجائے اور اس علم کی وجہ سے ہر عمل کرنے سے پہلے دنیا و آخرت کے معاملات میں ان احکام کو سوچ لیا کرو اور پھر ان احکام کے مطابق عمل کیا کرو۔

یتیموں کے اموال میں احتیاط کا حکم

اس کے بعد ایک تیسرا سوال اللہ تعالیٰ نے یہاں یہ ذکر فرمایا ہے کہ ﴿وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْيَتٰمٰى﴾ اور بہت سے لوگ آپ سے یتیموں کے بارے میں پوچھتے ہیں؟ تو ﴿قُلْ اِصْلَاحٌ لَّهُمْ خَيْرٌ﴾ ”آپ کہہ دیجیے کہ ان کی بھلائی چاہنا نیک کام ہے۔“

ان آیات کا پسِ منظر یہ ہے کہ ابتداء میں عرب میں یتیموں کا حق دینے میں پوری احتیاط نہ کی جاتی تھی، اس لیے قرآنِ کریم نے سورۂ نساء کے آغاز میں (۱) یتیموں کا مال کھانے پر بڑی سخت وعید سنائی تھی جس کے الفاظ یہ ہیں کہ ”جو لوگ یتیموں کا مال ناحق کھاتے ہیں وہ اپنے پیٹ میں آگ بھر رہے ہیں۔“ اسی سورت میں بتایا گیا کہ جن لوگوں کی پرورش میں کچھ یتیم بچے ہوں اور ان کا کچھ مال بھی ہو، جو انہیں اپنے باپ وغیرہ سے میراث میں ملا ہو، تو اس مال کو بہت احتیاط کے ساتھ خرچ کرنا چاہیے۔

جب یہ وعید نازل ہوئی، تو صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین اس وعید کے نتیجے میں بہت تشویش میں مبتلا ہوگئے اور بعض

---

(۱) ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْيَتٰمٰى ظُلْمًا اِنَّمَا يَاْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا ۭ وَسَيَصْلَوْنَ سَعِيْرًا﴾ [النساء: ۱۰]

صحابہ جن کی سرپرستی میں کچھ یتیم تھے وہ اتنی احتیاط کرنے لگے کہ ان کا کھانا الگ پکواتے، انہیں الگ ہی کھلاتے، یہاں تک کہ اگر ان کا کچھ کھانا بچ جاتا تو وہ سڑ جایا کرتا تھا، کیونکہ اس کا استعمال نہ ان کے لیے جائز تھا اور نہ انہیں یتیم کے مال کو صدقہ کرنے کا اختیار تھا۔ اس ساری مشقت میں تکلیف بھی تھی اور نقصان بھی تھا۔

اس لیے آپ ﷺ سے جب صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا تو اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہ بات واضح فرمادی کہ اصل مقصد یہ ہے کہ یتیموں کی مصلحت کا پورا خیال رکھا جائے، سرپرستوں کو مشکل میں ڈالنا مقصد نہیں ہے، لہٰذا ان کا کھانا ساتھ پکانے اور ساتھ کھلانے میں کوئی حرج نہیں، بشرطیکہ معقولیت اور انصاف کے ساتھ ان کے مال سے ان کے کھانے کا خرچ وصول کیا جائے۔ اس کے بعد بھی اگر غیر ارادی طور پر کچھ کمی بیشی ہو جائے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے معاف ہے، ہاں! جان بوجھ کر انہیں نقصان نہ پہنچایا جائے۔ اب رہی یہ بات کہ کون سی چیز انصاف ہے اور کون سی نا انصافی پر مشتمل ہے؟ کون اصلاح سے کام لے رہا ہے اور کس کی نیت خراب ہے؟ تو یہ سب اللہ تبارک وتعالیٰ ہی خوب جانتے ہیں، یہی بات اس آیت میں بیان فرمائی گئی ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ لوگ آپ سے یتیموں کے بارے میں سوال کرتے ہیں تو ﴿قُلْ اِصْلَاحٌ لَّهُمْ خَيْرٌ﴾ آپ کہہ دیجیے کہ ان کی بھلائی چاہنا ایک نیک کام ہے۔ ﴿وَاِنْ تُخَالِطُوْهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ﴾ ''اور اگر تم ان کے ساتھ مل جل کر رہو تو آخر وہ تمہارے بھائی ہی تو ہیں۔'' یہ اس شبہے کی تردید فرمادی یا اس طرزِ عمل کے بارے میں بات واضح فرمادی، جس کا ابھی ذکر کیا گیا کہ بہت سے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم یتیموں کے معاملے میں احتیاط کی خاطر ان کا کھانا الگ پکواتے تھے اور خود بھی ان کے ساتھ نہیں کھاتے تھے۔ اس بارے میں کہا کہ اس تکلّف کی ضرورت نہیں ہے، اگر تم ان کے ساتھ مل جل کر رہو تو کچھ حرج نہیں وہ تمہارے بھائی ہی تو ہیں۔

یتیموں کا کھانا اپنے ساتھ پکانے اور ساتھ کھلانے کی اجازت دینے کے ساتھ ساتھ یہ بھی بتا دیا کہ کوئی شخص اسے ان کی حق تلفی کا بہانہ نہ بنائے، اس لیے کہ اگر کوئی شخص یہ چاہے گا کہ میں یتیموں کے مال میں تصرّف کروں اور اس سے خود فائدہ اٹھاؤں تو یہ اللہ تعالیٰ کو خوب معلوم ہو جائے گا۔ ﴿وَاللّٰهُ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ﴾ اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے کہ کون معاملات بگاڑنے والا ہے اور کون سنوارنے والا ہے ﴿وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَاَعْنَتَكُمْ﴾ ''اور اگر اللہ چاہتا تو تمہیں مشکل میں ڈال دیتا۔'' مطلب یہ کہ جس طرح کا طرزِ عمل تم

نے اختیار کیا ہے، اس کا ہماری طرف سے باقاعدہ حکم نہیں آیا تھا، اگر اللہ تبارک وتعالیٰ چاہتے تو یہ حکم دے بھی دیتے کہ یتیموں کا کھانا الگ پکواؤ، کھانا ان کے ساتھ مت کھاؤ، انہیں ساتھ شریک بھی نہ رکھو، کہیں ایسا نہ ہو کہ ان کے کھانے کا کوئی حبہ (ذرہ) بھی تمہارے حلق میں چلا جائے، تو اگر اس قسم کے احکام آتے تو تم مشکل میں پڑ جاتے، لیکن اللہ تبارک وتعالیٰ تمہیں مشکل میں ڈالنا نہیں چاہتے، لہٰذا جس طرح کی تمہیں چھوٹ دی گئی ہے اسے انصاف کے ساتھ اور احتیاط کے ساتھ استعمال کرلو اور ان کے ساتھ کھانا کھانے میں کوئی مضائقہ نہیں۔

آیت کے آخر میں فرمایا: ﴿اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿٢٢٠﴾﴾ ”یقیناً اللہ کا اقتدار بھی کامل ہے، حکمت بھی کامل ہے،“ یعنی اللہ تعالیٰ کا اقتدار بڑا ہے، وہ جو چاہے حکم دے سکتا ہے، جو چاہے کرسکتا ہے، لیکن اپنی حکمت کے تحت وہ وہی حکم دیتا ہے جو بندوں کی مصلحت کے مطابق ہو اور ان کے لیے ناقابلِ برداشت تکلیف کا سبب نہ بنے، اسی لیے اس نے یتیموں کے مال سے متعلق آسان قانون بنا دیا۔

آیت نمبر ۲۲۱ تا ۲۲۳

وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ ۭ وَلَاَمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكَةٍ وَّ
لَوْ اَعْجَبَتْكُمْ ۚ وَلَا تُنْكِحُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَتّٰى يُؤْمِنُوْا ۭ وَلَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ خَيْرٌ
مِّنْ مُّشْرِكٍ وَّلَوْ اَعْجَبَكُمْ ۭ اُولٰۗىِٕكَ يَدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ ۚ وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلَى
الْجَنَّةِ وَالْمَغْفِرَةِ بِاِذْنِهٖ ۚ وَيُبَيِّنُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ﴿٢٢١﴾ ع ۲۷ ۵ ۱۱
وَيَسْـَٔـلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِيْضِ ۭ قُلْ هُوَ اَذًى ۙ فَاعْتَزِلُوا النِّسَاۗءَ فِي الْمَحِيْضِ ۙ
وَلَا تَقْرَبُوْهُنَّ حَتّٰى يَطْهُرْنَ ۚ فَاِذَا تَطَهَّرْنَ فَاْتُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ اَمَرَكُمُ
اللّٰهُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ ﴿٢٢٢﴾ نِسَاۗؤُكُمْ حَرْثٌ
لَّكُمْ ۠ فَاْتُوْا حَرْثَكُمْ اَنّٰى شِئْتُمْ ۡ وَقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ ۭ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ

اعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ مُّلٰقُوْهُ ۭ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝۲۲۳

اور مشرک عورتوں سے اس وقت تک نکاح نہ کرو جب تک وہ ایمان نہ لے آئیں۔ یقیناً ایک مومن باندی کسی بھی مشرک عورت سے بہتر ہے، خواہ وہ مشرک عورت تمہیں پسند آرہی ہو، اور اپنی عورتوں کا نکاح مشرک مردوں سے نہ کراؤ جب تک وہ ایمان نہ لے آئیں اور یقیناً ایک مومن غلام کسی بھی مشرک مرد سے بہتر ہے، خواہ وہ مشرک مرد تمہیں پسند آرہا ہو۔ یہ سب دوزخ کی طرف بلاتے ہیں جبکہ اللہ اپنے حکم سے جنت اور مغفرت کی طرف بلاتا ہے، اور اپنے احکام لوگوں کے سامنے صاف صاف بیان کرتا ہے، تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں۔ (۲۲۱) اور لوگ آپ سے حیض کے بارے میں پوچھتے ہیں، آپ کہہ دیجیے کہ وہ گندگی ہے، لہٰذا حیض کی حالت میں عورتوں سے الگ رہو، اور جب تک وہ پاک نہ ہوجائیں ان سے قربت (یعنی جماع) نہ کرو، ہاں جب وہ پاک ہوجائیں تو ان کے پاس اسی طریقے سے جاؤ جس طرح اللہ نے تمہیں حکم دیا ہے، بے شک اللہ ان لوگوں سے محبت کرتا ہے جو اس کی طرف کثرت سے رجوع کریں اور ان سے محبت کرتا ہے جو خوب پاک صاف رہیں۔ (۲۲۲) تمہاری بیویاں تمہارے لیے کھتیاں ہیں؛ لہٰذا اپنی کھیتی میں جہاں سے چاہو جاؤ، اور اپنے لیے (اچھے عمل) آگے بھیجو، اللہ سے ڈرتے رہو، اور یقین رکھو کہ تم اس سے جاکر ملنے والے ہو، اور مؤمنوں کو خوشخبری سنا دو۔ (۲۲۳)

مشرک عورتوں سے نکاح کی ممانعت

تقویٰ کے مختلف شعبوں کا جو بیان چل رہا ہے، اسی سلسلے میں ان آیات میں اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے انسان کی گھریلو زندگی سے متعلق کچھ احکام اور اہم ہدایات عطا فرمائی گئی ہیں۔ یہاں سب سے پہلے جو حکم دیا گیا ہے، وہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے لیے کسی مشرک عورت سے نکاح کرنا ناجائز ہے۔ اگرچہ اہلِ کتاب یعنی عیسائی اور یہودی خواتین سے نکاح کی فی الجملہ اجازت ہے، جس کی تفصیل ان شاء اللہ تعالیٰ آگے سورۂ مائدہ میں اپنے موقع پر آئے گی، لیکن یہاں مشرکین سے مراد وہ لوگ ہیں جو اہلِ کتاب نہ ہوں، چاہے

وہ بت پرست، بدھ مت یا ہندو مذہب کے پیرو ہوں یا مجوسی اور آتش پرست ہوں، ان کی خواتین سے نکاح کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان آیات میں ناجائز قرار دیا۔

ان آیات کا ایک شانِ نزول بھی بعض تفسیروں (۱) میں بیان ہوا ہے اور وہ یہ کہ ایک صحابی جن کا نام مرثد بن ابی مرثد رضی اللہ عنہ، جاہلیت کے زمانے میں ان کے ایک عورت سے تعلقات تھے، جس کا نام عناق تھا اور جیسا کہ جاہلیت کے زمانے میں بغیر نکاح کے ایک دوسرے کے ساتھ رہنے، ایک دوسرے سے ملنے جلنے اور محبت کا تعلق قائم رکھنے کا دستور عام تھا اور اس کو برا نہیں سمجھا جاتا تھا، چنانچہ اسی رواج کے تحت ان کے تعلقات عناق کے ساتھ چلے آتے تھے۔

اللہ تعالیٰ نے جب ان کو اسلام لانے کی توفیق عطا فرمائی، تو ایک مرتبہ کہیں جاتے ہوئے راستے میں اسی عورت سے ان کی ملاقات ہوگئی۔ عناق نے اپنے سابق رویّہ کے مطابق انہیں تنہائی کی دعوت دی، تو حضرت مرثد رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میں اب مسلمان ہوچکا ہوں، اب میں اس گناہ کے کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں، اس پر عناق نے پیش کش کی کہ اگر تم بغیر نکاح کے میرے ساتھ یہ تعلقات قائم نہیں کرنا چاہتے، تو مجھ سے نکاح کر لو، اس پر حضرت مرثد رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں اس وقت تک نکاح نہیں کرسکتا جب تک میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھ نہ لوں، کیونکہ مجھے معلوم نہیں کہ کسی غیر مسلم خاتون سے نکاح کرنا میرے لیے شرعاً جائز ہے یا نہیں؟ یہ بات کہہ کر وہ نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو اسی موقع پر یہ آیاتِ کریمہ نازل ہوئیں۔ (۲)

اصل معیارِ شرافت ایمان وتوحید ہے

﴿وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ﴾ ''اور مشرک عورتوں سے اس وقت تک نکاح نہ کرو جب تک وہ ایمان نہ لے آئیں،'' یہ حکم دینے کے بعد پھر ایک اصول کے طور پر یہ بات ارشاد فرمادی کہ ﴿وَلَاَمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكَةٍ﴾ ''اور یقیناً ایک مومن باندی یا کنیز کسی بھی مشرک عورت سے بہتر ہے۔'' عام طور پر آزاد عورت کو باندی پر فوقیت اور فضیلت دی جاتی ہے، لیکن اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ کسی شخص کی

---

(۱) دیکھیے: تفسير الطبري = جامع البيان (۹۷/۱۹).

(۲) أخرجه الترمذي (۳۲۹/۵) (۳۱۷۷) أبواب تفسير القرآن عن رسول الله ﷺ، باب: ومن سورة النور، وقال: "هذا حديث حسن غريب لا نعرفه إلا من هذا الوجه". وأبو داود (۲۲۱/۲) (۲۰۵۱) كتاب النكاح، باب في قوله تعالى ﴿اَلزَّانِيْ لَا يَنْكِحُ اِلَّا زَانِيَةً﴾.

فضیلت یا اس کی بڑائی کا اصل معیار، اس کا آزاد اور غلام ہونا نہیں ہے، بلکہ اصل معیار یہ ہے کہ وہ اللہ اور اس کی توحید پر ایمان رکھتا ہے یا نہیں؟

اگر کوئی مسلمان باندی ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کی توحید پر ایمان رکھتی ہے، تو وہ یقیناً کسی بھی اس مشرک عورت سے بہتر ہے جو اللہ تبارک و تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہراتی ہے یا بت پرستی کرتی ہے۔ ﴿وَّ لَوْ اَعْجَبَتْكُمْ﴾ ''اگرچہ وہ مشرک عورت تمہیں پسند آرہی ہو'' یعنی حسن و جمال اور مال و منال کے لحاظ سے تمہیں اچھی لگ رہی ہو، اس کا رویّہ بھی اچھا معلوم ہورہا ہو، لیکن جب تک وہ ایمان نہیں لے آتی، اس وقت تک وہ تمہارے نکاح میں آنے کے قابل نہیں اور اس وقت تک مسلمان کنیز ہی اس سے بہتر ہے، لہٰذا بغیر اسلام قبول کیے کسی بھی مشرکہ سے تمہارا نکاح جائز نہیں۔

مشرک مردوں سے مسلمان عورتوں کا نکاح جائز نہیں

جس طرح مسلمان مردوں کو مشرک عورتوں سے نکاح کرنے سے منع کیا گیا، اسی طرح مسلمان عورتوں کے مشرک مردوں سے نکاح کے بارے میں فرمایا گیا کہ ﴿وَ لَا تُنْكِحُوا الْمُشْرِكِيْنَ﴾ اور اپنی عورتوں کا نکاح مشرک مردوں سے نہ کراؤ ﴿حَتّٰى يُؤْمِنُوْا﴾ ''جب تک وہ ایمان نہ لے آئیں۔'' مطلب یہی ہے کہ کسی مومن عورت کا نکاح کسی غیر مسلم مرد سے جائز نہیں ہے۔ یہاں اہلِ کتاب اور غیر اہلِ کتاب میں بھی کوئی فرق نہیں، لہٰذا عیسائی ہو یا یہودی، بت پرست ہو یا آتش پرست، ایک مسلمان عورت کا کسی بھی غیر مسلم سے نکاح جائز نہیں ہے، اِلّا یہ کہ وہ ایمان لاکر اسلام میں داخل ہوجائے۔ ﴿وَ لَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكٍ﴾ اور ایک مومن غلام یقیناً کسی بھی مشرک مرد سے بہتر ہے ﴿وَّ لَوْ اَعْجَبَكُمْ﴾ ''خواہ وہ مشرک مرد تمہیں پسند آرہا ہو'' یعنی غیر مسلم مرد خواہ کتنا ہی اچھا لگے، لیکن اس سے نکاح نہیں ہوسکتا اور اس کے مقابلے میں مسلمان مرد ہی بہتر ہے، اگرچہ وہ غلام ہی کیوں نہ ہو۔

خواتین کا نکاح اولیاء ہی کے ذریعے بہتر ہونے کا اشارہ

یہاں پر ﴿وَ لَا تُنْكِحُوا الْمُشْرِكِيْنَ﴾ یعنی ''اپنی عورتوں کا نکاح مشرک مردوں سے نہ کراؤ'' میں ایک اہم اور غور طلب پہلو یہ ہے کہ پہلے جب مردوں سے متعلق حکم بیان کرنا مقصود تھا تو اللہ تعالیٰ نے مردوں سے

براہِ راست یہ فرمایا کہ ''تم مشرک عورتوں سے نکاح نہ کرو،'' اسی طرح اب جب عورتوں سے متعلق حکم بیان کیا جارہا ہے تو سابقہ ترتیب کا تقاضا تو یہی تھا کہ عورتوں سے کہا جاتا کہ ''اے عورتو! تم مشرک مردوں سے نکاح نہ کرو۔''

لیکن یہاں پر اللہ تبارک وتعالیٰ نے پیرایۂ بیان بدل کر عورتوں سے براہِ راست خطاب کرنے کے بجائے عورتوں کے اولیاء اور سرپرستوں سے خطاب کیا اور فرمایا: ﴿وَ لَا تُنْكِحُوا الْمُشْرِكِيْنَ﴾ ''اور تم اپنی عورتوں کا نکاح مشرک مردوں سے نہ کراؤ۔'' اس میں اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ خواتین کی حرمت اور ان کی حیا کا تقاضا یہ ہے کہ وہ اپنا نکاح خود کرنے کے بجائے اپنے اولیاء کے ذریعے کرائیں، اگرچہ غیر معمولی حالات اور مستثنیات تو ہر جگہ ہوتے ہیں، تاہم عام حالات میں عورت کو بغیر ولی کے خود اپنا نکاح کرنے کا اقدام نہیں کرنا چاہیے۔

کفر کی طرف دعوت حقیقت میں آگ کی دعوت ہے

مشرکین سے نکاح کے ممنوع ہونے کا سبب بیان کرتے ہوئے فرمایا: ﴿اُولٰٓئِكَ يَدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ﴾ ''یہ سب دوزخ کی طرف بلاتے ہیں،'' یعنی جو بت پرست اور مشرک ہیں، وہ دوسروں کو بھی شرک کی دعوت دیتے ہیں، اور یہ درحقیقت دوزخ کی طرف ہی بلانا ہوا اور ﴿وَ اللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلَى الْجَنَّةِ وَ الْمَغْفِرَةِ بِاِذْنِهٖ﴾ ''جبکہ اللہ اپنے حکم سے جنت اور مغفرت کی طرف بلاتا ہے،'' اور وہ یہ دعوت دیتا ہے کہ تم ایسے کام کرو جس سے تمہیں جنت حاصل ہو۔ پھر فرمایا کہ ﴿وَ يُبَيِّنُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ﴾ اور اللہ تعالیٰ اپنے احکام لوگوں کے سامنے صاف صاف بیان کرتا ہے، ﴿لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ﴿۲۲۱﴾﴾ ''تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں'' اور جنت کے مستحق بن سکیں۔

نکاح میں دینداری ہی کو ترجیح دینی چاہیے

مذکورہ بالا آیاتِ مبارکہ سے یہ بات بھی واضح ہوگئی کہ نکاح کے معاملے میں دینداری کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ جس طرح مشرکوں سے نکاح جائز نہیں، اسی طرح مسلمانوں کے درمیان نکاح میں بھی دینداری کو ترجیح دینی چاہیے۔ اس بات کو ایک حدیث میں نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے واضح کرتے ہوئے فرمایا کہ:

''کسی عورت سے چار چیزوں کی وجہ سے نکاح کیا جاتا ہے: اس کے مال کی وجہ سے،

اس کے حسب نسب کی وجہ سے، اس کے دین کی وجہ سے، اس کے حسن و جمال کی وجہ سے، لیکن دیکھو! تم دین دار عورت سے نکاح کرنا...۔''(۱)

لہٰذا معلوم ہوا کہ لڑکے یا لڑکی کے لیے رشتے کا انتخاب کرتے ہوئے ہمیشہ دینداری ہی کو ملحوظ رکھنا چاہیے، کیونکہ اگر شریکِ حیات نیک ہوگا، تو وہ تمہیں بھی جنت کی دعوت دے گا اور اگر فاسق وفاجر ہوگا، تو وہ تمہیں بھی دوزخیوں کے اعمال کی طرف دعوت دے گا۔

حالتِ حیض میں قربت سے متعلق شرعی احکام

آگے کی آیات میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے میاں بیوی کے ازدواجی تعلقات سے متعلق مختلف احکام بیان فرمائے ہیں۔ان میں سے بعض ایسے ہیں جو صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے کسی سوال کے جواب میں نازل کیے گئے اور بعض ایسے ہیں جو براہِ راست اللہ تبارک وتعالیٰ نے عطا فرمائے ہیں، لہٰذا اسی سلسلے میں نکاح اور طلاق سے تعلق رکھنے والی بہت سی باتوں کا ذکر آرہا ہے۔

ان میں سب سے پہلے اللہ تبارک وتعالیٰ نے لوگوں کے ایک سوال کا جواب دیا اور فرمایا: ﴿وَ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِيْضِ﴾ ''اور لوگ آپ سے حیض کے بارے میں پوچھتے ہیں۔'' حیض یعنی وہ خون جو عام طور پر عورتوں کو ہر مہینے آتا ہے جس کو ''ماہواری'' بھی کہتے ہیں، لوگ اس سے متعلق آپ سے پوچھتے ہیں تو ﴿قُلْ هُوَ اَذًى﴾ ''آپ کہہ دیجیے کہ وہ ایک گندگی ہے،'' اور چونکہ گندگی ہے، لہٰذا ﴿فَاعْتَزِلُوا النِّسَآءَ فِي الْمَحِيْضِ﴾ ''حیض کی حالت میں عورتوں سے الگ رہو۔''

حدیث میں نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بیان کردہ تشریح (۲) کے مطابق الگ رہنے کے معنیٰ یہ ہیں کہ حیض کی حالت میں میاں بیوی کا جو خصوصی تعلق ہوتا ہے جسے ازدواجی تعلق کہا جاتا ہے، وہ قائم کرنا جائز نہیں ہے، لہٰذا مردوں کے ذمے فرض ہے کہ حیض کی حالت میں وہ اپنی بیویوں سے جماع نہ کریں۔ پھر اسی حکم کی مزید تاکید بیان کرتے ہوئے فرمایا: ﴿وَ لَا تَقْرَبُوْهُنَّ حَتّٰى يَطْهُرْنَ﴾ ''اور جب تک وہ پاک نہ ہوجائیں، ان سے قربت نہ کرو۔'' یہاں پر بھی قربت سے مراد میاں بیوی کا خصوصی تعلق یعنی مجامعت ہے، عورتوں کے پاک

---

(۱) صحيح البخاري (۸/۷) (۵۰۹۰) كتاب النكاح، باب الأكفاء في الدين.

(۲) صحيح مسلم (۲٤٦/۱) (۳۰۲)- كتاب الحيض- باب اصنعوا كل شيء إلا النكاح.

ہونے تک اس تعلق سے منع کردیا گیا، پھر فرمایا کہ ﴿فَاِذَا تَطَهَّرْنَ﴾ پھر جب وہ پاکی حاصل کرلیں ﴿فَاْتُوْهُنَّ﴾ تو تم ان کے پاس جاسکتے ہو ﴿مِنْ حَيْثُ اَمَرَكُمُ اللّٰهُ﴾ ''جس طرح اللہ نے تم کو حکم دیا ہے۔''

یہ جو فرمایا ہے کہ ''جب تک وہ پاک نہ ہوجائیں، ان سے قربت نہ کرو،'' تو اس حوالے سے یہاں پر دو لفظ استعمال ہوئے ہیں۔ پہلے تو فرمایا: ﴿حَتّٰى يَطْهُرْنَ﴾ ''اس وقت تک تم ان کے پاس نہ جاؤ جب تک کہ وہ پاک نہ ہوجائیں'' اور پھر فرمایا: ﴿فَاِذَا تَطَهَّرْنَ...﴾ ''ہاں جب وہ پاک ہوجائیں تو پھر تم ان کے پاس جاسکتے ہو۔'' عربی زبان کے لحاظ سے جو پہلا لفظ ہے وہ ''طہر'' سے نکلا ہے، جس کے معنیٰ یہ ہیں کہ اگر کوئی عورت حیض سے فارغ ہوجائے تو حیض سے فارغ ہوتے ہی اس کا طہر شروع ہوجاتا ہے، یعنی وہ حیض سے پاک ہوگئی، لیکن اس کے بعد اس کے ذمے غسل کرنا فرض ہے۔ اس غسل کی طرف ﴿فَاِذَا تَطَهَّرْنَ﴾ کے لفظ سے اشارہ فرمایا گیا ہے اور مطلب یہ ہے کہ محض پاک ہونا، یعنی حیض کا بند ہوجانا ہی کافی نہیں، بلکہ پاک ہوجانے کے بعد جب تک وہ طہارت حاصل نہیں کرلیتیں، تب تک مردوں کے لیے ان سے اس طرح کی قربت (مجامعت) جائز نہیں۔ البتہ جب وہ نہا دھو کر تطہُّر (طہارت) اور پاکیزگی حاصل کرلیں تو پھر ان کے ساتھ اس طرح کی قربت جائز ہوجاتی ہے۔

حیض کے ایام سے متعلق دو اہم پہلو

یہاں دو باتیں مزید سمجھنے کی ہیں؛ ایک بات تو یہ ہے کہ یہاں پر اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہ بات اس انداز میں ارشاد فرمادی کہ ﴿فَاعْتَزِلُوا النِّسَآءَ فِي الْمَحِيْضِ﴾ ''حیض کی حالت میں عورتوں سے الگ رہو،'' اور اس کی تشریح میں پیچھے عرض کیا جا چکا ہے کہ حیض کی حالت میں مجامعت جائز نہیں ہے۔ اب مجامعت کے علاوہ اگر محبت کے کچھ دوسرے انداز آپس میں اختیار کیے جائیں جیسے بوس و کنار وغیرہ، تو اس کی اجازت ہے۔ البتہ اس معاملے میں اس بات کا لحاظ رکھنا ضروری ہے کہ اس حالت میں کوئی ایسی کیفیت انسان پر طاری نہ ہو جس کے نتیجے میں انسان جماع کے گناہ میں مبتلا ہوجائے۔

دوسری بات یہ سمجھنے کی ہے کہ حالتِ حیض میں جو چیز منع ہے وہ بیوی کے ساتھ مجامعت ہے، یعنی شوہر اور بیوی آپس میں مجامعت کا تعلق قائم نہ کریں، لیکن اس کے سوا بیویوں کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے، کھانے پینے اور ان

کے ساتھ رہنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ اس کی وضاحت رسولِ کریم ﷺ کے قول [۱] وفعل [۲] سے بھی ہوتی ہے۔

درحقیقت بعض معاشروں میں، جیسا کہ یہودیوں میں اس کا رواج تھا کہ جب عورت کو حیض آنا شروع ہوا تو اس کو بالکل اچھوت بنادیا جاتا تھا، اس کے ساتھ رہن سہن، اٹھنا بیٹھنا اور کھانا پینا جائز نہیں سمجھا جاتا تھا۔ ان کے مقابلے میں نبیِ کریم سرورِ دو عالم ﷺ نے ان آیات کی تشریح کے طور پر جو باتیں ارشاد فرمائیں، یا جو طرزِ عمل اختیار فرمایا اس سے یہ بات واضح ہوگئی کہ ان میں سے کوئی بھی چیز منع نہیں ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ حیض آنے کی وجہ سے عورت کو اچھوت بنادیا جائے اور اس کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا منع ہوجائے۔ صرف جو چیز منع ہے وہ مجامعت کا تعلق ہے، اس کے سوا اس کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ گویا اس معاملے میں بھی اسلام نے عورت کو عزت بخشی اور اس کی اس بیماری کو شرعی عذر قرار دے کر اس کے باقی تمام حقوق بحال فرمائے۔

توبہ کرنے والوں سے اللہ تعالیٰ کی محبت

پھر آگے اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا: ﴿إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ﴾ ''بے شک اللہ ان لوگوں سے محبت کرتا ہے جو اس کی طرف کثرت سے رجوع کریں۔'' ''التَّوَّابِيْن'' توّاب کی جمع ہے اور توّاب کے لغوی معنیٰ ہیں ''کثرت سے رجوع کرنے والے'' یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف بہت کثرت سے رجوع کرنے والے۔ اسی طرح ''التَّوَّابِيْن'' کے معنیٰ میں یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ سے ''بکثرت توبہ مانگنے والے'' کیونکہ توبہ بھی اللہ کی طرف رجوع ہی کا ایک طریقہ ہے، انسان اپنے گناہوں کی مغفرت مانگنے کے لیے اللہ تعالیٰ سے جو توبہ کرتا ہے وہ بھی اسی کے معنیٰ میں داخل ہے اور اس شخص کو ''توّاب'' کہا جائے گا جو بکثرت اللہ تعالیٰ سے توبہ کرتا ہو۔

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ توبہ تو کسی گناہ سے ہوتی ہے، اور اگر کوئی شخص گناہ ہی نہ کرتا ہو، تو بظاہر اُس کو توبہ کی ضرورت نہیں یا اگر ایک مرتبہ کسی گناہ سے توبہ کرلی، تو گناہ معاف ہو جاتا ہے، پھر ''بکثرت'' توبہ کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ توبہ صرف گناہ ہی سے نہیں ہوتی، بلکہ ہر اُس کام سے

(۱) كما في صحيح مسلم (۲٤٦/۱) (۳۰۲) كتاب الحيض، باب اصنعوا كل شيء إلا النكاح.

(۲) كما في صحيح البخاري (٦٧/۱) (۲۹۵) كتاب الحيض، باب غسل الحائض رأس زوجها وترجيله.

بھی ہوتی ہے جس میں کوئی کوتاہی ہوگئی ہو، مثلاً نماز تو پڑھی، لیکن اس میں خشوع وخضوع کا جو حق تھا وہ ادا نہ ہوا، اور اگر کسی درجے میں ہوا بھی تو اللہ تبارک وتعالیٰ کے شایانِ شان عبادت کس سے ہوسکتی ہے؟ اس لیے اللہ تعالیٰ کے نیک بندے اس قسم کی کوتاہیوں پر بھی توبہ اور استغفار کرکے "توّابین" میں شامل ہوجاتے ہیں۔ آگے فرمایا: ﴿وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ ﴿٢٢٢﴾﴾ "اور اللہ تعالیٰ اُن سے محبت کرتا ہے جو خوب پاک صاف رہتے ہیں۔"

حیض کے مسائل کے سلسلے میں یہاں دو باتیں ارشاد فرمائی گئی ہیں، ایک کثرت سے توبہ کرنا، اس کا خصوصی تعلق حیض سے یہ ہے کہ اگر کسی کو یہ حکم معلوم نہیں تھا کہ حیض کی حالت میں بیوی سے جماع جائز نہیں اور وہ کر گزرا، تو اب اس غلطی کا کفّارہ یہ ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کی طرف خوب رجوع کر کے اس سے معافی مانگ لو اور اس بات پر توبہ کرلو کہ آئندہ اس غلطی کا ارتکاب نہیں ہوگا، اور دوسرے آئندہ کے لیے حیض کی گندگی سے بچ کر پاکیزگی کا پورا خیال رکھو، کیونکہ اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں سے محبت رکھتے ہیں جو خوب پاکیزگی اختیار کرتے ہیں۔

باہمی ازدواجی تعلقات سے متعلق ایک بلیغ قرآنی تشبیہ

اگلی آیت میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے مرد وعورت کے باہمی ازدواجی تعلقات کے بارے میں اصولی ہدایت کے طور پر ایسی بلیغ اور لطیف بات ارشاد فرمائی ہے جو متعدّد پہلوؤں سے بڑی عظیم رہنمائی فراہم کرتی ہے۔ پہلے اس آیت کا ترجمہ ملاحظہ کیجیے، پھر ان شاء اللہ اس پر تفصیل سے بات کی جائے گی۔

باری تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ﴾ تمہاری بیویاں تمہارے لیے کھیتیاں ہیں ﴿فَأْتُوْا حَرْثَكُمْ أَنّٰى شِئْتُمْ﴾ لہٰذا اپنی کھیتی میں جہاں سے چاہو جاؤ ﴿وَقَدِّمُوْا لِأَنْفُسِكُمْ﴾ اور اپنے لیے اچھے عمل آگے بھیجو ﴿وَاتَّقُوا اللّٰهَ﴾ اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو ﴿وَاعْلَمُوْٓا﴾ اور یہ جان رکھو کہ ﴿أَنَّكُمْ مُّلٰقُوْهُ﴾ تم اس سے جاکر ملنے والے ہو ﴿وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿٢٢٣﴾﴾ "اور مومنوں کو خوشخبری سنادو۔"

اس آیتِ کریمہ میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے انسان کے لیے اس کی بیوی کو ایک کھیتی سے تشبیہ دی ہے اور یہ تشبیہ کئی حوالوں سے بڑی بلیغ اور لطیف ہے اور اس میں میاں بیوی کے خصوصی ملاپ کے بارے میں چند حقائق بیان کیے گئے ہیں۔ مرد کے لیے اس کی بیوی کو ایک کھیتی سے تشبیہ دینے کا ایک مطلب یہ ہے کہ جس

طرح کھیتی میں بیج ڈال کر پیداوار حاصل کی جاتی ہے، اسی طرح میاں بیوی کے تعلقات کے نتیجے میں اولاد حاصل ہوتی ہے۔ دیکھنے میں تو یہ محض چھوٹی سی عبارت ہے کہ ''تمہاری بیویاں تمہارے لیے کھیتیاں ہیں'' لیکن یہ قرآنِ کریم کا اعجاز ہے کہ مختصر عبارت میں اتنی بڑی بات کہہ دی گئی ہے جس سے کئی اہم پہلوؤں کی طرف رہنمائی حاصل کی جاسکتی ہے۔

• بیویوں کو کھیتی سے تشبیہ دینے کے چند اہم پہلو

بیویوں کو کھیتیوں سے تشبیہ دینے سے مشابہت کے بہت سے پہلو نکلتے ہیں، جن پر غور کرنے کا بڑا سامان ہے۔

(۱) جس طرح ایک کاشت کار کی ساری کائنات اس کی کھیتی ہوتی ہے اور وہ اس کی بڑھوتری اور نقصان کو اپنی زندگی اور موت کا مسئلہ سمجھتا ہے۔ اس کو دیکھ کر خوش ہوتا ہے اور اس سے اپنی امیدیں باندھتا ہے۔ جب فصل تیار ہوتی ہے یا پھل نمودار ہوتا ہے تو اس کی خوشی اور مسرت کا ایک عجیب عالم ہوتا ہے۔ الغرض جس طرح ایک کاشتکار اپنی کھیتی کو اپنی ساری کائنات سمجھتا ہے، اسی طرح ایک مرد کے لیے اس کی بیوی اس کی دنیاوی زندگی کی سب سے بڑی ساتھی ہے اور اس کے لحاظ سے وہ اس کے لیے ایک کائنات ہے۔ جس طرح ایک کاشتکار اپنی کھیتی کو دیکھ کر خوش ہوتا ہے، اسی طرح شوہر اور بیوی ایک دوسرے کو دیکھ کر خوش ہوتے ہیں۔ حدیث میں رسولِ کریم سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کو اس طرح تعبیر فرمایا کہ بہترین بیوی وہ ہے کہ:

إِذَا نَظَرَ إِلَيْهَا سَرَّتْهُ[1]

جب انسان اس کی طرف دیکھے تو وہ اس کو خوش کردے۔

لہٰذا اس میں ایک پہلو تو یہ ہوا کہ جس طرح انسان اپنی کھیتی کو دیکھ کر خوش ہوتا ہے اسی طریقے سے اپنی بیوی کو دیکھ کر بھی اسے خوشی حاصل ہوتی ہے۔ نیز اس میں یہ پیغام بھی ہے کہ میاں

---

(۱) سنن أبي داود (۲/ ۱۲۶) (۱۶٦٤) كتاب الزكاة، باب في حقوق المال، وسنن ابن ماجه (۱/ ۵۹٦) (۱۸۵۷) كتاب النكاح، باب أفضل النساء. والنسائي (٦/ ٦٨) (۳۲۳۱) كتاب النكاح، باب أي النساء خير، وقال الحافظ العراقي في تخريج الإحياء (۱/ ۳۸٤) (۱٤٤۳) بسند صحيح.

بیوی کے آپس کے تعلقات اس طرح خوشگوار ہونے چاہئیں کہ ایک دوسرے کو دیکھ کر انہیں خوشی کا احساس ہو۔

(۲) جس طرح ایک کاشتکار اپنی کھیتی کی نگہداشت اور اس کی دیکھ بھال کا فریضہ اس طرح انجام دیتا ہے کہ وہ میری زندگی کا ایک بہت بڑا سرمایہ ہے، اس لیے اس کی حفاظت میری ذمہ داری ہے، چنانچہ ایک شوہر کے لیے اپنی بیوی کی حفاظت، نگہداشت، اس کے مزاج اور مذاق کی رعایت اور اس کے ساتھ حسنِ سلوک ایسا ہی ہونا چاہیے جیسے ایک کاشتکار کا اپنی کھیتی کے ساتھ ہوتا ہے۔

(۳) ایک کاشتکار اپنی کھیتی کے بارے میں اس بات کا پورا خیال رکھتا ہے کہ اُسے وہ مناسب غذا ملے جو کھیتی کے پروان چڑھنے کا ذریعہ ہو، چنانچہ روزانہ اُسے پانی دینے کا اہتمام کرتا ہے، اس کے لیے مناسب کھاد مہیا کرتا ہے، اسی طرح شوہر کا فرض ہے کہ وہ اپنی بیوی کی غذائی ضروریات اُسی محبت سے فراہم کرے جس محبت سے وہ کھیتی کو اس کے مناسب ضروریات فراہم کرتا ہے۔

(۴) جس طرح انسان کھیتی کے اندر بیج ڈالتا ہے اور اس کا مقصود پیداوار کا حصول ہوتا ہے، اسی طریقے سے میاں اور بیوی کے تعلق کے درمیان جو آبیاری ہوتی ہے، اس سے انسانی نسل کی افزائش اور اولاد مقصود ہونی چاہیے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس تشبیہ کے ذریعے اس میں یہ عظیم پہلو بیان فرمایا ہے کہ میاں بیوی کا آپس میں جنسی تعلق محض لذت حاصل کرنے کی حد تک محدود نہ ہونا چاہیے، بلکہ اس تعلق کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے ایک بڑے مقصد کے لیے پیدا کیا ہے اور اسی بڑے مقصد کی خاطر انسان کو اس میں لذت فراہم کی ہے، لہٰذا وہ مقصد ہر دم پیشِ نظر رہنا چاہیے۔ وہ بڑا مقصد یہ ہے کہ اس کے ذریعے انسانی نسل کی بڑھوتری ہو، لہٰذا جب میاں بیوی آپس میں ایک دوسرے سے لذت حاصل کریں یا اپنے سرور وعیش کے ماحول میں داخل ہوں، تو یہ سمجھ لینا چاہیے کہ اس سے صرف لذت لینا مقصود نہیں ہے، بلکہ اس سے انسانی نسل کی بڑھوتری بھی مقصود ہے، چنانچہ پیچھے آیت نمبر ۱۸۷ میں جب رمضان کی راتوں میں بیویوں سے جماع کی اجازت دی گئی، تو یہ الفاظ فرمائے گئے:

فَالْئٰنَ بَاشِرُوْهُنَّ وَابْتَغُوْا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ

اب تم بیویوں سے صحبت کرو، اور جو (اولاد) اللہ نے تمہارے لیے لکھ دی ہے، اُسے حاصل کرو۔

نیز ایک حدیث میں نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

تَزَوَّجُوا الْوَدُوْدَ الْوَلُوْدَ فَإِنِّيْ مُكَاثِرٌ بِكُمُ الْأُمَمَ (۱)

زیادہ بچے جننے والی، اور زیادہ محبت کرنے والی عورت سے شادی کرو، اس لیے کہ میں تمہاری کثرت کی بنا پر سابقہ اُمتوں کے مقابلہ میں فخر کروں گا۔

• ازدواجی تعلقات میں آزادی کے ساتھ ایک اہم قید

پھر آگے فرمایا: ﴿فَأْتُوْا حَرْثَكُمْ اَنّٰى شِئْتُمْ﴾ ''لہٰذا اپنی کھیتی میں جہاں سے چاہو جاؤ'' یہ بھی بڑی بلیغ تعبیر ارشاد فرمائی گئی ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ ایک طرف انسان کو یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اس کا اور اس کی بیوی کا جو ذاتی اور خانگی تعلق ہے، یعنی اپنی نجی زندگی میں وہ آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ جس محبت اور پیار کا معاملہ کرتے ہیں، اس میں وہ پوری طرح آزاد ہیں اور اس آزادی کے اندر رہتے ہوئے اپنے اظہارِ محبت کا جو طریقہ بھی وہ اختیار کرنا چاہیں کرسکتے ہیں، جبکہ دوسری طرف اس پہلو کی طرف بھی متوجہ کرنا چاہتے ہیں کہ چونکہ تمہارے جنسی تعلقات کا اصل مقصد نسلِ انسانی کی بڑھوتری ہونی چاہیے، اس لیے یہ عمل اسی طرح انجام دینا چاہیے جس سے یہ مقصد حاصل ہو سکے۔

لہٰذا یہ عمل نسوانی جسم کے اسی حصے میں ہونا چاہیے جو اس کام کے لیے پیدا کیا گیا ہے، اور جہاں سے کھیتی کا مقصد حاصل ہوسکتا ہو، یعنی اولاد حاصل ہوسکتی ہو، لہٰذا پیچھے کا حصہ جو اس کام کے لیے نہیں بنایا گیا اس کو فطرت کے خلاف جنسی لذت کے لیے استعمال کرنا حرام ہے۔ ﴿فَأْتُوْا حَرْثَكُمْ اَنّٰى شِئْتُمْ﴾ کے یہی

---

(۱) سنن أبي داود (۲/۲۲۰) (۲۰۵۰) كتاب النكاح، باب النهي عن تزويج من لم يلد من النساء. وقال الحافظ العراقي في تخريج الإحياء (۱/۳۸٦) (۱٤٥٤): "إسناده صحيح." وأخرجه الحاكم في المستدرك (۲/۱۷٦) وقال: "هذا حديث صحيح الإسناد، ولم يخرجاه بهذه السياقة."

معنیٰ ہیں کہ ''تم اپنی کھیتی میں جاؤ، جہاں سے چاہو۔'' اور ''جہاں سے چاہو'' سے یہی مراد ہے کہ جو راستہ چاہو، اختیار کرسکتے ہو، لیکن جانا کھیتی میں ہی ہے، یا اسی جگہ جانا ہے جہاں سے پیداوار ہوسکتی ہے۔ کوئی ایسی جگہ جہاں سے پیداوار نہ ہوسکتی ہو، تمہارے لیے وہاں جانا جائز نہیں، کیونکہ وہ کھیتی نہیں۔

• وَقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ کی تشریح

میاں بیوی کے تعلقات کی حدود قیود بیان کرنے بعد فرمایا: ﴿وَقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ﴾ ''اور اپنے لیے کچھ آگے بھیجو۔'' یہاں اجمال کے ساتھ صرف اتنا کہا گیا ہے کہ ''اپنے لیے کچھ آگے بھیجو۔'' اب یہ بات کہ اپنے لیے آگے کیا بھیجنا چاہیے؟ اس کے متعدّد مطلب ہو سکتے ہیں۔[1] اس کی تفسیر یہ بھی ہوسکتی ہے اور کی گئی ہے کہ تم اپنے لیے اچھے عمل آگے بھیجو، اور یہ بھی ہوسکتی ہے کہ اس جملے سے اسی بات کی تاکید کرنا مقصود ہے کہ جب تم میاں بیوی آپس میں ایک دوسرے سے لذت اٹھارہے ہو تو اپنے لیے ایسا سامان بھیجو جو تمہارے لیے نفع بخش ہو اور وہ سامان تمہاری اولاد ہے، لہٰذا اس تعلق سے مقصود اولاد کا حصول ہونا چاہیے تاکہ تمہارے پاس اولاد ہو، اس اولاد کی تم اچھے طریقے سے تربیت کرو اور اس کے نتیجے میں وہ تمہارے لیے صدقۂ جاریہ ثابت ہو۔

اور بعض مفسرین نے اس کی تفسیر یہ بھی کی ہے کہ کیونکہ میاں بیوی کے باہمی تعلقات کا ذکر ہورہا ہے، تو مطلب یہ ہے کہ صرف جماع ہی مقصود نہیں ہے، بلکہ جماع سے پہلے جو جماع کے مقدّمات ہوتے ہیں ان کی طرف اشارہ ہے کہ تم ان مقدّمات کو بھی انجام دو، جیسا کہ بوس و کنار وغیرہ، تاکہ بیوی بھی اس عمل کے لیے تیار ہوسکے، لیکن زیادہ واضح تفسیر وہی پہلے والی ہے جس میں اس جملے کے مصداق کو عام رکھا گیا ہے اور مطلب یہ ہے کہ تم اپنے لیے اچھے عمل آگے بھیجو، انہی اچھے اعمال میں سے یہ بھی ہے کہ تمہاری اولاد پیدا ہو، تم اس کی تربیت کرو اور وہ اچھی اولاد ثابت ہو، تاکہ تمہارے لیے صدقۂ جاریہ اور ذخیرۂ آخرت بنے۔

یہ اللہ تعالیٰ کا خاص اسلوب ہے کہ جب کوئی حکم عطا فرماتے ہیں یا کوئی خاص قانون جاری فرماتے ہیں تو اس سے پہلے یا اس کے بعد تقویٰ یعنی اللہ تعالیٰ سے ڈرنے کی طرف ضرور متوجہ فرماتے ہیں، کیونکہ جب تک انسان کے دل میں اللہ تعالیٰ کا خوف اور اس کے سامنے جوابدہی کا احساس نہ ہو تو کسی بھی قانون یا کسی بھی حکم پر محض ڈنڈے کے زور سے عمل نہیں کرایا جاسکتا، چنانچہ یہاں پر بھی فرمایا کہ ﴿وَاتَّقُوا اللّٰهَ﴾ اور اللہ

(۱) انظر لجميع الاقوال؛ تفسير القرطبي (۹۶/۳) تحت هذه الآية.

سے ڈرو ﴿وَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ مُّلٰقُوْهُ﴾ ''اور یہ بات جان رکھو کہ تم اللہ کے پاس جا کر ملنے والے ہو،'' لہٰذا اپنے ہر قول و عمل میں اس بات کو مدِ نظر رکھو کہ ایک وقت آئے گا کہ تمہیں اللہ کے سامنے پیش ہو کر اپنے سارے اعمال کا جواب دینا ہوگا۔ ﴿وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۲۲۳﴾﴾ ''اور مومنوں کو خوشخبری سنادو،'' یعنی جو ایمان لائے ہوئے ہیں اور مقدور بھر اللہ تبارک وتعالیٰ کے احکام پر عمل کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو ان کو خوشخبری سنادو کہ انہیں آخرت میں اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے نعمتیں میسر آئیں گی۔

آیت نمبر ۲۲۴ تا ۲۲۸

وَلَا تَجْعَلُوا اللّٰهَ عُرْضَةً لِّاَيْمَانِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْا وَتَتَّقُوْا وَتُصْلِحُوْا بَيْنَ النَّاسِ ؕ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۲۴﴾ لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا كَسَبَتْ قُلُوْبُكُمْ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ﴿۲۲۵﴾ لِلَّذِيْنَ يُؤْلُوْنَ مِنْ نِّسَآئِهِمْ تَرَبُّصُ اَرْبَعَةِ اَشْهُرٍ ۚ فَاِنْ فَآءُوْ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۲۲۶﴾ وَاِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ فَاِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۲۷﴾ وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ ؕ وَلَا يَحِلُّ لَهُنَّ اَنْ يَّكْتُمْنَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ فِيْٓ اَرْحَامِهِنَّ اِنْ كُنَّ يُؤْمِنَّ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ وَبُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِيْ ذٰلِكَ اِنْ اَرَادُوْٓا اِصْلَاحًا ؕ وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِيْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۠ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ ؕ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۲۸﴾ ع ۲۸ ۷ ۱۲

اور اللہ (کے نام) کو اپنی قسموں میں اس غرض سے استعمال نہ کرو کہ اس کے ذریعے نیکی اور تقویٰ کے کاموں اور لوگوں کے درمیان صلح صفائی کرانے سے بچ سکو اور اللہ سب کچھ سنتا جانتا ہے۔ ﴿۲۲۴﴾ اور اللہ تمہاری لغو قسموں پر تمہاری گرفت نہیں کرے گا البتہ جو قسمیں تم نے اپنے دلوں کے ارادے سے کھائی ہوں گی، ان پر گرفت کرے گا

اور اللہ بہت بخشنے والا، بڑا بردبار ہے۔ (۲۲۵) جو لوگ اپنی بیویوں سے ایلاء کرتے ہیں (یعنی ان کے پاس نہ جانے کی قسم کھالیتے ہیں) ان کے لیے چار مہینے کی مہلت ہے، چنانچہ اگر وہ (قسم توڑ کر) رُجوع کرلیں، تو بے شک اللہ بہت بخشنے والا، بڑا مہربان ہے۔ (۲۲۶) اور اگر انہوں نے طلاق ہی کی ٹھان لی ہو تو (بھی) اللہ سننے جاننے والا ہے۔ (۲۲۷) اور جن عورتوں کو طلاق دے دی گئی ہو، وہ تین مرتبہ حیض آنے تک اپنے آپ کو انتظار میں رکھیں، اور اگر وہ اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتی ہوں تو ان کے لیے حلال نہیں ہے کہ اللہ نے ان کے رحم میں جو کچھ (حمل یا حیض) پیدا کیا ہے اسے چھپائیں اور اس مدت میں اگر ان کے شوہر حالات بہتر بنانا چاہیں، تو ان کو حق ہے کہ وہ ان عورتوں کو (اپنی زوجیت میں) واپس لے لیں، اور ان عورتوں کو معروف طریقے کے مطابق ویسے ہی حقوق حاصل ہیں جیسے (مردوں کو) ان پر حاصل ہیں۔ ہاں مردوں کو ان پر ایک درجہ فوقیت ہے اور اللہ غالب اور حکمت والا ہے۔ (۲۲۸)

عائلی زندگی سے متعلق مضامین کی ابتداء

ان آیاتِ کریمہ میں انسان کی عائلی یعنی گھریلو زندگی سے متعلق احکام دیے جا رہے ہیں اور اسی سلسلے میں نکاح و طلاق کا بھی معاملہ زیرِ بحث آیا ہے، نیز ایک طریقہ زمانۂ جاہلیت سے چلا آتا تھا کہ بعض اوقات کوئی شوہر اپنی بیوی سے ناراضگی کے اظہار کے طور پر اللہ کی قسم کھا کر کہتا تھا کہ میں تمہارے پاس نہیں آؤں گا، یعنی تمہارے ساتھ وہ ازدواجی تعلقات قائم نہیں کروں گا جو میاں بیوی کے درمیان ہوتے ہیں۔ اس طرح عورت غیر معینہ مدت تک لٹکی رہتی تھی، وہ نہ اس شوہر سے اپنے حقوق حاصل کرسکتی تھی اور نہ کوئی دوسرا نکاح کرسکتی تھی، جبکہ شوہر کو آزادی تھی کہ اگر وہ اس قسم کی قسم کھا بیٹھا ہے تو اگر دوسرا نکاح کرنا چاہتا تو کرسکتا تھا۔

اہلِ عرب کے اپنی بیویوں سے متعلق قسم کھانے کے اس خاص طرزِ عمل کو ''ایلاء'' کہا جاتا تھا، چنانچہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان آیات میں اسی ''ایلاء'' کا حکم بیان فرمایا ہے۔ ایلاء میں چونکہ بیوی کے پاس نہ جانے کی قسم کھائی جاتی تھی تو اس خاص قسم کا حکم بیان کرنے سے پہلے اللہ تبارک وتعالیٰ نے عمومی قسموں کا حکم بھی بیان فرمادیا ہے۔

باری تعالیٰ کے ناموں کو نیکی سے رکنے کا سبب بنانے کی ممانعت

اللہ تبارک وتعالیٰ نے پہلے تو یہ فرمایا: ﴿وَلَا تَجْعَلُوا اللّٰهَ عُرْضَةً لِّاَيْمَانِكُمْ﴾ اور اللہ کو تم اپنی قسموں میں اس غرض سے استعمال نہ کرو ﴿اَنْ تَبَرُّوْا وَتَتَّقُوْا وَتُصْلِحُوْا بَيْنَ النَّاسِ﴾ ''کہ تم اس کے ذریعے نیکی اور تقویٰ کے کاموں اور لوگوں کے درمیان صلح صفائی کرانے سے بچ سکو۔''

اس سے مقصود یہ ہے کہ اللہ کی قسم کھانا کوئی معمولی بات نہیں ہے، جب کوئی شخص اللہ کی قسم کھاتا ہے تو وہ اللہ کو گواہ بنا رہا ہوتا ہے۔ اب اگر کوئی شخص مثلاً اس بات پر قسم کھائے کہ میں کبھی کسی کے ساتھ نیکی کا سلوک نہیں کروں گا یا میں کوئی عبادت نہیں کروں گا، یا میں لوگوں کے درمیان صلح صفائی نہیں کراؤں گا، تو یہ ساری قسمیں اللہ تبارک وتعالیٰ کو گواہ بنا کر ایسے کام کے لیے کھائی جارہی ہیں جو بہت ہی بری اور اللہ تعالیٰ کے ہاں ناپسندیدہ باتیں ہیں، اور ان بری باتوں پر اللہ تعالیٰ کو گواہ بنانا یا ان مقاصد کے لیے اللہ تعالیٰ کا نام استعمال کرنا درست نہیں، یہاں اسی بات سے منع کیا جارہا ہے۔

بعض مرتبہ انسان کسی وقتی جذبے سے مغلوب ہوکر قسم کھا لیتا ہے کہ فلاں کام نہیں کروں گا، حالانکہ وہ نیک کام ہوتا ہے، مثلاً ایک مرتبہ حضرت مسطح رضی اللہ عنہ سے ایک غلطی ہوگئی تھی تو حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے یہ قسم کھالی تھی کہ آئندہ وہ ان کی مالی مدد نہیں کریں گے،[1] یا جیسے روح المعانی میں علامہ آلوسی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک روایت[2] نقل کی ہے کہ حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ نے اپنے بہنوئی کے بارے میں قسم کھالی تھی کہ وہ ان سے بات نہیں کریں گے اور نہ ان کی بیوی سے ان کی صلح کرائیں گے، یہ آیت ایسی قسم کھانے سے منع کررہی ہے، کیونکہ اس طرح اللہ تعالیٰ کا نام ایک غلط مقصد میں استعمال ہوتا ہے، اور صحیح حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اگر کوئی شخص ایسی نامناسب قسم کھالے تو اسے توڑ دینا چاہیے اور اس کا کفّارہ ادا کرنا چاہیے۔[3]

---

(۱) صحيح البخاري (۸/۱۳۸) (٦٦٧٩) كتاب الأيمان والنذور، باب اليمين فيما لا يملك، وفي المعصية وفي الغضب.

(۲) تفسير الألوسي = روح المعاني (۱/۵۲۰).

(۳) كما في صحيح البخاري (۸/۱۲۷) (٦٧٢٢) قال النبي صلى الله عليه وسلم: "وإذا حلفت على يمين، فرأيت غيرها خيرا منها، فأت الذي هو خير، وكفر عن يمينك" كتاب كفارات الأيمان، باب الكفارة قبل الحنث وبعده.

قسموں کے ذریعے حقوق اللہ اور حقوق العباد کی ادائیگی سے رکنا

یہاں پر ﴿ اَنْ تَبَرُّوْا وَ تَتَّقُوْا وَ تُصْلِحُوْا بَيْنَ النَّاسِ ﴾ میں قرآنِ کریم نے تین لفظ استعمال کیے ہیں، جن کا ترجمہ یہ ہے کہ ''تم نیکی اور تقویٰ کے کاموں اور لوگوں کے درمیان صلح صفائی کرانے سے بچنے کے لیے اللہ کے نام کی قسمیں مت کھاؤ۔'' ان میں سے ''تَبَرُّوْا'' بِرٌّ سے نکلا ہے اور ''بِرٌّ'' کے لغوی معنیٰ تو ''نیکی'' کے ہیں، لیکن اس کے مفہوم میں عام طور سے وہ نیک کام آتے ہیں جن کا تعلق بندوں کے حقوق سے ہوتا ہے، جیسے کسی غریب کو کھانا کھلا دینا، کسی غریب کی مدد کر دینا، کسی تکلیف میں مبتلا شخص کی تکلیف دور کر دینا، والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کرنا، پڑوسیوں کے ساتھ اچھا برتاؤ رکھنا، بہن بھائیوں کے ساتھ نیک سلوک کرنا وغیرہ، یہ ساری باتیں جن کا تعلق حقوق العباد سے ہے، ''بِرٌّ'' کے اندر داخل ہیں۔

دوسرا لفظ ''تَتَّقُوْا'' ہے، اس کا تعلق تقویٰ سے ہے اور تقویٰ کا بڑا حصہ حقوق اللہ سے متعلق ہے، جبکہ تیسرا لفظ ''تُصْلِحُوْا بَيْنَ النَّاسِ'' استعمال فرمایا گیا یعنی لوگوں کے درمیان صلح کروانا۔ یہ ایک معاشرتی اور اجتماعی نوعیت کی نیکی ہے کہ اگر کہیں پر لوگوں کے درمیان لڑائی جھگڑا ہو تو مسلمان کو چاہیے کہ ان کے درمیان صلح کرانے کی کوشش کرے۔

اللہ تعالیٰ نے ان تین الفاظ کے ذریعے تینوں قسم کی نیکیوں کا ذکر فرما دیا ہے کہ چاہے حقوق العباد سے متعلق نیکی ہو یعنی کسی انسان کو کوئی فائدہ پہنچانے کی نیکی ہو اور اس کے اوپر کوئی شخص قسم کھالے کہ میں یہ نیکی نہیں کروں گا، یا تقویٰ کا کام ہو اور کوئی آدمی یہ قسم اٹھالے کہ میں یہ کام نہیں کروں گا، یا یہ قسم کھالے کہ میں لوگوں کے درمیان کبھی صلح وصفائی نہیں کرواؤں گا، تو ان تمام بری باتوں کے لیے اللہ تعالیٰ کے نام کو ایک ذریعہ بنانا جائز نہیں، لہٰذا ایسی قسمیں جو انسان کو اچھے کاموں سے روکتی ہوں، ان سے اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں منع فرما دیا ہے۔

﴿ وَ اللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۲۴﴾ ﴾ ''اور اللہ تعالیٰ خوب سنتا، جانتا ہے۔'' اس میں تھوڑا سا تہدید (سرزنش/دھمکی) کا پہلو ہے کہ اگر تم ایسی قسمیں کھاؤ گے تو اللہ تعالیٰ سن رہا ہے اور تمہاری جو نیت ہے اس کو جانتا بھی ہے، لہٰذا اگر تم نے کوئی غلط کام کرنے کی یا کسی نیکی کے کام سے باز رہنے کی قسم کھائی ہوئی ہے، تو چونکہ اللہ تبارک وتعالیٰ سن رہا ہے اور خوب جانتا ہے کہ تمہاری نیت کیا ہے، اس لیے ہوسکتا ہے کہ تمہیں اس کی سزا بھگتنی پڑے۔

ماضی کے کسی واقعے سے متعلق جھوٹی قسم کھانے کا حکم

پھر آگے اللہ تبارک وتعالیٰ نے ''ایلاء'' کے ذکر سے پہلے قسموں کے بارے میں ایک چیز کا استثناء کرتے ہوئے فرمایا: ﴿لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ﴾ ''اللہ تمہاری لغو قسموں پر تمہاری گرفت نہیں کرے گا۔'' لغو یعنی بے معنی قسم کی قسم سے مراد ایک تو وہ قسمیں ہیں جو آدمی بلا ارادہ محض تکیۂ کلام کے طور پر کہہ دیتا ہے اور قسم کھانے کا ارادہ نہیں ہوتا۔ خاص طور پر عربوں میں اس کا رواج بہت تھا، مثلاً وہ یوں کہتے کہ وَاللہ (اللہ کی قسم) مجھے یہ کام کرنا ہے یا وَاللہ (اللہ کی قسم) میں نے یہ کام نہیں کیا۔

اس قسم کی قسموں سے ان کا مقصود قسم کھانا نہیں ہوتا تھا، بلکہ وہ اپنے کلام میں ایک محاورے کی روش اختیار کرتے ہوئے اس قسم کے الفاظ بول دیتے تھے، جن کو تکیۂ کلام کہا جاتا ہے، لہٰذا لغو قسم سے مراد ایک تو یہی قسم ہے جس میں قسم کھانے کا ارادہ تو نہیں تھا، لیکن محاورے یا تکیۂ کلام کے طور پر زبان سے کوئی قسم نکل گئی تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ وہ اس پر گرفت نہیں کریں گے، کیونکہ یہ تمہارے اختیار سے باہر کی بات ہے۔

فقہائے کرام (۱) نے اس لغو قسم کی ایک دوسری صورت یہ بھی بیان کی ہے کہ ایک آدمی قسم کے ارادے سے ہی قسم کھاتا ہے اور اس کے اپنے خیال کے مطابق وہ صحیح ہوتی ہے، مثلاً ماضی کے کسی واقعے پر کسی نے قسم کھالی کہ واقعۃً یہ واقعہ اس طرح ہوا ہے اور وہ یہی سمجھ رہا ہے کہ جس طرح وہ بیان کررہا ہے اسی طرح ہوا تھا، یعنی اس نے جھوٹی قسم کھانے کی نیت سے قسم نہیں کھائی، بلکہ اپنے نزدیک سچ سمجھ کر قسم کھائی، لیکن بعد میں پتہ چلا کہ یہ خیال غلط تھا اور حقیقت میں وہ بات صحیح نہیں تھی تو اس کو بھی لغو کی قسم میں داخل کیا گیا ہے۔ اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی گناہ نہیں ہے، کیونکہ اس نے جھوٹ بولنے کے ارادے سے جھوٹ نہیں بولا یا جھوٹی قسم کھانے کے ارادے سے قسم نہیں کھائی، بلکہ اپنے خیال کے مطابق اس نے سچی قسم کھائی ہے، اگرچہ حقیقت اس کے برعکس نکلی، لہٰذا اللہ تعالیٰ اس پر بھی گرفت نہیں کرے گا۔

اسی بات کے پیشِ نظر اس آیت میں کہا گیا کہ ﴿لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ﴾ ''اللہ تمہاری لغو قسموں پر تمہاری گرفت نہیں کرے گا۔'' اگرچہ اس آیت نے بتا دیا کہ اس قسم پر کوئی گناہ نہیں ہے، تاہم پھر بھی انسان کو چاہیے کہ وہ قسم کھانے میں احتیاط سے کام لے اور ایسی قسم سے بھی پرہیز کرے۔

---

(۱) بدائع الصنائع في ترتيب الشرائع (۳/۳) دار الكتب العلمية

﴿وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا كَسَبَتْ قُلُوْبُكُمْ﴾ ''لیکن تم سے ان قسموں پر گرفت کرے گا جو تم نے اپنے دلوں کے ارادے سے کھائی ہوں گی،'' یعنی دل کا ارادہ ہے کہ میں قسم ہی کھانا چاہتا ہوں، محض تکیۂ کلام یا محاورے کے طور پر لفظِ قسم استعمال نہیں ہو رہا، بلکہ قصد اور ارادے سے قسم کھائی جا رہی ہے۔ اس سے مراد جھوٹی قسم ہے جس میں انسان ماضی کے کسی واقعے کو بیان کرتے ہوئے جان بوجھ کر جھوٹی قسم کھاتا ہے، اس صورت میں اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے اس پر تمہاری گرفت ہوگی۔

تاہم ساتھ میں یہ بھی فرما دیا کہ ﴿وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ۝۲۲۵﴾ ''اور اللہ تعالیٰ بہت بخشنے والا، بڑا بردبار ہے۔'' اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ اگر کسی نے قسم کے معاملے میں اب تک بے احتیاطیاں کی ہیں تو اب اللہ تعالیٰ سے معافی مانگ لے اور آئندہ کے لیے اپنے آپ کو ایسی قسموں سے بچانے کا تہیہ کر کے اللہ تعالیٰ سے معافی مانگے گا تو اللہ تعالیٰ مغفرت کرنے والے بھی ہیں اور حلیم و بردبار بھی ہیں۔ وہ اپنے غضب سے کبھی مغلوب نہیں ہوتے، لہٰذا اگر تم اس سے معافی مانگو گے تو وہ معاف کر دیں گے اور ساتھ ہی ایسی جھوٹی قسم پر کوئی کفّارہ بھی نہیں دینا پڑے گا۔

قَسم کی ایک اور قِسم جو ''منعقدہ'' کہلاتی ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ کوئی شخص مستقبل کے بارے میں قسم کھالے کہ میں فلاں کام کروں گا یا فلاں کام نہیں کروں گا، پھر قسم کی مخالفت کرے۔ اس صورت میں مخالفت کی وجہ سے اُسے کفّارہ دینا ہوگا۔ اس کا حکم تفصیل کے ساتھ ان شاء اللہ تعالیٰ سورۂ مائدہ، آیت نمبر ۸۹ میں آئے گا۔

ایلاء کا قانون اور اس سے متعلق شرعی احکام

قسم کی حقیقت اور اس کے بنیادی احکام ذکر کرنے کے بعد اب اس خاص قِسم کا بیان کرنا مقصود ہے جو ''ایلاء'' کے نام سے مشہور تھی اور جس کے بارے میں اوپر بتایا گیا کہ ''ایلاء'' اس قسم کو کہتے تھے کہ جس میں کوئی شخص یہ قسم کھالے کہ میں اپنی بیوی سے صحبت نہیں کروں گا۔[1] یہ طریقہ زمانۂ جاہلیت میں رائج تھا جس کے نتیجے میں بیوی غیر معینہ مدت تک لٹکی رہتی تھی، نہ اسے بیوی جیسے حقوق ملتے اور نہ وہ کہیں اور شادی کر سکتی تھی۔

اس آیت میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے زمانۂ جاہلیت میں رائج ''ایلاء'' کے طریقِ کار کی اصلاح کرتے

---

(۱) الإيلاء: ''عبارة عن منع النفس عن قربان المنكوحة أربعة أشهر فصاعدا منعا مؤكدا باليمين.'' العناية شرح الهداية (۱۸۸/٤) دار الفكر بيروت.

ہوئے یہ قانون بنادیا کہ جو شخص یہ قسم کھائے کہ میں اپنی بیوی کے پاس نہیں جاؤں گا، تو اگر وہ چار مہینے کے اندر اندر اپنی قسم توڑ کر بیوی کے پاس چلا جائے اور کفّارہ ادا کر کے بیوی سے اپنے تعلقات بحال کرلے تو یہ بہت اچھی بات ہے، ورنہ اگر چار مہینے گزر گئے اور اس نے اپنی قسم سے رجوع نہ کیا، یعنی اپنی قسم نہ توڑی اور کفّارہ ادا کر کے اپنی بیوی کے پاس نہ گیا تو اس صورت میں چار مہینے گزرنے پر خود بخود طلاق پڑ جائے گی اور بیوی اس کے نکاح سے نکل جائے گی اور یہ طلاق، ''طلاقِ بائن'' ہوگی۔ اب بیوی کو اختیار ہوگا کہ وہ آزاد ہوکر اپنا فیصلہ کرے اور عدّت گزار کر کہیں دوسری جگہ نکاح کرنا چاہے تو کرسکے گی، البتہ اگر دونوں کے درمیان آپس میں تعلقات استوار ہوجاتے ہیں اور بیوی چاہتی ہے کہ میں اپنے پہلے شوہر کے پاس چلی جاؤں، تو دونوں آپس میں باہمی رضامندی سے نئے مہر پر نیا نکاح کرسکتے ہیں۔

ایلاء کے اسی حکم کو بیان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿لِلَّذِيْنَ يُؤْلُوْنَ مِنْ نِّسَآئِهِمْ﴾ ''جو لوگ اپنی بیویوں سے ایلاء کرتے ہیں،'' یعنی ان کے پاس نہ جانے کی قسم کھالیتے ہیں تو ان کے لیے ﴿تَرَبُّصُ اَرْبَعَةِ اَشْهُرٍ﴾ ''چار مہینے کی مہلت ہے،'' یعنی چار مہینے کے اندر اندر اگر وہ چاہیں تو رجوع کرلیں، چنانچہ ﴿فَاِنْ فَآءُوْ﴾ ''اگر وہ رجوع کرلیں،'' اور رجوع کرنے کے معنیٰ یہی ہیں کہ وہ قسم توڑ کر کفّارہ ادا کر کے بیوی کے پاس چلے جائیں، ایسی صورت میں ان کا نکاح باقی رہے گا اور ﴿فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۲۲۶﴾﴾ ''بے شک اللہ تبارک وتعالیٰ بہت بخشنے والا بڑا مہربان ہے۔''

جب ایلاء کرنے والے شخص نے اپنے اس عمل سے رجوع کرلیا تو گویا اسے اپنے اس عمل پر ندامت ہوئی کہ میں نے یہ ٹھیک کام نہیں کیا تھا، لہٰذا رجوع کر کے اس نے خود کو اس برے کام سے علیحدہ کرلیا اور کفّارہ ادا کر کے ایک طرح سے اللہ تبارک وتعالیٰ سے توبہ کرلی، لہٰذا اس کے بارے میں اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتے ہیں کہ وہ ''غَفُوْرٌ'' ہیں یعنی بہت بخشنے والے ہیں اور ''رَّحِيْمٌ'' ہیں یعنی بہت رحم فرمانے والے ہیں۔ اس واسطے وہ تمہاری اس غلطی کو بھی معاف فرمادیں گے اور تمہارے میاں بیوی کے تعلقات بھی بحال ہوجائیں گے۔

ایلاء میں چار ماہ گزرنے پر طلاق کا طریقِ کار

﴿وَاِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ﴾ اور اگر انہوں نے طلاق ہی کی ٹھان لی ہو ﴿فَاِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۲۷﴾﴾ ''تو یاد رکھو کہ اللہ تعالیٰ خوب سننے والا خوب جاننے والا ہے۔''

''طلاق ہی کی ٹھان لی ہو'' والے جملے کی تفسیر میں فقہائے کرام کی رائے میں تھوڑا اختلاف پیدا ہوا ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا مسلک یہ ہے کہ طلاق کی ٹھان لینے کے معنیٰ یہ ہیں کہ جب چار مہینے گزر گئے اور رجوع نہ کیا تو رجوع کیے بغیر چار مہینے گزار دینا یہ بذاتِ خود طلاق کی ٹھان لینا ہے، لہٰذا جونہی چار مہینے گزریں گے تو خود بخود طلاق واقع ہوجائے گی، جبکہ بعض فقہائے کرام اس کا مطلب یہ بیان فرماتے ہیں کہ طلاق کی ٹھان لینے یا طلاق کا عزم کرلینے سے مراد یہ ہے کہ گویا چار مہینے گزر گئے اور اس نے نہ رجوع کیا نہ زبان سے طلاق دی، تو اب عورت کو حق حاصل ہے کہ وہ عدالت میں جاکر وہاں سے طلاق کا فیصلہ حاصل کرے۔ اس مسئلے میں یہ تھوڑا سا اختلاف ضرور ہے، لیکن حنفی مسلک کے مطابق جونہی چار مہینے گزریں گے تو طلاق خود بخود واقع ہوجائے گی، اس کے لیے عدالت جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ (۱)

مطلقہ عورتوں کی عدت کا حکم

چونکہ ''ایلاء'' میں یا تو یہ ہوسکتا ہے کہ مرد زبان سے ہی طلاق دے دے یا چار مہینے گزرنے پر خود بخود طلاق واقع ہوجائے، پھر چاہے مرد نے خود طلاق دی ہو، چاہے عدالت سے حاصل کی گئی ہو، چاہے ایلاء کی مدت گزرنے سے خود بخود طلاق واقع ہوگئی ہو، ان تمام صورتوں میں جب عورت مطلقہ ہوگئی تو اس کو عدت گزارنی ہے۔ یہاں اللہ تبارک و تعالیٰ اس عدت کا حکم بیان فرمارہے ہیں کہ ﴿وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ﴾ ''اور جن عورتوں کو طلاق دے دی گئی ہے وہ تین مرتبہ حیض آنے تک اپنے آپ کو انتظار میں رکھیں،'' یعنی ان کی عدت یہ ہے کہ ان کو تین مرتبہ ایامِ ماہواری پورے ہوجائیں۔

یہاں یہ بات ذہن میں رہنی چاہیے کہ یہ جو تین مہینے کے بجائے تین ماہواری مدت قرار دی گئی ہے، یہ ان خواتین کے لیے ہے جن کو ماہواری آتی ہو، کیونکہ جن کو ماہواری آتی ہو، ان کے لیے عدت تین ماہواریاں ہی ہیں، وہ چاہے جتنے دن میں بھی پوری ہوجائیں، چنانچہ بعض اوقات وہ تین مہینے سے کم میں بھی پوری ہوسکتی ہیں اور بعض اوقات وہ مدت تین مہینے سے زیادہ میں پوری ہوسکتی ہے۔ بہرحال! اصل حکم یہ ہے کہ جن عورتوں کو ماہواری آتی ہو، ان کی طلاق کی عدت یہ ہے کہ ان کی تین ماہواریاں گزرجائیں۔ اور جن خواتین کو

---

(۱) كما في الدر المختار وحاشية ابن عابدين (رد المحتار) (۴۲۷/۳): (قوله: بانت بواحدة) أي بطلقة واحدة، وقوله: بمضيها: أي بسبب مضي المدة وأشار إلى أنه لا حاجة إلى إنشاء تطليق، أو الحكم بالتفريق خلافا للشافعي كما أفاده في الهداية.''

ماہواری نہ آتی ہو، یعنی ان کو حیض آنا بند ہوگیا ہو، تو قرآنِ کریم نے آگے دوسری جگہ یہ بھی بیان فرمایا ہے کہ ان کے لیے عدت تین مہینے ہوگی،(۱) لیکن اگر حیض آتا ہے تو پھر عدت تین ماہواریاں ہی شمار ہوں گی۔

عدت کے دراز ہونے کے اندیشے سے حمل چھپانا جائز نہیں

البتہ اگر ان ماہواریوں کے دوران پتہ چلے کہ عورت کو حمل ہے تو پھر اس کی عدت مختلف ہے، یعنی جب تک بچہ پیدا نہ ہوجائے اس وقت تک عدت باقی رہتی ہے۔ فرض کیجیے کہ کسی مطلقہ خاتون کی جب پہلی ماہواری کا وقت آیا تو اسے حیض نہیں آیا اور پتہ چلا کہ حمل ہے، تو اب چونکہ حمل ابھی ابھی ظاہر ہوا ہے اور عین ممکن ہے کہ وہ حمل کم از کم نو مہینے تک رہے اور پھر اس کے بعد ولادت ہو، تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس کی عدت کی مدت تین مہینے کے بجائے نو مہینے تک آگے بڑھ جائے گی۔ اگر حمل ظاہر نہ ہوتا، تو تین ماہواریاں آنے سے اس کی عدت گزر جاتی، جو عام طور سے تین مہینے یا اس کے لگ بھگ مدت میں آجایا کرتی ہیں۔ اسی طرح کبھی یہ بھی ہوسکتا ہے کہ حمل طلاق سے بہت پہلے سے موجود ہو تو اس لیے طلاق کے بعد بہت جلد اس کا بچہ پیدا ہوجائے تو اس صورت میں مدت تین ماہ سے کم بھی ہوسکتی ہے۔

اگر حمل کے نتیجے میں عدت کی مدت بڑی لمبی ہو رہی ہو، تو اس میں کسی عورت کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہوسکتا ہے، کیونکہ پہلے تو وہ محض تین مہینے گزرنے پر ہی، یعنی تین ماہواریاں آنے پر ہی عدت ختم سمجھ کر دوسری جگہ نکاح کرسکتی تھی، لیکن اب حمل ظاہر ہوگیا تو اس کے نتیجے میں اس کو نو مہینے تک انتظار کرنا پڑے گا جیسا کہ پیچھے مثال میں ذکر کیا گیا، تو اس کی وجہ سے بعض اوقات کسی عورت کے دل میں یہ خیال پیدا ہوسکتا ہے کہ میں اس حمل کو چھپالوں، تاکہ عدت جلدی ختم ہوجائے۔

اس بارے میں باری تعالیٰ فرمارہے ہیں کہ ﴿وَ لَا يَحِلُّ لَهُنَّ اَنْ يَّكْتُمْنَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ فِيْٓ اَرْحَامِهِنَّ﴾ ''اور ان عورتوں کے لیے حلال نہیں ہے کہ اللہ نے ان کے رحم میں جو کچھ (یعنی حمل یا حیض) پیدا کیا ہے اسے چھپائیں،'' یعنی اپنی صورتِ حال کو چھپانا ان کے لیے جائز نہیں ہے، لہٰذا اگر حیض ہے تو بتادیں کہ حیض آرہا ہے اور اگر حمل ہے تو اس کو واضح کردیں کہ مجھے حمل ہے۔ عدت کے دراز ہونے کے اندیشے سے یا کسی اور وجہ سے اس کو چھپانے کی کوشش نہ کریں، کیونکہ اس بات کے پوشیدہ کرنے سے عدت

---

(۱) ﴿وَالّٰٓـِٔيْ يَئِسْنَ مِنَ الْمَحِيْضِ مِنْ نِّسَآىِٕكُمْ اِنِ ارْتَبْتُمْ فَعِدَّتُهُنَّ ثَلٰثَةُ اَشْهُرٍ﴾ [الطلاق: ۴]

کا حساب غلط ہو جائے گا۔ ﴿اِنْ كُنَّ يُؤْمِنَّ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ﴾ ''اگر وہ اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتی ہوں۔'' یعنی اللہ تعالیٰ پر اور آخرت کے دن پر یقین رکھنے کا تقاضا یہ ہے کہ صحیح بات بتا دیں ورنہ کہیں ایسا نہ ہو کہ قیامت میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس نافرمانی پر سزا ہو جائے۔

طلاقِ رجعی میں شوہر کو رجوع کا حق حاصل ہے

آگے فرمایا: ﴿وَبُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِيْ ذٰلِكَ﴾ ''اور ان کے شوہر اس بات کے زیادہ حقدار ہیں کہ وہ ان کو اپنی زوجیت میں لوٹا لائیں۔'' ''بُعُوْلَتُهُنَّ'' کا معنیٰ ہے ان کے شوہر، یعنی جو ان کے سابق شوہر ہیں اور جنہوں نے ان کو طلاق دی تھی، ان کے بارے میں فرمایا کہ اگر ان کے شوہر عدت کے دوران ان عورتوں کو اپنی زوجیت میں واپس لانا چاہیں تو ان کو حق حاصل ہے ﴿اِنْ اَرَادُوْٓا اِصْلَاحًا﴾ ''اگر وہ اصلاح کرنا چاہتے ہوں'' اور حالات بہتر بنانا چاہتے ہوں۔

یہ اس صورت کا ذکر ہے جب کسی خاتون کو اس کے شوہر نے طلاقِ رجعی دی ہو اور عورت طلاقِ رجعی کی عدت گزار رہی ہو۔ طلاقِ رجعی سے بھی اگرچہ طلاق واقع ہو جاتی ہے، لیکن عدت کے دوران شوہر کو طلاق واپس لینے کا حق ہوتا ہے۔ یہاں اسی صورت کا ذکر ہو رہا ہے کہ اگر کسی نے اپنی بیوی کو طلاقِ رجعی دی اور عدت کے دوران وہ یہ چاہتا ہے کہ اب حالات بہتر بنا لیے جائیں تو اس صورت میں اس کو حق ہے یا وہ اس بات کا زیادہ حقدار ہے کہ اپنی اس بیوی کو واپس اپنی زوجیت میں لے لے۔

عائلی زندگی میں آپس کے حقوق سے متعلق ایک جامع نصیحت

یہاں پر ﴿وَبُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِيْ ذٰلِكَ...﴾ کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے خواتین کو یہ حکم دیا ہے کہ انہیں شوہروں کے اس حق کو تسلیم کرنا چاہیے، لیکن ساتھ ہی اللہ تعالیٰ نے آگے متنبہ فرما دیا کہ ﴿وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِيْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ﴾ ''ان خواتین کو بھی ویسے ہی حقوق حاصل ہیں جیسی ذمہ داریاں ان کے اوپر شوہروں کی ہیں،'' یعنی شوہروں کی جیسی ذمہ داریاں اور حقوق بیویوں کے اوپر ہیں، ویسے ہی حقوق بیویوں کو بھی شوہروں کے اوپر حاصل ہیں۔ دونوں کے باہمی تعاون سے ہی یہ گاڑی چلتی ہے، لہٰذا مرد کا یہ سمجھنا کہ سارے حقوق میرے ہی ہیں اور بیوی کا کوئی حق نہیں ہے، یہ بڑی زیادتی کی بات ہے۔

میاں بیوی کے حقوق ایک دوسرے پر برابر ہونے کے باوجود اللہ تعالیٰ نے مردوں کو عورتوں پر ایک درجہ کی برتری عطا فرمائی ہے۔ اسی بات کو بیان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ﴿وَ لِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ﴾ ''اور مردوں کو ان عورتوں پر ایک درجہ فوقیت ہے،'' وہ فوقیت کیا ہے؟ اس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے سورۂ نساء کی آیت نمبر ۳۴ میں بیان فرمایا ہے،(۱) ان شاء اللہ اُس موقع پر اس حوالے سے تفصیل سے گفتگو کی جائے گی، اور وہ آیت ہے:

اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ

مرد عورتوں پر نگران ہیں۔

اس کا حاصل یہ ہے کہ یہ دنیا کی زندگی ایک سفر ہے، اور اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہر شعبۂ زندگی میں اس شعبے کو نظم وضبط کا پابند بنانے کے لیے یہ مناسب سمجھا ہے کہ جب ایک سے زیادہ افراد کوئی کام کررہے ہوں تو اپنے میں سے کسی کو امیر بنالیں۔ فرض کیجیے کہ اگر چند آدمی سفر پر جارہے ہیں تو ان کے لیے مناسب ہے کہ وہ اپنوں میں سے کسی کو امیر منتخب کرلیں اور پھر لوگ اُس کی اطاعت کے تحت کام کریں۔ جیسا کہ نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ارشاد فرمایا کہ:

''جب تین آدمی سفر پر روانہ ہوں تو اپنے میں سے ایک شخص کو امیر بنالیں۔''(۲)

لہٰذا جب سفر میں امیر بنانے کی تاکید کی گئی ہے تو معاشرتی زندگی کے اس دائمی سفر میں تو اس کی اہمیت اور زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ جیسے لوگوں کی اس طرح بھیڑ جمع ہوجائے کہ ان کا کوئی امیر اور سربراہ نہ ہو، تو اس سے سوائے انارکی پھیلنے کے کچھ فائدہ حاصل نہیں ہوسکتا، اسی طرح زندگی کا سفر بھی ایسا ہی ہے کہ اس میں میاں بیوی جب اکٹھے زندگی کا سفر طے کررہے ہیں تو ان کے لیے ضروری ہے کہ ان میں سے کوئی ایک ان کا امیر ہو اور اللہ تعالیٰ نے زندگی کے سفر میں امارت وسربراہی کا یہ منصب مرد کو عطا کیا ہے۔

---

(۱) دیکھیے: ''آسان تفسیرِ قرآن'' جلدِ چہارم، سورۃ النساء، آیت نمبر: ۳۴۔ عنوان: ''معاشرتی زندگی اور میاں بیوی کے حقوق سے متعلق اہم ہدایات۔''

(۲) أخرجه أبو داود (۳/۳۶) (۲۶۰۹) كتاب الجهاد، باب في القوم يسافرون يؤمرون أحدهم. وذكره النووي في "المجموع" (٤/٢٨٢) وقال: "هذا حديث حسن رواه أبو داود بإسناد حسن." الناشر: دار الفكر، وأخرجه البزار (١/٤٦٣) من حديثِ عمر بن خطاب رضي الله عنه، قال الهيثمي في "المجمع" (٥/٤٦٤): "رواه البزار، ورجاله رجال الصحيح خلا عمار بن خالد وهو ثقة."

یہ بات ذہن میں رہنی چاہیے کہ مرد کو امیر بنانے کے یہ معنیٰ نہیں ہیں کہ وہ بات بے بات حکم چلایا کرے، بلکہ مقصد یہ ہے کہ زندگی کے سفر کو نظم وضبط کا پابند بنانے کے لیے اس کو سربراہ اور امیر کا درجہ دیا گیا ہے، اور جہاں تک حقوق کا تعلق ہے تو اللہ تعالیٰ نے فرمادیا کہ ''عورتوں کے ویسے ہی حقوق ہیں جیسے کہ ان کے ذمے شوہروں کے حقوق ہیں۔'' لہٰذا کسی مرحلے پر بھی کسی عورت کی حق تلفی کرنے سے متعلق اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں متنبہ فرمادیا ہے اور حکم دیا ہے کہ ان کے حقوق ادا کیے جائیں۔

نیز اس خاص موقع پر جب کہ اس بات کا ذکر ہو رہا ہے کہ عدت کے دوران اگر کوئی شوہر حالات بہتر بنانے کے لیے رجوع کرنا چاہتا ہے تو اس کو حق حاصل ہے، لیکن ساتھ ساتھ یہ بھی یاد دلایا جارہا ہے کہ جس طرح تمہارے حقوق ہیں، اسی طرح تمہاری بیوی کے بھی حقوق ہیں، اگر ان کو واپس لانا چاہتے ہو تو شرافت کے ساتھ اور صحیح طریقے سے، صحیح ازدواجی تعلق کے ساتھ ان کو اپنے ساتھ رکھنا ہوگا، ان کے حقوق کو تسلیم کرتے ہوئے حقوق کی ادائیگی کا اہتمام کرنا ہوگا۔

پھر آگے فرمایا: ﴿وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿٢٢٨﴾﴾ ''اور اللہ تعالیٰ غالب اور حکمت والا ہے،'' اللہ تعالیٰ چونکہ غالب ہے، لہٰذا تمہاری کسی بھی بدعملی پر تمہیں دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی سزا دے سکتا ہے، اور ساتھ میں حکیم بھی ہے یعنی حکمت والا ہے، لہٰذا اسی کو سزا دیتا ہے جس کو سزا دینا اس کی حکمت کے مطابق ہوتا ہے، اور وہی سزا دیتا ہے جو اس کی حکمت کے مطابق ہوتی ہے، اور اسی وقت سزا دیتا ہے جب اس کی حکمت کے مطابق سزا دینے کا مناسب وقت ہوتا ہے۔

آیت نمبر ۲۲۹ تا ۲۳۱

اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ ۪ فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ ؕ وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ
اَنْ تَاْخُذُوْا مِمَّآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ شَيْـًٔا اِلَّآ اَنْ يَّخَافَآ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ؕ
فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ۙ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيْمَا افْتَدَتْ بِهٖ ؕ
تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَعْتَدُوْهَا ۚ وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ
الظّٰلِمُوْنَ ﴿٢٢٩﴾ فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ ؕ

فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَآ اَنْ يَّتَرَاجَعَآ اِنْ ظَنَّآ اَنْ يُّقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ؕ وَتِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ يُبَيِّنُهَا لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ﴿۲۳۰﴾ وَ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ سَرِّحُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ ۪ وَّلَا تُمْسِكُوْهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوْا ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ ؕ وَلَا تَتَّخِذُوْٓا اٰيٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا ۠ وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمَآ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنَ الْكِتٰبِ وَالْحِكْمَةِ يَعِظُكُمْ بِهٖ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۲۳۱﴾ ع

الجزء ۲ ع ۲۹ ۳ ۱۳

طلاق (زیادہ سے زیادہ) دو بار ہونی چاہیے، اس کے بعد (شوہر کے لیے دو ہی راستے ہیں) یا تو قاعدے کے مطابق (بیوی کو) روک رکھے (یعنی طلاق سے رجوع کرلے) یا خوش اسلوبی سے چھوڑ دے (یعنی رجوع کے بغیر عدت گزر جانے دے) اور (اے شوہرو!) تمہارے لیے حلال نہیں ہے کہ تم نے ان (بیویوں) کو جو کچھ دیا ہو وہ (طلاق کے بدلے) ان سے واپس لو، الّا یہ کہ دونوں کو اس بات کا اندیشہ ہو کہ (نکاح باقی رہنے کی صورت میں) اللہ کی مقرّر کی ہوئی حدود کو قائم نہیں رکھ سکیں گے، چنانچہ اگر تمہیں اس بات کا اندیشہ ہو کہ وہ دونوں اللہ کی حدود کو قائم نہ رکھ سکیں گے تو ان دونوں کے لیے اس میں کوئی گناہ نہیں ہے کہ عورت مالی معاوضہ دے کر علیحدگی حاصل کرلے۔ یہ اللہ کی مقرّر کی ہوئی حدود ہیں؛ لہٰذا ان سے تجاوز نہ کرو۔ اور جو لوگ اللہ کی حدود سے تجاوز کرتے ہیں وہ بڑے ظالم لوگ ہیں۔ (۲۲۹) پھر اگر شوہر (تیسری) طلاق دے دے تو وہ (مطلقہ عورت) اس کے لیے اس وقت تک حلال نہیں ہوگی جب تک وہ کسی اور شوہر سے نکاح نہ کرے، ہاں اگر وہ (دوسرا شوہر بھی) اسے طلاق دے دے تو ان دونوں پر کوئی گناہ نہیں کہ وہ ایک دوسرے کے پاس (نیا نکاح کر کے) دوبارہ واپس آجائیں، بشرطیکہ انہیں یہ غالب گمان ہو کہ اب وہ اللہ کی حدود قائم

رکھیں گے، اور یہ سب اللہ کی حدود ہیں جو وہ ان لوگوں کے لیے واضح کر رہا ہے جو سمجھ رکھتے ہوں۔ (۲۳۰) اور جب تم نے عورتوں کو طلاق دے دی ہو اور وہ اپنی عدت کے قریب پہنچ جائیں، تو یا تو ان کو بھلائی کے ساتھ (اپنی زوجیت میں) روک رکھو، یا انہیں بھلائی کے ساتھ چھوڑ دو، اور انہیں ستانے کی خاطر اس لیے روک کر نہ رکھو کہ ان پر ظلم کرسکو، اور جو شخص ایسا کرے گا وہ خود اپنی جان پر ظلم کرے گا، اور اللہ کی آیتوں کو مذاق مت بناؤ اور اللہ نے تم پر جو انعام فرمایا ہے اسے اور تم پر جو کتاب اور حکمت کی باتیں تمہیں نصیحت کرنے کے لیے نازل کی ہیں انہیں یاد رکھو، اور اللہ سے ڈرتے رہو، اور جان رکھو کہ اللہ ہر چیز کو خوب جانتا ہے۔ (۲۳۱)

طلاق کے معاملے میں دیگر مذاہب کی اِفراط وتفریط اور اسلام کا عادلانہ نظام

ان آیات میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے طلاق کے احکام قدرے تفصیل کے ساتھ بیان فرمائے ہیں اور جس پسِ منظر میں بیان فرمائے ہیں، اس کو سمجھنا ان آیات کی عظیم حکمتوں کو سمجھنے کے لیے شاید ضروری ہوگا۔ قرآنِ کریم کے نزول سے پہلے جو مختلف معاشرے دنیا میں پائے جاتے تھے، ان میں طلاق کے سلسلے میں بڑی اِفراط وتفریط (کمی زیادتی) کا مظاہرہ ہوتا تھا۔ ایک طرف عیسائی مذہب میں اصل مذہب کے احکام کے مطابق طلاق دینے کو بالکل حرام قرار دیا گیا تھا اور ایک جملہ بائبل میں مذکور ہے جسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف منسوب کیا جاتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا:

”جس نے اپنی بیوی کو طلاق دے کر کسی دوسری عورت سے نکاح کیا، اس نے زنا کیا۔“(۱)

(۱) انجیل مرقس (۱۰:۱۱-۱۲) راجع للتفصیل: تکملة فتح الملهم، (۱/۱٤٤)- دار إحياء التراث العربي بيروت.

جس کے معنیٰ یہ ہیں کہ جب ایک مرتبہ دو میاں بیوی نکاح کے رشتے میں بندھ گئے، تو اب اس نکاح کے رشتے کو ختم کرنے کا کوئی راستہ نہیں، طلاق دینا بالکل حرام ہے، چنانچہ عیسائیت کے شروع کے زمانے میں اسی حکم پر عمل ہوتا تھا اور اس کے نتیجے میں بعض اوقات ایسی مصیبت کھڑی ہوجاتی تھی کہ میاں بیوی دونوں کے مزاج کسی طرح مل نہیں رہے، دونوں کے درمیان لڑائی جھگڑا چلتا رہتا اور دونوں سمجھ رہے ہوتے کہ ہم ایک دوسرے کے ساتھ زندگی نہیں گزار سکتے، لیکن اس کے باوجود چونکہ طلاق دینا حرام تھا اس لیے وہ سخت مصیبت میں زندگی گزارتے تھے اور طلاق دینے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔

پھر رفتہ رفتہ جب یہ مصیبتیں بڑھیں تو ایک دوسری صورت نکالی گئی کہ اچھا اگر تمہارے درمیان نباہ نہیں ہوتا، تو طلاق تو نہیں دے سکتے، البتہ یہ کر سکتے ہو کہ دونوں الگ الگ رہو، جس کو ''جسمانی افتراق'' کا قانون کہا جاتا تھا، یعنی کہ جسمانی طور پر وہ ایک دوسرے سے الگ رہیں، اور الگ الگ رہتے ہوئے بھی نکاح باقی رہتا، چنانچہ نہ شوہر دوسرا نکاح کرسکتا اور نہ بیوی دوسرا نکاح کرسکتی۔ یہ صورتِ حال بھی انتہائی سخت پریشانی لانے والی تھی، کیونکہ ایک تو میاں بیوی ایک دوسرے سے الگ رہ رہے ہیں اور باہمی ملاپ کی کوئی صورت نہیں، اور پھر وہ آگے شادی بھی نہیں کرسکتے، جس کے نتیجے میں وہ لٹکے رہتے تھے۔ عیسائی مذہب میں رائج اس طریقۂ کار کے مطابق طلاق کے دروازے کو بالکلیہ بند کردینا، انسانیت کے لیے ایک تکلیف دہ صورتِ حال تھی۔

دوسری طرف جاہلیت کے زمانے میں عربوں کے یہاں یہ طریقہ تھا کہ ان کے یہاں نہ صرف یہ کہ شوہر کے لیے طلاق دینا جائز تھا، بلکہ اس کی کوئی حد بھی مقرر نہیں تھی، شوہر جتنی دفعہ طلاق دینا چاہتا، دے سکتا تھا، چنانچہ بہت سے شوہر اپنی بیویوں پر یہ ظلم ڈھاتے تھے کہ طلاق دے دیتے اور پھر طلاق کے بعد جب چاہتے اس کو واپس لے لیتے اور اس طرح وہ دوبارہ ان کی زوجیت میں آجاتیں۔ اسی طرح پھر دوبارہ یا سہ بارہ کسی موقع پر طلاق دیتے اور پھر واپس لے آتے۔ اگر دسیوں مرتبہ بھی طلاق دے دی ہوتی تو پھر بھی شوہر کو یہ حق حاصل ہوتا تھا کہ بیوی کی مرضی کے بغیر اُسے اپنی زوجیت میں واپس لے آئے، نتیجہ یہ کہ عورت ہمیشہ کے لیے اسی مرد کے ساتھ لٹکی رہتی تھی۔

• طلاق سے متعلق اسلام کا حکیمانہ نظام

عیسائیت اور زمانۂ جاہلیت میں رائج طلاق سے متعلق اِفراط وتفریط والے نظریات کے مقابلے میں

قرآنِ کریم نے جو احکام بیان فرمائے ہیں وہ ہر قسم کے اِفراط وتفریط سے پاک ہیں۔ اس معتدل اور حکیمانہ نظام سے متعلق چند اہم پہلو سمجھ لینا ضروری ہے تاکہ آگے آنے والی آیات کا سمجھنا آسان ہوجائے۔

①.... پہلی بات تو یہ سمجھ لیجیے کہ قرآنِ کریم سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ نکاح کسی وقتی جذبے، وقتی مصلحت یا کسی وقتی فائدے کے حصول کے لیے نہیں ہونا چاہیے، بلکہ یہ زندگی بھر کا ایک سنجوگ (بندھن) اور معاہدہ ہے۔ اس لیے قرآنِ کریم میں نکاح کے اس بندھن کو بھاری اور مضبوط عہد قرار دیتے ہوئے فرمایا گیا کہ:

وَ اَخَذْنَ مِنْكُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا (۱)

اور عورتوں نے تم سے ایک بھاری عہد لیا ہے۔

نکاح کا معاملہ میاں بیوی دونوں کے درمیان ایک معاہدہ ہوتا ہے کہ ہم دونوں ایک ساتھ اکٹھی زندگی گزاریں گے، لہٰذا اس کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ حتی الامکان اس معاہدے کو باقی رکھنے کی کوشش کی جائے اور اس کو توڑنے کی نوبت نہ آنے پائے یا کم سے کم آئے۔ اسی واسطے حدیث میں نبیِ کریم سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد منقول ہے کہ:

أَبْغَضُ الْحَلَالِ إِلَى اللهِ تَعَالَى الطَّلَاقُ (۲)

جائز اور مباح چیزوں میں اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ مبغوض یعنی ناپسندیدہ چیز طلاق ہے۔

چونکہ طلاق اللہ تعالیٰ کے ہاں ناپسندیدہ چیز ہے اس لیے جب تک ایسے ناگزیر حالات نہ ہوجائیں کہ دونوں کے درمیان نباہ ممکن نہ ہو تو اس وقت تک طلاق کا اقدام نہیں کرنا چاہیے۔

لیکن دوسری طرف جب طبیعتوں کا اختلاف اتنا بڑھ جائے کہ آپس میں نباہ کرنا ممکن ہی نہ رہے، تو پھر اس رشتے کو زبردستی تھوپے رہنا بھی دونوں کی زندگی برباد کرسکتا ہے، اس لیے ایسے حالات میں طلاق کو اصل عیسائی مذہب کی طرح ناجائز بھی قرار نہیں دیا گیا، بلکہ اُس کا ایک شریفانہ طریقہ تجویز فرمادیا گیا ہے۔

---

(۱) سورۃ النساء (۴): آیت (۲۱)

(۲) سنن أبي داود (۲۵۵/۱)(۲۱۷۸) كتاب الطلاق،باب في كراهية الطلاق، وسنن ابن ماجه (۴۲۶/۳) (۲۰۱۸) والمستدرك للحاكم (۲۱۴/۲)(۲۷۹۴) وقال: "صحيح الإسناد، ووافقه الذهبي في التلخيص."

②...دوسری بات قرآنِ کریم نے یہ بتائی کہ طلاق ایسی چیز نہیں ہے جو محض غصہ نکالنے کی غرض سے استعمال کی جائے، اور ایک ہی لمحے میں آدمی تینوں طلاقیں دے کر ہمیشہ کے لیے اس طرح رشتہ توڑ دے کہ آئندہ تعلقات استوار ہونے کا راستہ بالکل بند ہوجائے، بلکہ اس کا مناسب طریقہ قرآنِ کریم نے یہ بتایا ہے کہ طلاق زیادہ سے زیادہ دو مرتبہ دی جائے۔ پھر طلاق دینے میں بھی احادیث سے جو بہتر طریقہ معلوم ہوتا ہے وہ یہ کہ:

- ایک تو حالتِ حیض میں طلاق نہ دی جائے۔
- اور دوسرے یہ کہ عورت کو طلاق ایسے طہر میں دی جائے جس میں اس کے ساتھ صحبت نہ کی ہو۔

اس سے معلوم ہوا کہ ایک تو حیض کی حالت میں طلاق دینا ناجائز ہے، دوسرے اُس طہر میں طلاق دینا بھی ناجائز ہے جس میں عورت کے ساتھ صحبت کر لی گئی ہو، اس کی ایک حکمت یہ بھی ہے کہ ایسے زمانے میں طلاق نہ دی جائے جس میں بیوی کی طرف شوہر کی رغبت کم ہوجاتی ہے، اور طلاق اس وقتی بے رغبتی کا نتیجہ نہ ہو، بلکہ سوچ سمجھ کر دی جائے، لہٰذا ان دو چیزوں کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔ یہ حکم قرآنِ کریم کی سورۂ طلاق کی پہلی آیت: ''فَطَلِّقُوْهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ'' سے بھی ماخوذ ہے۔

اس حکم کی دوسری حکمت یہ ہے کہ عورت کی عدت طویل نہ ہو، کیونکہ اگر حیض کی حالت میں طلاق دی گئی، تو موجودہ حیض عدت میں شمار نہ ہوگا، بلکہ اس حیض کے بعد ایک طہر اور پھر اس طہر کے بعد والے حیض سے عدت شمار ہوگی، اور اسی طرح جس طہر میں ہمبستری ہوچکی ہو اگر اس میں طلاق دی گئی تو اس بات کا امکان ہے کہ حمل ٹھہر جائے اور چونکہ حاملہ کی عدت وضعِ حمل ہوتی ہے، اس لیے مطلقہ بیوی کی عدت بچے کی پیدائش تک لمبی ہوجائے گی۔

• دو طلاقوں کے بعد کے دو اختیار

اس تمہید کے بعد اب ان آیات کا ترجمہ ملاحظہ کیجیے کہ کس طرح اللہ ربُّ العزت نے طلاق دینے کے صحیح طریقے کی طرف رہنمائی فرمائی ہے، چنانچہ فرمایا: ﴿اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ﴾ ''طلاق زیادہ سے زیادہ دو مرتبہ ہی ہونی چاہیے،'' اور پھر اس کا حکم بتایا کہ جب تک وہ طلاق دو سے آگے نہیں بڑھی، چاہے شوہر نے ایک مرتبہ طلاق دی ہو یا دو مرتبہ، لیکن دو سے زیادہ ابھی تک نہیں دی، تو اب شوہر کے لیے دو ہی راستے ہیں:

- پہلا راستہ یہ ہے کہ: ﴿فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ﴾ ''یا تو قاعدے کے مطابق بیوی کو روک رکھے،'' یعنی جب تک عورت کی عدت نہیں گزری تو عدت کے دوران اس کو رجوع کرنے کا حق حاصل ہے، اس سے پہلے پہلے اگر وہ اپنی طلاق کو واپس لینا چاہے تو یکطرفہ طور پر بھی واپس لے سکتا ہے اور جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے کہ عدت تین ماہواری ہوتی ہے، لہٰذا تین ماہواری گزرنے سے پہلے پہلے وہ بیوی کو واپس لینا چاہے یا رجوع کرنا چاہے تو کرسکتا ہے۔

مرد کو ایک یا دو طلاق کے بعد رجوع کا اختیار دینے کے ساتھ ساتھ ﴿بِمَعْرُوْفٍ﴾ کی قید بھی لگادی گئی ہے، یعنی اس کو رکھنا ہے تو پھر ''قاعدے کے مطابق'' رکھنا ہوگا۔ قاعدے کے مطابق رکھنے کے معنیٰ یہ ہیں کہ یہ نہ ہو کہ وہ اسے اس نیت سے رکھ رہا ہو کہ اب میں اس کو دوبارہ اپنے ظلم وستم کا نشانہ بناؤں گا اور دوبارہ اس کے ساتھ بدسلوکی کروں گا۔ اسی طرح اگر اس کے دل میں ظلم وستم کی نیت نہ بھی ہو، لیکن حسنِ سلوک کی بھی نیت نہ ہو، تو یہ بھی جائز نہیں۔ جب واپس لینا ہو تو پھر اس نیت سے واپس لے کہ میں اس کے ساتھ وہی طرزِ عمل اختیار کروں گا جو اللہ تعالیٰ کی رضا کے مطابق ہو اور میں اسے نیکی وخوش اسلوبی کے ساتھ رکھوں گا۔

- ﴿اَوْ﴾ ''یا'' پھر شوہر کے پاس دوسرا راستہ یہ ہے کہ ﴿تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ﴾ ''اسے خوش اسلوبی سے چھوڑ دے۔'' خوش اسلوبی سے چھوڑنے کے معنیٰ یہ ہیں کہ دو طلاقیں دینے کے بعد اسے نہ مزید طلاق دے اور نہ رجوع کر کے طلاق کو واپس لے۔ اس طرح عدت گزرنے کے بعد خود بخود عورت نکاح سے نکل جائے گی، اب شوہر کو رجوع کرنے کا حق نہیں رہے گا اور عورت جہاں چاہے نکاح کرسکتی ہے۔

• خلع کے احکام وشرائط

پیچھے دو طلاقوں کا حکم بیان کیا گیا ہے، ابھی تیسری طلاق کا ذکر نہیں آیا، لیکن بیچ میں ایک اور مسئلہ بیان فرما دیا جو ایسے حالات میں عموماً زیرِ بحث آتا ہے۔ وہ یہ کہ بعض مرتبہ کچھ مرد ایسے ہوتے ہیں کہ مزاج نہ ملنے کے سبب عورت ان کے ساتھ زندگی نہیں گزارنا چاہ رہی ہوتی یا شوہر بیوی کے اوپر ظلم کرتا ہے، جبکہ بیوی اس سے خلاصی حاصل کرنا چاہتی ہے اور اس مقصد کے لیے اس سے طلاق کا مطالبہ کرتی ہے، تو اس کے جواب

میں شوہر کہتا ہے کہ ''مجھے اتنے پیسے دو تو میں تمہیں طلاق دوں گا۔'' اب شوہر بعض اوقات اتنے پیسے مقرّر کر دیتا کہ بے چاری عورت کے لیے ان کا دینا بہت مشکل یا ناممکن ہو جاتا، نتیجہ یہ کہ وہ عورت اسی شوہر کے ساتھ رہنے پر مجبور ہو جاتی۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے اوّل تو شوہروں کو مخاطب کرتے ہوئے یہ فرمایا کہ اے شوہرو! ﴿وَ لَا يَحِلُّ لَكُمْ﴾ اور تمہارے لیے حلال نہیں ہے ﴿اَنْ تَاْخُذُوْا مِمَّآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ شَيْـًٔا﴾ ''کہ تم نے ان بیویوں کو (مہر یا تحفوں کی شکل میں) جو کچھ دیا ہو، اس کو ان سے واپس لو،'' یعنی مہر یا نفقے یا تحفے کی واپسی کا مطالبہ کرنا تمہارے لیے حلال نہیں ہے۔ ﴿اِلَّآ اَنْ يَّخَافَآ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ﴾ ''ہاں البتہ اگر میاں بیوی دونوں اس بات سے ڈرتے ہوں کہ (نکاح باقی رہنے کی صورت میں) وہ اللہ کی حدود کو قائم نہ کر سکیں گے،'' یعنی ان کو یہ اندیشہ ہو کہ ہم ایک دوسرے کے حقوق ادا نہیں کر پائیں گے، اور ہماری زندگی کی گاڑی ایک ساتھ نہیں چل سکتی۔ ﴿فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ﴾ چنانچہ اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ وہ دونوں اللہ کی حدود قائم نہ رکھ سکیں گے تو اس موقع پر ﴿فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيْمَا افْتَدَتْ بِهٖ﴾ ''ان دونوں کے لیے اس میں کوئی گناہ نہیں ہے کہ عورت مالی معاوضہ دے کر علیحدگی حاصل کر لے۔'' اسی کو اصطلاح میں ''خلع'' کہتے ہیں۔

یہاں بتلانا یہ مقصود ہے کہ ویسے تو مردوں کے لیے حلال نہیں ہے کہ وہ عورتوں کو دیے ہوئے مہر کی واپسی کا مطالبہ کریں یا انہوں نے جو کچھ ہدیے تحفے ان کو دیے ہیں وہ ان سے واپس لینے کا مطالبہ کریں، ایسا کرنا حلال نہیں ہے، البتہ اگر اس بات کو دونوں سمجھ رہے ہوں کہ زندگی کی گاڑی مزید آگے چل نہیں سکتی، اللہ تعالیٰ نے جس طرح میاں بیوی کو رہنے کا حکم دیا ہے اس طرح رہنا ممکن نہیں ہے اور اللہ کی حدود قائم نہیں رہ سکتیں تو خلع کی یہ صورت اختیار کی جا سکتی ہے۔ آیت کے آخر میں فرمایا: ﴿تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَعْتَدُوْهَا﴾ یہ اللہ کی مقرّر کی ہوئی حدود ہیں؛ لہٰذا ان سے تجاوز نہ کرو۔ ﴿وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۲۲۹﴾﴾ ''اور جو لوگ اللہ کی حدود سے تجاوز کرتے ہیں وہ بڑے ظالم لوگ ہیں۔''

• زیادتی شوہر کی طرف سے ہو تو طلاق پر معاوضہ لینا جائز نہیں

خلع کی شرائط میں سے ایک بات یہ بھی شامل ہے کہ زیادتی عورت کی طرف سے ہو، مرد کی طرف سے زیادتی نہ ہو، جیسا کہ احادیث اور فقہ کے احکام کے تحت بیان کیا گیا ہے۔ اگر زیادتی شوہر کی طرف سے ہے،

تو پھر شوہر کے لیے خلع کرنا بالکل جائز نہیں ہے،[1] ایسی صورت میں اس کو چاہیے کہ بغیر کسی معاوضے کے بیوی کو طلاق دے دے۔ لیکن اگر غلطی شوہر کی نہیں ہے اور پھر اس بات کا خیال ہے کہ دونوں اللہ کی حدود کو قائم نہیں رکھ سکیں گے، تو اس صورت میں بیوی اگر پیشکش کرے کہ میں مہر یا اس کا کچھ حصہ واپس دیتی ہوں، تو پھر دونوں کو باہمی رضا مندی سے اس خلع کو قبول کر لینے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

• خلع کے فیصلے میں خاندان کی مشاورت

یہاں پر خلع کی بات کے درمیان فرمایا: ﴿فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا يُقِيمَا حُدُودَ اللَّهِ﴾ ''اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ وہ دونوں اللہ کی حدود قائم نہ رکھ سکیں گے۔'' اس میں میاں بیوی کے جو رشتے دار اور ان کے خاندان والے یا پڑوسی ہیں، ان کو بھی خطاب ہو رہا ہے کہ اگر تمہیں اس بات کا اندیشہ ہو کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ زندگی نہیں گزار سکتے اور وہ اللہ کی حدود کو قائم نہیں کر پائیں گے، تو پھر ﴿فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيمَا افْتَدَتْ بِهِ﴾ ''دونوں پر اس بارے میں کوئی گناہ نہیں ہے کہ عورت کوئی فدیہ دے کر اپنی جان چھڑا لے۔''

اس سے بظاہر یوں لگ رہا ہے کہ خلع کا فیصلہ دونوں میاں بیوی محض اپنی تنہا رائے سے نہ کریں، بلکہ خاندان والوں کو بھی بیچ میں ڈالیں، تاکہ وہ اس بات کا جائزہ لے سکیں کہ واقعی ان کا نباہ ممکن ہے یا نہیں ہے؟ اور کیا واقعۃً ایسی صورت میں شوہر کے لیے مناسب ہے کہ وہ طلاق دینے کے لیے یا خلع کرنے کے لیے عورت سے پیسوں یا مہر کی واپسی کا مطالبہ کرے؟ اس بات کا اطمینان کرانے کے لیے ساتھ میں خاندان والوں کو بھی شامل کیا گیا ہے، تاکہ یہ بات محض جذباتی انداز کی نہ ہو اور جلد بازی میں کوئی فیصلہ نہ کیا جائے، بلکہ خاندان کی رائے کے ساتھ اس کا فیصلہ کیا جائے۔

• خلع میں پورا مہر واپس لینا مناسب نہیں

بہرحال! اگر اس طرح فیصلہ ہو جائے تو خلع ہو سکتا ہے اور خلع ہونے کے نتیجے میں عورت و مرد کا نکاح

---

(۱) الدر المختار وحاشية ابن عابدين (رد المحتار) (۳/۴۴۵): ''(قوله: وكره تحريما أخذ الشيء) أي قليلا كان، أو كثيرا. والحق أن الأخذ إذا كان النشوز منه حرام قطعا - ﴿فَلَا تَأْخُذُوا مِنْهُ شَيْئًا﴾ [النساء: ۲۰]''

آپس میں فسخ ہوجاتا ہے۔ البتہ یہاں پر یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ فقہائے کرام [1] نے قرآنِ کریم کی اس آیت سے یہ مسئلہ بھی نکالا ہے کہ اگرچہ خلع کے اندر کوئی بھی معاوضہ طے کیا جاسکتا ہے، لیکن شوہر کے لیے مناسب نہیں ہے کہ وہ مہر سے زیادہ رقم کا مطالبہ کرے۔ زیادہ سے زیادہ عوض مہر کی واپسی کی حد تک رکھنا چاہیے، بلکہ بہتر یہ ہے کہ شوہر پورے مہر کی واپسی کا مطالبہ نہ کرے، بلکہ اس کے کچھ حصے کا مطالبہ کرے، کیونکہ خلع کی بات شروع کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے جو تعبیر اختیار فرمائی ہے، وہ یہ ہے کہ ﴿وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا مِمَّآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ شَيْـًٔا﴾ ''جو کچھ تم نے اس کو دیا اس میں سے کوئی حصہ واپس نہ لو۔'' پھر آگے خاص حالات میں اس کی اجازت دی ہے، تو اجازت بظاہر اسی چیز کی ہوئی جس کی عام حالات میں ممانعت کی گئی تھی، اور وہ ہے ''جو کچھ تم نے اس کو دیا اس کا کوئی حصہ۔''

اس سے اشارہ اس طرف نکل رہا ہے کہ پورے کے پورے مہر کا واپس لینا بھی شوہر کے لیے مناسب نہیں ہے، بلکہ وہ مہر کا کچھ حصہ خلع کے طور پر مقرّر کرے تو بہتر ہے، وہ بھی اس صورت میں جب کہ زیادتی شوہر کی طرف سے نہ ہو، کیونکہ جس بیوی کے ساتھ ایک عرصہ گزرا اور تم نے اس سے فائدہ بھی اٹھایا، اس کے بعد اگر وہ علیحدگی چاہتی ہے تو اس سے یہ مطالبہ کرنا کہ میں نے جو کچھ بھی تمہیں بیوی کی حیثیت سے دیا تھا، وہ سارے کا سارا واپس کرو ایک طرح کی بے مروّتی ہے، اس لیے بہتر یہ ہے کہ مہر سے کچھ کم پر خلع کیا جائے۔

• تیسری طلاق کے بعد رجوع ممکن نہیں

خلع کا یہ حکم بیچ میں بیان کرنے کے بعد آگے اللہ تبارک وتعالیٰ نے تیسری طلاق کا حکم بیان فرمایا، یعنی اوپر تو یہ بیان فرمایا تھا کہ طلاق زیادہ سے زیادہ دو مرتبہ ہونی چاہیے اور اس کا صحیح طریقہ یہی ہے کہ دو مرتبہ سے زیادہ آدمی طلاق نہ دے، لیکن اگر کوئی تیسری بار بھی طلاق دے ڈالے تو اس کا حکم آگے بیان فرمایا کہ ﴿فَاِنْ طَلَّقَهَا﴾ پھر اگر شوہر (دو طلاقوں کے بعد تیسری) طلاق بھی دے دے ﴿فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ﴾ تو پھر اب وہ بیوی طلاق دینے والے کے لیے تیسری طلاق کے بعد حلال نہیں

---

(۱) كما في الدر المختار (٤٤٥/٣): (وكره) تحريما (أخذ شيء) ويلحق به الإبراء عما لها عليه (إن نشز وإن نشزت لا) ولو منه نشوز أيضا ولو بأكثر مما أعطاها على الأوجه فتح، وصحح الشمني كراهة الزيادة، وتعبير الملتقى لا بأس به يفيد أنها تنزيهية وبه يحصل التوفيق.

رہے گی، جب تک کہ وہ کسی اور شوہر سے نکاح نہ کرے، پھر وہ دوسرا شوہر بھی اسے کسی وجہ سے طلاق نہ دے دے۔

• تین طلاقوں کے بعد واپسی کی صورت

جیسا کہ میں نے پہلے ذکر کیا تھا، جاہلیت کے زمانے میں عورتوں کو لامتناہی طلاقیں دینے اور پھر روک لینے کا رواج چلا آتا تھا، اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا کہ اب طلاق کی ایک حد مقرّر ہوگئی ہے کہ تین طلاقوں کے بعد پھر تمہیں نہ واپس لینے کا اختیار ہے نہ اس کے ساتھ باہمی رضا مندی سے دوسرا نکاح کرنے کا اختیار ہے، کیوں کہ تم نے نکاح جیسے مقدّس رشتے کو پامال کیا اور اللہ تعالیٰ نے اس کا جو طریقہ بتایا تھا، جس طرح طلاق دینے کو کہا تھا کہ دو طلاقوں سے آگے نہ بڑھنا، اس طریقے کو ملحوظ نہیں رکھا، بلکہ ساری حدیں پھلانگ گئے۔ اب تمہاری سزا یہ ہے کہ اب تم دوبارہ اس عورت سے نکاح نہیں کرسکتے جس کے ساتھ تم نے یہ بے وفائی کی ہے، لہٰذا اس نکاح کو تمہارے لیے از سرِ نو تازہ کرنا جائز نہیں ہے۔

البتہ اگر وہ عورت کسی اور شخص سے اپنی مرضی سے نکاح کرلے اور دونوں میاں بیوی کی طرح ساتھ رہیں، ان کے درمیان میاں بیوی کے مخصوص تعلقات بھی قائم ہوں اور وہ ایک دوسرے سے صحبت بھی کریں، پھر اگر ان دونوں کے درمیان بھی نباہ نہ ہوسکے اور وہ دوسرا شوہر بھی اس عورت کو طلاق دے دے، تو پھر اس عورت کے لیے جائز ہوگا کہ اگر وہ چاہے تو پہلے شوہر سے دوبارہ نئے مہر پر نیا نکاح کرلے۔

تین طلاقوں کے بعد واپسی کی اسی صورت کو ذکر کرتے ہوئے آگے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ﴿فَاِنْ طَلَّقَهَا﴾ پھر اگر وہ (دوسرا شوہر بھی) اس کو طلاق دے دے تو ﴿فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَآ﴾ ان دونوں (پہلے میاں بیوی) پر کوئی گناہ نہیں ہے کہ ﴿اَنْ يَّتَرَاجَعَآ﴾ وہ ایک دوسرے کو واپس لے لیں ﴿اِنْ ظَنَّآ اَنْ يُّقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ﴾ ''بشرطیکہ ان کو یہ غالب گمان ہو کہ وہ اب اللہ کی حدود کو قائم رکھ سکیں گے،'' یعنی اللہ تبارک وتعالیٰ نے نکاح میں رہنے کا جو طریقہ بیان فرمایا ہے اور جن احکام اور ہدایات کی تعلیم دی ہے، اگر ان کے دل میں غالب گمان ہے کہ وہ ان احکام و ہدایات کے مطابق زندگی گزار سکیں گے، تو پھر وہ دوبارہ آپس میں ایک دوسرے سے اپنا رشتہ تازہ کرسکتے ہیں۔ ﴿وَتِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ يُبَيِّنُهَا لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ﴿۲۳۰﴾﴾ ''اور یہ اللہ کی حدود ہیں جو اللہ تعالیٰ ان لوگوں کے سامنے واضح کرتا ہے جو سمجھ رکھتے ہوں۔''

• پہلے مرد کے لیے دوبارہ حلال ہونے کے شرعی تقاضے

پہلے شوہر کے پاس دوبارہ واپس جانے کی جو استثنائی صورت بتائی ہے کہ اب وہ عورت کسی دوسرے شوہر سے نکاح کرلے، اس کو ''حلالہ'' سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ محض ایک حیلہ کرنے کی غرض سے یا محض وقتی طور پر ایک تقاضا پورا کرنے کی غرض سے کوئی نکاح کرلیا جائے، کیونکہ اس طرح عارضی طور پر نکاح کر لینے کی شریعت میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔

شریعت نے نکاح ایک ایسا رشتہ بنایا ہے جو ہمیشہ قائم رہنے والا ہو، چنانچہ اس کا تقاضا یہ ہے کہ یہ رشتہ اسی نیت سے کیا جائے کہ ہم ہمیشہ ایک دوسرے کے ساتھ رہیں گے۔ اگر وقتی طور پر کوئی نکاح کیا جاتا ہے تو وہ یا تو ''متعہ'' ہوتا ہے یا متعہ کے مشابہ ہوتا ہے اور اس کو اللہ تعالیٰ نے جائز قرار نہیں دیا۔ اگر پہلے سے نیت یہ ہو کہ ہم اس کو کچھ دیر کے بعد طلاق دے دیں گے اور پھر یہ دوبارہ اپنے شوہر کے لیے حلال ہوجائے گی تو اس طرح کی نیت رکھنا یا یہ شرط لگانا بالکل مناسب نہیں اور قرآنِ کریم کے منشأ کے بھی خلاف ہے۔

قرآنِ کریم کا منشأ یہ ہے کہ وہ خود اپنی مرضی سے اور باقاعدہ کسی دوسرے شوہر سے ہمیشہ اور پائیدار رہنے والا نکاح کرے اور پھر وہ شوہر کسی مجبوری کے تحت اسے طلاق دے دے تو اس صورت میں اس کے لیے واپسی کی گنجائش موجود ہے۔ اگر دل میں نیت تھی کہ یہ نکاح جو ہم کررہے ہیں یہ تھوڑے دنوں کے لیے ہے اور اس کے بعد خود ہی طلاق دے دیں گے تو جیسا کہ میں نے عرض کیا یہ قرآنِ کریم کا منشأ نہیں ہے، لیکن اگر کوئی اس طرح کرگزرے، تو چونکہ نیتوں کا حال تو اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے، ہم تو اس کے ظاہر کے اوپر حکم لگاتے ہیں اور ظاہری اعتبار سے انہوں نے نکاح کیا تھا اور اس کے بعد طلاق بھی دے دی ہے، اس واسطے وہ عورت ظاہری طور پر پہلے شوہر کے لیے حلال تو ہوجائے گی، لیکن ایسا کرنا قرآنِ کریم کے منشأ کے مطابق نہیں اور ایک شریف آدمی کے لیے ایسا کام کرنا کسی طرح بھی درست نہیں۔

• بیوی کو ستانے کے لیے اپنے پاس رکھنا جائز نہیں

جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا، جاہلیت کے زمانے میں لوگ بیویوں کو طلاق دے دیتے اور پھر جب عدت گزرنے کا وقت قریب آتا تو رجوع کرلیتے، تاکہ وہ دوسرا نکاح نہ کرسکیں، پھر اس کے حقوق ادا کرنے کے بجائے کچھ عرصے کے بعد پھر طلاق دیتے اور عدت گزرنے سے پہلے رجوع کرلیتے اور اس طرح وہ غریب

بیچ میں لٹکی رہتی، نہ کسی اور سے نکاح کرسکتی اور نہ شوہر سے اپنے حقوق حاصل کرسکتی، اس طرح کرنے سے بیویوں کو ستانا مقصود ہوتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ ستانا کسی طرح بھی تمہارے لیے حلال نہیں ہے، چنانچہ جاہلیت کے زمانے کی اس ظالمانہ رسم کو صراحتاً ختم کرتے ہوئے فرمایا: ﴿وَ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ﴾ جب تم نے عورتوں کو طلاق دے دی ہو ﴿فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ﴾ ''اور وہ اپنی عدت کے قریب پہنچ جائیں،'' یعنی جب عدت مکمل ہونے کے قریب ہورہی ہے، تو اب دو باتوں میں سے ایک کا فیصلہ کرنا ہے:

- ﴿فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ﴾ ''یا تو ان کو قاعدے کے مطابق (بھلائی کے ساتھ) اپنی زوجیت میں روک رکھو،'' یعنی وہی سابقہ بات کہ اب یہ پیمان تازہ کرلو کہ ہم اچھی طرح، اچھے میاں بیوی کی حیثیت سے رہیں گے، لہٰذا اس صورت میں عدت کے گزرنے سے پہلے پہلے پھر اپنی طلاق کو واپس لے لو۔
- ﴿اَوْ سَرِّحُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ﴾ یا پھر اس کو بھلائی کے ساتھ چھوڑ دو، یعنی عدت گزر جانے دو اور اس کے بعد پھر وہ تمہارے نکاح سے نکل جائیں گی۔

﴿وَّ لَا تُمْسِكُوْهُنَّ﴾ اور ان کو روکے نہ رکھو ﴿ضِرَارًا﴾ ستانے کے لیے ﴿لِّتَعْتَدُوْا﴾ تاکہ تم ان پر ظلم کرو ﴿وَ مَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ﴾ ''اور جو شخص ایسا کرے گا وہ خود اپنی جان پر ظلم کرے گا،'' یعنی جو شخص ستانے کی خاطر بیوی کو اپنے پاس رکھنا چاہے گا تو وہ اس پر تو ظلم کر ہی رہا ہوگا، لیکن حقیقت میں وہ اپنی جان پر بھی ظلم کر رہا ہے، کیونکہ اس کا خمیازہ اسے آخرت میں بھگتنا پڑے گا، اور اللہ تعالیٰ کے عذاب کا سامنا کرنا پڑے گا۔

﴿وَ لَا تَتَّخِذُوْٓا اٰيٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا﴾ ''اور اللہ کی آیتوں کو مذاق نہ بناؤ،'' یعنی جو حکم جس طرح دیا جارہا ہے لفظاً و معناً اس کے اوپر اسی طرح عمل کرو اور اس کا مذاق نہ بناؤ۔ ان احکام میں بڑی حکمتیں اور مصلحتیں پوشیدہ ہیں، ان میں حیلے کرنا یا تکلیف پہنچانے والی اغراض کو شامل کرنا، مثلاً رجوع کرنے سے عورت کو تنگ کرنا مقصود ہو، تو گویا یہ اللہ تعالیٰ کی آیات کا مذاق اڑانا ہے۔

﴿وَّ اذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ﴾ ''اور یاد رکھو اللہ کی نعمت کو جو تم پر اللہ تعالیٰ نے کی ہے،'' یعنی ایمان کی ہدایت اور اللہ تعالیٰ کے احکام پر مبنی قرآنی ہدایات، ﴿وَ مَآ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنَ الْكِتٰبِ﴾ اور تمہارے اوپر جو کتاب نازل کی ہے ﴿وَ الْحِكْمَةِ﴾ اور جو حکمت کی باتیں نازل کی ہیں ﴿يَعِظُكُمْ بِهٖ﴾ ''جس کے

ذریعے وہ تمہیں نصیحت کررہا ہے،'' ان سب کو یاد رکھو ﴿وَاتَّقُوا اللّٰهَ﴾ اور اللہ سے ڈرتے رہو ﴿وَاعْلَمُوْٓا﴾ اور یہ بات یاد رکھو کہ ﴿اَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿٢٣١﴾﴾ ''اللہ تعالیٰ ہر بات کو جاننے والا ہے،'' لہٰذا اگر تم کوئی حیلے بہانے کر کے اللہ تعالیٰ کے حکم سے انحراف کرنا چاہو گے تو اللہ تعالیٰ سب جانتا ہے، تمہاری نیتوں سے بھی باخبر ہے، تمہارے ارادوں سے بھی باخبر ہے، لہٰذا یہ نہ سمجھنا کہ تم نے اللہ تعالیٰ کو دھوکہ دے دیا ہے۔

آیت نمبر ۲۳۲ تا ۲۳۳

وَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ اَنْ يَّنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ اِذَا تَرَاضَوْا بَيْنَهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ ۭ ذٰلِكَ يُوْعَظُ بِهٖ مَنْ كَانَ مِنْكُمْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ ذٰلِكُمْ اَزْكٰى لَكُمْ وَاَطْهَرُ ۭ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿٢٣٢﴾ وَالْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ ۭ وَعَلَي الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۭ لَا تُكَلَّفُ نَفْسٌ اِلَّا وُسْعَهَا ۚ لَا تُضَاۗرَّ وَالِدَةٌۢ بِوَلَدِهَا وَلَا مَوْلُوْدٌ لَّهٗ بِوَلَدِهٖ ۚ وَعَلَي الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ ۚ فَاِنْ اَرَادَا فِصَالًا عَنْ تَرَاضٍ مِّنْهُمَا وَتَشَاوُرٍ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا ۭ وَاِنْ اَرَدْتُّمْ اَنْ تَسْتَرْضِعُوْٓا اَوْلَادَكُمْ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِذَا سَلَّمْتُمْ مَّآ اٰتَيْتُمْ بِالْمَعْرُوْفِ ۭ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿٢٣٣﴾

اور جب تم نے عورتوں کو طلاق دے دی ہو، اور وہ اپنی عدّت کو پہنچ جائیں، تو (اے میکے والو!) انہیں اس بات سے منع نہ کرو کہ وہ اپنے (پہلے) شوہروں سے (دوبارہ) نکاح کریں، بشرطیکہ وہ بھلائی کے ساتھ ایک دوسرے سے راضی ہوگئے ہوں۔ ان باتوں کی نصیحت تم میں سے ان لوگوں کو کی جارہی ہے جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہوں۔ یہی تمہارے لیے زیادہ ستھرا اور پاکیزہ طریقہ ہے۔ اللہ جانتا ہے اور تم

نہیں جانتے۔ (۲۳۲) اور مائیں اپنے بچوں کو پورے دو سال تک دُودھ پلائیں۔ یہ مدت ان کے لیے ہے جو دُودھ پلانے کی مدت پوری کرنا چاہیں، اور جس باپ کا وہ بچہ ہے اس پر واجب ہے کہ وہ معروف طریقے پر ان ماؤں کے کھانے اور لباس کا خرچ اُٹھائے۔ (ہاں) کسی شخص کو اس کی وسعت سے زیادہ تکلیف نہیں دی جاتی۔ نہ تو ماں کو اپنے بچے کی وجہ سے ستایا جائے، اور نہ باپ کو اپنے بچے کی وجہ سے، اور اسی طرح کی ذمہ داری وارث پر بھی ہے۔ پھر اگر وہ دونوں (یعنی والدین) آپس کی رضامندی اور باہمی مشورے سے (دو سال گزرنے سے پہلے ہی) دودھ چھڑانا چاہیں، تو اس میں بھی ان پر کوئی گناہ نہیں ہے، اور اگر تم یہ چاہو کہ اپنے بچوں کو کسی انا سے دُودھ پلواؤ تو بھی تم پر کوئی گناہ نہیں، جبکہ تم نے جو اُجرت ٹھہرائی تھی وہ (دُودھ پلانے والی انا کو) بھلے طریقے سے دے دو، اور اللہ سے ڈرتے رہو، اور جان رکھو کہ اللہ تمہارے سارے کاموں کو اچھی طرح دیکھ رہا ہے۔ (۲۳۳)

طلاق کے بعد دوبارہ پہلے شوہر سے نکاح سے منع کرنے کی ممانعت

ان آیاتِ کریمہ میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے طلاق کے نتیجے میں پیدا ہونے والے بعض اہم مسائل کا ذکر فرمایا ہے۔ ان میں سے ایک مسئلہ یہ ہے کہ بعض اوقات ایسا ہوتا تھا کہ کسی شوہر نے اپنی بیوی کو طلاق دی اور عدت گزر گئی اور طلاق اس نے اسی طرح دی تھی جیسے کہ شریعت میں دینے کا طریقہ ہے، یعنی ایک طلاق دی یا دو طلاقیں دیں، البتہ تین طلاقیں نہیں دی تھیں۔ طلاق کے بعد عدت گزر گئی، اب عدت گزرنے کے بعد بعض اوقات ایسا ہوتا تھا کہ میاں بیوی دونوں کو پچھتاوا ہوتا تھا کہ ہم نے اپنے نکاح کے رشتے کو ختم کرکے غلطی کی ہے اور اب ہم اگر اپنی زندگی کو دوبارہ صحیح بنیادوں پر استوار کرنا چاہیں تو کرسکتے ہیں، چنانچہ وہ چاہتے تھے کہ دوبارہ نکاح ہوجائے۔

شرعاً بھی اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس کی اجازت دی تھی کہ جب تک تین طلاقیں نہ دی گئی ہوں، دوبارہ دوسرا نکاح باہمی رضامندی سے اور نئے مہر پر کیا جا سکتا ہے، لیکن بکثرت ہوتا یہ تھا کہ بعض مرتبہ عورت کے میکے والے، عورت کو پچھلے شوہر سے نکاح کرنے سے منع کرتے تھے اور کہتے تھے کہ اب ہم تمہیں اس شوہر کے پاس نہیں جانے دیں گے جس نے تمہیں پہلے طلاق دی تھی، گویا ایک طرح سے اس کو اپنی غیرت اور انا کا

مسئلہ بنا لیتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ چونکہ شوہر نے ایک مرتبہ طلاق دے دی ہے، لہٰذا ہم اس کو دوبارہ نکاح کا رشتہ استوار کرنے کی اجازت نہیں دیں گے۔ اگرچہ عورت کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے نکاح کے معاملے میں یہ اختیار دیا ہے کہ اگر وہ خود بھی اپنا نکاح کرنا چاہے تو اس کی اجازت ہے، لیکن ہوتا یہ تھا کہ میکے والوں کے دباؤ کی وجہ سے وہ عورت نکاح کرنے سے قاصر رہتی تھی۔

اس پسِ منظر میں بات کرتے ہوئے باری تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ﴾ اور جب تم نے عورتوں کو طلاق دے دی ہو ﴿فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ﴾ ''اور وہ اپنی عدت کو پہنچ جائیں،'' یعنی اپنی عدّت کی میعاد پوری کرلیں، تو ﴿فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ﴾ ان کو منع نہ کرو ﴿اَنْ يَّنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ﴾ کہ وہ نکاح کریں اپنے سابق شوہروں سے ﴿اِذَا تَرَاضَوْا بَيْنَهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ﴾ ''جب کہ ان کے درمیان بھلائی کے ساتھ آپس میں رضا مندی سے بات طے ہوگئی ہو،'' یعنی اب جبکہ دونوں کو پچھتاوا ہونے کے ساتھ ساتھ اپنی سابقہ غلطیوں کا اندازہ بھی ہوگیا اور اس کا خمیازہ بھی بھگت لیا ہے، نیز انہوں نے آپس میں طے کرلیا ہے کہ اب وہ اپنی آئندہ کی زندگی بھلائی کے ساتھ گزاریں گے تو اب اصلاح کی امید کی جاسکتی ہے، لہٰذا اب کوئی وجہ نہیں ہے کہ ان کو آپس میں نکاح سے روکا جائے۔

یہ نکتہ بھی قابلِ ذکر ہے کہ عورتوں کے اپنے سابق شوہر کے پاس واپس جانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے ایک شرط تو یہ لگائی ہے کہ ﴿اِذَا تَرَاضَوْا بَيْنَهُمْ﴾ ''جب وہ ایک دوسرے سے راضی ہو جائیں،'' اور دوسری شرط یہ ہے کہ یہ واپسی ﴿بِالْمَعْرُوْفِ﴾ ہو، یعنی بھلائی کے ساتھ ہو، لہٰذا اگر آپس کے اس نکاح میں ان دونوں کی رضامندی نہ ہو اور کوئی کسی پر زور زبردستی کرنا چاہے، تو سب کو روکنے کا حق ہے یا اسی طرح رضامندی بھی ہو، مگر شرعی قاعدہ کے موافق نہ ہو، مثلاً بلا نکاح آپس میں میاں بیوی کی طرح رہنے پر رضامند ہوجائیں، یا تین طلاقوں کے بعد ناجائز طور پر آپس میں نکاح کرلیں یا ایامِ عدت میں دوسرے شوہر سے نکاح کا ارادہ ہو، تو ہر مسلمان کو بالخصوص ان لوگوں کو جن کا ان مرد وعورت کے ساتھ تعلق ہے، روکنے کا حق حاصل ہے، بلکہ بقدرِ استطاعت روکنا واجب ہے۔

مطلقہ عورت کے اولیاء کے لیے اہم نصیحتیں

پھر اللہ تبارک وتعالیٰ نے لڑکی کے میکے والوں سے یہ کہا کہ ﴿ذٰلِكَ يُوْعَظُ بِهٖ مَنْ كَانَ مِنْكُمْ يُؤْمِنُ

بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ﴾ ''ان باتوں کی نصیحت تم میں سے ان لوگوں کو کی جارہی ہے جو اللہ اور یومِ آخرت پر ایمان رکھتے ہوں۔'' اس میں اس طرف اشارہ کیا جارہا ہے کہ اگر واقعۃً تمہارا اللہ اور یومِ آخرت پر ایمان ہے تو پھر یہ بات تمہیں قبول کرنی چاہیے اور اس سے اعراض نہیں کرنا چاہیے، کیونکہ اللہ تعالیٰ پر اور روزِ قیامت پر ایمان رکھنے کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ آدمی ان احکامِ الٰہیہ کا پورا پورا پابند ہو اور جو لوگ ان احکام کی اتباع میں کوتاہی کرتے ہیں وہ سمجھ لیں کہ ان کے ایمان میں خلل ہے۔

﴿ ذٰلِكُمْ اَزْكٰى لَكُمْ ﴾ کیونکہ یہ تمہارے لیے زیادہ ستھرا ﴿ وَ اَطْهَرُ ﴾ ''اور زیادہ پاکیزہ طریقہ ہے،'' یعنی ان احکام کی پابندی تمہارے لیے پاکی اور صفائی کا ذریعہ ہے۔ اس میں اشارہ فرما دیا گیا کہ ان احکام کی خلاف ورزی گناہوں کی غلاظت میں آلودگی اور فتنہ و فساد کا سبب بنے گی۔ ﴿ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَ اَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۳۲﴾ ﴾ ''اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے،'' یعنی اللہ تعالیٰ نے تمہیں جو احکام دیے ہیں، ان کی حکمتوں اور مصلحتوں کو اللہ تعالیٰ ہی جانتے ہیں، تمہیں نہیں پتہ کہ ان احکام میں کس قدر فوائد ہیں۔

بچے کو دودھ پلانے سے متعلق نزاعات کا تصفیہ

ایک مسئلہ جو عام طور پر طلاق کے بعد کھڑا ہوتا ہے اور بعض اوقات شوہر اور بیوی کے درمیان طلاق کے بعد جھگڑوں کا سبب بھی بن جاتا ہے، وہ بچوں کی پرورش اور بچوں کے دودھ پلانے کا معاملہ ہوتا ہے، بعض اوقات مرد یہ چاہتا ہے کہ بچے کو ماں سے چھین کر کسی اور عورت سے دودھ پلوائے اور اس طرح اس غریب ماں کو بچے کی جدائی میں تڑپائے، جبکہ کبھی عورت بچے کو دودھ پلانے سے اس لیے انکار کرتی ہے کہ بظاہر مرد کے پاس دودھ پلانے والی کوئی اور عورت موجود نہیں ہوتی تو اس طرح وہ اسے پریشان کرنا چاہتی ہے۔ اس لیے اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہاں دودھ پلانے کے کچھ احکام ذکر فرمائے ہیں۔ اگرچہ باتیں تو طلاق کی چل رہی ہیں، لیکن جو احکام بیان فرمائے گئے ہیں وہ صرف طلاق کے بعد کی حالت کے ساتھ مخصوص نہیں ہیں، بلکہ جب نکاح قائم ہو، اس وقت بھی بچے کو دودھ پلانے یا دودھ چھڑانے سے متعلق یہ تمام احکام عائد ہوتے ہیں اور ان میں ایسا جامع نظام بتا دیا گیا ہے کہ جس سے جھگڑے، فساد یا کسی فریق پر ظلم و زیادتی کا راستہ بند ہوجاتا ہے۔

بچوں کو دودھ پلانے کی زیادہ سے زیادہ مدّت

پہلے تو بچوں کو دودھ پلانے کی مدّت بیان فرمادی کہ ﴿وَالْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ﴾ اور مائیں اپنے بچوں کو دودھ پلائیں ﴿حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ﴾ پورے دو سال ﴿لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ﴾ ''یہ مدّت ان کے لیے ہے جو دُودھ پلانے کی مدّت پوری کرنا چاہیں۔'' اس آیت نے بتا دیا کہ بچوں کو دودھ پلانے کی کل مدّت زیادہ سے زیادہ دو سال ہے، دو سال پورے ہونے پر ان کا دودھ چھڑانا ضروری ہے، اور چونکہ بچہ رفتہ رفتہ ہی دودھ چھوڑتا ہے اس لیے کچھ پہلے سے ہی اس کو دودھ چھڑانے کی کوشش کرنی چاہیے۔ دودھ پلانے کی زیادہ سے زیادہ مدّت جو دو سال بتائی گئی ہے، یہ طلاق کے ساتھ مخصوص نہیں ہے، بلکہ جب نکاح قائم ہو اور اس میں دودھ پلایا جارہا ہو، تب بھی دودھ پلانے کی مدت دو سال ہی ہے۔

دودھ پلانے والی عورت کا خرچہ شوہر پر ہونے کی صورتیں

پھر یہ فرمایا: ﴿وَعَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ﴾ ''اور جس باپ کا وہ بچہ ہے اس باپ پر واجب ہے کہ وہ معروف طریقے پر ان ماؤں کے کھانے اور لباس کا خرچ اُٹھائے،'' یعنی جو ماں اپنے بچوں کو دودھ پلا رہی ہے، اس کے کھانے اور لباس وغیرہ کا خرچہ بچے کے باپ پر واجب ہے، وہی یہ تمام اخراجات ادا کرے گا۔

دودھ پلانے والی عورت کے خرچ کے اعتبار سے ممکنہ طور پر درج ذیل صورتیں بن سکتی ہیں:

۱۔ اگر ماں باپ کے درمیان نکاح قائم ہے تو دودھ پلانے والی ماں کا خرچہ نکاح کی وجہ سے پہلے سے ہی شوہر پر واجب ہے۔

۲۔ اگر طلاق ہوگئی ہے اور طلاق ہونے کے بعد ماں بچے کو دودھ پلا رہی ہے تو عدّت کے دوران دودھ پلانا مطلقہ ماں پر واجب ہے اور اس دوران اس کا نفقہ طلاق دینے والے شوہر پر واجب ہوگا۔

۳۔ اگر عدت گزر گئی ہو، اور پھر بھی بچے کو ماں کے دودھ کی ضرورت ہو، تو اگرچہ ماں کے ذمے اب دودھ پلانا واجب نہیں، لیکن اگر پھر بھی وہ بچے کو دودھ پلا رہی ہو تو وہ سابق شوہر سے

عدّت کے بعد دودھ پلانے کی اجرت کا مطالبہ کرسکتی ہے۔ جیسے اگر دوسری اناؤں (دودھ پلانے والی عورتوں) کو رکھا جاتا، تو ان کو جو اجرت دی جاتی، بیوی کو بھی وہ اجرت دینا ضروری ہے اور اس کے لیے یہ مطالبہ کرنا جائز ہے۔ اب اگرچہ اس مطلقہ کی عدّت گزر جانے کی وجہ سے اس کا نفقہ شوہر پر واجب نہیں رہا، لیکن شوہر کے بچے کو دودھ پلانے کی وجہ سے وہ اجرت کی حقدار ہوگی۔

۴۔ اگر ماں کسی عذر سے دودھ نہیں پلاسکتی اور کسی اور عورت سے بچے کو پلوایا جارہا ہے تو اس کا خرچہ بھی باپ پر ہوگا، یہ آخری صورت آگے ﴿وَ اِنْ اَرَدْتُّمْ اَنْ تَسْتَرْضِعُوْٓا اَوْلَادَكُمْ﴾ کے ذیل میں آرہی ہے۔

بچے کا باپ ہونے کی حیثیت سے متوسط خرچہ کا لزوم

یہاں پر دودھ پلانے والی ماؤں کا نفقہ شوہر پر واجب ہونے کے سلسلے میں ﴿وَ عَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ﴾ کا لفظ استعمال کیا گیا، جس کا ترجمہ ہے کہ ”جس باپ کا وہ بچہ ہے“ یہ تعبیر اختیار کرکے اس طرف اشارہ کردیا گیا کہ تمہیں جو نفقہ کا پابند بنایا جارہا ہے، کہ تم دودھ پلانے والی عورت کے لباس وخوراک کا خرچہ برداشت کرو، تو وہ اس وجہ سے ہے کہ جس بچے کو وہ دودھ پلارہی ہے وہ تمہارا بچہ ہے، لہٰذا جس باپ کا وہ بچہ ہے اس پر واجب ہے کہ وہ معروف طریقے پر ان ماؤں کے کھانے اور لباس کا خرچ اٹھائے۔

آگے اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا: ﴿لَا تُكَلَّفُ نَفْسٌ اِلَّا وُسْعَهَا﴾ ”کسی بھی شخص کو اس کی وسعت سے زیادہ تکلیف نہیں دی جاتی،“ یعنی شوہر کے ذمے دودھ پلانے والی ماں کا جو خرچہ ہے تو وہ اس کی وسعت کی حد تک ہی واجب ہے، یہ نہیں کہ وہ بیچارہ مالی اعتبار سے معمولی حیثیت کا ہو اور دودھ پلانے والی اس سے بہت اعلیٰ معیار کے نفقہ کا یا لباس اور کھانے کا مطالبہ کرے۔ اللہ تعالیٰ نے کسی بھی شخص کو اس کی وسعت سے زیادہ کا مکلّف نہیں بنایا، اس واسطے اس بات کا خیال رہے کہ جو اجرت مقرّر کی جائے وہ شوہر کی مالی حیثیت کے مطابق ہی مقرّر کی جانی چاہیے۔

دودھ پلانے کی وجہ سے ماں یا باپ کو ستانا جائز نہیں

آگے دودھ پلانے سے متعلق مزید احکام بیان کرتے ہوئے فرمایا: ﴿لَا تُضَآرَّ وَالِدَةٌۢ بِوَلَدِهَا﴾

''کسی ماں کو اپنے بچے کی وجہ سے کوئی تکلیف نہ پہنچائی جائے'' مطلب یہ ہے کہ ماں اگر کسی معقول عذر کی وجہ سے دودھ نہ پلائے، مثلاً اُسے کوئی بیماری ہے، جس کی وجہ سے وہ دودھ پلانے سے واقعۃً قاصر ہے اور ایک معقول عذر کی وجہ سے وہ انکار کررہی ہے، تو پھر اس کو زبردستی مجبور کرنا کہ تم ضرور دودھ پلاؤ، چاہے تمہیں کتنی ہی تکلیف کیوں نہ ہو، یہ جائز نہیں۔

﴿وَ لَا مَوْلُوْدٌ لَّهٗ بِوَلَدِهٖ﴾ ''اور نہ مولودلہ یعنی بچے کے والد کو اپنے بچے کی وجہ سے تکلیف پہنچائی جائے۔'' مطلب یہ ہے کہ مثلاً بچہ ماں کے سوا کسی دوسری عورت کا دودھ لیتا ہی نہیں، بلکہ وہ ماں ہی سے دودھ پینے کو مُصر ہے، تو ماں کے لیے ایسی صورت میں انکار جائز نہیں۔ اس صورت میں اگر وہ انکار کرے گی، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ باپ کو تکلیف پہنچارہی ہے۔ اب وہ بے چارہ دودھ پلانے والی عورت کہاں سے لائے؟ بچے کو دودھ پلانے کا کیسے انتظام کرے؟ جبکہ وہ کسی دوسری عورت کا دودھ نہیں لیتا، لہٰذا ایسی صورت میں ماں کے لیے انکار جائز نہیں، اس صورت میں اگر وہ عورت انکار کرے گی، تو باپ کو بلاوجہ ستانے کے مترادف ہے، اس لیے اس سے منع کیا گیا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ بچے کی مصلحت کے حالات دیکھے جائیں، اور شوہر اور بیوی کے حالات کو بھی مدِّنظر رکھا جائے، تمام باتوں کو مدِّ نظر رکھ کر کوئی فیصلہ کرنا چاہیے۔ محض ضد کی وجہ سے کوئی جھگڑا پیدا کرنا درست نہیں ہے، بلکہ سب آپس میں بیٹھ کر یہ دیکھیں کہ بچے کی مصلحت کس میں ہے؟ اور جانبین میں سے کسی کو بھی بلا وجہ تکلیف پہنچانے سے گریز کیا جائے، اس طرح باہمی مفاہمت کے ذریعے اس مسئلے کو طے کیا جائے۔

دودھ پلانے کے اخراجات ورثاء پر لازم ہونے کی صورت

آگے فرمایا: ﴿وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ﴾ ''اسی طرح کی ذمہ داری وارث پر بھی ہے،'' یعنی اگر کسی بچے کا باپ زندہ نہ ہو، تو دودھ پلانے کے سلسلے میں جو ذمہ داری باپ کی تھی، اب وہ بچوں کے وارثوں پر آئے گی، مثلاً ایک بچہ ہے، اس کے والد کی ذمہ داری تھی کہ وہ اس کی ماں کو نفقہ یا اجرت دے کر یا کسی دوسری خاتون کو اجرت دے کر اس بچے کے لیے دودھ کا انتظام کرے، لیکن اب چونکہ بچے کا باپ فوت ہوچکا ہے، تو یہ ذمہ داری اب ان لوگوں پر عائد ہوگی جو اس بچے کے وارث بنیں گے۔ مثال کے طور پر اگر بچے کی ملکیت میں مال ہو، اور اس کا انتقال ہوجائے تو جو لوگ اس کے مال کے وارث بنیں گے، وہی لوگ بچے کی زندگی میں بچے کو دودھ پلانے کا خرچ بھی برداشت کریں گے۔

کمانے سے قاصر شخص کا نفقہ اور ایک اہم فقہی ضابطہ

اسی سے فقہائے کرام نے یہ بات مستنبط کی ہے کہ جو لوگ کسی کے مرنے کے بعد اس کے وارث بنتے ہیں، یعنی اس کا ترکہ اُن کو جاتا ہے، تو جب تک وہ آدمی مرا نہیں اور کسی وجہ سے وہ کمانے سے معذور ہوگیا، مثلاً وہ اتنا بیمار یا اتنا اپاہج ہوگیا کہ وہ کوئی کام کرنے سے قاصر ہے اور خود نہیں کما سکتا تو اس وقت اس کا نفقہ اور اس کا خرچہ ان لوگوں پر واجب ہوتا ہے جو اس کے مرنے کے بعد اس کے وارث بنتے ہیں۔ گویا اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہ ایک ایسا جامع نظام بنایا ہے جس میں فائدے اور ذمے داریاں متوازن طریقے سے چل رہی ہیں، اگر ایک انسان کو کسی کے مرنے کے بعد اُس کی میراث ملنے سے فائدہ پہنچتا ہے، تو پھر اس کو اس کی کچھ ذمہ داری بھی اٹھانی چاہیے اور وہ ذمہ داری یہ ہے کہ اگر وہ معذور یا اپاہج ہوجائے، تو اس کا نفقہ اس کے ذمے واجب ہوگا۔ (۱)

دو سال سے پہلے بچے کو دودھ چھڑوانا یا کسی دوسری عورت سے دودھ پلوانا

پھر آگے فرمایا: ﴿فَاِنْ اَرَادَا فِصَالًا عَنْ تَرَاضٍ مِّنْهُمَا وَ تَشَاوُرٍ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا﴾ ''پھر اگر وہ دونوں یعنی والدین، آپس کی رضامندی اور باہمی مشورے سے دو سال گزرنے سے پہلے ہی دُودھ چھڑانا چاہیں، تو اس میں بھی ان پر کوئی گناہ نہیں ہے۔''

پیچھے جو فرمایا تھا کہ دودھ پلانے کی کل مدّت دو سال ہے، تو اس سے کسی کو یہ شبہ ہوسکتا تھا کہ شاید دو سال سے پہلے دودھ چھڑانا جائز نہ ہو۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ﴿فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا﴾ فرما کر اس شبہے کو دور فرمادیا کہ بچے کے والدین اگر آپس کی رضا مندی سے دودھ چھڑانا چاہیں، تو اس مدّت سے پہلے بھی دودھ چھڑانے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے اور اس پر انہیں کوئی گناہ نہیں ہوگا۔ آپس کے مشورے اور رضامندی کی شرط اس لیے لگائی گئی تاکہ دودھ چھڑانے میں بچے کی مصلحت پیشِ نظر رہے، کہیں ایسا نہ ہو کہ آپس کے لڑائی جھگڑے کے سبب بچے کو نقصان پہنچایا جائے۔

پھر آگے فرمایا: ﴿وَ اِنْ اَرَدْتُّمْ﴾ اور اگر تم یہ چاہو کہ ﴿اَنْ تَسْتَرْضِعُوْٓا اَوْلَادَكُمْ﴾ اپنے بچوں کو کسی انا سے دُودھ پلواؤ، ﴿فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ﴾ ''تو بھی تم پر کوئی گناہ نہیں،'' یعنی کسی وجہ سے ماں سے دودھ نہیں

---

(۱) كذا في الهندية (۵٦٦/۱) [الفصل الخامس في نفقة ذوي الأرحام] الناشر: دار الفكر

پلوایا جارہا کہ یا تو ماں دودھ پلانے سے قاصر ہے، یا ماں کا دودھ ایسا ہے جو بچے کے لیے مناسب نہیں ہے یا کوئی اور معقول وجہ ہے جس کی وجہ سے ماں دودھ نہیں پلاسکتی، اور تم خود چاہتے ہو کہ ماں دودھ نہ پلائے یا بچے کے ماں باپ دونوں باہمی رضامندی سے یہ طے کرلیں کہ دودھ کسی اور عورت سے پلوایا جائے، تو ایسی صورت میں تم کسی باہر کی انا کو یا دودھ پلانے والی عورت کو رکھ سکتے ہو، اس میں کوئی حرج کی بات نہیں، بشرطیکہ ﴿اِذَا سَلَّمْتُمْ مَّآ اٰتَيْتُمْ بِالْمَعْرُوْفِ﴾ ''جبکہ تم نے جو اُجرت ٹھہرائی تھی، (وہ دُودھ پلانے والی انا کو) بھلے طریقے سے دے دو۔''

قوانینِ الٰہیہ پر عمل کو آسان بنانے کے لیے قرآنِ کریم کا خاص انداز

اور پھر فرمایا: ﴿وَاتَّقُوا اللّٰهَ﴾ اور اللہ سے ڈرتے رہو، ﴿وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۲۳۳﴾﴾ ''اور جان رکھو کہ اللہ تمہارے سارے کاموں کو اچھی طرح دیکھ رہا ہے۔'' جیسا کہ میں نے پہلے بھی عرض کیا ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ جب کوئی حکم بتاتے ہیں تو اس کے شروع میں یا آخر میں عموماً تقویٰ کا حکم دیا جاتا ہے، اور یہ اس لیے کہ کوئی آدمی قانون کتنا ہی اچھا بنا دے، لیکن جب تک اس قانون پر عمل کرنے والوں کے دل میں اللہ تعالیٰ کا خوف نہ ہو، تقویٰ نہ ہو، تو محض ڈنڈے کے زور سے یا محض پولیس کے خوف سے کسی آدمی کو کسی قانون پر مجبور نہیں کیا جاسکتا۔ یہ قرآنِ کریم کا خاص اسلوب ہے جو اکثر جگہ پر نظر آتا ہے اور اس کے ذریعے قوانینِ الٰہیہ پر عمل پیرا ہونے کے جذبے کو مہمیز دی جاتی ہے۔

آیت نمبر ۲۳۴ تا ۲۳۷

وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا يَّتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّعَشْرًا ۚ فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا فَعَلْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿۲۳۴﴾ وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا عَرَّضْتُمْ بِهٖ مِنْ خِطْبَةِ النِّسَاۗءِ اَوْ اَكْنَنْتُمْ فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ ۭ عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ سَتَذْكُرُوْنَهُنَّ وَلٰكِنْ لَّا تُوَاعِدُوْهُنَّ سِرًّا اِلَّآ اَنْ تَقُوْلُوْا قَوْلًا

مَّعْرُوْفًا ۭ وَلَا تَعْزِمُوْا عُقْدَةَ النِّكَاحِ حَتّٰى يَبْلُغَ الْكِتٰبُ اَجَلَهٗ ۭ وَاعْلَمُوْٓا
اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ فَاحْذَرُوْهُ ۚ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ
حَلِيْمٌ ۝۲۳۵ لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِنْ طَلَّقْتُمُ النِّسَاۗءَ مَا لَمْ تَمَسُّوْهُنَّ اَوْ تَفْرِضُوْا ع ۳ ۴ ۱۴
لَهُنَّ فَرِيْضَةً ۖ وَّمَتِّعُوْهُنَّ ۚ عَلَي الْمُوْسِعِ قَدَرُهٗ وَعَلَي الْمُقْتِرِ قَدَرُهٗ ۚ
مَتَاعًۢا بِالْمَعْرُوْفِ ۚ حَقًّا عَلَي الْمُحْسِنِيْنَ ۝۲۳۶ وَاِنْ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ
تَمَسُّوْهُنَّ وَقَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيْضَةً فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ اِلَّآ اَنْ
يَّعْفُوْنَ اَوْ يَعْفُوَا الَّذِيْ بِيَدِهٖ عُقْدَةُ النِّكَاحِ ۭ وَاَنْ تَعْفُوْٓا اَقْرَبُ
لِلتَّقْوٰى ۭ وَلَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝۲۳۷

اور تم میں سے جو لوگ وفات پا جائیں اور بیویاں چھوڑ کر جائیں، تو وہ بیویاں اپنے آپ کو چار مہینے اور دس دن انتظار میں رکھیں گی۔ پھر جب وہ اپنی (عدّت کی) میعاد کو پہنچ جائیں، تو وہ اپنے بارے میں جو کارروائی (مثلاً دوسرا نکاح) قاعدے کے مطابق کریں، تو تم پر کچھ گناہ نہیں، اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے پوری طرح باخبر ہے۔ ۲۳۴ اور (عدت کے دوران) اگر تم ان عورتوں کو اِشارے کنائے میں نکاح کا پیغام دو یا (ان سے نکاح کا ارادہ) دِل میں چھپائے رکھو تو تم پر کوئی گناہ نہیں ہے۔ اللہ جانتا ہے کہ تم ان (سے نکاح) کا خیال تو دِل میں لاؤ گے، لیکن ان سے نکاح کا دو طرفہ وعدہ مت کرنا، اِلّا یہ کہ مناسب طریقے سے کوئی بات کہہ دو، اور نکاح کا عقد پکا کرنے کا اس وقت تک ارادہ بھی مت کرنا جب تک عدّت کی مقرّرہ مدّت اپنی میعاد کو نہ پہنچ جائے، اور یاد رکھو کہ جو کچھ تمہارے دِلوں میں ہے اللہ اسے خوب جانتا ہے؛ لہٰذا اس سے ڈرتے رہو؛ اور یاد رکھو کہ اللہ بہت بخشنے والا، بڑا بردبار ہے۔ ۲۳۵ تم پر اس میں بھی کوئی گناہ نہیں ہے کہ تم عورتوں کو ایسے وقت طلاق دو جبکہ ابھی تم نے ان کو

چھوا بھی نہ ہو، اور نہ ان کے لیے کوئی مہر مقرّر کیا ہو، اور (اس صورت میں) ان کو کوئی تحفہ دو، خوشحال شخص اپنی حیثیت کے مطابق اور غریب آدمی اپنی حیثیت کے مطابق بھلے طریقے سے یہ تحفہ دے۔ یہ نیک آدمیوں پر ایک لازمی حق ہے۔ (۲۳۶) اور اگر تم نے انہیں چھونے سے پہلے ہی اس حالت میں طلاق دی ہو جبکہ ان کے لیے (نکاح کے وقت) کوئی مہر مقرّر کر لیا تھا، تو جتنا مہر تم نے مقرّر کیا تھا اس کا آدھا دینا (واجب ہے) اِلّا یہ کہ وہ عورتیں رعایت کر دیں (اور آدھے مہر کا بھی مطالبہ نہ کریں) یا وہ (شوہر) جس کے ہاتھ میں نکاح کی گرہ ہے، رعایت کرے (اور پورا مہر دے دے) اور اگر تم رعایت کرو، تو یہ تقویٰ کے زیادہ قریب ہے، اور آپس میں فراخ دِلی کا برتاؤ کرنا مت بھولو۔ جو عمل بھی تم کرتے ہو، اللہ یقیناً اسے دیکھ رہا ہے۔ (۲۳۷)

بیوہ کی عدّت کے احکام

پیچھے طلاق کے احکام سے متعلق گفتگو چل رہی تھی، پھر بیچ میں رضاعت یعنی دودھ پلانے سے متعلق کچھ احکام ذکر کیے گئے اور اب یہاں ان آیاتِ کریمہ میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے عدت کے اور مہر کے کچھ مسائل بیان فرمائے ہیں، چنانچہ فرمایا: ﴿وَ الَّذِیْنَ یُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ﴾ اور تم میں سے جو لوگ وفات پاجائیں ﴿وَ یَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا﴾ اور وہ بیویاں چھوڑ کر جائیں ﴿یَّتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّ عَشْرًا﴾ ''تو وہ بیویاں اپنے آپ کو چار مہینے اور دس دن انتظار میں رکھیں گی۔''

شوہر کی وفات کے بعد اللہ تعالیٰ نے چار ماہ دس دن عدت کے جو ایام مقرّر فرمائے ہیں، یہ گویا ایک طرح سے جانے والے شوہر کا اکرام ہے اور اس کی وفات پر ایک طرح سے سوگ منانے کے لیے مقرّر کردہ ایام ہیں۔ اسی وجہ سے اس عدت کے دوران ان خواتین کے لیے زیب و زینت کے معروف طریقوں کو اختیار کرنا اور عام حالات میں گھر سے نکلنا بھی جائز نہیں ہوتا، تاکہ سابقہ نکاح کی عزت و حرمت، شوہر کا اکرام اور شوہر سے محبت کے جذبات کا مظاہرہ ہو سکے۔

حاملہ عورت کی عدّت کی میعاد

یہ چار ماہ دس دن اس عورت کی عدّت ہے جس کے شوہر کا انتقال ہوا ہو اور وہ حمل سے نہ ہو، لیکن اگر

شوہر کا انتقال اس حالت میں ہوا کہ اس سے بیوی کو کوئی حمل ٹھہر چکا ہو، تو اس صورت میں چار مہینے دس دن بھی کافی نہیں ہیں، بلکہ بچے کی پیدائش ضروری ہے، جیسا کہ قرآنِ کریم میں دوسری جگہ فرمایا گیا کہ ''اور جو عورتیں حاملہ ہوں، ان کی عدّت کی میعاد یہ ہے کہ وہ اپنے پیٹ کا بچہ جن لیں۔''[1] حاملہ عورتوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے اس بات کا خاص اہتمام فرمایا ہے کہ اگر ایک شوہر سے حمل قرار پاچکا ہے، تو جب تک وضعِ حمل نہ ہوجائے، کسی دوسرے کو اس کے پاس جانے کی اجازت نہیں ہونی چاہیے، اس لیے بچہ پیدا ہونے تک نکاح جائز نہیں رکھا گیا۔ چنانچہ اگر کسی عورت کو حمل ہو اور اس کے شوہر کا انتقال ہوجائے تو اس صورت میں چار مہینے دس دن ہی نہیں، بلکہ اگر بچے کی پیدائش کی وجہ سے زیادہ مدّت بھی گزارنی پڑے تو وہ بھی گزارنی ہوگی۔

بیوہ عورتوں کے نکاحِ ثانی کا حکم

پھر فرمایا: ﴿فَإِذَا بَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ﴾ ''جب وہ اپنی مدت کو یا میعاد کو پہنچ جائیں،'' یعنی عدت گزر جائے تو ﴿فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيمَا فَعَلْنَ فِي أَنْفُسِهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ﴾ ''وہ اپنی ذات کے بارے میں جو کارروائی (مثلاً دوسرا نکاح) معروف طریقے اور قاعدے کے موافق کریں، تو تم پر کچھ گناہ نہیں۔'' مراد یہ ہے کہ اگر عدّتِ وفات گزر جانے کے بعد وہ بیوہ خواتین کسی اور شوہر سے نکاح کرنا چاہیں تو اس میں کوئی رکاوٹ ڈالنے کی ضرورت نہیں ہے، اور نہ اس میں تمہارے اوپر کوئی حرف آتا ہے۔

یہ خطاب اس بیوہ عورت کے اولیاء یعنی اس کے سرپرستوں کو ہورہا ہے اور کہا جارہا ہے کہ تم لوگ اس چیز کو اپنی انا کا یا اپنی غیرت کا مسئلہ نہ بنانا۔ عدّتِ وفات گزارنے کے بعد اگر وہ کسی اور شوہر سے نکاح کرنا چاہتی ہیں، تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے، بشرطیکہ وہ نکاح معروف طریقے یعنی قاعدے کے مطابق ہو، خفیہ طور پر ناجائز آشنائیاں پیدا کرنے کا طریقہ نہ ہو۔ جیسا کہ قرآنِ کریم نے دوسری جگہ فرمایا ہے۔[2] بلکہ سُنّت کے مطابق نکاح کا اقدام ہو، تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ پھر فرمایا: ﴿وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ ﴿٢٣٤﴾﴾ ''اور اللہ تعالیٰ ہر اس بات کو جانتے ہیں جو تم کرتے ہو۔'' اللہ تبارک وتعالیٰ تمہارے سارے کاموں سے باخبر ہیں، لہٰذا کوئی کام ایسا نہ کرو کہ جو اللہ تعالیٰ کے احکام اور ہدایات کے خلاف ہو۔

---

(۱) ﴿وَأُولَاتُ الْأَحْمَالِ أَجَلُهُنَّ أَنْ يَضَعْنَ حَمْلَهُنَّ﴾ [الطلاق: ۴]

(۲) ﴿وَلَا مُتَّخِذَاتِ أَخْدَانٍ﴾ [النساء: ۲۵]

بیوگان کے نکاح کو معیوب سمجھنا جائز نہیں

بہت سے معاشروں میں بیواؤں کا نکاح کرنا بہت معیوب سمجھا جاتا ہے۔ خود ہمارے غیر منقسم ہندوستان میں بھی یہ ہندوانہ رسم تھی کہ کسی بیوہ کا دوسری شادی کرلینا بہت بڑا عیب سمجھا جاتا تھا، چنانچہ بکثرت ایسا بھی ہوتا تھا کہ کسی خاتون کا شوہر شادی کے بعد بہت جلد انتقال کرگیا اور وہ لڑکی ابھی نوجوان ہے، لیکن اس کو اس بات پر مجبور کیا جاتا تھا کہ وہ کوئی دوسرا نکاح نہ کرے بلکہ ساری زندگی اسی طرح گزار دے۔ یہ بڑا ظلم تھا جو خواتین پر روا رکھا جاتا تھا، قرآنِ کریم نے اس کو یہاں پر واضح فرمادیا کہ بیوہ کا نکاح کرنا نہ کوئی معیوب بات ہے اور نہ اس میں کوئی گناہ ہے، بلکہ تمہیں ان کے اس حق کے استعمال میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈالنی چاہیے۔

جیسا کہ عرض کیا گیا، غیر منقسم ہندوستان کے طول وعرض میں بیواؤں کا شادی کرنا بہت بڑا عیب شمار ہوتا تھا اور اس اقدام کو جائز نہیں سمجھا جاتا تھا۔ علمائے کرام نے اس دور میں ہندوستان کے اندر اس رسم کو ختم کرنے کے لیے ''تحریکِ نکاح بیوگان'' کے نام سے ایک تحریک شروع کی۔ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت امداد اللہ صاحب مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ اور دوسرے بہت سے علمائے کرام نے بیواؤں کے نکاح کرانے کی باقاعدہ مہم چلائی اور اپنے عمل سے اس کی تردید کی۔ اس کے نتیجے میں الحمد للہ صورتِ حال بتدریج بہتر ہوتی چلی گئی اور اب بیواؤں کے نکاح کو اتنا معیوب نہیں سمجھا جاتا جتنا پہلے سمجھا جاتا تھا۔

دورانِ عدّت پیغامِ نکاح سے متعلق احکام و ہدایات

اب جو آیت آرہی ہے، اس میں درحقیقت یہ بیان کرنا مقصود ہے کہ جب عورت کے شوہر کا انتقال ہوچکا ہے اور وہ عدّت گزار رہی ہے تو اس عدت کے دوران اس کو باقاعدہ نکاح کا پیغام دینا جائز نہیں، یعنی کوئی شخص یہ چاہے کہ اس عدت کے دوران جاکر اس سے کہے کہ میں آپ سے نکاح کرنا چاہتا ہوں اور عدت ختم ہونے کے بعد ہم آپس میں ایک دوسرے سے نکاح کرلیں گے تو اس طرح کا پیغام دینا یا اس قسم کا معاہدہ کرنا جائز نہیں ہے۔ البتہ اس آیت میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہ فرمادیا کہ اگرچہ صراحتاً پیغام دینا تو جائز نہیں ہے، لیکن اگر اشارے کنایے میں کوئی ایسی بات کہہ دی جائے جس سے عورت سمجھ جائے کہ عدت گزرنے کے بعد یہ شخص مجھ سے نکاح کرنا چاہتا ہے تو اس طرح اشارے کنایے میں کوئی بات کہہ دینے کی گنجائش ہے، اس میں حرج نہیں ہے، مثلاً یہ کہہ دے کہ میں بھی کسی مناسب رشتے کی تلاش میں ہوں وغیرہ۔

اسی بارے میں ہدایات دیتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ﴿وَ لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا عَرَّضْتُمْ بِهٖ﴾ اور تمہارے اوپر اس میں کچھ گناہ نہیں کہ اگر تم ان عورتوں کو اشارے کنایے میں نکاح کا پیغام دو ﴿اَوْ اَكْنَنْتُمْ فِيْۤ اَنْفُسِكُمْ﴾ ''یا تم ان سے نکاح کا ارادہ اپنے دِل میں چھپائے رکھو (تو تم پر کوئی گناہ نہیں ہے)'' یعنی تم نے اپنے دل میں یہ ارادہ چھپایا ہوا ہو کہ اس کی عدّت گزرنے کے بعد میں اس سے نکاح کروں گا تو اس میں کوئی مضائقہ کی بات نہیں۔ اس اجازت کی وجہ یہ ہے کہ ﴿عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ سَتَذْكُرُوْنَهُنَّ﴾ ''اللہ جانتا ہے کہ تم ان سے نکاح کا خیال تو دِل میں لاؤ گے ہی،'' یعنی اللہ تعالیٰ کو یہ بات معلوم ہے کہ جو عورتیں عدّت گزار رہی ہیں تو کسی نہ کسی کے دل میں خیال آسکتا ہے کہ میں عدت کے بعد اس سے نکاح کروں گا۔ اس طرح دل میں خیال آجائے تو کوئی بات نہیں، بلکہ اشارے کنایے میں کوئی بات کہہ دو تو بھی کوئی حرج نہیں، ﴿وَ لٰكِنْ لَّا تُوَاعِدُوْهُنَّ سِرًّا﴾ لیکن ان سے خفیہ طور پر نکاح کا دوطرفہ وعدہ مت کرنا ﴿اِلَّاۤ اَنْ تَقُوْلُوْا قَوْلًا مَّعْرُوْفًا﴾ ''اِلّا یہ کہ تم مناسب طریقے سے کوئی بات کہہ دو،'' اور مناسب طریقے سے کہنے کی بات وہی ہے کہ جس میں خواتین کے لیے تھوڑا سا اشارہ ہو کہ یہ شخص میرے ساتھ نکاح میں دلچسپی رکھتا ہے۔

﴿وَ لَا تَعْزِمُوْا عُقْدَةَ النِّكَاحِ﴾ اور تم نکاح کا عقد پکا کرنے کا اس وقت تک ارادہ بھی مت کرنا ﴿حَتّٰى يَبْلُغَ الْكِتٰبُ اَجَلَهٗ﴾ جب تک عدت کی مقرّرہ مدت اپنی میعاد کو نہ پہنچ جائے ﴿وَ اعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِيْۤ اَنْفُسِكُمْ﴾ اور یاد رکھو کہ جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے اللہ اسے خوب جانتا ہے۔ ﴿فَاحْذَرُوْهُ﴾ ''لہٰذا اس سے ڈرتے رہو'' اور ناجائز بات کا دل میں ارادہ بھی مت کیا کرو ﴿وَ اعْلَمُوْۤا﴾ اور یاد رکھو کہ ﴿اَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ۝۲۳۵﴾ ''اللہ بہت بخشنے والا، بڑا بردبار ہے۔'' اس لیے عدت کے دوران صرف دل کے ارادے یا اشارے کنائے پر تمہاری گرفت نہیں کرتا۔

بغیر مہر والی عورت کو خلوت سے پہلے طلاق اور تحفے کا حکم

آگے اللہ تبارک وتعالیٰ نے مہر کے کچھ احکام بیان فرمائے ہیں جن میں سے پہلا حکم تو یہ ہے کہ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص نے کسی عورت سے نکاح کیا اور نکاح کے عقد میں کوئی مہر مقرّر نہیں کیا، یعنی مہر کا ذکر کیے بغیر ہی نکاح کر لیا۔ صحیح طریقہ تو یہ ہے کہ جب نکاح کیا جائے، تو ساتھ ساتھ مہر بھی مقرّر کر لیا جائے، لیکن اگر مہر مقرّر نہ کیا گیا ہو، یعنی دونوں نے نکاح کا ایجاب وقبول تو کر لیا، لیکن مہر کا کوئی ذکر ہی نہیں

آیا تو نکاح تو صحیح ہوجاتا ہے لیکن ایسی صورت میں عورت کے لیے مہرِ مثل واجب ہوتا ہے۔ مہرِ مثل کے معنیٰ یہ ہیں کہ: ''بیوی کے خاندان کی عورتوں کا عام طور پر جتنا مہر مقرّر ہوتا ہے، مثلاً بہنوں کا، اتنا ہی اس کا بھی مہر واجب ہوگا۔''(۱)

خلاصہ یہ کہ نکاح کے منعقد ہونے کے لیے مہر کا مقرّر کرنا اگرچہ اچھی بات ہے، تاہم یہ نکاح کے لیے کوئی لازمی شرط نہیں ہے۔ اگر نکاح کے دوران مہر کا ذکر نہ کیا جائے یا مہر مقرّر نہ کیا جائے تب بھی نکاح ہوجاتا ہے۔ یہاں پر اللہ تعالیٰ یہی صورت بیان فرمارہے ہیں کہ جب کسی شخص نے کوئی مہر مقرّر کیے بغیر نکاح کیا اور ابھی تک رخصتی بھی نہیں ہوئی تھی، اور ان کے درمیان کوئی خلوت بھی نہیں ہوئی تھی، یعنی تنہائی کی نوبت بھی نہیں آئی تھی کہ اس دوران اتفاق سے شوہر کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ میرا اس کے ساتھ گزارا ممکن نہیں ہے، چنانچہ یہ سوچ کر شوہر نے اپنی منکوحہ کو طلاق دے دی، تو اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتے ہیں کہ اس صورت میں کوئی مہر واجب نہیں ہوگا۔ گویا مہر واجب نہ ہونے کی دو شرطیں ہیں:

- ایک یہ کہ نکاح کے وقت مہر مقرّر نہ کیا گیا ہو۔
- دوسرا یہ کہ طلاق جو دی گئی وہ رخصتی سے پہلے دی گئی ہو، اور اس دوران دونوں کے درمیان کوئی خلوت نہ ہوئی ہو۔

اگر یہ دو شرطیں پائی جائیں، تو اس صورت میں کوئی مہر واجب نہیں ہوتا، البتہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ اس صورت میں مرد کے ذمے اپنی مطلقہ بیوی کو ایک تحفہ دینا واجب ہے، وہ تحفہ جوڑے کی شکل میں بھی ہوسکتا ہے اور کسی اور شکل میں بھی ہوسکتا ہے۔ تاہم ساتھ میں یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ جو لوگ زیادہ وسعت رکھنے والے ہیں، وہ اپنی وسعت کے مطابق تحفہ دیں اور جو بغیر وسعت والے ہیں یعنی غریب لوگ ہیں وہ اپنی استطاعت کے مطابق دیں، لیکن بہرحال تحفہ دینا ضروری ہے۔

ذیل کی آیات میں انہی احکام کو بیان کرتے ہوئے باری تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ﴾ تمہارے اوپر کوئی گناہ نہیں ہے ﴿اِنْ طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ﴾ اگر تم نے عورتوں کو طلاق دی ﴿مَا لَمْ تَمَسُّوْهُنَّ اَوْ تَفْرِضُوْا لَهُنَّ فَرِيْضَةً﴾ ''جبکہ ابھی تم نے ان کو چھوا بھی نہ ہو اور نہ ان کے لیے کوئی مہر مقرّر کیا ہو،'' تو اگر ایسی صورت میں طلاق دی ہے تو کوئی حرج نہیں ہے، البتہ ایسی صورت میں ﴿وَّمَتِّعُوْهُنَّ﴾ ان کو کوئی تحفہ

---

(۱) فتاویٰ عثمانی، فصل فی الجهاز و المهر۔ جلد ۲، صفحہ ۲۹۵

دو ﴿عَلَى الْمُوْسِعِ قَدَرُهٗ﴾ جو آدمی خوشحال ہو وہ اپنی حیثیت کے مطابق تحفہ دے ﴿وَ عَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهٗ﴾ اور غریب آدمی اپنی حیثیت کے مطابق تحفہ دے، ﴿مَتَاعًۢا بِالْمَعْرُوْفِ﴾ لیکن یہ تحفہ بھلے طریقے سے دے ﴿حَقًّا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۲۳۶﴾﴾ ''یہ نیک آدمیوں پر ایک لازمی حق ہے۔''

اس میں بتادیا گیا کہ ایسی صورت میں مہر تو واجب نہیں ہے، لیکن تحفہ دینا واجب ہے۔ اس تحفہ کو اصطلاح میں ''متعہ'' بھی کہا جاتا ہے، لیکن چونکہ متعہ کا لفظ کسی اور معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے، اس لیے اسے ''تحفے'' سے تعبیر کرنا زیادہ بہتر ہے۔ تحفہ دینے کا یہ حکم بتا رہا ہے کہ اگر طلاق کی نوبت آ بھی جائے، تب بھی تعلقات ختم کرنے کا طریقہ بھی شریفانہ اور خوش گوار ہونا چاہیے۔

مقرّرہ مہر والی عورت کو خلوت سے پہلے طلاق اور مہر کا حکم

یہاں تک اس صورت کا بیان تھا کہ جب نکاح کے وقت کوئی مہر مقرّر نہیں کیا گیا تھا اور پھر شوہر نے رخصتی سے پہلے ہی بیوی کو طلاق دے دی تو تحفہ دینا واجب ہوگا۔ اب آگے اللہ تبارک وتعالیٰ وہ صورت بیان فرمارہے ہیں، جب نکاح میں مہر کی مقدار طے کرلی گئی تھی، لیکن شوہر نے رخصتی سے پہلے اور بیوی کے ساتھ خلوت کیے بغیر اسے طلاق دے دی، تو ایسی صورت میں مطلقہ عورت کے لیے مقرّر شدہ مہر کا آدھا مہر واجب ہوگا۔

طلاق کی اس صورت کو بیان کرتے ہوئے باری تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿وَ اِنْ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ﴾ اور اگر تم نے ان کو طلاق دی ﴿مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ﴾ قبل اس کے کہ تم نے ان کو چھوا ہو ﴿وَ قَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيْضَةً﴾ جبکہ تم نے ان کے لیے کوئی مہر مقرّر کرلیا تھا ﴿فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ﴾ ''تو جتنا مہر تم نے مقرّر کیا تھا'' اس کا آدھا دینا واجب ہے، مگر دو صورتیں اس مجموعی حکم سے مستثنیٰ ہیں:

- ایک تو یہ کہ ﴿اِلَّاۤ اَنْ يَّعْفُوْنَ﴾ یہ آدھا دینا بھی اس صورت میں واجب نہیں ہوگا ''جب کہ وہ عورتیں یعنی بیویاں رعایت کردیں۔'' ''رعایت کرنے'' کے معنیٰ یہ کہ وہ آدھے مہر کا بھی مطالبہ نہ کریں اور کہہ دیں ہم نے وہ آدھا مہر بھی معاف کیا، یا اسی طرح وہ عورتیں آدھے مہر کے اندر بھی کچھ اور کمی کردیں، تو یہ ان کی طرف سے رعایت کی صورت ہے۔ اس صورت میں جیسا بھی وہ چاہیں اس کے مطابق عمل کیا جائے۔

- اور دوسری صورت یہ مستثنیٰ ہے کہ ﴿اَوْ يَعْفُوَا الَّذِيْ بِيَدِهٖ عُقْدَةُ النِّكَاحِ﴾ ''یا وہ جس کے ہاتھ میں نکاح کی گرہ ہے (یعنی مرد) وہ رعایت کرے،'' اور پورا مہر دے دے۔ نکاح کی گرہ شوہر کے ہاتھ میں ہے اور اس کو طلاق دینے کا حق حاصل ہے، اس لیے یہاں پر یہ تعبیر اختیار فرمائی گئی کہ جس کے ہاتھ میں نکاح کی گرہ ہے، یعنی شوہر اگر رعایت کرے تو وہ نصفِ مہر سے زیادہ بھی دے سکتا ہے۔ اس صورت میں شرعاً تو شوہر کے ذمے آدھا مہر واجب تھا، لیکن وہ رعایت کر کے اس کو پورا ہی مہر دے دے، تو اس صورت میں آدھے کے بجائے پورا ہی دیا جائے گا۔

رخصتی سے پہلے طلاق کی صورت میں مکمل مہر دینے کی ترغیب

یہاں اللہ تبارک وتعالیٰ نے جو یہ تعبیر اختیار فرمائی کہ ﴿اَوْ يَعْفُوَا الَّذِيْ بِيَدِهٖ عُقْدَةُ النِّكَاحِ﴾ ''وہ رعایت کرے جس کے ہاتھ میں نکاح کی گرہ ہے۔'' اس سے بظاہر اس بات کی طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے -واللہ سبحانہ اعلم- کہ شوہر کو ایک طرح سے ترغیب دی جارہی ہے کہ چونکہ ابھی تک رخصتی نہیں ہوئی، اس لیے اگرچہ تمہیں حق حاصل ہے کہ نصفِ مہر دو، مگر بہتر یہ ہے کہ تم مہر میں کٹوتی نہ کرو اور پورا ادا کردو، اور یہ اس لیے کہ نکاح کی گرہ تمہارے ہاتھ میں ہے اور تم نے ہی یکطرفہ طور پر طلاق کا فیصلہ کیا ہے، لہٰذا تمہارے لیے بہتر یہ ہوگا کہ تم آدھا دینے کے بجائے پورا دو۔

چنانچہ آگے خود ہی فرمادیا: ﴿وَ اَنْ تَعْفُوْٓا اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى﴾ ''اور اگر تم معاف کردو (یعنی پورا دے دو) تو یہ تقویٰ کے زیادہ قریب ہے،'' اور تمہارے لیے فضیلت کا سبب ہے۔

ایک دوسرے کے ساتھ فراخدلی کا برتاؤ کرنے کی تعلیم

اور پھر آگے اللہ تعالیٰ نے ایک عمومی ہدایت عطا فرمائی کہ ﴿وَلَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ﴾ ''اور تم آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ فراخدلی کا برتاؤ کرنا مت بھولو،'' یعنی بحیثیتِ انسان اور مسلمان ہونے کے تم سے یہ توقع ہونی چاہیے کہ تم ایک دوسرے کے ساتھ معاملات کرنے میں تنگ دلی کے بجائے فراخدلی اور رعایت کے معاملات کرو۔ ایک دوسرے کے معاملے میں ایثار سے کام لو، اور ایسا نہ کرو کہ ایک ایک پیسے پر جان دینے لگو، ﴿اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝۲۳۷﴾ ''بے شک اللہ تعالیٰ ان تمام باتوں کو دیکھتا ہے جو تم کرتے

ہو،'' لہٰذا اگر تم کسی کے ساتھ رعایت و احسان کا معاملہ کرو گے تو اللہ تعالیٰ تمہیں اس کی جزائے خیر عطا فرمائیں گے۔

آیت نمبر ۲۳۸ تا ۲۴۲

حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَ الصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى ۗ وَ قُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ ﴿۲۳۸﴾ فَاِنْ
خِفْتُمْ فَرِجَالًا اَوْ رُكْبَانًا ۚ فَاِذَاۤ اَمِنْتُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَمَا عَلَّمَكُمْ مَّا لَمْ
تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۳۹﴾ وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا ۖ
وَّصِيَّةً لِّاَزْوَاجِهِمْ مَّتَاعًا اِلَى الْحَوْلِ غَيْرَ اِخْرَاجٍ ۚ فَاِنْ خَرَجْنَ فَلَا
جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْ مَا فَعَلْنَ فِيْۤ اَنْفُسِهِنَّ مِنْ مَّعْرُوْفٍ ؕ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ
حَكِيْمٌ ﴿۲۴۰﴾ وَلِلْمُطَلَّقٰتِ مَتَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ ﴿۲۴۱﴾ كَذٰلِكَ
يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۲۴۲﴾ ع

ع ۳۱ ۷ ۱۵

تمام نمازوں کا پورا پورا خیال رکھو، اور (خاص طور پر) بیچ کی نماز کا، اور اللہ کے سامنے باادب فرماں بردار بن کر کھڑے ہوا کرو۔ ﴿۲۳۸﴾ اور اگر تمہیں (دُشمن کا) خوف لاحق ہو تو کھڑے کھڑے یا سوار ہونے کی حالت ہی میں (نماز پڑھ لو) پھر جب تم امن کی حالت میں آجاؤ تو اللہ کا ذکر اس طریقے سے کرو جو اس نے تمہیں سکھایا ہے جس سے تم پہلے ناواقف تھے۔ ﴿۲۳۹﴾ اور تم میں سے جو لوگ وفات پاجائیں اور اپنے پیچھے بیویاں چھوڑ جائیں تو وہ اپنی بیویوں کے حق میں یہ وصیت کرجایا کریں کہ ایک سال تک وہ (ترکے سے نفقہ وصول کرنے کا) فائدہ اُٹھائیں گی اور ان کو (شوہر کے گھر سے) نکالا نہیں جائے گا۔ ہاں اگر وہ خود نکل جائیں تو اپنے حق میں قاعدے کے مطابق وہ جو کچھ بھی کریں اس میں تم پر کوئی گناہ نہیں ہوگا، اور اللہ صاحبِ اقتدار بھی ہے، صاحبِ حکمت بھی۔ ﴿۲۴۰﴾ اور مطلقہ عورتوں کو قاعدے کے مطابق فائدہ پہنچانا

متقیوں پر ان کا حق ہے۔ (۲۴۱) اللہ اپنے اَحکام اسی طرح وضاحت سے تمہارے سامنے بیان کرتا ہے، تاکہ تم سمجھ داری سے کام لو۔ (۲۴۲)

نمازوں کی محافظت ونگرانی کا حکم

سورۂ بقرہ کی آیت نمبر ۱۵۳ سے یہاں تک اسلامی عقائد و احکام کا جو بیان شروع ہوا تھا وہ اب قریبُ الاختتام ہے۔ آیت نمبر ۱۵۳ میں ''يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ'' کہہ کر نماز کی تاکید سے یہ بیان شروع ہوا تھا اور اب آخر میں دوبارہ نماز کی اہمیت بیان کرتے ہوئے، اس کی نگہداشت و نگرانی اور اس کے خیال رکھنے کا حکم دیا جارہا ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ﴾ ''تمام نمازوں کا پورا پورا خیال رکھو'' یعنی تم تمام نمازوں کی پوری پوری نگرانی رکھو، ان کی محافظت کرو۔

نماز کی محافظت یا حفاظت کے معنیٰ یہ ہیں کہ ایک تو وہ نماز بروقت ادا کی جائے، قضا نہ کی جائے اور دوسرے یہ کہ ان آداب کے تحت ادا کی جائے جن آداب کے تحت نماز کو فرض کیا گیا ہے یا جن کو سنت یا مستحب قرار دیا ہے۔ جس طرح جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے کی بڑی تاکید آئی ہے، لہٰذا جماعت کے ساتھ نماز پڑھی جائے، وقت پر پڑھی جائے اور خشوع وخضوع کے ساتھ پڑھی جائے، یہ ساری باتیں محافظت یعنی نماز کی نگرانی کے اندر داخل ہیں۔

نمازِ عصر کے اہتمام کی تاکید

نماز کی اسی نگرانی کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ ایسے حالات میں جبکہ انسان کسی ایسے کام میں الجھا ہوا ہو کہ وہاں سے نکلنا اس کے لیے مشکل ہورہا ہو تو اس وقت میں خاص طور پر نماز کی نگہداشت کا حکم دیا گیا ہے، چنانچہ فرمایا: ﴿وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى﴾ ''اور خاص طور پر بیچ کی نماز'' یعنی تمام نمازوں کی پابندی کرو، خاص طور پر بیچ کی نماز کا پورا پورا خیال رکھو۔ بیچ کی نماز کی تفسیر متعدّد ذرائع[1] سے یہ کی گئی ہے کہ اس سے مراد ''عصر'' کی نماز ہے، کیونکہ اس سے پہلے دو نمازیں دن کی ہیں، یعنی فجر اور ظہر کی نماز اور اس کے بعد دو

---

(۱) كما في تفسير القرطبي (۲۱۰/۳): "....أنها العصر .... وقال ابن عطية في تفسيره: وعلى هذا القول الجمهور من الناس وبه أقول. واحتجوا بالأحاديث الواردة في هذا الباب خرجها مسلم وغيره..." ولمزيد من التفصيل راجع الي تفسير الطبري (۱٦٨/٥)

نمازیں رات کی ہیں یعنی مغرب اور عشاء کی نماز۔

یہاں پر ﴿حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ﴾ والے جملے میں اگرچہ عصر کی نماز بھی شامل ہوگئی تھی، لیکن اللہ تبارک و تعالیٰ نے خاص طور پر اس کا الگ سے ذکر اس لیے فرمایا کہ یہ وہ وقت ہوتا ہے جب لوگ اپنے کاروبارِ زندگی میں خوب منہمک ہوتے ہیں، یا تو اس وقت ان کا کاروبار عروج پر ہوتا ہے یا وہ کاروبار بند کر کے گھر جانے والے ہوتے ہیں اور کام سمیٹنے کا وقت ہوتا ہے یا کوئی ملازمت پیشہ لوگ ہوں تو انہیں کام ختم کر کے گھر پہنچنے کی جلدی ہوتی ہے، اس طرح انسانوں کا ذہن اس وقت میں خاص طور پر اپنے دنیاوی کام کاج اور کاروبار میں مشغول ہوتا ہے، لہٰذا اسی لیے خاص طور پر ذکر کیا کہ عصر کی نماز کا خصوصی خیال رکھو اور کہیں ایسا نہ ہو کہ دنیاوی مشغولیات اور کاروبار و ملازمت کے کاموں کی وجہ سے نماز یا جماعت سے بے پروائی ہو جائے۔

اسی لیے احادیثِ مبارکہ میں عصر کی نماز کی خاص طور پر تاکید کی گئی ہے، اور عصر کی نماز میں کوتاہی پر شدید وعیدیں بیان فرمائی گئی ہیں۔ ایک حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

مَنْ فَاتَتْهُ الْعَصْرُ، فَكَأَنَّمَا وُتِرَ أَهْلَهُ وَمَالَهُ(۱)

جس کی عصر کی نماز فوت ہوگئی وہ ایسا ہے جیسے گویا کہ اُس کا گھر اور مال سب کچھ چھین لیا گیا۔

اسی طرح ایک اور حدیث میں فرمایا:

مَنْ تَرَكَ صَلَاةَ الْعَصْرِ فَقَدْ حَبِطَ عَمَلُهُ(۲)

جس نے عصر کی نماز ترک کردی اُس کا عمل ضائع ہوگیا۔

مومنانہ صفات کے شروع اور آخر میں نماز کا تذکرہ

یہاں پر نماز کی محافظت یا نگہداشت کا جو حکم دیا جارہا ہے، اس میں ایک اہم نکتہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے

---

(۱) صحيح مسلم (۱/۴۳۶) (۶۲۶) كتاب المساجد ومواضع الصلاة، باب التغليظ في تفويت صلاة العصر.

(۲) صحيح البخاري (۱/۱۱۵) (۵۵۳) كتاب مواقيت الصلاة، باب من ترك العصر.

جہاں جہاں بھی اپنے نیک بندوں کے احکام بیان فرمائے ہیں یا ان کی صفات بیان فرمائی ہیں تو متعدّد جگہ ایسا ہوا ہے کہ ان صفات کو اللہ تعالیٰ نے شروع بھی نماز سے کیا اور پھر ختم بھی نماز پر کیا۔

جیسے سورۂ مومنون کے شروع میں ''قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝۱'' [1] کے ذریعے فلاح یافتہ اور کامیاب مومنین کی صفات بیان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے ان کی سب سے پہلی صفت یہ بیان فرمائی کہ ''الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ ۝۲'' ''جو اپنی نماز میں خشوع سے کام لیتے ہیں۔'' یہاں پر ''فلاح یافتہ مومنین'' کا سب سے پہلا وصف نماز کا ذکر کیا گیا ہے، اور پھر بہت سے اوصاف ذکر کرنے کے بعد آخر میں دوبارہ فرمایا:

وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَوٰتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ ۝۹

اور جو اپنی نمازوں کی پوری نگرانی رکھتے ہیں۔

شروع بھی نماز سے اور ختم بھی نماز پر، لیکن اختتام پر نماز کے ساتھ محافظت یعنی پابندی یا نگہداشت کا ذکر فرمایا گیا۔ اسی طرح سورۂ معارج میں بھی جہاں اللہ تعالیٰ نے نیک بندوں کا ذکر کیا ہے تو وہاں فرمایا کہ ''الَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ دَآئِمُوْنَ ۝۲۳'' کہ جو نماز کو ہمیشہ ادا کرتے ہیں، اور پھر دیگر بہت سی صفات بیان کرنے کے بعد پھر آگے فرمایا:

وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ ۝۳۴

اور جو اپنی نماز کی پوری پوری حفاظت کرنے والے ہیں، (یعنی نماز کی پابندی کرتے ہیں۔)

دیگر مقامات کی طرح یہاں سورۂ بقرہ میں بھی جہاں اللہ تبارک وتعالیٰ نے دین کے مختلف احکام بیان فرمائے ہیں اور مختلف عقائد کا ذکر فرمایا ہے، ان کی ابتداء میں بھی اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے نماز کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا: ''يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ'' ''اے ایمان والو! صبر سے اور نماز سے مدد حاصل کرو،'' پھر درمیان میں بہت سارے احکام وعقائد اور دین کے مختلف شعبہ جات سے متعلق تفصیلات ذکر کرنے کے بعد اختتام پر پھر نماز کی نگرانی کی تاکید کرتے ہوئے فرمایا گیا کہ ﴿حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ﴾ ''تمام نمازوں کا پورا پورا خیال رکھو۔''

---

(۱) ترجمہ: ''اُن ایمان والوں نے یقیناً فلاح پالی ہے۔''

قرآنِ کریم کے اس خاص اسلوب کے ذریعے تمام احکام کے شروع میں بھی اور آخر میں بھی نماز کی پابندی ونگرانی کا ذکر کر کے یہ تنبیہ فرمائی جارہی ہے کہ تمام احکام میں سب سے زیادہ اہمیت اور سب سے زیادہ پابندی کے قابل جو چیز ہے وہ نماز ہے۔ جو شخص نماز کی پابندی کرے گا تو اس کے دوسرے کام بھی درست ہوں گے اور اس کے اندر دوسری صفات بھی بآسانی پیدا ہو جائیں گی، اور - اللہ بچائے - جو نماز کے اندر کوتاہی کرے گا یا نماز کی طرف دھیان نہیں دے گا تو اس کے دوسرے کام اور زیادہ خراب ہوں گے۔ یہی بات حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ نے اپنے عہدِ خلافت میں اپنے تمام گورنروں کے نام ایک سرکاری فرمان کے طور پر بھی لکھی تھی، جس میں فرمایا تھا کہ جو شخص نماز کی پابندی کرے گا، اس کے دوسرے کام بھی درست ہوں گے:

وَمَنْ ضَيَّعَهَا فَهُوَ لِمَا سِوَاهَا أَضْيَعُ[1]

اور جو نماز کو ضائع کردے اس کے دوسرے کام زیادہ برباد ہوں گے۔

نماز میں ادب وتعظیم کے ساتھ کھڑے ہونے کا حکم

آگے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَ قُوْمُوْا لِلّٰهِ﴾ اور کھڑے رہو اللہ کے سامنے ﴿قٰنِتِيْنَ ۝٢٣٨﴾ ''با ادب فرمانبردار بن کر۔'' قٰنِتِيْنَ'' قنوت سے نکلا ہے۔ اور قنوت کا لفظ عربی زبان میں بہت سے معنیٰ کے لیے آتا ہے اور اس کو اگر اردو میں کسی ایک لفظ سے تعبیر کرنا چاہیں تو ایسے کسی لفظ سے تعبیر کرنا مشکل ہے جو اس کا مفہوم مکمل طور پر واضح کرنے والا ہو۔ قنوت میں ایک پہلو ادب اور تعظیم کا ہے اور دوسرا پہلو اطاعت و فرمانبرداری کا ہے۔ اس لیے اوپر آیات کا ترجمہ کرتے ہوئے ہم نے یہاں پر یہ الفاظ استعمال کیے ہیں ''با ادب فرمانبردار بن کر کھڑے ہوا کرو۔'' اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے نماز کا حکم دینے کے ساتھ ساتھ یہ فرمایا ہے کہ نماز میں اس طرح کھڑے ہوا کرو جس طرح با ادب اور فرماں بردار آدمی کھڑا ہوتا ہے۔

اس بات کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ آدمی اللہ تبارک وتعالیٰ کے سامنے بالکل اس طرح کھڑا ہو کہ سوائے نماز کے اور کوئی بات نہ کرے اور سوائے نماز کے کسی اور حرکت میں اپنے آپ کو بلاوجہ مبتلا نہ کرے، بلکہ سکون کی

---

(١) أخرجه مالك في الموطأ (١/ ٦) (٦) عن نافع مولى عبد الله بن عمر،باب وقوت الصلاة.وكذا أخرجه عبدالرزاق(١/٥٣٦)(٢٠٣٧)،والبيهقى(٤/٤٥٤)(١٩٣٥).

حالت میں کھڑا ہو۔ اسی آیت کے بارے میں احادیث میں آتا ہے کہ شروع میں نماز کے دوران بات چیت کرنا جائز تھا۔ چنانچہ حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ:

''ہم لوگ پہلے نماز میں ایک دوسرے سے بات چیت کرلیا کرتے تھے، چنانچہ ہم میں سے کوئی اپنے کسی بھائی سے اپنی حاجت کے لیے بات کرلیا کرتا تھا، یہاں تک کہ قرآنِ کریم کی آیت: ''حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَ الصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى ۚ وَ قُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ'' نازل ہوئی اور ہمیں نماز کے دوران خاموشی اختیار کرنے کا حکم دے دیا گیا۔''(۱)

چونکہ قنوت کے اندر ایک پہلو یہ بھی ہے کہ آدمی با ادب ہو کر کھڑا ہو اور با ادب ہونے کا ایک تقاضا یہ ہوتا ہے کہ وہ سکون کی حالت میں ہو، بلاوجہ حرکت نہ کرے۔ اسی لیے نماز کے آداب میں یہ بات بھی داخل ہے کہ آدمی جب کھڑا ہو تو اس کے جسم میں کوئی حرکت نہ ہو، بلکہ وہ بالکل سیدھا کھڑا ہو اور بغیر کسی عذر کے نہ اپنے ہاتھ ہلائے اور نہ اپنے جسم کو حرکت دے۔ ہاں! اگر کوئی عذر پیش آ گیا، مثلاً کوئی تکلیف زیادہ ہو رہی ہے اور اس تکلیف کی وجہ سے کوئی آدمی اپنے ہاتھ وغیرہ کو حرکت دے دے، تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں، لیکن عام حالات میں نماز کا ادب یہی ہے کہ آدمی ساکت و صامت کھڑا ہو اور سوائے نماز کی حرکات کے کوئی اور حرکت اس کے جسم سے صادر نہ ہو۔

حالتِ جنگ میں نماز کی تاکید اور طریقہ

جب اللہ تبارک وتعالیٰ نے نماز کی محافظت، یعنی نگرانی اور نگہداشت کا حکم دیا تو اس میں یہ پہلو بھی ہمیشہ پیشِ نظر رہنا چاہیے کہ جن مواقع پر انسان نماز سے غافل ہوسکتا ہے، ان مواقع پر بھی نماز کا خیال رکھنا لازم ہے۔ اس کا ایک پہلو تو ابھی نمازِ عصر سے متعلق عرض کیا گیا کہ یہ عام طور سے کاروبارِ زندگی میں منہمک ہونے کا وقت ہوتا ہے، اس لیے اس وقت میں نماز کا اہتمام کرنے کی خاص طور پر تاکید کی گئی۔ اب یہاں اللہ تعالیٰ اس کا دوسرا پہلو بیان فرما رہے ہیں کہ دشمن سے جنگ ہو رہی ہو اور اس جنگ کے اندر ایک خوف کی کیفیت ہو کہ کسی بھی وقت کوئی دشمن حملہ نہ کردے، تو ایسی حالت میں آدمی سوچتا ہے کہ یہ تو ایک ہنگامی حالت ہے، لہٰذا اس حالت میں اگر نماز چھوٹ بھی جائے تو شاید حرج نہ ہو۔

---

(۱) كما في صحيح البخاري (۳۰/٦) (٤٥٣٤) كتاب تفسير القرآن، باب ما ينهى عنه من الكلام في الصلاة.

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اس خوف کی حالت میں بھی جب تک تم نماز پڑھ سکتے ہو تو پڑھو، چاہے اس کے لیے عام طریقے سے ہٹ کر کوئی اور طریقہ اختیار کرنا پڑے ﴿فَاِنْ خِفْتُمْ﴾ اگر تمہیں دشمن کا خوف لاحق ہو ﴿فَرِجَالًا﴾ ''تو کھڑے کھڑے نماز پڑھ لو'' کھڑے کھڑے نماز پڑھنے کا مطلب یہ ہے کہ رکوع اور سجدہ نہ کریں، اور کھڑے کھڑے ہی اشارہ کر دیں۔ رکوع کے لیے سر جھکا کر تھوڑا سا اشارہ کیا جائے اور سجدے کے لیے ذرا تھوڑا زیادہ سر کو جھکا کر اشارہ کر لیا جائے، اور اگر حالتِ جنگ میں سواری پر سوار ہوں تو سوار ہونے کی حالت میں بھی پڑھ سکتے ہیں، اسی کو فرمایا: ﴿اَوْ رُكْبَانًا﴾ ''یا سوار ہونے کی حالت ہی میں نماز پڑھ لو'' پہلے زمانے میں گھوڑے کی پشت پر سوار ہوتے تھے اور اسی حالت میں لڑائی ہوتی تھی، تو اس میں اگر موقع مل گیا ہے تو نیچے اترنے کی ضرورت نہیں، بلکہ گھوڑے کی پشت پر ہی بیٹھے بیٹھے اشارے سے نماز پڑھی جا سکتی ہے۔

اگر کوئی صورت ایسی پیش آجائے کہ جس میں نہ کھڑے کھڑے نماز پڑھنے کا موقع ہو اور نہ سواری پر بیٹھ کر نماز پڑھنے کا موقع ہے، تو اس موقع پر جہاد کی ضرورت کی وجہ سے اگر نماز قضا ہو جائے تو ان شاء اللہ اس کا کچھ گناہ نہیں ہوگا۔ خود نبی کریم سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہے کہ ''غزوۂ اَحزاب'' کے موقع پر آپ کی بعض نمازیں جنگ کی مشغولیت کی وجہ سے وقت پر نہ پڑھی جا سکیں[1] اور پھر آپ نے بعد میں پڑھیں، اور بعد میں پھر صحابۂ کرام کا بھی معمول یہی رہا کہ جب تک جنگ کے دوران نماز پڑھنے کا موقع ہوتا تھا تو جس طرح بھی موقع مل جاتا تھا، کھڑے ہو کر یا سوار ہو کر نماز پڑھ لیتے تھے، لیکن جہاں موقع نہیں ہوتا تھا تو نماز کا وقت گزر جانے دیتے اور اس کے بعد پھر قضا پڑھ لیتے تھے، ایسی صورت میں قضا کرنے کا گناہ بھی نہیں ہوتا تھا، کیونکہ یہ نماز مجبوری کی وجہ سے قضا ہوئی ہے۔

جنگ کی حالت اور خوف کی حالت میں نماز کا حکم دینے اور نماز کا طریقہ بتانے کے بعد فرمایا: ﴿فَاِذَآ اَمِنْتُمْ﴾ جب تم امن کی حالت میں آجاؤ ﴿فَاذْكُرُوا اللّٰهَ﴾ تو اللہ کا ذکر اس طریقے سے کرو ﴿كَمَا عَلَّمَكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ﴿٢٣٩﴾﴾ ''جو اس نے تمہیں سکھایا ہے جس سے تم پہلے ناواقف تھے'' یعنی اللہ تبارک وتعالیٰ نے تمہیں جو اطمینان کی حالت میں معمول کی نماز کا طریقہ سکھایا ہے، پھر تمہیں اسی کے مطابق ہی نماز ادا کرنی چاہیے۔

---

(١) صحيح البخاري (٦/٣٠) (٤٥٣٣): كتاب تفسير القرآن، باب ﴿حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَ الصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى﴾

حکمِ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) درحقیقت حکمِ خداوندی

اس آیت میں یہ بات بھی بڑی اہم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نماز کے بارے میں یہ فرمایا ہے کہ امن کی حالت میں تم نماز اُسی طرح پڑھو جس طرح اللہ تعالیٰ نے تمہیں سکھایا ہے، حالانکہ قرآنِ کریم میں کہیں بھی نماز کا طریقہ نہیں سکھایا گیا۔ یہ مفصّل طریقہ تو حضور نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے قول وفعل سے سکھایا ہے، لیکن آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیم کو اللہ تعالیٰ اپنی طرف منسوب کرکے یہ فرما رہے ہیں کہ وہ معمول کا طریقہ ہم نے تمہیں سکھایا ہے۔

اس سے یہ بات پوری وضاحت سے معلوم ہوگئی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیم درحقیقت اللہ تعالیٰ ہی کی تعلیم ہے اور آپ کے اقوال وافعال جنہیں ہم ''حدیث'' سے تعبیر کرتے ہیں، وہ شریعتِ مطہّرہ میں قرآنِ کریم کی طرح واجبُ التعمیل ہیں۔ اس سے ان لوگوں کی واضح تردید ہوجاتی ہے جو حدیث کو حجّت نہیں سمجھتے۔

مسائلِ طلاق کا تتمہ اور بیوہ کے لیے وصیت

یہاں نماز کا ذکر کرنے کے بعد پیچھے جو طلاق کے مسائل چل رہے تھے، ان کا ایک تکملہ ضمنی طور پر بیان ہوا ہے جو مطلقہ عورتوں کے حقوق سے متعلق ہے۔ صورتِ حال یہ تھی کہ زمانۂ جاہلیت میں بیوہ عورت کی عدت ایک سال ہوتی تھی، لیکن اسلام نے پیچھے آیت نمبر: ۲۳۴ میں عدت کی مدت گھٹا کر چار مہینے دس دن مقرّر کردی۔ جس وقت زیرِ نظر آیت نازل ہوئی ہے، اس وقت تک میراث کے احکام نہیں آئے تھے اور جیسا کہ اوپر آیت نمبر: ۱۸۰ میں گزرا، لوگوں پر یہ واجب تھا کہ وہ اپنے رشتے داروں کے حق میں وصیت کیا کریں کہ ان کے ترکے سے کس کو کتنا دیا جائے، لہٰذا اس آیت میں اسی اصول کے تحت یہ حکم دیا گیا ہے کہ اگرچہ بیوہ کی عدّت چار مہینے دس دن ہے جسے وہ اسی گھر میں گزارے گی جس میں شوہر کا انتقال ہوا ہو، لیکن اس کے شوہر کو چاہیے کہ وہ اپنی بیوی کے حق میں یہ وصیت کرجائے کہ اسے سال بھر تک اس کے ترکے سے نفقہ بھی دیا جائے اور اس کے گھر میں رہائش بھی فراہم کی جائے۔ اس کے سسرال والوں کو یا مرنے والے کے رشتے داروں اور وارثوں کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ سال بھر کے دوران اس کو شوہر کے گھر سے باہر نکالیں اور یہ کہیں کہ اب تم یہاں سے نکل جاؤ اور اپنا کوئی اور گھر تلاش کرو، بلکہ اس وصیت کی وجہ سے سال بھر تک ان کو شوہر کے گھر میں رہائش کا حق دینا ورثاء کے ذمے واجب ہوجائے گا۔

چونکہ یہ حق عورت کا تھا، اس لیے اس کے وصول کرنے یا نہ کرنے کا اختیار بھی اسی کو حاصل تھا، چنانچہ اگر خود عورت اپنی مرضی سے چار مہینے دس دن عدّت پوری کرنے کے بعد کہیں اور جانا چاہتی ہے یا کسی اور گھر میں رہنا چاہتی ہے، تو بے شک رہے، اس کے اوپر کوئی پابندی نہیں ہے، لیکن اگر اس کا کوئی دوسرا ٹھکانہ نہیں ہے یا کسی اور وجہ سے وہ سال بھر شوہر کے گھر میں ہی گزارنا چاہتی ہے، تو پھر اس صورت میں وارثوں کو اسے نکالنے کا حق حاصل نہیں ہے۔

جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا، اللہ تعالیٰ نے یہ حکم شروع شروع میں اس وقت عطا فرمایا تھا جب میراث کے احکام نہیں آئے تھے۔ بعد میں پھر اللہ تبارک وتعالیٰ نے سورۂ نساء میں میراث کے مفصّل احکام عطا فرمائے اور اس میں بیوی کو شوہر کے ترکے میں حصے دار بناتے ہوئے فرمایا کہ اگر مرنے والے کی اولاد ہے تو بیوی کو شوہر کے ترکے سے آٹھواں حصہ اور اگر اولاد نہیں ہے تو بیوی کو چوتھا حصہ ملے گا۔

میراث کے احکام نازل ہونے کے بعد جب ترکے میں بیوی حصہ دار بن گئی، تو اب سال بھر تک شوہر کے ترکے سے نفقہ پانے اور اس کے گھر میں رہنے کا جو حق تھا، اس کی ضرورت ہی نہ رہی، کیونکہ شوہر کے ترکے میں سے ایک معقول مقدار بیوی کو مل جائے گی، تو اب وہ اس میراث کے حصے کے ذریعے اپنی رہائش کا انتظام بھی کرسکتی ہے اور اپنے نان نفقہ کا انتظام بھی کرسکتی ہے، لہٰذا اب چار مہینے دس دن تک جو عدّت کے ایام ہیں، ان میں تو بے شک وہ شوہر کی طرف سے نفقہ پانے کی حقدار ہے، لیکن عدت گزرنے کے بعد پھر اس کے نفقہ کی ضرورت نہیں ہے، کیونکہ اس کو شوہر کی میراث میں سے اپنا حصہ مل چکا ہے۔

انہی احکام کو بیان کرتے ہوئے باری تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ﴾ اور تم میں سے جو لوگ وفات پاجائیں ﴿وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا﴾ اور اپنے پیچھے بیویاں چھوڑ جائیں ﴿وَّصِيَّةً لِّاَزْوَاجِهِمْ﴾ تو وہ اپنی بیویوں کے حق میں یہ وصیت کرجایا کریں ﴿مَّتَاعًا اِلَى الْحَوْلِ غَيْرَ اِخْرَاجٍ﴾ کہ وہ ایک سال تک (ترکے سے نفقہ وصول کرنے کا) فائدہ اُٹھائیں گی اور ان کو (شوہر کے گھر سے) نہیں نکالا جائے گا۔ ﴿فَاِنْ خَرَجْنَ﴾ ''ہاں اگر وہ خود نکل جائیں،'' یعنی چار مہینے دس دن کی عدت پوری کرنے کے بعد وہ خود اپنی مرضی سے یہ چاہیں کہ ہم کسی اور گھر میں جاکر رہیں، تو ایسی صورت میں ﴿فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ﴾ تمہارے اوپر کوئی گناہ نہیں ہے ﴿فِيْ مَا فَعَلْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِنَّ مِنْ مَّعْرُوْفٍ﴾ ''کہ وہ اپنے حق میں قاعدے کے مطابق جو کچھ کریں۔'' وہ اگر اپنے حق میں خود فیصلہ کررہی ہیں اور قاعدے کے مطابق کررہی ہیں، تو اس میں

کوئی حرج نہیں ہے اور تمہارے اوپر کوئی گناہ نہیں ہے۔

یہاں پر ﴿مِنْ مَّعْرُوْفٍ﴾ یعنی ''قاعدے کے مطابق'' فیصلہ کرنے کے معنیٰ یہ ہیں کہ وہ عدّت گزرنے سے پہلے شوہر کے گھر سے جانے کا اقدام نہ کریں، بلکہ عدت پوری کرنے کے بعد یعنی چار ماہ دس دن یا وضعِ حمل کے بعد اس گھر سے جانے یا نکاح وغیرہ کا اقدام کررہی ہیں، تو اس صورت میں تمہارے اوپر کوئی گناہ نہیں ہے کہ تم ان کو شوہروں کے گھر سے باہر جانے کی اجازت دے دو۔ ﴿وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿٢٤٠﴾﴾ ''اور اللہ تعالیٰ صاحبِ اقتدار بھی ہے، صاحبِ حکمت بھی ہے۔'' چونکہ صاحبِ اقتدار ہے اس لیے اس کو حق حاصل ہے کہ جو بھی چاہے حکم دے دے اور چونکہ صاحبِ حکمت بھی ہے تو ایسا ہی حکم عطا فرماتا ہے جو بندوں کی مصلحت کے مطابق ہو، چاہے وہ مصلحت بندوں کی سمجھ میں آئے یا نہ آئے۔

مطلقہ عورتوں کے حقوق کی ادائیگی کی تلقین

پھر آگے ایک جامع جملہ مطلّقہ عورتوں کے حق میں ارشاد فرمادیا کہ ﴿وَلِلْمُطَلَّقٰتِ مَتَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ﴾ ''مطلقہ عورتوں کو قاعدے کے مطابق فائدہ پہنچانا متقیوں پر ان کا حق ہے،'' یعنی ایسی عورتیں جن کو طلاق دے دی گئی ہو، ان کو فائدہ پہنچانا متقیوں کے ذمے ضروری ہے۔ یہاں پر فائدہ پہنچانے کی تفصیل نہیں بیان فرمائی گئی، لیکن جیسا کہ دیگر آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض جگہ وہ فائدہ پہنچانا واجب ہے، بعض جگہ پر مستحب ہے۔

- واجب ہونے کی ایک صورت تو یہ ہے کہ طلاق ہونے کے بعد بھی عدت کے دوران ان کا نفقہ ادا کریں، چاہے وہ مطلّقات کسی بھی قسم کی ہوں، چاہے طلاقِ رجعی دی ہو، چاہے طلاقِ بائن دی ہو یا چاہے مغلّظ طلاق دی ہو، ہر حالت میں عدت کے دوران ان کا نفقہ برداشت کرنا شوہر کے ذمے واجب ہے۔
- دوسری صورت یہ کہ اگر مطلّقات نے ابھی تک مہر وصول نہیں کیا، تو مہر دینا بھی واجب ہے، البتہ اگر رخصتی کے بعد اور صحبت کے بعد طلاق دی گئی ہے تب تو پورا مہر دینا واجب ہے اور اگر بغیر صحبت اور بغیر خلوت کے طلاق ہوئی ہے تو اس صورت میں آدھا مہر واجب ہے، پھر بھی پورا دینا بہتر ہے جیسا کہ پیچھے گزرا۔ ان تمام صورتوں میں تو فائدہ پہنچانا لازم ہے اور یہ ایک واجب

قسم کا حق ہے۔

- تیسری صورت یہ کہ اگر کسی خاتون سے نکاح ہوا اور اس میں مہر مقرّر نہیں ہوا اور پھر رخصتی سے پہلے یا صحبت اور خلوت سے پہلے ہی طلاق دے دی تو اس صورت میں مہر تو کچھ واجب نہیں ہوتا، لیکن مطلقات کو تحفہ دینا واجب ہوتا ہے، جیسا کہ پیچھے گزر چکا ہے۔
- اور عام حالات میں جب کہ مہر مقرّر ہوا ہو اور رخصتی کے بعد طلاق دی گئی ہو تو اس میں اگرچہ یہ تحفہ دینا فرض اور واجب تو نہیں ہے، لیکن مستحب ہے کہ طلاق دینے والا اپنی مطلقہ بیوی کو کوئی تحفہ دے دے۔

لہٰذا قرآنِ کریم کے اس مختصر مگر جامع جملے میں ہر طرح کے فائدے داخل ہوگئے، اور یہاں ﴿بِالْمَعْرُوْفِ﴾ یعنی ''قاعدے کے مطابق'' کا ایسا جامع لفظ ذکر کیا گیا جس سے سب باتوں کا احاطہ ہوگیا۔ جو جس قسم کا قاعدہ ہے، اسی کے مطابق عمل کیا جائے، جہاں واجب ہے وہاں ان کے ذمے فائدہ پہنچانا واجب ہوگا، جہاں مستحب ہے وہاں پر ان کو فائدہ پہنچانا مستحب ہوگا۔

ان تمام احکام سے یہ بات واضح ہورہی ہے کہ اوّل تو طلاق کوئی پسندیدہ چیز نہیں ہے، اور اس کا اقدام اسی وقت کرنا چاہیے جب کوئی اور صورت باقی نہ رہی ہو، دوسرے جب یہ اقدام کیا جائے تو نکاح کے تعلق کا اختتام بھی شرافت، فراخ دلی اور احترام سے خوشگوار ماحول میں ہونا چاہیے، دشمنی کے ماحول میں نہیں۔ پھر فرمایا: ﴿كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ﴾ اللہ تعالیٰ اسی طرح اپنی آیتیں یا اپنے احکام تمہارے سامنے بیان فرماتے ہیں ﴿لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۲۴۲﴾﴾ تاکہ تم سمجھ داری سے کام لے کر ان احکام کو سمجھو اور اس کے اوپر عمل کرنے کی کوشش کرو۔

آیت نمبر ۲۴۳ تا ۲۴۵

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَهُمْ اُلُوْفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ ۪ فَقَالَ لَهُمُ اللّٰهُ مُوْتُوْا ۫ ثُمَّ اَحْيَاهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ ﴿۲۴۳﴾ وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ

اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۴۴﴾ مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗٓ اَضْعَافًا كَثِيْرَةً ۭ وَاللّٰهُ يَقْبِضُ وَيَبْصُۜطُ ۠ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۲۴۵﴾

کیا تمہیں ان لوگوں کا حال معلوم نہیں ہوا جو موت سے بچنے کے لیے اپنے گھروں سے نکل آئے تھے اور وہ ہزاروں کی تعداد میں تھے؟ چنانچہ اللہ نے ان سے کہا: ''مرجاؤ'' پھر انہیں زندہ کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ لوگوں پر بہت فضل فرمانے والا ہے، لیکن اکثر لوگ شکر ادا نہیں کرتے۔ ﴿۲۴۳﴾ اور اللہ کے راستے میں جنگ کرو، اور یقین رکھو کہ اللہ خوب سننے والا، خوب جاننے والا ہے۔ ﴿۲۴۴﴾ کون ہے جو اللہ کو اچھے طریقے پر قرض دے، تاکہ وہ اسے اس کے مفاد میں اتنا بڑھائے چڑھائے کہ وہ بدرجہا زیادہ ہوجائے؟ اور اللہ ہی تنگی پیدا کرتا ہے، اور وہی وسعت دیتا ہے، اور اسی کی طرف تم سب کو لوٹایا جائے گا۔ ﴿۲۴۵﴾

جہاد فی سبیل اللہ اور انفاق فی سبیل اللہ کے مضامین

یہاں سے اللہ تبارک وتعالیٰ نے دو مضمون ایک ساتھ بیان فرمائے ہیں، جن میں سے ایک جہاد سے متعلق اور دوسرا اللہ تعالیٰ کے راستے میں مال خرچ کرنے سے متعلق ہے۔ جہاد کی ترغیب کے لیے اللہ تبارک وتعالیٰ نے کچھ ہدایات دینے کے ساتھ ساتھ کچھ واقعات بھی بیان فرمائے ہیں جن سے یہ بتانا مقصود ہے کہ موت اور زندگی اور فتح وشکست سب اللہ تعالیٰ کے قبضے میں ہے، اور چونکہ جہاد میں اللہ تعالیٰ کے راستے میں مال خرچ کرنے کی نوبت بھی آتی ہے اور اس کی ضرورت بھی پڑتی ہے تو اس مناسبت سے اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کرنے کا ذکر بھی اہتمام کے ساتھ فرمایا گیا ہے۔ اور جب اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کرنے ذکر آیا، تو وہ جہاد کے لیے خرچ کرنے کے ساتھ خاص نہ رہا، بلکہ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے صدقہ وخیرات کے ذریعے جس طرح بھی مال خرچ کیا جائے، ان سب کے تفصیلی فضائل بھی اللہ تبارک وتعالیٰ نے آگے بیان فرمائے ہیں اور کچھ احکام بھی بیان فرمائے ہیں۔

موت وحیات اللہ کے ہاتھ میں ہونے کے پانچ واقعات

چونکہ بعض منافقین اور کمزور طبیعت کے لوگ جہاد میں جانے سے اس لیے کتراتے تھے کہ انہیں موت کا خوف ہوتا تھا، اس لیے اللہ تبارک وتعالیٰ نے پہلے تو کچھ ایسے واقعات بیان فرمائے ہیں جن کا حاصل یہ ہے کہ موت اور زندگی اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے، وہ چاہے تو جنگ کے بغیر بھی موت دے دے اور چاہے تو شدید جنگ کے درمیان بھی انسانوں کی حفاظت کرلے، بلکہ اس کی قدرت میں یہ بھی ہے کہ وہ مرنے کے بعد بھی انسانوں کو دوبارہ زندہ کردے۔ اس قدرت کا عمومی مظاہرہ تو آخرت میں ہی ہوگا جب تمام انسانوں کو ان کی قبروں سے اٹھا کر زندہ کیا جائے گا، لیکن اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں بھی کچھ ایسے نمونے دکھادیے ہیں جن میں بعض لوگوں کو مرنے کے بعد بھی زندہ کیا گیا۔ یہاں پر اس قسم کے واقعات کے کل پانچ نمونے ذکر کیے گئے، جن کی تفصیل حسبِ ذیل ہے:

- اس کی پہلی مثال اسی آیت: ﴿ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ ... ﴾ میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے دی ہے، جس میں موت سے بھاگنے والے بنی اسرائیل کے لوگوں کا واقعہ بیان کیا گیا ہے۔
- ایک اشارہ آیت نمبر ۲۵۳ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف کیا گیا ہے جن کے ہاتھوں اللہ تعالیٰ نے کئی مردوں کو زندہ کیا۔
- تیسرا حوالہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور نمرود کے مکالمے (آیت نمبر ۲۵۸) میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے موت اور زندگی دینے سے متعلق ہے۔
- چوتھا واقعہ آیت نمبر ۲۵۹ میں حضرت عزیر علیہ السلام کا بیان فرمایا گیا ہے۔
- اور اس سے اگلی آیت (آیت نمبر ۲۶۰) میں پانچواں واقعہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ہے جس میں انہوں نے اللہ تعالیٰ سے عرض کیا تھا کہ اللہ تعالیٰ مردوں کو کیسے زندہ کرتے ہیں؟

موت سے بھاگنے والے بنی اسرائیل کے لوگوں کا واقعہ

موت وحیات اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہونے سے متعلق واقعات میں سے پہلا واقعہ بیان کرتے ہوئے

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ﴿اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ﴾ ''کیا تمہیں ان لوگوں کا حال معلوم نہیں ہوا؟'' اس کے اگر لفظی معنیٰ کیے جائیں تو یہ ہوں گے کہ ''کیا تم نے ان کو نہیں دیکھا؟'' اور ظاہر ہے کہ یہاں آنکھوں سے دیکھنا مراد نہیں ہے، بلکہ ان کا حال معلوم ہونا مراد ہے۔ اس لیے ہم نے ترجمہ اس طرح کیا ہے کہ ''کیا تمہیں ان لوگوں کا حال معلوم نہیں ہوا؟'' ﴿خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ﴾ جو اپنے گھروں سے نکلے تھے ﴿وَهُمْ اُلُوْفٌ﴾ ''جب کہ وہ ہزاروں کی تعداد میں تھے۔'' اس تعداد کی تعیین میں اگرچہ روایات مختلف ہیں، تاہم عربی زبان کے قواعد کے لحاظ سے یہ لفظ جمع کثرت کا ہے، جس کا اطلاق دس سے کم پر نہیں ہوتا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی تعداد دس ہزار سے کم نہ تھی۔ پھر ان کے گھروں سے نکلنے کی وجہ بیان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ﴿حَذَرَ الْمَوْتِ﴾ یعنی وہ موت سے بچنے کے لیے گھروں سے نکل کھڑے ہوئے تھے ﴿فَقَالَ لَهُمُ اللّٰهُ﴾ اللہ تعالیٰ نے ان کو حکم دیا کہ ﴿مُوْتُوْا﴾ ''مرجاؤ۔'' اس حکم کے ساتھ ہی وہ سب مرگئے، ﴿ثُمَّ اَحْيَاهُمْ﴾ ''پھر اللہ تعالیٰ نے انہیں زندہ کیا۔''

اس واقعے کی پوری تفصیل تو قرآنِ کریم نے بیان نہیں فرمائی، صرف اتنا بتایا ہے کہ کسی وقت کوئی قوم جو کہ ہزاروں کی تعداد میں تھی، وہ موت سے بچنے کے لیے اپنے گھروں سے نکل کھڑی ہوئی تھی، مگر اللہ تعالیٰ نے انہیں پھر بھی موت دے دی اور پھر زندہ کرکے یہ دکھادیا کہ اگر موت سے بچنے کے لیے کوئی شخص اللہ تعالیٰ کے حکم کی خلاف ورزی کرتے ہوئے کوئی تدبیر اختیار کرے تو ضروری نہیں کہ موت سے بچ بھی جائے، اللہ تعالیٰ اسے پھر بھی موت دے سکتے ہیں۔

یہاں قرآنِ کریم نے یہ تفصیل بیان نہیں فرمائی کہ یہ لوگ کون تھے؟ کس زمانے میں تھے؟ اور موت کا خوف کیا تھا جس کی بنا پر یہ بھاگ کھڑے ہوئے تھے؟ یہ تفصیل اس لیے بیان نہیں فرمائی کہ قرآنِ کریم کوئی تاریخ کی کتاب نہیں ہے، اس میں جو واقعات بیان ہوتے ہیں وہ کوئی سبق دینے کے لیے ہوتے ہیں، لہٰذا اکثر اوقات ان کا صرف اتنا حصہ بیان کیا جاتا ہے جس سے وہ سبق مل جائے۔ زیرِ نظر واقعہ سے بھی جو سبق دینا مقصود ہے، اس کے لیے اتنی بات کافی ہے جو یہاں بیان ہوئی ہے۔ البتہ جس انداز سے قرآنِ کریم نے اس واقعے کی طرف اشارہ کیا ہے کہ کیا تمہیں ان لوگوں کا حال معلوم نہیں ہوا؟ اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ جب قرآن نازل ہورہا تھا اس وقت یہ قصہ لوگوں میں مشہور ومعروف تھا۔

چنانچہ امام المفسرین حافظ ابن جریر طبری رحمہ اللہ نے یہاں عبد اللہ بن عباس اور بعض تابعین رضی اللہ عنہم سے

کئی روایتیں (۱) نقل کی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ بنو اسرائیل کے لوگوں کا ہے جو کسی وقت ہزاروں کی تعداد میں ہونے کے باوجود یا تو کسی دشمن کے مقابلے سے کترا کر اپنا گھر بار چھوڑ گئے تھے یا طاعون کی وبا سے گھبرا کر نکل کھڑے ہوئے تھے، لیکن جب اس جگہ پہنچے جسے وہ اپنی پناہ گاہ سمجھتے تھے، تو اللہ کے حکم سے موت نے ان کو وہیں آ لیا۔ بعد میں جب وہ بوسیدہ ہڈیوں میں تبدیل ہو گئے، تو حضرت حزقیل علیہ السلام کا وہاں سے گزر ہوا اور اللہ تعالیٰ نے ان کو حکم دیا کہ وہ ان ہڈیوں سے خطاب کریں، چنانچہ ان کے خطاب کے بعد وہ ہڈیاں پھر سے انسانی شکل میں زندہ ہو کر کھڑی ہو گئیں۔

حضرت حزقیل علیہ السلام کا یہ قصہ موجودہ بائبل (۲) میں بھی مذکور ہے، اس لیے کچھ بعید نہیں ہے کہ یہ واقعہ مدینہ منوّرہ کے یہودیوں میں بھی مشہور ہو گیا ہو اور پھر یہودیوں سے اہلِ عرب کے پاس بھی پہنچا ہو اور اس طرح ان کو بھی اس کا علم ہو گیا ہو۔ بہرحال! واقعہ کی یہ تفصیلات چونکہ قرآن نے بیان نہیں کیں، لہٰذا ہم یقین کے ساتھ ان پر بھروسہ نہیں کر سکتے، لیکن اتنی بات قرآنِ کریم کے صاف اور صریح الفاظ سے واضح ہے کہ ان لوگوں کو حقیقی طور پر موت کے بعد زندہ کیا گیا تھا۔

حقیقی موت کے بجائے سیاسی موت قرار دینے کی دور از کار تاویل

ہمارے زمانے کے بعض مصنفین نے مردوں کے زندہ ہونے کو بعید از قیاس سمجھتے ہوئے اس آیت میں یہ تاویل کی ہے کہ یہاں موت سے مراد سیاسی اور اخلاقی موت ہے اور دوبارہ زندہ ہونے سے مراد سیاسی غلبہ ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ تاویل قرآنِ کریم کے صریح الفاظ سے کسی طرح میل نہیں کھاتی اور عربیت اور قرآنِ کریم کے اسلوب سے بھی بہت بعید ہے۔ اگر کسی قوم کے بارے میں یہ کہا جائے کہ وہ سیاسی یا اخلاقی موت مر گئی تھی تو اس بات کا سیدھا سادہ یہ اسلوب ہوتا ہے کہ ان کے بارے میں یوں کہا جائے کہ ان کے اوپر ایک موت طاری ہو گئی تھی، لیکن یہاں تو خاص طور پر اللہ تعالیٰ نے ﴿فَقَالَ لَهُمُ اللّٰهُ مُوْتُوْا﴾ فرمایا ہے، یعنی ''اللہ تعالیٰ نے ان سے کہا کہ مر جاؤ'' لہٰذا یہاں اس کو سیاسی موت سے تعبیر کرنا کہ اللہ تعالیٰ نے ان سے کہا کہ تم سیاسی موت مر جاؤ، یہ بہت ہی بعید اور دور از کار بات ہے۔

---

(۱) دیکھیے: تفسير الطبري = جامع البيان (٥/٢٦٦): الناشر: مؤسسة الرسالة.

(۲) دیکھیے: حزقی ایل ۱:۱۵ تا ۳۷

اس میں اس قسم کی کوئی تاویل کرنے کی ضرورت ہی نہیں، اگر اللہ تعالیٰ کی قدرت پر ایمانِ کامل ہو تو اس قسم کے واقعات میں تعجب کی کیا بات ہے؟ اللہ تعالیٰ قادرِ مطلق ہیں اور وہ ہر چیز پر قادر ہیں، نیز جیسا کہ میں نے شروع میں عرض کیا کہ یہاں سے لے کر آیت نمبر ۲۶۰ تک جو سلسلۂ گفتگو چل رہا ہے اس کی روشنی میں یہاں موت اور زندگی سے حقیقی معنیٰ مراد ہونا ہی قرینِ قیاس ہے اور آگے بھی اللہ تبارک وتعالیٰ ایسے کئی واقعات بتا رہے ہیں جس میں مرنے کے بعد کسی کو زندہ کیا گیا۔

آگے پھر اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا: ﴿اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ﴾ ''حقیقت یہ ہے کہ اللہ لوگوں پر بہت فضل فرمانے والا ہے،'' یعنی یہ واقعہ کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان کو ایک تنبیہ کے طور پر موت بھی دی اور پھر اس کے بعد ان کو دوبارہ زندہ بھی کیا، یہ سارا کچھ اللہ تبارک وتعالیٰ کے فضل کا ایک مظہر تھا، اس میں ان لوگوں پر فضل کا تذکرہ کرنے کے ساتھ ساتھ اُمتِ محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام پر بھی فضل کا ہونا ظاہر ہے کہ جنہیں یہ واقعہ بتا کر ان کے لیے درسِ عبرت پیدا کیا گیا۔ ﴿وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ ﴿۲۴۳﴾﴾ ''لیکن اکثر لوگ شکر ادا نہیں کرتے،'' یعنی انسانی زندگی کے اندر بے شمار واقعات ایسے آتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم کی بنا پر وجود میں آتے ہیں اور انسان کا فرض ہے کہ ان پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرے، لیکن بہت سے لوگ اس فریضے سے غافل رہتے ہیں اور شکر ادا نہیں کرتے۔

قتال فی سبیل اللہ کا حکم اور منافقین کو تنبیہ

اس واقعے کو بیان کرنے سے بھی اور آئندہ جو واقعات آرہے ہیں ان کو بیان کرنے سے بھی جو مقصود تھا، اگلی آیت میں اس کو صریح انداز میں بیان فرمادیا کہ ﴿وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ﴾ اور اللہ کے راستے میں جنگ کرو ﴿وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۴۴﴾﴾ ''اور یقین رکھو کہ اللہ خوب سننے والا، خوب جاننے والا ہے،'' یعنی تم جو کچھ باتیں آپس میں کرتے ہو، بعض اوقات اس میں بزدلی کی باتیں ہوتی ہیں، بعض اوقات اس میں جہاد کے مقصد کے خلاف باتیں ہوتی ہیں، وہ بھی اللہ تعالیٰ سنتا ہے اور تمہارے دل میں جو جہاد سے فرار کی باتیں پیدا ہوتی ہیں، تو وہ بھی اللہ تعالیٰ جانتا ہے۔ جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا، بعض منافقین خاص طور پر جہاد سے کترایا کرتے تھے، تو ان کو یہ تنبیہ کردی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہارے ہر کام سے واقف بھی ہے اور ہر بات کو سُن بھی رہا ہے، لہٰذا وہ ہر ایک کو اس کے مناسب سزا و جزا دے گا۔

انفاق کی ترغیب اور قرضِ حسن کا مطلب ومفہوم

جہاد کے مضمون کے ساتھ اب آگے کی آیات میں اللہ تعالیٰ کے راستے میں مال خرچ کرنے کی ترغیب دی گئی ہے۔ چنانچہ اپنے راستے میں مال خرچ کرنے کی ترغیب دیتے ہوئے باری تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ﴿مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا﴾ ''کون ہے جو اللہ کو اچھے طریقے پر قرض دے؟'' اللہ تعالیٰ کا فضل وکرم دیکھیے کہ دنیا میں جس کسی کے پاس کوئی مال و دولت ہے، وہ اللہ تعالیٰ ہی کا دیا ہوا ہے، لہٰذا اللہ تعالیٰ کو پورا حق ہے کہ وہ اس دولت کو جہاں کہیں خرچ کرنے کا حکم دینا چاہے دے دے، پھر اگر بندہ اس حکم کی تعمیل میں وہ مال خرچ کر دے تو نہ یہ کسی پر احسان ہے، نہ اُسے قرض کہا جاسکتا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ نیک کاموں میں خرچ کرنے کو اس طرح تعبیر فرمارہے ہیں کہ جو مال بھی تم اللہ تعالیٰ کے حکم یا ترغیب سے خرچ کرو گے، اُسے یہ سمجھو کہ تم نے اللہ تعالیٰ کو قرض دیا ہے، کیونکہ جس طرح مقروض کے ذمے فرض ہے کہ وہ قرض کی رقم قرض خواہ کو واپس کرے، اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اپنے اوپر یہ ذمہ داری لے لی ہے کہ وہ آخرت میں تمہیں بڑھا چڑھا کر ادا فرمائے گا۔

پھر یہاں پر ﴿حَسَنًا﴾ کا لفظ قرض کی صفت کے طور پر ذکر کیا گیا ہے۔ ہماری اردو زبان میں بھی ''قرضِ حسن'' بولا جاتا ہے، اسے بعض لوگ ''قرضِ حسنہ'' بولتے ہیں وہ صحیح لفظ نہیں ہے، قواعد کے لحاظ سے صحیح لفظ ''قرضِ حسن'' ہے اور اس کے معنیٰ ہیں: ''اچھا قرض''۔ اچھے قرض سے مراد ایسا قرض ہوتا ہے جو اخلاص کے ساتھ اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کے لیے دیا جائے، دکھاوا یا دنیا میں بدلہ لینا مقصود نہ ہو، اس میں دینے والے کا رویہ بھی اچھا ہو، خوش اخلاقی کے ساتھ دیا جائے، مناسب موقع پر دیا جائے، مناسب طریقے سے دیا جائے اور اگر جہاد کے لیے یا کسی غریب کی مدد کے طور پر قرض ہی دیا جائے، تو اس پر کسی سود کا مطالبہ نہ ہو، یہ سب باتیں مل کر قرضِ حسن بنتی ہیں اور ایسا قرض اللہ تعالیٰ کو پسند ہے۔ کفار اپنی جنگی ضروریات کے لیے سود پر قرض لیتے تھے، مسلمانوں کو تاکید کی گئی ہے کہ اگرچہ دنیا میں تو انہیں سود نہیں ملے گا، لیکن آخرت میں اللہ تعالیٰ اس کا ثواب اصل سے بدرجہا زیادہ عطا فرمائیں گے۔

مذکورہ بالا صفات کے حامل قرض یعنی قرضِ حسن کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ کون ہے جو اللہ کو اچھے طریقے پر قرض دے ﴿فَیُضٰعِفَهٗ لَهٗۤ اَضْعَافًا كَثِیْرَةً﴾ ''تاکہ وہ اسے اس کے مفاد میں اتنا بڑھائے چڑھائے کہ وہ بدرجہا زیادہ ہوجائے'' یعنی اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے فضل وکرم سے یہ اپنی ذمے

داری لے رکھی ہے کہ جب کوئی شخص اچھے طریقے سے کوئی چیز اللہ تبارک وتعالیٰ کی بارگاہ میں، اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کی خاطر دے گا تو اس کو ہم اپنی طرف سے زیادہ بڑھا کر دیں گے۔

یہاں پر فرمایا کہ ﴿اَضْعَافًا كَثِيْرَةً﴾ بدرجہا زیادہ ''اَضْعَافًا'' ضِعفٌ کی جمع ہے اور ضِعفٌ کے معنیٰ دگنے کے ہوتے ہیں، یہاں پر جب ضعف کی بھی جمع یعنی ''اضعاف'' ذکر کی گئی تو اس کے اندر دگنے، تگنے، چوگنے اور پتہ نہیں کتنے گنے داخل ہوگئے، اور پھر اس کے ساتھ ''كَثِيْرَةً'' یعنی بہت زیادہ کا لفظ بھی بڑھادیا گیا، جس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ اس کو بہت زیادہ تعداد میں بڑھا کر ادا فرماتے ہیں۔

قرض کی واپسی میں غیر مشروط زیادتی حُسنِ قضا ہے

یہاں یہ بات بھی سمجھ لیجیے کہ دنیا میں انسانوں کے درمیان جو قرض کا معاملہ ہوتا ہے، اس میں اگر قرض دیتے وقت یا قرض کے معاہدے میں یہ بات طے کرلی جائے کہ قرض لینے والا جب واپس کرے گا، تو اس پر اتنا اضافہ کرکے واپس کرے گا، تو اسی کا نام ''سود'' ہے، جس کی ممانعت اسی سورت کے اندر آگے آنے والی ہے۔ لیکن اگر قرض تو بغیر کسی اضافے کی شرط کے دیا گیا، نہ کوئی شرط لگائی گئی، اور نہ دینے والے کے دل میں خیال تھا کہ میں اس سے زیادہ وصول کروں گا، لیکن جب ادائیگی کا وقت آیا تو جو قرض لینے والا تھا اس نے محض اپنی خوش دلی سے قرض خواہ کی طرف سے کسی قسم کے مطالبے کے بغیر اسے کچھ پیسے زیادہ دے دیے، تو یہ بات نہ صرف یہ کہ جائز ہے، بلکہ فضیلت کی چیز بھی ہے، اس کو حدیث میں ''حسنِ قضا'' سے تعبیر فرمایا گیا ہے اور اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ ادائیگی اچھے طریقے سے کی جائے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

إِنَّ خِيَارَكُمْ أَحْسَنُكُمْ قَضَاءً[1]

تم میں سے بہترین وہ شخص ہے جو اپنے قرض کو اچھے طریقے سے ادا کرے۔

یہاں یہ واضح رہے کہ انسانوں کے درمیان جو قرض کا معاملہ ہوتا ہے، اس میں تو شرط لگانا سود ہے اور حرام ہے جیسا کہ آگے آئے گا، لیکن اللہ تبارک وتعالیٰ اگر یہ اعلان فرمارہے ہیں کہ جو ہمیں قرض دے گا، یعنی

---

(۱) صحيح البخاري (۳/ ۱۱۷) (۲۳۹۳) كتاب في الاستقراض وأداء الديون والحجر والتفليس، باب حسن القضاء.

ہمارے راستے میں خرچ کرے گا تو ہم اس کو آخرت میں جا کر کئی گنا بڑھا دیں گے، یہ وہ شرط نہیں ہے جو اسے سود میں داخل کردے۔ کیونکہ سود کا معاملہ دنیا میں ہوتا ہے، یہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے آخرت کے ثواب کا وعدہ ہے۔ دنیا میں ہونے والا کوئی معاملہ نہیں ہے جس میں قرض کے اوپر کسی اضافے کی شرط لگائی گئی ہو۔

راہِ خدا میں خرچ کرنے سے مال میں کمی نہیں ہوتی

جب کہیں اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کرنے کا کوئی موقع آتا ہے تو بخیل آدمی کے دل میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ اگر میں نے خرچ کردیا تو میرے مال میں کمی ہو جائے گی اور میری ضرورتیں پوری نہ ہوسکیں گی، اس خیال کے پیشِ نظر وہ اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کرنے سے اپنا ہاتھ کھینچ لیتا ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہ جو تمہارے دل میں خیال پیدا ہورہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کرنے سے مال میں کمی یا تنگی ہوجائے گی، تو یہ تنگی اور کشادگی تو اللہ تعالیٰ کے قبضۂ قدرت میں ہے، چنانچہ فرمایا کہ ﴿وَاللّٰهُ يَقْبِضُ﴾ اور اللہ تعالیٰ ہی تنگی پیدا کرتا ہے ﴿وَ يَبْصُۜطُ﴾ ''اور وہ ہی وسعت دیتا ہے۔'' اس لیے یہ نہ سمجھو کہ صدقہ دینے کی وجہ سے یا اللہ تبارک وتعالیٰ کے راستے میں خرچ کرنے کی وجہ سے تم گھاٹے میں رہو گے اور تمہارے مال میں کمی یا تنگی پیش آجائے گی، ایسا نہیں ہوگا، بلکہ وسعت اور تنگی دینے والی ذات تو اللہ ہی کی ہے، وہ تمہیں تنگی سے بچائے گا۔

ٹھیک ہے کہ فوری طور پر گنتی میں کمی آئے گی، لیکن وہ گنتی کی کمی بھی اللہ تبارک وتعالیٰ دوسرے ذرائع سے پوری فرما سکتے ہیں۔ اور پھر ساتھ ساتھ یہ بھی سمجھنا ضروری ہے کہ گنتی ہی تو ساری چیز نہیں ہوتی، اصل بات یہ ہے کہ اس پیسے میں برکت ہو اور انسان اس سے فائدہ حاصل کرسکے اور وہ برکت اور فائدہ صرف اللہ تبارک وتعالیٰ ہی دے سکتے ہیں۔ وہ چاہیں تو تھوڑے پیسوں میں بھی زیادہ فائدہ عطا فرما دیں اور نہ چاہیں تو بہت پیسوں کو بھی بے برکت بنا دیں، لہٰذا تنگی پیدا ہونا یا کشادگی پیدا ہونا یہ تو سب اللہ تعالیٰ کے قبضۂ قدرت میں ہے، اللہ تعالیٰ کے عطا کیے ہوئے مال کو خرچ کرنے میں یہ اندیشے آڑے نہیں آنے چاہئیں۔

ایک حدیث[1] میں نبی کریم سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد منقول ہے کہ کوئی دن ایسا نہیں جاتا کہ

---

(۱) صحيح البخاري (۲ /۱۱۵) (۱۴۴۲) كتاب الزكوة، باب قول الله تعالى: ﴿فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰى وَ اتَّقٰىۙ۝ وَ صَدَّقَ بِالْحُسْنٰىۙ۝ فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْيُسْرٰىؕ۝﴾ [الليل:٦].

جب بندے صبح کو اٹھتے ہوں تو دو فرشتے آسمان سے اترتے نہ ہوں (یعنی وہ دو فرشتے ہر روز پابندی سے اترتے ہیں)۔ ان میں سے ایک فرشتہ تو یہ کہتا ہے کہ:

اَللّٰهُمَّ! أَعْطِ مُنْفِقًا خَلَفًا

اے اللہ جو آپ کے راستے میں خرچ کرنے والا ہو اس کو اس کے بدلے میں اور دیجیے۔

اور دوسرا فرشتہ کہتا ہے:

اَللّٰهُمَّ! أَعْطِ مُمْسِكًا تَلَفًا

اے اللہ! جو سینت سینت کر اپنے پاس پیسے رکھ رہا ہو (اور آپ کے راستے میں خرچ نہ کرتا ہو) تو اس کے مال پر ہلاکت مسلط فرما دیجیے۔

پھر آخر میں باری تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ﴿وَ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۲۴۵﴾﴾ ''اور بالآخر تمہیں اللہ تعالیٰ کی طرف ہی لوٹایا جائے گا۔'' اگر تم نے یہاں مال خرچ کیا ہوگا، تو دنیا کے اندر بھی تمہارے مال کے اندر برکت ہوگی، اور آخرت میں جو کچھ اس کے اوپر اجر ملے گا وہ اتنا عظیم الشان ہے کہ اس کو الفاظ میں بیان بھی نہیں کیا جاسکتا۔

آیت نمبر ۲۴۶ تا ۲۴۸

وقف لازم

اَلَمْ تَرَ اِلَى الْمَلَاِ مِنْۢ بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰى ۘ اِذْ قَالُوْا لِنَبِيٍّ لَّهُمُ ابْعَثْ لَنَا مَلِكًا نُّقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ قَالَ هَلْ عَسَيْتُمْ اِنْ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ اَلَّا تُقَاتِلُوْا ؕ قَالُوْا وَ مَا لَنَاۤ اَلَّا نُقَاتِلَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ قَدْ اُخْرِجْنَا مِنْ دِيَارِنَا وَ اَبْنَآئِنَا ؕ فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ تَوَلَّوْا اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ ؕ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ ﴿۲۴۶﴾ وَ قَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ اِنَّ اللّٰهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوْتَ مَلِكًا ؕ قَالُوْۤا اَنّٰى يَكُوْنُ لَهُ الْمُلْكُ عَلَيْنَا وَ نَحْنُ

اَحَقُّ بِالْمُلْكِ مِنْهُ وَلَمْ يُؤْتَ سَعَةً مِّنَ الْمَالِ ۭ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىهُ عَلَيْكُمْ وَزَادَهٗ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ ۭ وَاللّٰهُ يُؤْتِيْ مُلْكَهٗ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ۲۴۷ وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ اِنَّ اٰيَةَ مُلْكِهٖٓ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ التَّابُوْتُ فِيْهِ سَكِيْنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَبَقِيَّةٌ مِّمَّا تَرَكَ اٰلُ مُوْسٰى وَاٰلُ هٰرُوْنَ تَحْمِلُهُ الْمَلٰۗىِٕكَةُ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۲۴۸ ع ۳۲ ۲ ۱۲

کیا تمہیں موسیٰ کے بعد بنی اسرائیل کے گروہ کے اس واقعے کا علم نہیں ہوا جب انہوں نے اپنے ایک نبی سے کہا تھا کہ ہمارا ایک بادشاہ مقرّر کردیجیے تاکہ (اس کے جھنڈے تلے) ہم اللہ کے راستے میں جنگ کرسکیں۔ نبی نے کہا: ''کیا تم لوگوں سے یہ بات کچھ بعید ہے کہ جب تم پر جنگ فرض کی جائے تو تم نہ لڑو؟'' انہوں نے کہا: ''بھلا ہمیں کیا ہوجائے گا جو ہم اللہ کے راستے میں جنگ نہ کریں گے حالانکہ ہمیں اپنے گھروں اور اپنے بچوں کے پاس سے نکال باہر کیا گیا ہے۔'' پھر (ہوا یہی کہ) جب ان پر جنگ فرض کی گئی تو ان میں سے تھوڑے لوگوں کو چھوڑ کر باقی سب پیٹھ پھیر گئے، اور اللہ ظالموں کو خوب جانتا ہے۔ ۲۴۶ اور ان کے نبی نے ان سے کہا کہ: ''اللہ نے تمہارے لیے طالوت کو بادشاہ بنا کر بھیجا ہے۔'' کہنے لگے: ''بھلا اس کو ہم پر بادشاہت کرنے کا حق کہاں سے آگیا؟ ہم اس کے مقابلے میں بادشاہت کے زیادہ مستحق ہیں، اور اس کو تو مالی وسعت بھی حاصل نہیں۔'' نبی نے کہا: ''اللہ نے ان کو تم پر فضیلت دے کر چنا ہے اور انہیں علم اور جسم میں (تم سے) زیادہ وسعت عطا کی ہے، اور اللہ اپنا ملک جس کو چاہتا ہے دیتا ہے،'' اور اللہ بڑی وسعت اور بڑا علم رکھنے والا ہے۔ ۲۴۷ اور ان سے ان کے نبی نے یہ بھی کہا کہ: ''طالوت کی بادشاہت کی علامت یہ ہے کہ تمہارے پاس وہ صندوق (واپس) آجائے گا جس میں تمہارے پروردگار کی

طرف سے سکینت کا سامان ہے اور موسیٰ اور ہارون نے جو اشیاء چھوڑی تھیں ان میں سے کچھ باقی ماندہ چیزیں ہیں۔ اسے فرشتے اٹھائے ہوئے لائیں گے اگر تم مومن ہو تو تمہارے لیے اس میں بڑی نشانی ہے۔" (۲۴۸)

بنی اسرائیل کو عمالقہ کے ساتھ جہاد کا حکم

یہ واقعہ جو ان آیاتِ کریمہ میں بیان ہوا ہے، اس کا پسِ منظر یہ ہے کہ جب اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو فرعون سے نجات دی اور آپ بنی اسرائیل کو لے کر سمندر کے پار آ گئے، تو اصل مقصد یہ تھا کہ بنی اسرائیل کو فرعون کے مظالم سے نجات دلا کر اُنہیں ان کے اپنے اصل وطن یعنی فلسطین واپس لے جا کر آباد کیا جائے، کیونکہ بنی اسرائیل اصل میں فلسطین کے رہنے والے تھے، فلسطین ہی میں یہ پلے بڑھے تھے اور حضرت یعقوب علیہ السلام، جن کا لقب اسرائیل تھا اور جن کی وجہ سے یہ بنی اسرائیل کہلائے، وہ حضرت اسحٰق علیہ السلام کے صاحبزادے اور حضرت یوسف علیہ السلام کے والد تھے، وہ بھی وہیں پر رہتے تھے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کا مشہور واقعہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے ان کو مصر کا بادشاہ بنا دیا تو انہوں نے اپنے خاندان کو اپنے پاس بلا لیا، چنانچہ حضرت یعقوب علیہ السلام اور ان کی اولاد فلسطین سے مصر منتقل ہو گئے۔

مصر میں بنی اسرائیل کی کچھ عرصے تک تو بہت اچھی زندگی گزری، لیکن بعد میں مختلف فرعون آنے لگے اور انہوں نے بنی اسرائیل کو تنگ کرنا شروع کر دیا تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یہ ذمہ داری سونپی کہ آپ ایک طرف تو لوگوں کو ہدایت دیں اور دوسری طرف بنی اسرائیل کو فرعون کے مظالم سے نجات دلا کر واپس ان کے اپنے اصل وطن یعنی فلسطین واپس لے جائیں، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرعون کو شکست دی، وہ سمندر میں غرق ہوا اور بنی اسرائیل سمندر سے پار صحرائے سینا میں اتر گئے۔

وہاں پر اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا کہ ان کو لے کر جائیں اور فلسطین کو آباد کریں۔ اس دوران فلسطین پر ایک طاقتور اور زور آور قوم عمالقہ قابض ہو گئی تھی اور فلسطین واپس پہنچنے کے لیے ضروری تھا کہ ان عمالقہ سے جہاد کیا جائے جو بنی اسرائیل کے وطن پر قابض ہو گئے تھے، چنانچہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کو ان عمالقہ سے جہاد کرنے کی دعوت دی تو بنی اسرائیل نے روایتی سرکشی سے کام لیتے ہوئے نہ صرف یہ کہ اس مہم سے انکار کر دیا، بلکہ موسیٰ علیہ السلام سے یہاں تک کہہ دیا کہ:

فَاذْهَبْ اَنْتَ وَ رَبُّكَ فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ (۱)

بس تم اور تمہارا رب چلے جاؤ اور ان سے لڑو، ہم تو یہیں بیٹھے ہیں۔

یعنی اگر ان سے لڑنا ہے تو آپ اور آپ کا پروردگار دونوں جا کر لڑ لو، ہم تو نہیں جاسکتے، کیونکہ وہ بڑے زور آور لوگ ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا کہ فلسطین پر عمالقہ قابض ہیں، لہٰذا جب تک تم ان سے جہاد نہیں کروگے وہ علاقہ خالی نہیں ہوسکے گا اور تم وہاں جا کر آباد نہیں ہوسکتے، لیکن تم چونکہ جہاد نہیں کر رہے تو اب چالیس سال تک تمہیں صحرائے سینا کے اندر چکر لگانا پڑے گا، چنانچہ وہ صحرائے سینا میں چالیس سال تک پھرتے رہے، جو اُن کے لیے ایک قید خانے کی مانند ہوگیا، وہ اس صحرائے سینا سے نکلنا چاہتے تھے مگر نکلنے کا کوئی راستہ نہیں ہوتا تھا۔ اسی صحرائے سینا میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات ہوگئی۔ بعد میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ایک نائب حضرت یوشع علیہ السلام پیغمبر بنے۔ انہوں نے بنی اسرائیل کو کچھ غیرت دلا کر کسی طرح جہاد پر آمادہ کیا اور پھر حضرت یوشع علیہ السلام کی قیادت میں فلسطین کا ایک بڑا علاقہ فتح ہوا۔

حضرت یوشع اور حضرت سموئیل علیہما السلام کی بعثت

حضرت یوشع علیہ السلام آخر عمر تک بنی اسرائیل کی نگرانی کرتے رہے اور ان کے معاملات کے تصفیہ کے لیے انہوں نے قاضی مقرّر کیے، تقریباً تین سو سال تک نظام اسی طرح چلتا رہا کہ بنی اسرائیل کا کوئی بادشاہ یا حکمران نہیں تھا، بلکہ قبیلوں کے سردار اور حضرت یوشع علیہ السلام کے مقرّر کیے ہوئے نظام کے تحت کچھ قاضی ہوا کرتے تھے، اسی لیے اس دور کو ''قاضیوں کا زمانہ'' کہا جاتا ہے۔ چونکہ اس دور میں پوری قوم کا کوئی متفقہ حکمران نہیں تھا، اس لیے آس پاس کی قومیں ان پر حملہ آور ہوتی رہتی تھیں۔ آخر میں فلسطین کی ایک بت پرست قوم جو اشدودی کہلاتی تھی، اس نے ان پر حملہ کرکے انہیں سخت شکست دی اور وہ متبرک صندوق بھی وہ لوگ اٹھا کر لے گئے جس میں حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کے کچھ تبرکات، تورات کا ایک نسخہ اور آسمان سے نازل ہونے والی غذا من وسلویٰ میں سے ''من'' (جو کہ ایک بُوٹی تھی) کا ایک مرتبان محفوظ تھا اور جسے بنی اسرائیل جنگوں کے موقع پر تبرک کے طور پر آگے رکھا کرتے تھے۔ جب اشدودی لوگ اس

(۱) سورۃ المائدہ (۵): آیت (۲۴)

صندوق کو بھی اٹھا کر لے گئے، تو اس سے بنی اسرائیل کی ہمتیں بہت پست ہوگئیں اور وہ حوصلہ ہارنے لگے کہ یہ صندوق جو ہمارے لیے ایک تقویت کا سامان تھا، یہ ہم سے جدا ہوگیا۔

حالات کے اس پسِ منظر میں اللہ تعالیٰ نے حضرت سموئیل علیہ السلام کو نبوّت کا منصب عطا فرمایا، اور جب ان کے دور میں بھی بنی اسرائیل پر فلسطینیوں کا ظلم وستم جاری رہا اور وہ مختلف طریقوں سے ان پر ظلم ڈھاتے رہے، تو بنی اسرائیل نے حضرت سموئیل علیہ السلام سے درخواست کی کہ ان پر کوئی بادشاہ مقرّر کردیا جائے، تاکہ وہ اس کے جھنڈے تلے جمع ہوکر فلسطین میں جہاد کرسکیں اور وہاں اپنے وطن کی طرف واپس پہنچ سکیں۔ اس کے نتیجے میں طالوت کو بادشاہ بنایا گیا جس کا واقعہ اللہ تعالیٰ نے ان دو رکوعوں میں ذکر فرمایا ہے۔

بائبل میں بھی یہ واقعات موجود ہیں، لیکن قرآنِ کریم کے بیان میں اور بائبل کے بیان میں بعض جگہوں پر فرق ہے، مثلاً یہ کہ بائبل میں بادشاہ کا نام ساؤل ذکر کیا گیا ہے اور قرآنِ کریم میں ان کا نام طالوت بتایا ہے، اسی طرح بائبل میں کچھ جزوی تفصیلات میں بھی فرق ہے۔ یہ تفصیلات کا جو فرق ہے اس میں بظاہر ایسا لگتا ہے کہ جو لوگ طالوت کو بادشاہ ماننے سے انکار کررہے تھے، کسی وقت ان کو موقع ملا ہوگا تو انہوں نے اس میں کچھ تحریف وتبدیلی کرلی ہوگی۔ واللہ اعلم۔ بہرحال! قرآنِ کریم کا بیان بالکل واضح اور صاف ہے اور اس میں کسی قسم کے شک وشبہ کی کوئی گنجائش نہیں۔

بنی اسرائیل کا جہاد کے لیے بادشاہ کی تقرّری کا تقاضا

یہاں اس واقعے کے سلسلے میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے سب سے پہلے فرمایا: ﴿اَلَمْ تَرَ اِلَى الْمَلَاِ مِنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰى﴾ کیا تمہیں موسیٰ کے بعد بنی اسرائیل کے گروہ کے اس واقعہ کا علم نہیں ہوا؟ ﴿اِذْ قَالُوْا لِنَبِيٍّ لَّهُمُ ابْعَثْ لَنَا مَلِكًا﴾ ''جب انہوں نے اپنے ایک نبی سے کہا تھا کہ ہمارا ایک بادشاہ مقرّر کردیجیے۔'' یہاں نبی سے مراد حضرت سموئیل علیہ السلام ہیں اور ان سے انہوں نے کہا تھا کہ ہمارا ایک بادشاہ مقرّر کردیجیے تاکہ ﴿نُّقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ﴾ ''جس کے جھنڈے تلے ہم اللہ کے راستے میں جنگ کریں۔''

حضرت سموئیل علیہ السلام چونکہ بنی اسرائیل کی عادت سے واقف تھے کہ یہ لوگ دعوے تو بڑے لمبے چوڑے کرتے ہیں، لیکن جب عمل کا وقت آتا ہے تو پیچھے ہٹ جاتے ہیں اور پہلے بھی متعدّد جنگوں میں وہ پیٹھ دکھا چکے ہیں، اور جیسا کہ ایک بہادر قوم کو دشمن کا مقابلہ کرنا چاہیے، اس طرح کا حوصلہ ان کے اندر نہیں ہے تو اس

لیے ﴿قَالَ﴾ انہوں نے فرمایا: ﴿هَلْ عَسَيْتُمْ اِنْ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ اَلَّا تُقَاتِلُوْا﴾ ''کیا تم سے یہ بات کچھ بعید ہے کہ جب تم پر جنگ فرض کی جائے تو تم لڑنے سے انکار کردو؟''

حضرت سموئیل علیہ السلام کے جواب میں ﴿قَالُوْا﴾ انہوں نے کہا: ﴿وَمَا لَنَآ اَلَّا نُقَاتِلَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ﴾ بھلا ہمیں کیا ہوجائے گا کہ جو ہم اللہ کے راستے میں جنگ نہ کریں گے ﴿وَقَدْ اُخْرِجْنَا مِنْ دِيَارِنَا وَ اَبْنَآئِنَا﴾ ''جبکہ ہمیں اپنے گھروں اور اپنے بچوں کے پاس سے نکال باہر کیا گیا ہے،'' یعنی دشمن نے ہماری بعض بستیاں بھی دبالی ہیں اور ہماری اولاد کو بھی قید کرلیا ہے، لہٰذا اب ہم دوبارہ اس وطن میں جانے کے لیے اور اپنے حقوق حاصل کرنے کے لیے کیوں جنگ نہیں کریں گے؟ اگر ہمیں بادشاہ میسر آجائے تو ضرور کریں گے۔

باری تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ان لوگوں نے دعوے تو بہت بڑے کیے تھے، لیکن ﴿فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ﴾ جب ان پر جنگ فرض کی گئی تو ﴿تَوَلَّوْا اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ﴾ ''ان میں سے تھوڑے لوگوں کو چھوڑ کر باقی سب پیٹھ پھیر گئے،'' یعنی کچھ لوگ تو ثابت قدم رہے اور انہوں نے جہاد میں شرکت بھی کی اور اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے فتح بھی حاصل ہوئی، جیسا کہ آگے آنے والا ہے، لیکن اکثر لوگ پیٹھ پھیر گئے اور وہ جہاد میں شامل نہ ہوئے، ﴿وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ ﴿۲۴۶﴾﴾ ''اور اللہ تعالیٰ ظالموں کو خوب جانتا ہے،'' یعنی اللہ تعالیٰ اپنے حکم کی خلاف ورزی کرنے والوں کو خوب جانتا ہے اور ان کو مناسب سزا دے گا۔

طالوت کے بادشاہ مقرّر ہونے کا واقعہ

بنی اسرائیل کے ان لوگوں کے لیے بادشاہ مقرّر ہونے کا واقعہ بیان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ﴿وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ﴾ اور ان کے نبی نے ان سے کہا تھا کہ ﴿اِنَّ اللّٰهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوْتَ مَلِكًا﴾ ''اللہ نے تمہارے لیے طالوت کو بادشاہ بنا کر بھیجا ہے۔''

طالوت ان صاحب کا نام ہے جن کو اللہ تعالیٰ کے حکم سے بنی اسرائیل پر بادشاہ بنا کر مقرّر کیا گیا تھا۔ طالوتؔ کے لفظی معنیٰ عبرانی زبان میں لمبے تڑنگے آدمی کے ہوتے ہیں اور یہ لفظ عربی میں بھی طول کے مادے سے قریب ہے۔ ان کا یہ نام شاید اس لیے ہوگا کہ ان کا قد وقامت اور ان کی جسامت عام لوگوں سے مضبوط اور طویل تھی۔ قرآنِ کریم نے بھی آگے ذکر فرمایا ہے کہ جسمانی اعتبار سے بھی ان کو دوسرے لوگوں پر فوقیت

حاصل تھی، یعنی وہ بڑے تنومند اور ڈیل ڈول کے اعتبار سے بڑے آدمی تھے۔ بائبل میں مذکور ہے کہ وہ اتنے لمبے تھے کہ دوسرے لوگ ان کے کندھے تک آتے تھے۔

اسلام میں حکمرانی کا تصوّر اور حکمران کی خصوصیات

یہاں ﴿اِنَّ اللّٰهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوْتَ مَلِكًا﴾ کے ذریعے بتادیا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے طالوت کو بنی اسرائیل پر ''ملک'' یعنی بادشاہ بنا دیا۔ یہاں قرآنِ کریم نے ''بادشاہ'' کا لفظ استعمال کیا ہے، اور خود اللہ تعالیٰ کی طرف سے بادشاہ مقرّر کرنے کا اعلان کیا ہے، جس سے معلوم ہوا کہ براہِ راست بادشاہ ہونا بذاتِ خود کوئی شریعت کے خلاف بات نہیں ہے، نام چاہے کچھ بھی رکھ لیا جائے۔ اگر کوئی حکمران، کوئی سربراہِ حکومت، اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کو تسلیم کرتے ہوئے، اس کے تابع ہو کر حکومت چلاتا ہے یعنی جو احکام دیتا ہے، وہ اللہ کے احکام کے تابع دیتا ہے، اپنے آپ کو ساری سلطنت کا مالک تصوّر نہیں کرتا اور جو کچھ اس کے پاس ذرائع اور وسائل ہیں ان کو اپنے پاس امانت تصوّر کرتے ہوئے، اس امانت کو عوام کی فلاح و بہبود کے لیے استعمال کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی شریعت کو نافذ کرتا ہے، تو اس کا نام چاہے بادشاہ رکھ لیں، چاہے صدر رکھ لیں، چاہے رئیس رکھ لیں یا چاہے امیر رکھ لیں، جو نام بھی چاہیں رکھ سکتے ہیں، ایسی صورت میں اس کا یہ منصب شریعت کے خلاف نہیں ہوسکتا۔

اصل حقیقت یہی ہے کہ سربراہِ مملکت ایسا ہونا چاہیے جو اللہ تعالیٰ کے حضور جوابدہ ہو، جو اللہ تبارک وتعالیٰ کے احکام کی تعمیل کرنے والا ہو، اللہ تعالیٰ کے احکام کو زمین پر نافذ کرے، اللہ تعالیٰ کے احکام کے مطابق ہی عوام کی فلاح وبہبود کے لیے کام کرے اور زمین پر رعیّت کے درمیان عدل و انصاف قائم کرے۔ یہ صفات جس میں بھی پائی جائیں گی وہ اللہ تعالیٰ کے یہاں مقبول ہے، لہٰذا حکومت کے سربراہ کے لیے اس بات کی اہمیت نہیں ہے کہ اس کا لقب بادشاہ ہے یا کوئی اور، بلکہ اہمیت اس بات کی ہے کہ وہ کس نظام کے تحت حکومت کرتا ہے؟ اس نظام کی تفصیل میں نے اپنی کتاب ''اسلام اور سیاسی نظریات'' میں بیان کی ہے۔

طالوت کے بادشاہ مقرّر ہونے پر بنی اسرائیل کا ردِّ عمل

جب اللہ تعالیٰ نے طالوت کو بنی اسرائیل کے لیے بادشاہ بنا کر بھیجا، تو جیسا کہ بنی سرائیل کی عادت رہی ہے کہ وہ ہر موقع پر کسی نہ کسی سرکشی کا مظاہرہ کرتے تھے، اسی طرح انہوں نے یہاں پر بھی ایسے ہی کیا،

بادشاہ خود مانگا، لیکن جب طالوت کو بادشاہ بنا کر ان کے پاس بھیج دیا گیا تو ﴿قَالُوْٓا اَنّٰى يَكُوْنُ لَهُ الْمُلْكُ عَلَيْنَا﴾ کہنے لگے کہ بھلا اس کو ہمارے اوپر بادشاہت کا حق کیسے حاصل ہوگیا؟ ﴿وَنَحْنُ اَحَقُّ بِالْمُلْكِ مِنْهُ﴾ جبکہ ہم اس کے مقابلے میں بادشاہت کے زیادہ مستحق ہیں ﴿وَلَمْ يُؤْتَ سَعَةً مِّنَ الْمَالِ﴾ ''اور ان کو تو مالی وسعت بھی حاصل نہیں،'' لہٰذا ہم ان کو بادشاہ کیسے تسلیم کرلیں؟

اصل بات یہ تھی کہ طالوت بنی اسرائیل کے قبیلے بنیامین سے تعلق رکھتے تھے، اور بنیامین کا قبیلہ بارہ قبیلوں میں سب سے چھوٹا قبیلہ تھا اور اس میں بھی طالوت مالی اعتبار سے کم حیثیت کے آدمی تھے۔ بنی اسرائیل جن کی نگاہ اپنے قبائلی تعصّبات، قبائلی فخر وغرور اور مال ودولت پر تھی، ان کی نظر میں طالوت کوئی وقعت نہیں رکھتے تھے، اس لیے انہوں نے کہا کہ وہ ہم پر کیسے بادشاہ بن جائیں گے؟ جبکہ ہم یعنی ہمارا قبیلہ بادشاہت کا زیادہ حق دار ہے۔

جب انہوں نے یہ بات کہی تو حضرت سموئیل علیہ السلام نے ان سے جواب میں ﴿قَالَ﴾ کہا کہ ﴿اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىهُ عَلَيْكُمْ﴾ ''اللہ تعالیٰ نے انہیں تمہارے اوپر منتخب کیا ہے،'' یعنی انہیں تم پر فضیلت دے کر چنا ہے ﴿وَزَادَهٗ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ﴾ ''اور انہیں علم میں اور جسم میں زیادہ وسعت عطا کی ہے،'' یعنی علم کے اعتبار سے بھی وہ تم سے زیادہ ہیں اور جسمانی طاقت اور ظاہری ڈیل ڈول کے اعتبار سے بھی تم سے فائق ہیں، اور اس وقت ایسے ہی کسی حکمران کی ضرورت ہے جو بڑے ڈیل ڈول والی زور آور عمالقہ قوم سے جہاد کرسکے، لہٰذا ان کو بادشاہ بنانا عین حکمت کے مطابق ہے۔

اور پھر ساتھ ہی یہ بھی فرمایا: ﴿وَاللّٰهُ يُؤْتِيْ مُلْكَهٗ مَنْ يَّشَآءُ﴾ ''اور اللہ اپنا ملک جس کو چاہتا ہے دے دیتا ہے،'' یعنی ملک کی حکمرانی جس کو چاہتا ہے دے دیتا ہے۔ یہ تمہارا کوئی حق نہیں ہے کہ تم کہو کہ بادشاہ ہم میں سے ہی کوئی ہونا چاہیے تھا، بلکہ اللہ تعالیٰ جس کو منتخب کرکے مقرّر کردے وہی اس منصب کے لیے مناسب ہے۔ ﴿وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ۝۲۴۷﴾ ''اور اللہ تعالیٰ بڑی وسعت والا اور بڑا علم رکھنے والا ہے۔''

''وہ وسعت والا ہے،'' لہٰذا وہ تمہاری طرح تنگ دائرے میں نہیں سوچتا، بلکہ اس کا فیصلہ مصلحتوں کے بڑے وسیع دائرے میں ہوتا ہے اور ''وہ علم رکھنے والا ہے،'' لہٰذا اس کو پتہ ہے کہ کون شخص بادشاہت کا زیادہ مستحق ہے اور اس کے جو مقاصد ہیں ان کو کون اچھی طرح پورا کرسکے گا؟

طالوت کے من جانب اللہ مقرّر ہونے کی نشانی

جب بنی اسرائیل نے طالوت کو بادشاہ ماننے سے انکار کیا اور ان کے بادشاہ مقرّر ہونے پر کوئی نشانی طلب کی تو حضرت سموئیل علیہ السلام نے بنی اسرائیل سے کہا کہ اگر تمہیں کچھ شک ہورہا ہے کہ طالوت کو ہی اللہ تعالیٰ نے بادشاہ مقرّر کیا ہے یا نہیں؟ تو اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے ان کے بادشاہ بننے کی ایک علامت یہ ہوگی کہ اشدّودی قوم کے لوگ جو متبرک صندوق اٹھا کر لے گئے تھے اور جس میں حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کی کچھ یادگاریں اور تبرکات تھے، تورات کا نسخہ تھا اور کچھ تھوڑی سی ''من'' کی غذا موجود تھی، اللہ کے فرشتے وہ صندوق تمہارے پاس اٹھا کر لے آئیں گے۔ جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا اشدّودی جس صندوق کو اٹھا کر لے گئے تھے وہ بنی اسرائیل کے ہاں بڑا متبرک صندوق سمجھا جاتا تھا اور وہ اس کے جانے سے بڑے کمزور، پژمردہ، اور بے حوصلہ ہوگئے تھے۔

اسی تفصیل کو بیان کرتے ہوئے باری تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿وَ قَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ﴾ اور ان کے نبی نے ان سے یہ بھی کہا تھا کہ ﴿اِنَّ اٰيَةَ مُلْكِهٖۤ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ التَّابُوْتُ﴾ ان کی سلطنت کی علامت یہ ہوگی کہ تمہارے پاس وہ صندوق واپس آجائے گا ﴿فِيْهِ سَكِيْنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ﴾ جس میں تمہارے پروردگار کی طرف سے سکینت کا سامان ہے ﴿وَ بَقِيَّةٌ مِّمَّا تَرَكَ اٰلُ مُوْسٰى وَ اٰلُ هٰرُوْنَ﴾ اور موسیٰ اور ہارون نے جو اشیاء چھوڑی تھیں، ان میں سے کچھ باقی ماندہ چیزیں ہیں ﴿تَحْمِلُهُ الْمَلٰٓئِكَةُ﴾ ''اسے فرشتے اٹھائے ہوئے لائیں گے،'' چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ وہ صندوق واپس آگیا۔ آگے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ﴿اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۲۴۸﴾ ''اگر تم مومن ہو تو تمہارے لیے اس واقعہ میں بڑی نشانیاں ہیں،'' یعنی صندوق کے واپس آجانے کے واقعہ میں بڑی نشانیاں ہیں۔

متبرک صندوق کی بنی اسرائیل کی طرف واپسی کا قضیہ

صندوق کی واپسی کا واقعہ اسرائیلی روایات میں یہ مذکور ہے کہ اشدّودی قوم کے لوگ جب صندوق اٹھا کر لے گئے، تو انہوں نے اسے ایک مندر میں جا کر رکھ دیا، مگر اس کے بعد وہ طرح طرح کی مصیبتوں میں مبتلا ہوگئے، کبھی ان کے بُت اوندھے پڑے رہتے، کبھی ان کے درمیان گلٹیوں کی وبا پھیل جاتی اور کبھی چوہوں کی کثرت ہوجاتی۔ آخر کار ان کے نجومیوں نے انہیں مشورہ دیا کہ یہ ساری آفتیں تم پر اس صندوق کی

وجہ سے آرہی ہیں، چنانچہ انہوں نے وہ صندوق اٹھا کر بیل گاڑیوں پر رکھا اور انہیں شہر سے باہر ہنکا دیا۔

یہ واقعہ بعض اسرائیلی روایات میں بھی مذکور ہے اور بائبل میں بھی اسی طرح مذکور ہے، البتہ بائبل میں اس بات کا ذکر نہیں ہے کہ اس صندوق کو فرشتے اٹھا کر لائے تھے، بلکہ یہ مذکور ہے کہ انہوں نے بیل گاڑیوں پر رکھ کر شہر سے باہر نکال دیا تھا، جبکہ قرآنِ کریم نے اس صندوق کے بارے میں یہ بتایا ہے کہ اسے فرشتے اٹھا کر لائیں گے۔ اگر بائبل کی روایت درست بھی ہو کہ ان لوگوں نے خود صندوق کو باہر نکال دیا تھا، تو یہ ممکن ہے کہ بیل گاڑیوں کے ذریعے اسے شہر سے باہر لایا گیا ہو، پھر وہاں سے اسے فرشتے اٹھا کر بنی اسرائیل کے پاس لے آئے ہوں اور یہ بھی ممکن ہے کہ بیل گاڑیوں پر ہنکانے کا قصہ ہی غلط ہو اور فرشتے اسے براہِ راست اٹھا کر لائے ہوں۔ بہرحال! قرآنِ کریم کے بیان کے مطابق فرشتوں کے ذریعے وہ صندوق بنی اسرائیل کے پاس واپس آ گیا۔

سکینت کا معنی ومفہوم

یہاں پر اس صندوق سے متعلق بات کرتے ہوئے اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا: ﴿فِيْهِ سَكِيْنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ﴾ ''اس صندوق میں تمہارے پروردگار کی طرف سے تمہارے لیے سکینت کا سامان ہے۔'' لغت کے اعتبار سے ''سکینت'' کے اصل معنیٰ تو سکون اور اطمینان کے ہوتے ہیں، لیکن خاص طور سے ''سکینت'' کا لفظ اس موقع پر استعمال ہوتا ہے جب کسی دشمن سے مقابلہ ہو، کوئی لڑائی ہو رہی ہو یا دیگر کئی قسم کے خطرات موجود ہوں، اور اس وقت میں کسی وجہ سے دل میں تسلی اور ڈھارس پیدا ہو جائے، تو اس کو سکینت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

یہاں پر بھی یہی مراد ہے کہ وہ صندوق ایسا تھا کہ اس کے بنی اسرائیل کے ساتھ رہنے کی وجہ سے اُن کے دل میں تسلی رہتی تھی، اور ان کی ڈھارس بندھی رہتی تھی، نیز جب وہ لوگ دشمن کا مقابلہ کرنے جاتے تھے اور وہ صندوق ان کے ساتھ ہوتا تھا تو اس کی وجہ سے وہ اپنے دل میں اطمینان محسوس کرتے تھے۔ اب جبکہ وہ صندوق دوبارہ ان کے پاس واپس آجائے گا اور وہ حسبِ حکم فلسطین کے قابضوں کے اوپر جا کر حملہ کریں گے، تو ان کی ڈھارس بندھی رہے گی کہ ان کے پاس اپنے رب کی جانب سے تسلی کا ایک سامان موجود ہے۔

بنی اسرائیل کا عمالقہ سے جہاد اور اس میں ہمارے لیے اسباق

آیت نمبر ۲۴۹ تا ۲۵۲

فَلَمَّا فَصَلَ طَالُوْتُ بِالْجُنُوْدِ ۙ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ مُبْتَلِيْكُمْ بِنَهَرٍ ۚ فَمَنْ شَرِبَ مِنْهُ فَلَيْسَ مِنِّيْ ۚ وَمَنْ لَّمْ يَطْعَمْهُ فَاِنَّهٗ مِنِّيْٓ اِلَّا مَنِ اغْتَرَفَ غُرْفَةً بِيَدِهٖ ۚ فَشَرِبُوْا مِنْهُ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ ۭ فَلَمَّا جَاوَزَهٗ هُوَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ ۙ قَالُوْا لَا طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ بِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ ۭ قَالَ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوا اللّٰهِ ۙ كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةًۢ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ۲۴۹ وَلَمَّا بَرَزُوْا لِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ قَالُوْا رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَي الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ۲۵۰ فَهَزَمُوْهُمْ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۙ وَقَتَلَ دَاوٗدُ جَالُوْتَ وَاٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَهٗ مِمَّا يَشَاۗءُ ۭ وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ ۙ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوْ فَضْلٍ عَلَي الْعٰلَمِيْنَ ۲۵۱ تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ ۭ وَاِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ۲۵۲

چنانچہ جب طالوت لشکر کے ساتھ روانہ ہوا تو اس نے (لشکر والوں سے) کہا کہ: ''اللہ ایک دریا کے ذریعے تمہارا امتحان لینے والا ہے، جو شخص اس دریا سے پانی پیئے گا وہ میرا آدمی نہیں ہوگا اور جو اسے نہیں چکھے گا وہ میرا آدمی ہوگا، الّا یہ کہ کوئی اپنے ہاتھ سے ایک چلو بھر لے (تو کچھ حرج نہیں)۔'' پھر (ہوا یہ کہ) ان میں سے تھوڑے آدمیوں کے سوا باقی سب نے اس دریا سے (خوب) پانی پیا، چنانچہ جب وہ (یعنی طالوت) اور اس کے ساتھ ایمان رکھنے والے دریا کے پار اترے، تو یہ لوگ (جنہوں

نے طالوت کا حکم نہیں مانا تھا) کہنے لگے کہ: ''آج جالوت اور اس کے لشکر کا مقابلہ کرنے کی ہم میں بالکل طاقت نہیں ہے۔ (مگر) جن لوگوں کا ایمان تھا کہ وہ اللہ سے جا ملنے والے ہیں انہوں نے کہا کہ: ''نجانے کتنی چھوٹی جماعتیں ہیں جو اللہ کے حکم سے بڑی جماعتوں پر غالب آئی ہیں، اور اللہ ان لوگوں کا ساتھی ہے جو صبر سے کام لیتے ہیں۔'' ﴿۲۴۹﴾ اور جب یہ لوگ جالوت اور اس کے لشکروں کے آمنے سامنے ہوئے تو انہوں نے کہا: ''اے ہمارے پروردگار! صبر و اِستقلال کی صفت ہم پر انڈیل دے، ہمیں ثابت قدمی بخش دے، اور ہمیں اس کافر قوم کے مقابلے میں فتح و نصرت عطا فرما دے۔'' ﴿۲۵۰﴾ چنانچہ انہوں نے اللہ کے حکم سے ان (جالوت کے ساتھیوں) کو شکست دی اور داؤد نے جالوت کو قتل کیا، اور اللہ نے اس کو سلطنت اور دانائی عطا کی اور جو علم چاہا اس کو عطا فرمایا۔ اگر اللہ لوگوں کا ایک دوسرے کے ذریعے دفاع نہ کرے تو زمین میں فساد پھیل جائے، لیکن اللہ تمام جہانوں پر بڑا فضل فرمانے والا ہے۔ ﴿۲۵۱﴾ یہ اللہ کی آیات ہیں جو ہم آپ کے سامنے ٹھیک ٹھیک پڑھ کر سناتے ہیں، اور آپ بے شک ان پیغمبروں میں سے ہیں جو رسول بنا کر بھیجے گئے ہیں۔ ﴿۲۵۲﴾

• عمالقہ سے جہاد کے لیے بنی اسرائیل کا امتحان

ان آیاتِ مبارکہ میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے طالوت کے اس جہاد کا تذکرہ فرمایا ہے، جو انہوں نے فلسطین پر عمالقہ کے ناجائز قبضے کو ہٹانے کے لیے ان کے خلاف کیا تھا۔ طالوت کے بادشاہ مقرّر ہوجانے کے بعد اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے تقرّر کی نشانی آجانے کے بعد جب بنی اسرائیل نے طالوت کو بادشاہ تسلیم کرلیا، تو طالوت نے عمالقہ سے مقابلے کے لیے لوگوں کو جمع کیا۔ جب جنگ کے لیے روانہ ہونے لگے تو طالوت نے بنی اسرائیل کو آزمانے کے لیے ان کا ایک امتحان لیا، تاکہ جنگ میں صرف وہی لوگ شامل ہوں جو صحیح معنی میں جہاد کے جذبے سے سرشار ہوں اور اللہ تبارک وتعالیٰ کے سامنے جوابدہی کا احساس رکھتے ہوں، کیونکہ دشمن بڑے طاقتور، ہٹے کٹے، قد آور اور بڑے پہلوان قسم کے لوگ تھے۔ نیز یہ بھی مقصود تھا کہ منافق لوگ ہمارے لشکر میں شامل نہ ہوں، چاہے وہ اعتقادی منافقین ہوں یا عملی منافقین۔

طالوت نے امتحان یہ لیا کہ سارے لشکر والوں سے کہا کہ ہم جب اس دریا کے پاس پہنچیں گے، جسے

پار کر کے ہمیں فلسطینیوں کے اوپر حملہ کرنا ہے، تو وہاں پر اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے تمہاری ایک آزمائش مقرّر کی گئی ہے اور وہ یہ کہ کوئی شخص بھی اس دریا سے پانی نہ پیئے، اِلاّ یہ کہ ایک آدھ چلو ہاتھ سے لے کر پی لے تو اس کی گنجائش ہے، لیکن باقاعدہ برتن میں بھر کر پانی پینے کی ممانعت ہے۔ جو لوگ اس ممانعت کی پابندی کریں گے اور اس دریا سے پانی نہیں پئیں گے، وہ تو میرے لشکر میں شامل ہوں گے اور جو لوگ اس حکم کی مخالفت کریں گے، اور پانی پی لیں گے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ میرے ساتھ چلنے کے اہل نہیں ہیں، اور وہ میرے لشکر میں شامل نہیں ہوں گے۔

• طالوت کا اپنے لشکر سے خطاب اور آزمائش کی اطلاع

یہاں پر پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے ان کی اِس آزمائش کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا: ﴿فَلَمَّا فَصَلَ طَالُوْتُ بِالْجُنُوْدِ﴾ ''جب طالوت لشکر کے ساتھ روانہ ہوا'' فَصَلَ کے معنیٰ ہوتے ہیں کسی جگہ سے روانہ ہونا، لہٰذا جب وہ روانہ ہوئے تو ﴿قَالَ﴾ طالوت نے (اپنے لشکر کے لوگوں سے) کہا: ﴿اِنَّ اللّٰهَ مُبْتَلِيْكُمْ بِنَهَرٍ﴾ ''بے شک اللہ تمہیں ایک دریا کے ذریعے آزمانے والا ہے۔'' یہاں پر طالوت نے آزمائش کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کی ہے، یہ بظاہر اس لیے ہے کہ یہ آزمائش حضرت سموئیل علیہ السلام کے ذریعے اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہی طالوت تک پہنچائی ہوگی کہ طالوت لوگوں پر یہ بات واضح کردے کہ ہم ایک آزمائش کرنے والے ہیں اور جو لوگ آزمائش میں پورے اتریں گے انہیں جہاد میں شامل کیا جائے گا۔

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے دریا کا نام نہیں لیا، بلکہ صرف ''نہر'' کا لفظ ارشاد فرمایا ہے، لیکن چونکہ جس جگہ کا واقعہ بیان ہو رہا ہے، وہاں دریا ایک ہی ہے اور وہ ''دریائے اُردن'' ہے، اس لیے بظاہر اس سے مراد وہی دریائے اردن ہے۔ ﴿فَمَنْ شَرِبَ مِنْهُ فَلَيْسَ مِنِّيْ﴾ تو جو شخص اس دریا سے پانی پیئے گا تو وہ میرا آدمی نہیں ہوگا ﴿وَمَنْ لَّمْ يَطْعَمْهُ﴾ اور جو اس کو نہیں چکھے گا ﴿فَاِنَّهٗ مِنِّيْٓ﴾ تو وہ میرا آدمی ہوگا ﴿اِلَّا مَنِ اغْتَرَفَ غُرْفَةً بِيَدِهٖ﴾ ''سوائے اس بات کے کہ کوئی شخص اپنے ہاتھ سے ایک چلو بھر لے (تو اس حد تک گنجائش ہے۔)''

یہ ایک کڑی آزمائش تھی، کیونکہ یہ سارے علاقے ایسے ہیں جہاں پانی کمیاب ہے، سفر کی تھکاوٹ کے دوران، پیاس کی شدت کی حالت میں پانی کی شدید ضرورت محسوس ہوتی ہے، تو اس موقع پر ایک آدھ چلو

کے علاوہ پانی پینے سے منع کر دیا گیا۔ یہ آزمائش درحقیقت اس لیے تھی کہ جہاد کے دوران اصل چیز مجاہد کا صبر ہے کہ وہ کڑے سے کڑے حالات میں ثابت قدم رہے۔ دریا سے پانی نہ لینا اسی صبر کی تربیت بھی تھی اور ایک کڑا امتحان بھی تھا۔

اب ساری آزمائش کے نتیجے میں واقعہ کیا ہوا؟ اگلی آیت میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے وہ بیان فرمایا کہ ﴿فَشَرِبُوْا مِنْهُ﴾ ''سبھی نے پانی پی لیا،'' یعنی خوب ڈٹ کر پانی پیا، جس طرح پانی پینے سے منع کیا گیا تھا، اسی طرح پیا ﴿اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ﴾ ''سوائے کچھ لوگوں کے جو اُن میں سے ثابت قدم رہے۔'' انہوں نے طالوت کے حکم کو تسلیم کرتے ہوئے پانی نہیں پیا، اور آزمائش میں پورے اترے۔ یہاں پر ان کی تعداد تو بیان نہیں کی گئی، لیکن بعض روایات[1] سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی تعداد ۳۱۳ تھی اور پھر انہوں نے ہی جہاد کیا۔ یہ وہی تعداد ہے جو کفّار کے ساتھ ہونے والے اسلام کے پہلے عظیم مقابلے غزوۂ بدر میں حضور نبیِ کریم سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جاں نثار صحابہ کی تھی۔

• آزمائش میں پورے نہ اترنے والوں کی کم ہمتی

پھر اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اس امتحان میں تو ایک بڑی اکثریت ناکام ہوگئی، چنانچہ اسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ﴿فَلَمَّا جَاوَزَهٗ هُوَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ﴾ ''جب طالوت نے اور ان لوگوں نے بھی جو اس کے لشکر میں ایمان کے ساتھ موجود تھے، دریا پار کر لیا،'' تو جو اس امتحان میں ناکام ہوگئے تھے اور انہوں نے خوب ڈٹ کر پانی پیا تھا ﴿قَالُوْا﴾ انہوں نے اس موقع پر یہ کہا کہ ﴿لَا طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ بِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ﴾ ''آج ہمارے پاس جالوت اور اس کے لشکر کا مقابلہ کرنے کی بالکل طاقت نہیں ہے،'' یعنی اس آزمائش میں ناکام ہونے کے نتیجے میں ان پر ایسی بزدلی طاری ہوئی کہ انہوں نے اپنے دشمن کے مقابلے سے اپنے آپ کو بالکل کمزور سمجھ کر یہ کہہ دیا کہ ہم میں ان سے مقابلے کی طاقت ہی نہیں ہے۔

جالوت عمالقہ کے لشکر کا سردار بھی تھا اور بہت بڑا نامی گرامی پہلوان بھی تھا، جو بہت سی جنگوں میں بہت کارہائے نمایاں انجام دے چکا تھا۔ عمالقہ ویسے بھی بڑے تنومند، قد آور اور مضبوط ڈیل ڈول والے لوگ تھے، اور پھر ان میں سے خاص طور پر جالوت بہت زیادہ نمایاں تھا۔ اس لیے ان پست ہمت لوگوں نے خاص

---

(۱) تفسير الطبري = جامع البيان (٥/٣٤٦).

طور پر جالوت کا نام لے کر کہا کہ آج ہمارے اندر جالوت اور اس کے لشکر سے مقابلہ کرنے کی بالکل طاقت نہیں ہے۔

• آزمائش میں کامیاب ہونے والوں کی ایمان افروز گفتگو

ایک طرف تو یہ بزدل لوگ یہ کہہ رہے تھے کہ آج ہمارے پاس جالوت اور اس کے لشکر کا مقابلہ کرنے کی بالکل طاقت نہیں ہے، لیکن دوسری طرف جو لوگ آزمائش میں پورے اترے تھے اور انہوں نے حضرت طالوت کی ہدایت کے مطابق دریائے اردن سے پانی نہیں پیا تھا یا تھوڑا سا چلو بھر کر پیا تھا، انہوں نے جب آزمائش میں پورے نہ اترنے والے لوگوں کی یہ بزدلانہ گفتگو سنی تو ﴿قَالَ﴾ (ان سے) کہا۔ یہاں پر ان کا جواب نقل کرنے سے پہلے اللہ تبارک و تعالیٰ نے ان کی ایک اہم صفت بیان فرمائی کہ ﴿الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوا اللّٰهِ﴾ ''جو اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے جا ملنے والے ہیں،'' یعنی یہ وہ لوگ تھے کہ جن کے پیشِ نظر یہ خیال تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے رُوبرو پیش ہونے والے ہیں۔

آگے ان کا جواب نقل کرتے ہوئے فرمایا: ﴿كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ﴾ کتنی ہی چھوٹی جماعتیں ہیں ﴿غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةًۢ بِاِذْنِ اللّٰهِ﴾ ''جو اللہ کے حکم سے بڑی جماعتوں پر غالب آئی ہیں،'' لہٰذا یہ تم کیسی بزدلی کی باتیں کر رہے ہو؟ اصل غلبہ دینے والا اور فتح عطا کرنے والا تو اللہ تعالیٰ ہے۔ اگر ہماری تعداد تھوڑی ہو اور دشمن کی تعداد بہت زیادہ بھی ہو، لیکن ہمیں اللہ تعالیٰ کی نصرت حاصل ہو تو ہم ضرور فتح یاب ہوں گے۔ اصل چیز صبر و اِستقلال اور اللہ تعالیٰ کی ذات پر بھروسہ ہے، جسے یہ حاصل ہو جائے وہ پھر اگر طاقت میں یا افرادی وقت میں کم ہی کیوں نہ ہو، اللہ تعالیٰ اسے فتح سے سرفراز کر سکتے ہیں۔

انہوں نے یہ بھی کہا کہ ﴿وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۲۴۹﴾﴾ ''اور اللہ ان لوگوں کا ساتھی ہے جو صبر سے کام لیتے ہیں۔'' صبر سے کام لینے کے معنیٰ یہ ہیں کہ اگرچہ تمہارا دل گھبرا رہا ہے اور تمہارے دل میں بزدلی پیدا ہو رہی ہے، لیکن اللہ تبارک وتعالیٰ کے راستے میں جہاد کی وجہ سے اس گھبراہٹ کا مقابلہ کر کے خود جہاد کی طرف بڑھو، تو یہ صبر سے کام لینا ہوگا اور جو لوگ ایسے صبر سے کام لیتے ہیں اللہ تبارک وتعالیٰ ان کا ساتھی بن جاتا ہے اور پھر ان کو اللہ تعالیٰ کی مدد حاصل ہوتی ہے۔

• اللہ تعالیٰ سے ملنے کی امید؛ ایک اہم صفت

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے طالوت کے لشکر کے لوگوں کی ایک خاص صفت یہ بیان کی کہ ﴿الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوا اللّٰهِ﴾ ''جو یہ گمان رکھتے تھے (یا یوں کہہ لیجیے کہ یقین رکھتے تھے) کہ وہ اللہ سے جاملنے والے ہیں۔'' یہاں پر یوں بھی کہا جاسکتا تھا کہ ''ان لوگوں نے کہا جو لوگ اس آزمائش میں کامیاب ہوئے تھے'' یا یوں بھی کہا جاسکتا تھا کہ ''ان لوگوں نے کہا کہ جو صحیح معنی میں مومن تھے۔'' لیکن اس کے بجائے اللہ تعالیٰ نے خاص طور پر ان کی اس صفت کا ذکر فرمایا کہ ''جو اس بات کا یقین رکھتے تھے کہ وہ اللہ سے جاملنے والے ہیں۔''

اس طرح فرما کر اس طرف اشارہ کردیا کہ جہاد کے اندر پامردی اور ثابت قدمی کے ساتھ ہر قسم کے دشمن کا مقابلہ وہی کرسکتا ہے جس کو اس بات کا یقین ہو کہ وہ جب شہید ہوگا، تو اللہ تبارک وتعالیٰ سے جاکر ملے گا اور اللہ تبارک وتعالیٰ اس کو اپنے انعامات سے نوازیں گے۔ آزمائش میں پورے اترنے والے لوگوں نے کہا کہ چونکہ اللہ تعالیٰ سے ملنا ہی ہے، لہٰذا اگر کوئی جماعت چھوٹی بھی ہو تو بھی اس میں کوئی ڈرنے کی بات نہیں ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ اس کو بڑی جماعت پر غلبہ اور فتح عطا فرماسکتے ہیں۔

• صبر و استقلال کی دعا پر مشتمل ایک عجیب جملہ

جو مضبوط ایمان والے لوگ امتحان میں کامیاب ہوئے تھے، ان کے عزم و ہمت کا تذکرہ کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ﴿وَ لَمَّا بَرَزُوْا لِجَالُوْتَ وَ جُنُوْدِهٖ﴾ اور جب وہ لوگ جالوت اور اس کے لشکر کے آمنے سامنے گئے تو ﴿قَالُوْا﴾ انہوں نے یہ کہا یعنی یہ دعا کی کہ ﴿رَبَّنَاۤ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا﴾ ''اے ہمارے پروردگار! صبر و استقلال کی صفت ہم پر انڈیل دے۔'' یہ بڑا عجیب جملہ ہے، یہ نہیں فرمایا کہ ہمیں صبر عطا فرمادیجیے، بلکہ لفظ یہ ہے کہ ''ہم پر صبر و استقلال کی صفت انڈیل دیجیے،'' یعنی ہم سر سے لے کر پاؤں تک صبر اور استقلال کے اندر غرق ہوجائیں، اور صبر ہماری طبیعتِ ثانیہ بن جائے، ﴿وَّ ثَبِّتْ اَقْدَامَنَا﴾ اور ہمیں ثابت قدمی بخش دیجیے، ﴿وَ انْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ۝۲۵۰﴾ ''اور اس کافر قوم کے مقابلے میں ہمیں فتح و نصرت عطا فرمایئے۔''

ایک طرف تو انہوں نے عزم و ہمت کا مظاہرہ کیا اور اپنے عمل سے اس عزم و ہمت کا ثبوت بھی فراہم کیا

کہ وہ جالوت اور اس کے لشکر کے مقابلے پر بڑھتے چلے گئے۔ عمل کا مظاہرہ تو یوں کیا کہ اپنے سے طاقتور دشمن کے مقابلے میں جا کھڑے ہوئے، لیکن دوسری طرف اللہ تعالیٰ سے بھی مدد طلب کی اور یہ کہا کہ اللہ! ہمیں ثابت قدمی عطا فرما دیجیے، ہم پر صبر و استقلال کی صفت انڈیل دیجیے اور اس کافر قوم کے مقابلے میں ہمیں فتح عطا فرمایئے۔ ﴿فَهَزَمُوْهُمْ بِاِذْنِ اللّٰهِ﴾ ''چنانچہ (اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ) انہوں نے اللہ کے حکم سے اپنے دشمنوں کو شکست دے دی۔''

• ہر جائز مقصد میں کامیابی کے لیے کرنے کے دو کام

ان کے اس واقعہ میں ہمیں یہ سبق دیا گیا ہے کہ آدمی کا کام تو یہ ہے کہ جب وہ کسی نیک اور جائز مقصد کا ارادہ کرے، تو اسے چاہیے کہ وہ اپنے قدم اس طرف بڑھائے، اپنی طرف سے جتنا کچھ کرسکتا ہو وہ کر گزرے، اور پھر اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرے اور اللہ تعالیٰ سے اس مقصد میں کامیابی کی دعا مانگے۔

یہ دو کام جب مل جاتے ہیں تو پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے قبولیت عطا ہوتی ہے اور اکثر اوقات انسان کو اس کی منزل مل جاتی ہے یا اسے اس کا مقصد حاصل ہو جاتا ہے، لیکن اگر بالفرض دنیا میں مقصد نہ بھی ملے، تو آخرت میں اس پر بڑا عظیم اجر و ثواب عطا ہوتا ہے۔

• داؤد علیہ السلام کے ہاتھوں جالوت کا قتل

﴿وَ قَتَلَ دَاوٗدُ جَالُوْتَ﴾ ''اور داؤد نے جالوت کو قتل کیا۔'' اس وقت تک حضرت داؤد علیہ السلام کی کوئی نمایاں حیثیت نہیں تھی، اس جنگ میں وہ ایک ایسے نوجوان کی شکل میں سامنے آئے جنہوں نے جالوت کو قتل کیا۔ جالوت کے قتل ہونے سے متعلق جو روایتیں موجود ہیں، جن میں سے کچھ اسرائیلی روایات بھی ہیں اور کچھ تفصیل بائبل میں بھی آئی ہے، ان سب کا خلاصہ یہ ہے کہ جالوت دشمن کی فوج کا بڑا قوی ہیکل سردار تھا اور وہ کئی روز تک بنی اسرائیل کو چیلنج دیتا رہا کہ کوئی اس کے مقابلے کے لیے آئے، مگر کسی کو اس سے دُوبدو لڑنے کی جرأت نہیں ہو رہی تھی۔ حضرت داؤد علیہ السلام اس وقت نوعمر نوجوان تھے، ان کے تین بھائی جنگ میں شریک تھے، مگر وہ چونکہ سب سے چھوٹے تھے، اس لیے اپنے بوڑھے والد کی خدمت کے لیے ان کے پاس رہ گئے تھے اور جنگ میں شامل ہونے کے لیے نہیں آئے تھے۔

بائبل میں یہ مذکور ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام ایک چرواہے تھے اور جب ان کے تین بھائی جنگ میں شامل

ہونے کے لیے چلے گئے تو یہ اپنے والد کی خبر گیری کے لیے ان کے پاس رہے اور بکریاں چراتے رہے، لیکن جب کافی دن گزر گئے، تو والد نے انہیں بھائیوں کی خیر خبر لینے کے لیے میدانِ جنگ بھیجا، یہ وہاں پہنچے تو دیکھا کہ جالوت مسلسل چیلنج دے رہا ہے اور کوئی اس سے لڑنے کے لیے آگے نہیں بڑھ رہا۔

یہ دیکھ کر انہیں غیرت آئی اور انہوں نے طالوت سے اجازت مانگی کہ وہ جالوت سے مقابلے کے لیے جانا چاہتے ہیں۔ وہ چونکہ بہت نوعمر تھے، اس لیے شروع میں طالوت اور دوسرے لوگوں کو تردّد ہوا کہ انہیں جالوت جیسے طاقتور شخص سے مقابلے کے لیے بھیجنا بھی چاہیے یا نہیں؟ لیکن داؤد علیہ السلام کے اصرار پر انہیں اجازت مل گئی۔ بائبل میں کہیں یہ بھی مذکور ہے کہ انہوں نے کہا کہ میں ہوں تو چرواہا، لیکن میں بکریوں پر حملہ کرنے والے شیر اور ریچھ کو بھی مار چکا ہوں، اس لیے آپ مجھے یہ نہ سمجھیں کہ میں ان کا مقابلہ نہیں کرسکتا، لہٰذا ان کے اصرار پر طالوت نے ان کو جالوت کے مقابلے کے لیے جانے کی اجازت دے دی۔

حضرت داؤد علیہ السلام چونکہ چرواہے تھے اور اس سے پہلے انہوں نے باقاعدہ نہ کسی جنگ میں حصہ لیا تھا، اور نہ انہیں اس وقت کے معروف قسم کے ہتھیاروں کا تجربہ تھا، اس لیے جب طالوت نے انہیں جنگی لباس پہنایا تو انہوں نے یہ کہہ کر اتار دیا کہ مجھے اس کا تجربہ نہیں ہے اور وہ صرف کچھ پتھر لے کر جالوت کے قریب پہنچ گئے، اور فلاخن (غلیل) میں رکھ کر ایک پتھر جالوت کی پیشانی پر اس زور سے مارا کہ وہ اس کے سر میں گھس گیا اور وہ زمین پر گر پڑا۔ یہ اس کے پاس گئے اور پھر خود اسی کی تلوار لے کر اس کا سر قلم کردیا، یہ واقعہ بائبل کی کتاب سموئیل اوّل کے باب سترہ میں بھی موجود ہے۔

یہاں تک بائبل میں اور قرآنِ کریم کے بیان میں کوئی تعارض نہیں ہے، لیکن اس کے بعد بائبل میں یہ کہا گیا ہے کہ طالوت کو حضرت داؤد علیہ السلام کی مقبولیت سے حسد ہوگیا تھا، چنانچہ بائبل میں ان کے خلاف بہت سی ناقابلِ یقین باتیں ذکر کی گئی ہیں، بظاہر یہ داستانیں ان بنی اسرائیل کی کارروائی لگتی ہے جو شروع سے طالوت کے مخالف تھے۔ قرآنِ کریم نے جن الفاظ میں طالوت کی تعریف کی ہے، ان کے پیشِ نظر طالوت میں حسد جیسی بیماری کی گنجائش معلوم نہیں ہوتی۔

بہرحال! حضرت داؤد علیہ السلام کے اس کارنامے نے ان کو ایسی مقبولیت عطا کی کہ بعد میں وہ بنی اسرائیل کے بادشاہ بھی بنے اور اللہ تعالیٰ نے انہیں نبوّت سے بھی سرفراز فرمایا۔ ان کے ذریعے پہلی بار ایسا ہوا کہ نبوّت اور بادشاہت ایک ہی ذات میں جمع ہوگئیں، حضرت داؤد علیہ السلام نبی بھی تھے اور بادشاہ بھی تھے۔ یہ سب

واقعہ جالوت کے قتل کرنے کے بعد پیش آیا، چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ''داؤد نے جالوت کو قتل کیا۔'' ﴿وَ اٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ وَ الْحِكْمَةَ﴾ ''اور اللہ نے ان کو سلطنت اور دانائی عطا کی۔'' یہاں دانائی سے مراد نبوّت ہے۔ ﴿وَ عَلَّمَهٗ مِمَّا يَشَآءُ﴾ ''اور جو کچھ اللہ تعالیٰ نے چاہا وہ ان کو علم عطا فرمایا،'' جیسا کہ بغیر آلات کے زرہیں بنانا اور دین کے احکام، اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے انہیں یہ سب چیزیں عطا فرمائیں۔

• جہاد کی مشروعیت اور اس کی حکمت

یہ سارا واقعہ بیان کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہ جو مشرکین سے یا کافروں سے جہاد ہوئے ہیں، تو ان کا منشأ درحقیقت انسانیت کی فلاح و بقا ہے۔ اگر یہ جہاد نہ ہوں، یہ لڑائیاں نہ ہوں تو دنیا کے اندر فساد پھیل جائے، کیونکہ مُفسد لوگ دوسرے لوگوں کا حق مارنے کے لیے ان پر غالب آجائیں اور پھر دنیا میں عبادت کرنے والے بھی باقی نہ رہیں، چنانچہ فرمایا: ﴿وَ لَوْ لَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ﴾ ''اور اگر اللہ لوگوں کا ایک دوسرے کے ذریعے دفاع نہ کرے،'' یعنی اگر مصلحین کو مفسدین پر غالب نہ کرتے رہا کریں تو ﴿لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ﴾ زمین میں فساد پھیل جائے ﴿وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ۝۲۵۱﴾ ''لیکن اللہ تمام جہانوں پر بڑا فضل فرمانے والا ہے،'' اور اسی لیے اللہ تبارک وتعالیٰ نے جہاد کو مشروع کیا ہے۔

عام حالت میں تو بے شک امن و امان ہی بہتر ہے، لیکن اگر دنیا میں یا دنیا کے کسی حصے میں ایسے ظالم لوگ مسلّط ہو جائیں جو دوسروں کے اوپر ظلم ڈھائیں، دوسروں کا حق ماریں اور دوسروں کو تنگ کریں تو ان کا مقابلہ کرنے کے لیے جہاد ایک لازمی فریضہ ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو زمین میں فساد پھیل جائے، کیونکہ ایسی صورت میں وہی مُفسد اور ظالم لوگ غالب رہیں اور لوگوں کے لیے مصیبت کا سبب بن جائیں۔ اللہ تعالیٰ نے ایسے لوگوں کے شر کو رفع کرنے کے لیے اور ان کی مصیبت کو دفع کرنے کے لیے یہ لڑائی مشروع کی ہے۔

• سابقہ واقعات کا بیان درحقیقت نبوّت کی دلیل ہے

اب اللہ تبارک وتعالیٰ یہ سارے کا سارا واقعہ بیان کرنے اور اس کی حکمت بتانے کے بعد یہ فرمارہے ہیں کہ ﴿تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ﴾ ''یہ اللہ کی آیات ہیں جو ہم آپ کے سامنے ٹھیک

ٹھیک پڑھ کر سناتے ہیں۔'' یہاں پر ''ٹھیک ٹھیک پڑھ کر سناتے ہیں'' سے اشارہ اس طرف کر دیا گیا ہے کہ یہی واقعات بائبل میں بھی بیان ہوئے ہیں، لیکن بائبل میں یہ واقعات جس طرح بیان ہوئے ہیں، اس میں بہت سے لوگوں نے کتر بیونت (کانٹ چھانٹ) کر کے اپنی طرف سے کچھ چیزیں بڑھا کر اور کچھ گھٹا کر اس کو اپنی خواہشات کے مطابق مرتب کر دیا ہے، اس لیے وہ اپنی اصلی شکل میں باقی نہیں رہیں۔ جیسا کہ پیچھے گزرا، بائبل کے مطابق طالوت کو حضرت داود علیہ السلام سے حسد ہوگیا تھا، جبکہ ہم قرآنِ کریم کے ذریعے بالکل حقیقت کے مطابق صحیح صحیح واقعات بیان کرتے ہیں اور ان میں جو بلا وجہ کے اضافے ہوگئے ہیں یا کچھ چیزیں حذف کردی گئی ہیں یا کوئی مفہوم مختلف بیان کیا گیا ہے، تو اس کی اصلاح کر کے ٹھیک واقعات آپ کے سامنے پڑھ کر سنا دیتے ہیں۔

﴿وَ اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ۝۲۵۲﴾ ''اور آپ بے شک ان پیغمبروں میں سے ہیں جو رسول بنا کر بھیجے گئے ہیں۔'' اللہ تبارک وتعالیٰ نے جو یہ جملہ ارشاد فرمایا ہے اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ جتنے واقعات ہم نے آپ کو بتائے ہیں، مثلاً طالوت کے بادشاہ مقرر ہونے کا واقعہ یا داود علیہ السلام کے ہاتھوں جالوت کے قتل ہونے کا واقعہ، ان واقعات کا نبیِ کریم سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبانِ مبارک پر جاری ہونا، آپ کے رسول ہونے کی واضح دلیل ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس ان واقعات کو جاننے کا وحی کے سوا کوئی اور ذریعہ نہیں تھا، آپ ویسے ہی اُمّی تھے، پڑھتے اور لکھتے نہیں تھے، لہٰذا کوئی کتاب پڑھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ آپ کے پاس ایسے لوگ بھی موجود نہیں تھے جو بائبل کے عالم ہوں اور انہوں نے بائبل کی باتیں پڑھ کر آپ کو سنادی ہوں اور آپ نے ان سے سن کر یہ واقعات جان لیے ہوں، یہ بات بھی ممکن نہیں ہے، کیونکہ ایسے لوگ آپ کے آس پاس موجود ہی نہیں تھے۔

اگر بالفرض آپ نے یہ باتیں کسی سے سیکھی بھی ہوتیں تو پھر جو روایتیں اس میں جس طرح موجود ہیں ویسے ہی بیان کرتے، لیکن یہاں اللہ تعالیٰ فرما رہے ہیں کہ اس قرآن کے اندر ہم صحیح صحیح باتیں بیان کر رہے ہیں اور بائبل کے اندر یا دوسری کتابوں کے اندر جو مغالطہ آمیز یا واقعے کے خلاف باتیں آگئی ہیں ہم ان کی تردید کر رہے ہیں، تو یہ تردید اس وقت تک نہیں ہوسکتی جب تک کہ نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو وحی کے ذریعے اس سے باخبر نہ کیا گیا ہو، لہٰذا آپ کا ان واقعات کو بیان فرمانا بذاتِ خود اس بات کی دلیل ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ کے سچے پیغمبر ہیں اور آپ کو صحیح معنی میں اللہ تعالیٰ نے رسول بنا کر بھیجا ہے، یہی معنیٰ ہیں ﴿وَ اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ۝۲۵۲﴾ کے، یعنی ''آپ بے شک ان پیغمبروں میں سے ہیں جو رسول بنا کر بھیجے گئے ہیں۔''

• طالوت و جالوت کے واقعہ سے حاصل شدہ بصائر و عبر

قرآنِ کریم کوئی قصہ کہانی کی کتاب نہیں ہے، اس لیے وہ جو واقعات بیان فرماتا ہے، وہ ہمارے سبق لینے کے لیے ہوتے ہیں۔ اس واقعے میں بھی ہمارے لیے متعدّد سبق ہیں جن پر ایک نظر ڈال لینا ضروری ہے:

۱- پہلا سبق تو یہ ہے کہ جہاد شریعت کا ایک اہم حکم ہے اور اس کا مقصد ملک گیری نہیں، بلکہ ظلم کا مقابلہ ہے، اگر جہاد نہ ہو تو دنیا میں فساد پھیل جائے۔

۲- جہاد میں فتح و شکست اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ اگر جہاد کا مقصد صحیح ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لیے لڑا جارہا ہے، تو اللہ تعالیٰ کی مدد اس کے ساتھ ہوتی ہے، چاہے مجاہدین کی تعداد اور وسائل دشمن سے کم ہوں۔

۳- مجاہد اللہ تعالیٰ سے ملنے کا یقین لے کر جہاد کرتا ہے، اور شہادت کو اعلیٰ ترین کامیابی سمجھتا ہے۔ ایسے مجاہدین ہی اللہ تعالیٰ کی نصرت اور ثواب کے حق دار ہوتے ہیں۔

شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مومن
نہ مالِ غنیمت، نہ کشور کشائی

۴- کسی بھی بلند مقصد کے لیے انسان کو اپنی نفسانی خواہشات کی قربانی دینی پڑتی ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں نے پیاس کے باوجود دریا کا پانی پینے سے اجتناب کیا اور اپنے سے کئی گنا بڑے دشمن کے مقابلے پر کھڑے ہوگئے۔

۵- بندہ جب اپنے حصے کا کام کرلیتا ہے اور پھر اللہ تعالیٰ سے مانگتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی دعا کو ردّ نہیں فرماتے۔ آج ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ ہم اپنے حصے کا کام نہیں کرتے اور پھر مایوسی کا شکار رہتے ہیں۔ آج جب لوگوں سے کہا جاتا ہے کہ اللہ کے بندو! اپنی نگاہوں کی حفاظت کرو، اپنی زبان کو بچاؤ، گالم گلوچ سے پرہیز کرو، غیبتیں نہ کرو، جھوٹ نہ بولو، رشوت نہ لو، تو لوگ کہتے ہیں ہم جس معاشرے اور جس ماحول میں رہتے ہیں وہ سارا معاشرہ ان گناہوں سے بھرا ہوا ہے، اس لیے ان گناہوں سے کیسے بچیں؟ گویا وہ کہہ رہے ہوتے ہیں: ''لَا طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ بِجَالُوْتَ وَ جُنُوْدِهٖ'' ''آج جالوت اور اس کے لشکر کا مقابلہ کرنے کی ہمارے اندر طاقت نہیں ہے۔''

اگر ماحول، معاشرے اور نفس سے مقابلے کی طاقت نہیں ہے، تو کیا ایک قدم بھی نہیں بڑھا سکتے؟ کیا ارادہ نہیں کر سکتے کہ آج سے میں اپنی نگاہوں کو، اپنی زبان کو، اپنے کانوں کو، اپنے اقدامات کو اللہ کی نافرمانی سے بچانے کا ارادہ کرتا ہوں؟

اللہ تعالیٰ سے ایک مرتبہ معافی مانگ لو کہ پیچھے جو ہوا سو ہوا، یا اللہ اس کو معاف کر دیجیے اور آئندہ کے لیے ارادہ کرتا ہوں کہ ایسا نہیں کروں گا، یہ عزم و ارادہ کر کے پھر اللہ تعالیٰ سے مانگو: ﴿رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا﴾ اے پروردگار! ہمیں صبر عطا فرما، کیا صبر عطا فرما؟ یعنی نفسانی خواہشات سے جنگ کرنے کی طاقت عطا فرما اور ہمیں ثابت قدم رکھ۔ اگر یہ کر لیا تو اللہ تعالیٰ ''فَهَزَمُوْهُمْ بِاِذْنِ اللّٰهِ'' کا معجزہ دکھا دیں گے اور تم اللہ تعالیٰ کے حکم سے شیطان کو اور اپنے نفس کے تقاضوں کو شکست دے دو گے۔

الحمدللہ! سورۂ بقرہ کی آیت نمبر: ۲۵۲ پر دوسرے پارے (سَيَقُوْلُ) کا اختتام ہوا، اور یہاں تک کی تفسیر مکمل ہوئی۔ اگلے صفحے سے تیسرے پارے (تِلْكَ الرُّسُلُ) کی تفسیر شروع ہو رہی ہے۔

آیت ۲۵۳ تا ۲۵۴

الجزء ۳ تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۘ مِنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ وَرَفَعَ
بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ ؕ وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ
الْقُدُسِ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلَ الَّذِيْنَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا
جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ وَلٰكِنِ اخْتَلَفُوْا فَمِنْهُمْ مَّنْ اٰمَنَ وَمِنْهُمْ مَّنْ كَفَرَ ؕ وَلَوْ
ع ۳۳ ۵ ۱ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلُوْا ۫ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ ﴿۲۵۳﴾ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا
اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيْهِ وَلَا خُلَّةٌ وَّلَا
شَفَاعَةٌ ؕ وَالْكٰفِرُوْنَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۲۵۴﴾

یہ پیغمبر جو ہم نے (مخلوق کی اصلاح کے لیے) بھیجے ہیں، انہیں ہم نے ایک دوسرے پر فضیلت عطا کی ہے۔ ان میں سے بعض وہ ہیں جن سے اللہ نے کلام فرمایا، اور ان میں سے بعض کو اس نے بدرجہا بلندی عطا کی اور ہم نے عیسیٰ ابن مریم کو کھلی نشانیاں دیں اور روحُ القدس سے ان کی مدد فرمائی اور اگر اللہ چاہتا تو ان کے بعد والے لوگ اپنے پاس روشن دلائل آجانے کے بعد آپس میں نہ لڑتے، لیکن انہوں نے خود اختلاف کیا، چنانچہ ان میں سے کچھ وہ تھے جو ایمان لائے اور کچھ وہ جنہوں نے کفر اپنایا۔ اور اگر اللہ چاہتا تو وہ آپس میں نہ لڑتے، لیکن اللہ وہی کرتا ہے جو وہ چاہتا ہے۔ ﴿۲۵۳﴾ اے ایمان والو! جو رزق ہم نے تمہیں دیا ہے اس میں سے وہ دن آنے سے پہلے پہلے (اللہ کے راستے میں) خرچ کرلو جس دن نہ کوئی سودا ہوگا نہ کوئی دوستی (کام آئے گی) اور نہ کوئی سفارش ہوسکے گی۔ اور ظالم وہ لوگ ہیں جو کفر اختیار کیے ہوئے ہیں۔ ﴿۲۵۴﴾

ربطِ آیات اور جہاد و انفاق کے مضامین بیان کرنے کی وجہ

جیسا کہ پہلے ''اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ''[1] کی تشریح میں عرض کیا گیا تھا، سورۂ بقرہ کے اس آخری حصے میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے دو چیزوں کا خاص طور پر بیان فرمایا ہے؛ ایک جہاد فی سبیل اللہ، اور ایک انفاق فی سبیل اللہ، یعنی اللہ تبارک وتعالیٰ کے راستے میں قتال کرنا اور اللہ تبارک وتعالیٰ کے راستے میں خرچ کرنا۔ جہاد سے متعلق کچھ واقعات و احکام، سابقہ آیات میں بیان ہو چکے ہیں۔ اب سورۂ بقرہ کی آنے والی آیات میں زیادہ تر اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کرنے کی تاکید فرمائی گئی ہے، البتہ بیچ میں کچھ دیگر باتیں بھی کسی ضمنی فائدے کا لحاظ رکھتے ہوئے ارشاد فرمائی گئی ہیں۔

پیچھے سورۂ بقرہ میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے عائد کیے گئے جو احکام بیان ہوئے تھے، اگر اُن کی خلاف ورزی کا داعیہ کبھی انسان کے دل میں پیدا ہوتا ہے، تو اس کے عموماً دو ہی سبب ہوسکتے ہیں؛ کبھی تو اسے اپنی جان محبوب ہوتی ہے، اس لیے وہ اللہ تعالیٰ کے کسی حکم کی نافرمانی کرتا ہے، اور کبھی مال کی محبت اسے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی پر آمادہ کرتی ہے، لہٰذا ان دونوں اسباب کا علاج جہاد اور انفاق کے ذریعے کیا گیا۔

اللہ تعالیٰ کے راستے میں جہاد کرنے سے انسان کو اپنی جان کی محبت، اللہ تعالیٰ کی محبت سے زیادہ نہیں رہتی، بلکہ اللہ تعالیٰ کی محبت جان کی محبت پر غالب آجاتی ہے اور اللہ کے راستے میں خرچ کرنے کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مال کی محبت دل میں کم ہوتی ہے۔ جب ان دونوں چیزوں کی محبت کم ہوتی ہے تو اس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ کے احکام پر عمل کرنا نسبتاً آسان ہوجاتا ہے، اس لیے ان دو چیزوں پر زیادہ زور دیا گیا ہے۔ جہاد پر زور دینے کے سلسلے میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے ابھی طالوت اور جالوت کا واقعہ بیان فرمایا اور اس میں بتایا گیا کہ کس طرح اللہ تبارک وتعالیٰ نے ایک چھوٹی جماعت کو بڑی جماعت پر فتح عطا فرمائی، اور اسی طرح مال کی محبت دل سے نکالنے کے لیے آگے آنے والی آیات میں صدقہ کے فضائل بیان کیے گئے۔

نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تسلّی کا مضمون

دوسرے پارے کی آخری آیت میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے نبیِ کریم سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ گزشتہ قوموں کے یہ واقعات جو آپ سنا رہے ہیں، یہ خود اس بات کی دلیل ہے

---

(۱) سورۃ البقرۃ (۲): آیت (۲۴۳)

کہ آپ ﷺ اللہ کے بھیجے ہوئے پیغمبر ہیں، لہٰذا فرمایا تھا کہ ''اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ'' ''بے شک آپ اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے پیغمبروں میں سے ہیں،'' آپ کے پاس وحی آتی ہے اور وحی کے ذریعے آپ کو ان واقعات کا علم ہوا ہے۔

اب یہ بتایا جارہا ہے کہ جب یہ بات طے ہوگئی کہ نبیِ کریم سرورِ دو عالم ﷺ اللہ تعالیٰ کے سچے پیغمبر ہیں، تو کسی کے دل میں یہ خیال پیدا ہوسکتا ہے، اور خود آنحضرت ﷺ کے دل میں بھی اس بات سے غم ہوتا تھا کہ جب رسول اللہ ﷺ کی پیغمبری اور رسالت کے دلائل اتنے واضح اور روشن ہیں تو اس کے باوجود بہت سے لوگ آپ ﷺ کی رسالت کو تسلیم کیوں نہیں کرتے؟ اسی بات کا جواب دیتے ہوئے اگلی آیات میں نبیِ کریم ﷺ کے لیے تسلّی کا ایک مضمون بیان کیا جارہا ہے کہ آپ ﷺ سے پہلے بھی مختلف درجوں کے پیغمبر گزرے ہیں، لیکن ایمان کا عام ہونا کسی بھی اُمت میں نہیں رہا، کسی نے موافقت کی اور کسی نے مخالفت، لہٰذا اگر آپ پر یہ لوگ ایمان نہیں لاتے تو آپ رنجیدہ نہ ہوں۔

انبیائے کرام میں سے بعض کو بعض پر فضیلت

﴿تِلْكَ الرُّسُلُ﴾ ''یہ پیغمبر،'' یعنی جتنے پیغمبر پیچھے گزرے ہیں ان سب کی طرف اشارہ ہے ﴿فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ﴾ ''انہیں ہم نے ایک دوسرے پر فضیلت عطا کی ہے،'' یعنی کسی کو کسی دوسرے پیغمبر پر فضیلت عطا کی ہے۔ فضیلت سے یہاں پر یہ بھی مراد ہوسکتا ہے کہ ان کے اندر کوئی ایسی خصوصی امتیازی صفات تھیں، جو دوسرے انبیاء میں نہیں تھیں یا انہیں کچھ خاص معجزے دیے گئے تھے جو دوسرے انبیاء کو نہیں دیے گئے، مثلاً حضرت موسیٰ علیہ السلام سے اللہ تبارک وتعالیٰ براہِ راست ہم کلام ہوئے، پچھلے بہت سے انبیاء کو اس کا موقع نہیں ملا۔ اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو مُردوں کو زندہ کرنے کا ایسا معجزہ عطا فرمایا گیا تھا جو کسی اور کو نہیں ملا، یا جیسے حضرت سلیمان علیہ السلام کو ہواؤں پر حکومت عطا کی گئی۔ غرض اس طرح کی جزوی فضیلتیں انبیائے کرام علیہم السلام کو ایک دوسرے پر حاصل رہی ہیں، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ بس کسی فضیلت والے پیغمبر کو اپنا مقتدا مان کر باقی پیغمبروں کا انکار کردیا جائے، اور نہ اس کا یہ مطلب ہے کہ لوگ انبیائے کرام علیہم السلام کے درمیان اس طرح تقابل کیا کریں کہ جس سے کسی پیغمبر کی۔ معاذ اللہ۔ ادنیٰ اہانت لازم آئے۔ اسی لیے رسول اللہ ﷺ نے اپنی امت سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

لَا تُفَضِّلُوْا بَيْنَ أَنْبِيَاءِ اللهِ.(۱)

تم اللہ کے نبیوں کے درمیان ایک دوسرے کو فضیلت مت دیا کرو۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی اُمت کو ہدایت فرمارہے ہیں کہ تم لوگ انبیاء کے درمیان ایک دوسرے کی فضیلت کی بات نہ کیا کرو، کیونکہ اس میں اندیشہ ہے کہ کہیں کسی پیغمبر کی شان میں کوئی گستاخی یا بے ادبی نہ ہوجائے، اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مستقل طور پر اس سے منع فرمادیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس بات سے ازراہِ احتیاط منع فرمادیا، ورنہ واقعہ یہ ہے کہ کسی پیغمبر کو کسی دوسرے پیغمبر پر فضیلت حاصل ہوسکتی ہے اور ہوئی بھی ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ﴿مِنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ﴾ ''ان پیغمبروں میں سے بعض وہ ہیں جن سے اللہ نے براہِ راست بات کی،'' جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام ﴿وَ رَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ﴾ اور کسی کو اللہ نے بدرجہا بلندی عطا فرمائی، یعنی اللہ تبارک وتعالیٰ نے بعض کو دوسروں پر درجات کے اعتبار سے بہت زیادہ فضیلت عطا فرمائی۔ اس میں نبیِ کریم سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف ایک لطیف اشارہ ہے کہ دوسرے انبیائے کرام کو تو ایک دوسرے پر کچھ جزوی فضیلتیں حاصل ہوتی رہی ہیں، لیکن ان میں سے کچھ وہ ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے بدرجہا بلندی عطا فرمائی ہے، اور بظاہر اس سے مراد رسولِ کریم سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتِ گرامی ہی ہے۔

آگے فرمایا: ﴿وَ اٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ﴾ اور ہم نے عیسیٰ ابن مریم کو روشن دلیلیں، کھلی نشانیاں عطا فرمائیں ﴿وَ اَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ﴾ ''اور روحُ القدس سے ان کی مدد فرمائی۔'' پیچھے بھی یہ مضمون گزر چکا ہے(۲) کہ روحُ القدس سے مراد حضرتِ جبرئیل علیہ السلام ہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی روحُ القدس سے مدد کرنے کا مفہوم بظاہر یہ ہے کہ چونکہ یہودی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے جانی دشمن تھے، اس لیے انہیں ضرورت تھی کہ کوئی ان کی حفاظت پر مامور ہو، چنانچہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضرت جبرئیل علیہ السلام کو ان کی حفاظت پر مامور فرمادیا تھا تاکہ یہودی اور دوسرے مجوسی انہیں نقصان نہ پہنچاسکیں۔

نبیِ برحق کی رسالت سے انکار اور اس کی وجوہات

مذکورہ بالا آیت یعنی ﴿تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ..... الخ﴾ میں اللہ تبارک وتعالیٰ

---

(۱) صحيح البخاري (۳/۱۱۷) (۳٤۱٤) كتاب أحاديث الأنبياء، باب قول الله تعالى: ﴿وإنَّ يُونُسَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ﴾

(۲) دیکھیے سورۃ البقرۃ (۲): آیت (۸۷)

نے نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت کے برحق ہونے کے باوجود بہت سے لوگوں کے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پیغمبر تسلیم نہ کرنے کی دو وجوہات کی طرف اشارہ فرمایا ہے:

ایک وجہ تو یہ کہ جتنے پیغمبر بھی پہلے آئے ہیں، ان سب میں صورتِ حال یہ رہی ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ حالات کے لحاظ سے کسی پیغمبر میں کوئی خصوصی صفت یا خصوصی فضیلت ایسی پیدا فرما دیتے ہیں جو انہیں تو حاصل ہوتی ہے، لیکن بعض اوقات دوسرے انبیاء کو حاصل نہیں ہوتی، اب ان کے امتی یا نام لیوا بعض اوقات اس فضیلت کو اس طرح استعمال کرتے ہیں کہ اس کی وجہ سے نبی کا درجہ بڑھا کر اسے خدا تک پہنچا دیتے ہیں، اور اگر بعض اوقات خدا تک نہ بھی پہنچائیں تو اس کے نتیجے میں وہ اتنا ضرور سمجھتے ہیں کہ ہمیں بس انہی نبی کی پیروی کرنی ہے اور انہی پر ایمان لانا ہے۔ -العیاذ باللہ- دوسرے انبیائے کرام کی ان کے دل میں کوئی وقعت نہیں ہوتی اور نہ وہ ان پر ایمان لانا ضروری سمجھتے ہیں، بس وہ اپنے ایک نبی کی فضیلت کو معیار بنا کر انہی کی حد تک اپنے ایمان کو محدود رکھتے ہیں اور اس کے نتیجے میں دوسرے پیغمبروں کی باتیں سننے سے انکار کر دیتے ہیں۔

جیسا کہ مثلاً یہودیوں نے بے شک حضرت موسیٰ علیہ السلام کی فضیلت کو اہمیت دی اور واقعۃً وہ فضیلت کے لائق بھی تھے، لیکن انہوں نے یہ سمجھ لیا کہ اب حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد (آخر زمانے کے مزعومہ مسیّا کے سوا) کسی اور پیغمبر کو نہیں مانیں گے، چنانچہ جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام نبی بن کر تشریف لائے تو انہوں نے ان کی بات ماننے سے انکار کر دیا، اور اپنا ایک الگ گروہ بنالیا۔ اسی طرح عیسیٰ علیہ السلام کے پیروکاروں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اپنا پیغمبر مانا، لیکن جب نبیِ کریم سرورِ دوعالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف لائے تو آپ کے منکر ہو گئے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے مختلف انبیاء کو جو ایک دوسرے پر فضیلت عطا فرمائی تھی، اس فضیلت کا صحیح مفہوم اور تقاضا تو یہ تھا کہ سب انبیاء برحق ہیں، البتہ کسی کو کوئی خصوصیت حاصل ہے اور کسی کو کوئی، ہر ایک کی خصوصیات جدا جدا ہیں اور بقولِ شاعر ؏

ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است

یعنی ہر ایک پھول کی رنگت اور خوشبو دوسرے پھول سے مختلف ہوتی ہے، لہٰذا اگر ان الگ الگ خصوصیات کو سامنے رکھتے ہوئے ان پر ایمان لایا جاتا، تو اس طرح کوئی خرابی پیدا نہ ہوتی، لیکن لوگوں نے اسے اپنے گروہی تعصب کا ذریعہ بنا کر دوسرے انبیائے کرام کی توہین وغیرہ شروع کر دی، اسی سے یہ خرابی

پیدا ہوئی کہ انہوں نے نبیِ کریم سرورِ دو عالم ﷺ کی رسالت کا بھی انکار کردیا، لہٰذا یہ یہود و نصاریٰ جو آپ ﷺ کے نبیِ برحق اور نبیِ مُرسل ہونے کے باوجود جانتے بوجھتے آپ ﷺ کی رسالت کا انکار کررہے ہیں، وہ درحقیقت اپنے اسی گروہی تعصب کی وجہ سے ایسا کررہے ہیں، یہ ان کے انکار کی پہلی وجہ بیان کی گئی۔

اس آیت میں دوسری وجہ اس طرح بیان کی گئی ہے کہ اگرچہ بڑے بڑے فضیلت والے انبیائے کرام آئے ہیں، لیکن ان کے زمانوں میں جہاں کچھ لوگ ان کے ماننے والے تھے، وہیں انہیں جھٹلانے والے اور ان کی تکذیب کرکے ان پر ایمان نہ لانے والے بھی بہت لوگ تھے۔ اس طرح رسولِ کریم ﷺ کو تسلی دی جارہی ہے کہ مکّہ مکرمہ یا حجاز کے لوگ آپ کو رسول ماننے سے انکار کررہے ہیں، تو یہ کوئی نئی بات نہیں ہے، پچھلے انبیائے کرام کے ساتھ بھی ایسا ہوتا رہا ہے۔

ایمان میں اختیار دینے سے مقصود آزمائش ہے

اب آگے اللہ تعالیٰ فرمارہے ہیں کہ جو لوگ تعصب کی وجہ سے آپ ﷺ کی رسالت کا انکار کررہے ہیں، اللہ تعالیٰ انہیں اس بات پر مجبور کرنے پر قادر تھا کہ وہ حق بات کو مانیں، رسول اللہ ﷺ پر ایمان لے آئیں، لیکن یہ اللہ تعالیٰ کی حکمت کے خلاف ہے کہ وہ کسی کو جبر کے ذریعے ایمان لانے پر مجبور کرے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ دنیا آزمائش کے لیے بنائی ہے اور اس میں ہر انسان سے یہ مطالبہ ہے کہ وہ اپنے اختیار سے اور اپنی سوچ سمجھ سے کام لے کر اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے اور ان کی باتوں کو مانے۔ اللہ تعالیٰ چاہتا تو بے شک کوئی اختلاف ہی پیدا نہ ہوتا، جب سے حضرت آدم علیہ السلام پیدا ہوئے، اس وقت سے سب لوگ ایک ہی دین پر ہوتے اور انبیائے کرام کے پیروکار آپس میں کبھی نہ لڑتے۔ ایسا ہوسکتا تھا، لیکن اللہ تعالیٰ نے روشن دلیلوں کے ذریعے رہنمائی فراہم کرکے یہ ان کے اختیار پر چھوڑ دیا کہ آیا وہ صحیح راستہ اختیار کرتے ہیں یا غلط راستہ؟

اسی بات کو بیان کرتے ہوئے اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتے ہیں کہ ﴿وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلَ الَّذِيْنَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ﴾ اور اگر اللہ چاہتا تو ان کے بعد والے لوگ آپس میں نہ لڑتے ﴿مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ﴾ ''اپنے پاس روشن دلائل آجانے کے بعد،'' یعنی اگر اللہ چاہتا تو وہ لوگ جو انبیائے کرام علیہم السلام کے بعد آئے ہیں، وہ اپنے پاس روشن دلائل اور کھلی نشانیاں آجانے کے بعد آپس میں اختلاف نہ کرتے اور نوبت قتل وقتال

تک نہ آتی۔

''آپس میں نہ لڑنے'' میں دونوں مفہوم داخل ہیں، یعنی کوئی عقائد کا اختلاف بھی نہ ہوتا، اور جنگ بھی نہ ہوتی، سب کا دین ایک ہی ہوجاتا، ﴿وَ لٰكِنِ اخْتَلَفُوْا﴾ لیکن انہوں نے خود اختلاف کیا ﴿فَمِنْهُمْ مَّنْ اٰمَنَ﴾ ان میں سے کچھ وہ تھے جو ایمان لے آئے ﴿وَ مِنْهُمْ مَّنْ كَفَرَ﴾ ''اور کچھ وہ جنہوں نے کفر اپنایا'' پھر دوبارہ فرمایا: ﴿وَ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلُوْا﴾ اگر اللہ چاہتا تو یہ آپس میں نہ لڑتے ﴿وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ ۝۲۵۳﴾ ''لیکن اللہ وہی کرتا ہے جو وہ چاہتا ہے،'' وہ مالک و مختار ہے اور اس کا کوئی فعل حکمت سے خالی نہیں۔

آگے آیت نمبر: ۲۵۶ میں صراحت کے ساتھ یہ بات کہہ دی گئی ہے کہ دین میں کوئی زبردستی نہیں ہے، حق کے دلائل واضح کردیے گئے ہیں، اس کے بعد جو کوئی حق کو اختیار کرے گا وہ اپنے ہی فائدے کے لیے ایسا کرے گا اور جو شخص اسے نظر انداز کرکے شیطان کے سکھائے ہوئے راستے پر چلے گا، وہ اپنا ہی نقصان کرے گا۔

قرآنِ کریم میں انفاق کا مفہوم وتصوّر

جیسا کہ پیچھے عرض کیا تھا، یہاں اصل مضمون انفاق اور جہاد کی تاکید و ترغیب کا ہے، درمیان میں نبیِ کریم سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت کا ذکر آیا تھا، اور اس پر ایمان لانے نہ لانے سے متعلق جو ایک شبہ پیدا ہوتا تھا، اللہ تعالیٰ نے پچھلی آیات میں اسے ردّ فرما دیا اور نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اشارۃً کہہ دیا گیا کہ آپ تسلی رکھیں، کچھ لوگ آپ کو مانیں گے کچھ نہیں مانیں گے۔ نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دی گئی اس تسلی کے بعد اب پھر اللہ تبارک وتعالیٰ اصلی مقصود یعنی اللہ تعالیٰ کی راہ میں، خاص طور پر جہاد میں مال خرچ کرنے کی طرف متوجہ فرمارہے ہیں۔ چونکہ انفاقِ مال پر عبادت و معاملات کے بہت سارے امور موقوف ہیں، اس لیے اس کے بیان میں زیادہ تفصیل اور تاکید سے کام لیا گیا ہے، چنانچہ اب جو آیات آگے آرہی ہیں ان میں سے اکثر میں انفاقِ مال سے متعلق مختلف چیزوں کو بیان کیا گیا ہے۔

باری تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا﴾ اے ایمان والو! ﴿اَنْفِقُوْا﴾ ''خرچ کرو'' اَنْفِقُوْا انفاق سے نکلا ہے اور انفاق کے لفظی معنیٰ مطلق خرچ کرنے کے ہوتے ہیں، اگر کوئی شخص تعیّش کی چیزیں خریدنے کے لیے پیسے خرچ کرتا ہے، تو اسے بھی لغت کے اعتبار سے تو انفاق ہی کہیں گے، لیکن

قرآنِ کریم جب انفاق کا لفظ استعمال کرتا ہے تو اس سے اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کرنا مراد ہوتا ہے، بعض جگہ ''انفاق فی سبیل اللہ'' یعنی اللہ کے راستے میں خرچ کرنا کہہ کر صراحت کے ساتھ اس کی تعیین بھی کردی ہے اور بعض جگہ صراحت نہیں کی گئی، لیکن قرآنِ کریم میں عام طور سے انفاق سے وہی خرچ مراد ہے جو اللہ تبارک وتعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے ہو، جس میں کسی غریب کی مدد کی گئی ہو، جس میں کسی شخص کے دکھ درد میں انسان نے حصہ لیا ہو، یا جس کے نتیجے میں کوئی اجتماعی بھلائی پیدا کی گئی ہو، یہ وہ انفاق ہے جو اللہ تعالیٰ کو محبوب ہے۔ یہاں پر بھی اسی انفاق کی بات ہو رہی ہے۔

مال کمانے میں ہمارا اپنا کوئی کمال نہیں

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اے ایمان والو! اللہ کے راستے میں خرچ کرو ﴿مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ﴾ ''اس مال سے جو ہم نے تمہیں دیا ہے۔'' اس تعبیر میں اشارہ اس طرف ہے کہ یہ جو تم کسی خیر کے کام میں یا بھلائی کے کام میں خرچ کرتے ہو، تو یہ کوئی تمہارا احسان نہیں ہے، کیونکہ جو مال بھی تمہارے پاس ہے، وہ سب اللہ کا دیا ہوا ہے، لہٰذا اگر اللہ تبارک وتعالیٰ اس میں سے کچھ حصہ کہیں خرچ کرنے کا حکم دے رہا ہے تو یہ اس کا عین حق ہے۔ اگر کوئی شخص یہ کہے کہ نہیں، میں نے تو اپنی قوتِ بازو سے کمایا ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ صرف قوتِ بازو کے بل پر کوئی نہیں کما سکتا تھا، اللہ تعالیٰ نے دنیا کا نظام ایسا بنایا ہے کہ ایک کی ضرورت کو دوسرے کی ضرورت کے ساتھ وابستہ کردیا ہے، تاجر کے پاس گاہک آتے ہیں، اِس سے بکری ہوتی ہے اور نفع حاصل ہوتا ہے، نفع حاصل ہوتا ہے تو آمدنی ہوتی ہے اور اس سے انسان اپنا کام چلاتا ہے۔

جتنے ذرائع سے انسان کما رہا ہے، درحقیقت وہ سب اللہ تعالیٰ ہی کے عطا کیے ہوئے ہیں اور اصل دینے والا تو اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ جب اللہ تعالیٰ ہی اصل دینے والا ہے تو وہ اپنے دیے ہوئے مال میں سے کچھ خرچ کرنے کے لیے کہہ رہا ہے کہ فلاں جگہ خرچ کرو، چاہے وہ جہاد میں خرچ کرنا ہو، چاہے وہ غریبوں کی امداد کے لیے خرچ کرنا ہو یا کسی اور بھلائی کے مصرف کے لیے خرچ کرنا ہو، تو تمہیں اس کام میں خوشدلی سے خرچ کرنا چاہیے۔

قیامت کے دن سے پہلے پہلے خرچ کرنے کی تلقین

پھر اللہ تعالیٰ فرمارہے ہیں کہ ﴿مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ﴾ وہ دن آنے سے پہلے پہلے اللہ کے راستے

میں خرچ کرلو ﴿لَّا بَيْعٌ فِيْهِ﴾ جس دن نہ کوئی سودا ہوگا ﴿وَلَا خُلَّةٌ﴾ اور نہ کوئی دوستی کام آئے گی ﴿وَّلَا شَفَاعَةٌ﴾ ''اور نہ کوئی سفارش ہوسکے گی۔'' اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ قیامت کا دن آنے سے پہلے پہلے خرچ کرلو، کیونکہ قیامت کا دن آجائے گا تو پھر تمہیں کچھ فائدہ نہیں پہنچ سکے گا۔

نیکی کمانے اور اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کا موقع یہ دنیا ہی ہے، آخرت میں نہ تو کوئی تجارت یا کاروبار ہوگا کہ عذاب سے بچنے کے لیے پیسوں سے نیکیاں خرید لی جائیں یا پیسے دے کر جنت خرید لی جائے۔ نہ وہاں پر کوئی دوستی کام آسکتی ہے کہ دوستی کی مد میں تم جنت میں چلے جاؤ، اور نہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے بغیر کسی کی سفارش کام آسکتی ہے کہ وہ سفارش کرکے تمہیں جنت میں پہنچا دے۔ جب تک کہ خود تمہارے اپنے اعمال ٹھیک نہ ہوں، اور جب تک تمہارا اپنا نامۂ اعمال وزنی نہ ہو، اس وقت تک تم جنت میں داخل نہیں ہوسکو گے، لہٰذا اپنا نامۂ اعمال وزنی کرنے کے لیے اُس وقت کے آنے سے پہلے پہلے تم یہاں پر خرچ کرلو، اس طرح ان شاء اللہ وہاں آخرت کے اندر تمہارا ذخیرہ جمع ہوتا رہے گا۔

﴿وَالْكٰفِرُوْنَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝۲۵۴﴾ ''اور ظالم وہ لوگ ہیں جو کفر اختیار کیے ہوئے ہیں۔'' انہوں نے سرے سے یہ ماننے سے ہی انکار کردیا ہے کہ مرنے کے بعد کوئی دوسری زندگی آنے والی ہے اور اس کے لیے کوئی تیاری بھی کرنی چاہیے، لہٰذا وہ اس بات سے منکر بنے بیٹھے ہیں اور اس آخرت کی زندگی کے لیے کوئی تیاری کرنے کے لیے بھی آمادہ نہیں ہیں، اس لیے وہ بڑے ظالم لوگ ہیں۔

آیت الکرسی: بت پرستوں کے عقیدے کی نفی میں توحید کی ایک عظیم الشان آیت

آگے اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنی توحید کی ایک عظیم آیت نازل فرمائی، جسے ''آیت الکرسی'' کہا جاتا ہے اور اس کا اس پچھلی آیت سے ربط یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں فرمایا تھا کہ آخرت میں یا قیامت کے دن کسی کی سفارش کام نہیں آئے گی۔ یہ درحقیقت مشرکین کے اس عقیدے کی تردید تھی جس میں وہ لوگ اپنے بتوں اور دیوتاؤں کو یہ کہتے تھے کہ:

هٰٓؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ (۱)

(۱) سورۃ یونس (۱۰): آیت (۱۸)

یہ اللہ کے یہاں ہماری سفارش کریں گے۔

وہ لوگ کہتے تھے ہم ان کے آگے اپنا سر اس لیے جھکاتے ہیں، اور ان کو اپنا معبود اس لیے قرار دیتے ہیں کہ یہ اللہ کے یہاں جا کر ہماری سفارش کریں گے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا کہ یہ شرک کا عقیدہ ہے، کیونکہ اس عقیدے کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ ان بتوں کو کام سونپ کر فارغ ہو بیٹھا ہے، اور اب وہ کچھ بھی نہیں کرتا، نہ اس کو لوگوں کے بارے میں پوری طرح معلومات ہیں، بلکہ اب یہ بُت اور دیوتا جو کچھ اللہ تعالیٰ کو آ کر بتاتے ہیں، وہ وہی کرتا ہے۔ مثلاً فلاں شخص کو آپ قبول کر لیجیے، فلاں شخص کو فائدہ پہنچا دیجیے، فلاں شخص کو رزق دے دیجیے، فلاں کو اولاد دے دیجیے، یہ سب سفارشیں کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ ان کی سفارش کی بنیاد پر وہ کام کر دیتے ہیں، یہ سارا مشرکانہ عقیدہ تھا۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس مشرکانہ عقیدے کے جواب میں ایک ایسی آیت نازل فرمائی جو اپنی عظمت و قوت کے اعتبار سے، فصاحت و بلاغت کے اعتبار سے اور جامعیت وتاثیر کے لحاظ سے قرآنِ کریم کی بڑی عظیم آیت ہے اور اس کو ''آیت الکرسی'' کہا جاتا ہے۔

اس آیت کی تفسیر سے پہلے چند اُن فضائل پر نظر ڈال لینی چاہیے جو احادیث میں اس آیت کے بارے میں آئے ہیں:

• آیت الکرسی کے خاص خاص فضائل

• بعض احادیث میں آیا ہے کہ یہ قرآنِ کریم کی عظیم ترین آیت ہے۔ حضرت اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ نبی کریم، سرورِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے ارشاد فرمایا: اے ابو منذر! کیا تم جانتے ہو کہ اللہ کی کتاب کی سب سے عظیم آیت تمہارے پاس کون سی ہے؟ میں نے جواب دیا کہ اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول زیادہ جانتے ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر پوچھا: اے ابو منذر! کیا تم جانتے ہو کہ کتابِ الٰہی میں سب سے عظیم آیت تمہارے پاس کون سی ہے؟ حضرت اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے جواب دیا: اَللّٰهُ لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ (یعنی آیت الکرسی) پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم

نے اپنے دستِ مبارک سے میرے سینے پر مارا اور فرمایا: ''ابومنذر! تمہیں علم مبارک ہو۔''(۱)

- حضرتِ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی ایک روایت میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد منقول ہے کہ ''سورۂ بقرہ میں ایک آیت ہے جو -سیدۃُ آیِ القرآن- ہے۔(۲) یعنی قرآنِ کریم کی آیات کی سردار ہے۔ اسی روایت میں یہ بھی ہے کہ ''جس گھر میں یہ آیت پڑھی جائے شیطان اس سے نکل جاتا ہے۔''

- بخاری شریف میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ پیش آنے والے ایک واقعے کے ذیل میں نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے تصدیق شدہ یہ عمل منقول ہے کہ: ''جب تم سونے کے لیے بستر پر لیٹ جاؤ، تو آیت الکرسی آخر تک پڑھ لیا کرو، اس کے پڑھ لینے سے صبح تک ایک نگہبان تمہارے پاس رہے گا اور شیطان تمہارے پاس نہ آسکے گا۔''(۳)

- ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ''جو شخص ہر فرض نماز کے بعد آیت الکرسی پڑھا کرے تو اس کو جنت میں داخل ہونے کے لیے موت کے سوا کوئی چیز مانع نہیں ہوگی۔''(۴) یعنی موت کے بعد فوراً وہ جنت کے آثار اور راحت و آرام کا مشاہدہ کرنے لگے گا۔

• آیت الکرسی کو قرآنِ کریم کی سب سے عظیم آیت قرار دینے کی وجہ

آیت الکرسی کو قرآنِ کریم کی سب سے عظیم آیت کیوں قرار دیا گیا؟ اس کی اصل حقیقت تو اللہ تعالیٰ ہی

---

(۱) صحيح مسلم (۵۵۶/۱) (۸۱۰) كتاب صلاة المسافرين وقصرها، باب فضل سورة الكهف، وآية الكرسي.

(۲) سنن الترمذي (۱۵۷/۵) (۲۸۷۸) ابواب فضائل القرآن، باب ما جاء في فضل سورة البقرة وآية الكرسي، وأخرجه ايضًا الحاكم في المستدرك على الصحيحين (۷۴۸/۱) (۲۰۵۹) وقال: "هذا حديث صحيح الإسناد ولم يخرجاه" كتاب فضائل القرآن، أخبار في فضل سورة البقرة.

(۳) صحيح البخاري (۱۸۸/۶) (۵۰۱۰) كتاب فضائل القرآن، باب فضل سورة البقرة.

(۴) أخرجه النسائي في السنن الكبرى (۶۶/۱۲) (۱۰۰۳۸) كتاب عمل اليوم والليلة، ثواب من قرأ آية الكرسي دبر كل صلاة. والطبراني في المعجم الأوسط (۹۲/۸) (۸۰۶۸) عن أبي أمامة. وذكره المنذري في "الترغيب" (۲۹۹/۲) (۲۲۸۶) وقال: "رواه النسائي والطبراني بأسانيد أحدها صحيح، وقال شيخنا أبو الحسن هو على شرط البخاري وابن حبان في كتاب الصلاة وصححه." كتاب الذكر والدعاء، الترغيب في الإكثار من ذكر الله سراً وجهراً.

بہتر جانتے ہیں۔ متعدّد دلائل سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ قرآنِ کریم کے معنیٰ تو عظیم ہیں ہی، لیکن اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس کے الفاظ میں بھی کچھ خصوصی راز رکھے ہیں، خاص طور پر وہ الفاظ جو اللہ تعالیٰ کے ناموں اور اس کی صفات پر مشتمل ہیں، ان کی عظمت اور ان کی برکات ایسی ہیں جن کا ٹھیک ٹھیک تصوّر ہمارے لیے اس دنیا میں ممکن نہیں۔ آخرت میں جب اس کائنات کے حقیقی بھید کھلیں گے، شاید اُس وقت ان کا اندازہ ہوگا، لہٰذا جن سورتوں یا آیتوں کے خصوصی فضائل صحیح احادیث میں بیان فرمائے گئے ہیں، ہماری مادّے میں لپٹی ہوئی سمجھ، ان کی حقیقت کا مکمل اِدراک کرہی نہیں سکتی، کیونکہ اس کا تعلق اُس عالَم سے ہے جس تک نہ ہماری آنکھ کی رسائی ہے نہ ہماری سمجھ کی، لیکن اس وقت جو کچھ ہماری محدود سمجھ میں آسکتا ہے، اس کی تھوڑی سی تفصیل ذکر کی جاتی ہے۔

اس آیت میں توحید کے عقیدے کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے بڑی شان سے اس طرح بیان فرمایا ہے کہ اس میں اللہ تعالیٰ کی اُن خصوصی صفات کا حوالہ دیا ہے جن میں سے ہر ایک صفت اس بات کی دلیل ہے کہ اس کو اپنی خدائی میں کسی شریک کی نہ صرف یہ کہ کوئی ضرورت نہیں، بلکہ اس کی خدائی کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ وہ تنہا اس کائنات پر حکمرانی کرے، اور صرف اُسی کی اطاعت کی جائے۔

سب سے پہلے تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنی قدرتِ کاملہ کا بیان فرمایا ہے، اور بتایا ہے کہ یہ کائنات کا کارخانہ صرف اُسی کے حکم سے چل رہا ہے، اور وہ اتنا قادرِ مطلق اور قوت وطاقت کا مالک ہے کہ پوری کائنات کے انتظام سے نہ تھکتا ہے، نہ اُسے نیند آتی ہے۔ اس لیے اُسے کسی دوسرے کی نہ مدد کی ضرورت ہے کہ وہ اپنے کچھ کام اُسے سونپ دے، اور نہ کسی کام کی انجام دہی میں اُسے کسی کی سفارش کی ضرورت ہے۔ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں کسی کی سفارش نہیں چلتی، سوائے اس کے کہ اللہ تعالیٰ خود ہی کسی کو اجازت دے دے یا حکم دے کہ تم سفارش کرو، تو پھر بے شک اس کی سفارش اللہ تعالیٰ قبول فرمالیتے ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ کی مرضی کے بغیر خود اپنی خواہش اور اپنی مرضی سے کوئی جا کر سفارش کرنے لگے تو کسی کو اس کی جرأت نہیں ہوسکتی۔ اب آیت الکرسی کا ترجمہ اور اس کی تشریح ملاحظہ فرمائیں:

آیت نمبر ۲۵۵

اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ ۚ لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ ؕ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ؕ مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَهٗۤ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ؕ

يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ ۚ وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖٓ اِلَّا بِمَا شَآءَ ۚ وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ ۚ وَلَا يَئُوْدُهٗ حِفْظُهُمَا ۚ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ ﴿۲۵۵﴾

اللہ وہ ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں، جو سدا زندہ ہے، جو پوری کائنات سنبھالے ہوئے ہے، جس کو نہ کبھی اونگھ آتی ہے، نہ نیند۔ آسمانوں میں جو کچھ ہے (وہ بھی) اور زمین میں جو کچھ ہے (وہ بھی) سب اسی کا ہے۔ کون ہے جو اس کے حضور اس کی اجازت کے بغیر کسی کی سفارش کرسکے؟ وہ سارے بندوں کے تمام آگے پیچھے کے حالات کو خوب جانتا ہے، اور وہ لوگ اس کے علم کی کوئی بات اپنے علم کے دائرے میں نہیں لاسکتے، سوائے اس بات کے جسے وہ خود چاہے، اس کی کرسی نے سارے آسمانوں اور زمین کو گھیرا ہوا ہے، اور ان دونوں کی نگہبانی سے اسے ذرا بھی بوجھ نہیں ہوتا۔ اور وہ بڑا عالی مقام، صاحب عظمت ہے۔ ﴿۲۵۵﴾

• اللہ تعالیٰ کی صفات "اَلْحَیُّ الْقَیُّوْم" کا مطلب

اس آیتِ کریمہ میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے سب سے پہلے فرمایا: ﴿اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ﴾ "اللہ وہ ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں۔" یہ توحید کا وہ کلمہ ہے جو ایمان کی بنیاد ہے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اپنی کچھ صفات ذکر فرمائی ہیں، پہلی صفت یہ ذکر فرمائی کہ ﴿اَلْحَیُّ﴾ "وہ زندہ ہے۔" اگرچہ زندہ انسانوں اور جانوروں کو بھی زندہ کہا جاتا ہے، لیکن اُن میں سے کوئی بھی خود سے زندہ نہیں ہوجاتا، اور نہ اُسے خود اپنی زندگی پر کوئی اختیار ہے کہ جب تک چاہے، زندہ رہے۔ وہ زندگی حاصل کرنے کے لیے بھی کسی کا محتاج ہے، اور زندہ رہنے کے لیے بھی محتاج ہے۔ پھر کائنات میں کوئی بھی زندہ وجود ایسا نہیں ہے جو ہمیشہ سے زندہ ہو، اور ہمیشہ زندہ رہے، جتنے انسانوں کو، جانوروں کو، جنات کو، ملائکہ کو، غرض جس جس کو بھی جو زندگی حاصل ہے، وہ زندگی ہمیشہ کے لیے نہیں ہے، ایک نہ ایک وقت ان کو موت آنی ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ زندگی ان کی ذاتی صفت نہیں ہے، نہ وہ اپنے اختیار سے زندہ ہوئے ہیں، نہ

اپنے اختیار سے زندہ باقی رہ سکتے ہیں، لہٰذا یہ زندگی حقیقی زندگی نہیں ہے، بلکہ کسی نے انہیں کچھ عرصے کے لیے مستعار دی ہے۔ لیکن اللہ تبارک وتعالیٰ کا زندہ ہونا اس کی ذات کی لازمی صفت ہے، اُسے زندگی حاصل کرنے کے لیے کسی اور کی حاجت نہیں۔ وہ ذات ہی ایسی ہے کہ ازل سے یعنی ہمیشہ سے زندہ ہے، اور اَبد تک یعنی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے زندہ رہے گی۔ اسی لیے ہم نے اس کا ترجمہ ''سدا زندہ'' سے کیا ہے۔ نیز وہی ذات ہے جو اپنی مخلوقات کو زندگی دیتی بھی ہے، اور جب چاہے واپس بھی لے لیتی ہے۔ لہٰذا ﴿اَلْحَیُّ﴾ یعنی ''زندہ'' صحیح معنیٰ میں اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذاتِ اعلیٰ صفات ہی ہے، اور اس کے سوا کوئی بھی حقیقت میں زندہ کہلانے کے لائق نہیں۔ اس لیے اُس کو زندہ ہونے یا زندہ رہنے کے لیے کسی مددگار کی ضرورت نہیں ہے جو خدائی میں اُس کا شریک ہو۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی دوسری صفت: ﴿اَلْقَیُّوْمُ﴾ ذکر فرمائی ہے۔ اَلْقَیُّوْمُ کا ترجمہ ہم نے کیا ہے: ''جو پوری کائنات کو سنبھالے ہوئے ہے۔'' اصل میں یہ لفظ ''قیام'' سے نکلا ہے اور اسی سے اسمِ فاعل ''قائم'' بنتا ہے جس کے معنیٰ ہیں: ''کھڑا ہونے والا''۔ ''قیّوم'' یا ''قیّام'' اسمِ فاعل سے مبالغے کا صیغہ ہے، اور اس کے معنیٰ ہیں وہ ذات جو خود بھی قائم رہے اور خود قائم رہ کر دوسروں کو بھی قائم رکھے یا دوسروں کو سنبھالے رکھے۔ یہ صفت صرف اللہ تعالیٰ ہی کی ہوسکتی ہے۔ اور کائنات میں کوئی اور مخلوق یا کوئی اور چیز ایسی نہیں ہوسکتی جو کائنات کی دوسری چیزوں کو سنبھال سکے، دیگر تمام چیزیں تو خود اپنے آپ کو سنبھالنے میں اللہ تعالیٰ کے حکم کی محتاج ہیں، لہٰذا اللہ تعالیٰ کی یہ صفت کہ اُس نے پوری کائنات کو سنبھالا ہوا ہے، اس کی عظیم قدرت پر دلالت کررہی ہے۔ یعنی اس کی قدرت اتنی بڑی ہے کہ وہ تنہا اس وسیع وعریض کائنات کو چلارہی ہے، اُسے کائنات کا یہ نظام چلانے کے لیے کسی کی مدد کی ضرورت نہیں ہے۔ لہٰذا عبادت کے لائق بھی تنہا وہی ذات ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں ہوسکتا۔

• کسی بھی انسان کو قیوم کہنا جائز نہیں

''اَلْقَیُّوْمُ'' چونکہ اللہ تعالیٰ ہی کی خاص صفت ہے، اس لیے کسی بھی انسان کو صرف ''قیّوم'' کہنا جائز نہیں ہے۔

جن لوگوں کا نام عبد القیوم ہوتا ہے، اس کے معنیٰ ہیں ''قیّوم'' کا بندہ۔ یہ نام صحیح ہے، لیکن ہمارے

معاشرے میں جو رواج چل پڑا ہے کہ عبد القیوم کے نام کو مختصر کرنے کے لیے صرف قیّوم کہتے ہیں، یہ جائز نہیں ہے۔ کیونکہ جب قیّوم کہہ کر آپ کسی انسان کو بلا رہے ہیں تو گویا اللہ تعالیٰ کی مخصوص صفت اس کی طرف منسوب کر رہے ہیں، اور اسی کا نام شرک ہے۔ اگرچہ ایسا چونکہ عموماً بے خیالی یا لاعلمی میں ہوتا ہے، اس لیے ہم اس پر کفر و شرک کا فتویٰ تو نہیں لگائیں گے، البتہ کوئی ایسا عمل کرنا جو شرک کا مظہر ہو، یہ کسی طرح بھی جائز نہیں۔ ہمارے ہاں عموماً لوگ عبد القیوم کو قیوم کہہ کر، عبد الرحمن کو رحمٰن کہہ کر، عبد الرزّاق کو رزّاق کہہ کر پکارتے اور بلاتے ہیں، یہ بہت ہی غلط طریقہ ہے اور اس میں غیر شعوری طور پر شرک کا بھی شائبہ ہے، لہٰذا اس سے پرہیز کرنا لازم ہے۔

• اللہ تعالیٰ اونگھ اور نیند سے پاک ذات ہے

پھر آگے فرمایا: ﴿لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ﴾ ''اللہ تبارک وتعالیٰ کو نہ کبھی اونگھ لگتی ہے اور نہ نیند۔'' نیند کا جو ابتدائی حصہ ہوتا ہے، جس کو اردو میں اونگھ سے تعبیر کرسکتے ہیں، اسی کو عربی میں ''سِنَةٌ'' کہا جاتا ہے۔ اور ''نَوْمٌ'' باقاعدہ پوری نیند کو کہا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ دونوں سے پاک ہے، اسے نہ تو اونگھ لگتی ہے اور نہ نیند۔

مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ زندہ تو ہے ہی، لیکن تم اللہ تعالیٰ کے زندہ ہونے کو اپنی طرح کی زندگی پر قیاس نہ کرو۔ تمہیں تو اپنی زندگی میں نیند طاری ہو جاتی ہے، بہت سا کام کرکے تھک جاتے ہو، اور آخر کار تمہیں سونا پڑتا ہے۔ اور اسی وجہ سے کسی کام کے لیے مختلف اوقات میں لوگوں کی ڈیوٹیاں تبدیل کرنی پڑتی ہیں کہ ایک شخص دن بھر کام کرکے رات کو سوتا ہے، اور دوسرا رات بھر کام کرکے دن میں سوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کائنات کا جو نظام سنبھالا ہوا ہے، اس میں نہ تھکن ہوتی ہے، نہ نیند آتی ہے، بلکہ اونگھ تک نہیں آتی، اس لیے اُسے کسی ساتھی، مددگار یا شریک کی ضرورت نہیں ہے جو۔ معاذ اللہ۔ اس کی نیند کے وقت اس کی جگہ کائنات کا کام سنبھالے، اس لیے اس کے سوا کوئی خدا یا خدا کا شریک نہیں ہوسکتا۔

پھر فرمایا: ﴿لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ﴾ یعنی زمین اور آسمان کے درمیان جتنی چیزیں ہیں، وہ ساری کی ساری اللہ تعالیٰ کی ملکیت ہیں، لہٰذا اُن سب پر اللہ تعالیٰ کو پورا قابو حاصل ہے۔ چنانچہ زمین و آسمان کی تمام چیزوں کو سنبھالنے میں کوئی دوسری طاقت رکاوٹ نہیں بن سکتی۔ اور زمین و آسمان کی تمام چیزوں پر اللہ تعالیٰ کی ملکیت اُس قسم کی ملکیت نہیں ہے جیسی انسانوں کو اپنی زمین یا جائیداد وغیرہ پر ہوتی

ہے، کیونکہ وہ آنی جانی ہے، اور کبھی نہ کبھی ختم ہوجاتی ہے۔ زندگی میں بھی انسانوں کی املاک ایک سے دوسرے کی طرف منتقل ہوتی رہتی ہیں، اور کوئی کتنا بڑا سرمایہ دار یا جاگیر دار ہو، مرنے کے بعد تو کوئی چیز اُس کی ملکیت میں رہتی ہی نہیں، بلکہ مرضُ الموت ہی میں شرعاً انسان کو اپنی املاک پر مکمل اختیار حاصل نہیں رہتا۔ اس کے علاوہ دنیا میں جس کسی کو کوئی ملکیت حاصل ہوتی ہے، وہ اللہ تعالیٰ ہی نے عارضی طور پر دی ہے۔

اس کے برعکس اللہ تعالیٰ کی ملکیت دائمی اور ابدی ہے جس میں اللہ تعالیٰ کا کوئی اور شریک نہیں ہے۔ وہ خودمختار ہے اور اس کے قبضۂ قدرت میں سب کچھ ہے۔ جب یہ بات ہے، تو اس کو اپنی خدائی چلانے کے لیے کسی شریک کی حاجت کیوں ہو؟ شریک کی حاجت تو اس کو ہوتی ہے جو بے وسیلہ ہو، اکیلے کوئی کام نہ کرسکتا ہو۔ جب کوئی کام کسی کے بس میں نہیں ہوتا، تو وہ اپنی حاجت پوری کرنے کے لیے کسی کی مدد چاہتا ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کو اس کی کوئی ضرورت نہیں۔

• حکمِ الٰہی کے بغیر سفارش کا اہل نہ ہونے کا مطلب اور اس کی تفصیل

پھر فرمایا: ﴿مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَهٗۤ اِلَّا بِاِذْنِهٖ﴾ ”کون ہے جو اس کی اجازت کے بغیر، اس کے حضور کسی کی سفارش کرسکے؟“

یہ اللہ تعالیٰ کے مکمل طور پر خودمختار ہونے کا بیان ہے۔ کافروں کا عقیدہ تھا کہ یہ بُت اور دیوتا اللہ تبارک وتعالیٰ کی بارگاہ میں ہماری سفارش کریں گے، اس کی تردید ہورہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں کوئی سفارش نہیں کرسکتا جب تک کہ اللہ ہی کی طرف سے اجازت نہ ہو۔ یہ جو تمہارے دل میں تصوّر ہے کہ یہ ہمارے دیوتا خود اپنی مرضی سے اللہ تعالیٰ کے یہاں سفارش کردیں گے اور اللہ تعالیٰ ان کی ناز برداری کرتے ہوئے ان کی سفارش قبول کرلیں گے، یہ خیال بالکل غلط ہے۔ اللہ تعالیٰ چونکہ مکمل طور پر خودمختار ہے، اس لیے اُس کے حکم کے بغیر اس کے حضور کوئی سفارش کوئی نہیں کرسکتا۔ ہاں البتہ! جس کو اللہ تعالیٰ سفارش کرنے کا خود ہی حکم دے دے یا اجازت دے دے، تو وہ کرسکتا ہے، جیسے پیغمبروں کو بعض مرتبہ اجازت دی جائے گی اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو شفاعت کا منصب عطا فرمایا جائے گا۔

اور اللہ تبارک وتعالیٰ کا اپنے بندوں میں کسی کسی کو سفارش کی اجازت دینا، درحقیقت یہ بھی اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے اپنے بندوں پر ایک اندازِ کرم ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ سفارش کی یہ اجازت اپنی رحمت

کے ایک عنوان کے طور پر عطا فرمائیں گے، ورنہ ایسا نہیں ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کو تو پتہ نہیں تھا کہ آیا یہ شخص قابلِ معافی ہے یا نہیں؟ یہ جنت کے لائق ہے یا نہیں ہے؟ لیکن پیغمبر کے کہنے سے یا ان کی سفارش سے اللہ تعالیٰ نے اس کو جنت میں داخل کردیا اور اس کی مغفرت کردی، بلکہ ہر شخص کے بارے میں اللہ تعالیٰ کے علمِ ازلی میں موجود ہے کہ کون شخص جنتی ہے اور کون جہنمی؟ کون شخص اللہ تبارک وتعالیٰ کے یہاں مقبول و مقرّب ہے، اور کون راندۂ درگاہ؟

یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے، لیکن یہ اللہ تعالیٰ کا ایک اندازِ کرم ہے کہ براہِ راست مغفرت اور رحمت کا معاملہ کرنے کے بجائے اس کو نبیِ کریم سرورِ دو عالم ﷺ کی یا کسی اور پیغمبر یا مقرّب بندے کی شفاعت پر موقوف کردیا گیا کہ وہ سفارش کریں گے تو ہم یہ کرم فرمادیں گے۔ اس میں سفارش کرنے والے کا بھی اعزاز و اکرام ہے، اور ساتھ ہی جس شخص کے ساتھ معاملہ ہورہا ہے اس کو نبیِ کریم سرورِ دو عالم ﷺ اور دوسرے پیغمبروں کے ساتھ محبت، الفت اور تعلقِ خاطر کے پیدا کرنے کا بھی ایک ذریعہ ہے۔

بہرحال! یہ شفاعت جاہلیت کے عقائد میں دیوتاؤں کی سفارش کی طرح نہیں ہے، جس میں ان لوگوں کا عقیدہ تھا کہ یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی مرضی کے خلاف بھی سفارش کردیں گے، اور وہ سفارش اللہ تعالیٰ کے یہاں مقبول بھی ہوگی۔ اس لیے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ''کون ہے جو اللہ کے حضور سفارش کرسکے مگر اس کی اجازت سے؟''

ایک اور آیت میں اللہ تعالیٰ نے اسی طرح واضح طور پر فرمادیا ہے کہ:

''اس دن کسی کی سفارش کام نہیں آئے گی، سوائے اس شخص کی سفارش کے جسے خدائے رحمن نے اجازت دی ہو اور اس کے بولنے پر وہ راضی ہو۔''(۱)

بتلانا یہ ہے کہ مشرکین جن بتوں یا خاص شخصیتوں سے شفاعت کروانے کی امید باندھے بیٹھے ہیں، ان کی شفاعت کسی کام نہیں آئے گی، ان کا تو بارگاہ الٰہی میں بولنے کا حوصلہ بھی نہیں ہوگا، بلکہ وہ خود ہی ان کے خلاف گواہی دیں گے جیسے پتھروں کے بُت جن کا ذکر دوسری جگہ قرآن کریم میں اس طرح فرمایا گیا ہے:

وَ يَوْمَ نَحْشُرُهُمْ جَمِيْعًا ثُمَّ نَقُوْلُ لِلَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا مَكَانَكُمْ اَنْتُمْ وَ شُرَكَآؤُكُمْ ۚ

---

(۱) ﴿يَوْمَئِذٍ لَّا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَ رَضِيَ لَهُ قَوْلًا﴾ [طٰہٰ: ۱۰۹]

فَزَيَّلْنَا بَيْنَهُمْ وَ قَالَ شُرَكَآؤُهُمْ مَّا كُنْتُمْ اِيَّانَا تَعْبُدُوْنَ ﴿۲۸﴾ فَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا بَيْنَنَا وَ بَيْنَكُمْ اِنْ كُنَّا عَنْ عِبَادَتِكُمْ لَغٰفِلِيْنَ ﴿۲۹﴾ (۱)

اور (یاد رکھو وہ دن جب ہم ان سب کو اکٹھا کریں گے، پھر جن لوگوں نے شرک کیا تھا، ان سے کہیں گے کہ: ذرا اپنی جگہ ٹھہرو، تم بھی اور وہ بھی جن کو تم نے اللہ کا شریک مانا تھا، پھر ان کے درمیان (عابد اور معبود کا) جو رشتہ تھا، ہم وہ ختم کردیں گے، اور اُن کے وہ شریک کہیں گے کہ: ''تم ہماری عبادت تو نہیں کرتے تھے۔ ہمارے اور تمہارے درمیان اللہ گواہ بننے کے لیے کافی ہے کہ ہم تمہاری عبادت سے بالکل بے خبر تھے۔''

ظاہر ہے کہ پتھر کے بنے ہوئے بتوں کو کیسے معلوم ہوتا کہ ان کی پوجا کی جارہی ہے۔ ان میں ایسا مکمل شعور نہیں کہ وہ ہر بات سمجھ سکیں کہ دوسرا ان کے ساتھ کیا کررہا ہے، اس لیے وہ کہیں گے کہ ہمیں تو پتہ ہی نہیں تھا کہ تم لوگ ہماری عبادت کرتے تھے۔ اب بتایئے کہ جب وہ بُت اپنے پُجاریوں سے دستبردار ہوگئے تو وہ ان کی سفارش کیسے کرسکتے ہیں؟

جہاں تک ان شخصیتوں کا تعلق ہے جنہیں مشرکین خدائی میں شریک مانتے تھے، ان میں سے اکثر تو ایسے ہیں جو واقعۃً اللہ تعالیٰ کے محبوب پیغمبر ہیں۔ مثلاً حضرت موسیٰ علیہ السلام جن سے یہودیوں کو یہ امید ہوگی کہ وہ ان کی سفارش کریں۔ عیسائیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے امیدیں لگائی ہوں گی، لیکن حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام ان کی سفارش کیسے کریں گے جبکہ وہ ان سے سخت ناراض ہوں گے کہ انہوں نے ان کے لائے ہوئے دین کو کچھ کا کچھ بنادیا تھا، اور نبیِ آخرالزماں صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تشریف آوری کی جو واضح خبر انہوں نے دی تھی، ان کے دین کی تحریف کرنے والوں نے اس کی ہزار تاویلیں کرکے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لانے سے صاف انکار کردیا تھا جس کی وجہ سے حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام ان سے ناراض ہیں، پھر وہی کیسے ان کی شفاعت کرسکتے ہیں!

کچھ عرب فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں کہا کرتے تھے، اور ان کو اپنا محافظ سمجھ کر ان کی عبادت کیا کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ علی الاعلان ان فرشتوں سے پوچھیں گے:

---

(۱) سورۃ یونس (۱۰): آیت (۲۸-۲۹)

وَ يَوْمَ يَحْشُرُهُمْ جَمِيْعًا ثُمَّ يَقُوْلُ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اَهٰٓؤُلَآءِ اِيَّاكُمْ كَانُوْا يَعْبُدُوْنَ ﴿۴۰﴾ قَالُوْا سُبْحٰنَكَ اَنْتَ وَلِيُّنَا مِنْ دُوْنِهِمْ ۚ بَلْ كَانُوْا يَعْبُدُوْنَ الْجِنَّ ۚ اَكْثَرُهُمْ بِهِمْ مُّؤْمِنُوْنَ ﴿۴۱﴾ (۱)

وہ دن نہ بھولو جب اللہ ان سب کو جمع کرے گا، پھر فرشتوں سے کہے گا کہ: کیا یہ لوگ واقعی تمہاری عبادت کرتے تھے؟ وہ کہیں گے کہ ''ہم تو آپ کی ذات کی پاکی بیان کرتے ہیں، ہمارا تعلق آپ سے ہے ان لوگوں سے نہیں۔ دراصل یہ تو جنّات کی عبادت کیا کرتے تھے۔ ان میں سے اکثر لوگ انہی کے معتقد تھے۔''

جب یہ جلیل القدر انبیاء بھی اور فرشتے بھی جنہیں سفارش کی اجازت مل سکتی تھی، سب اُن سے براءت کا اظہار کر کے ہاتھ اُٹھالیں گے، تو وہ اللہ تعالیٰ کے حضور ان کی سفارش کہاں کر سکتے ہیں۔

• باری تعالیٰ کا علم پوری کائنات کو محیط ہے

﴿يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَ مَا خَلْفَهُمْ﴾ ''اللہ تعالیٰ بندوں کے تمام آگے پیچھے کے حالات جانتا ہے۔'' یہ اللہ تعالیٰ کی صفتِ علم کا بیان ہے، اور اس کا حوالہ بظاہر اس سیاق (Context) میں دیا جارہا ہے کہ سفارش دنیا میں عموماً اس موقع پر ہوتی ہے جب کسی کو کسی کے حالات کا علم نہیں ہوتا۔ مثلاً ایک اعلیٰ درجے کا افسر ہے، اس کو کسی شخص کے حالات کا علم نہیں ہے، یعنی اسے پتہ نہیں ہے کہ یہ آدمی اچھا ہے یا برا ہے؟ ظالم ہے یا مظلوم ہے؟ اس کی مدد کرنی چاہیے یا نہیں؟ اب اُس شخص کا کوئی قریبی دوست اس افسر کا بھی دوست ہے، اور وہ افسر کے پاس آکر کہتا ہے کہ میں فلاں بندے کی سفارش کرتا ہوں، کیونکہ یہ میری نظر میں اچھا آدمی ہے، اور اس کا کام کر دینا چاہئے۔ اس افسر کو خود اس کا کچھ علم نہیں تھا، لیکن جب کسی نے کچھ آکر بتایا تو اسے علم حاصل ہوگیا اور اس نے اسے نواز دیا۔ لیکن اللہ ﷻ چونکہ ﴿يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَ مَا خَلْفَهُمْ﴾ ''انسانوں کے تمام آگے پیچھے کے حالات کو خوب جانتا ہے،'' اس لیے اس کو فیصلہ کرنے کے لیے کسی آدمی کی سفارش کی ضرورت ہی نہیں ہے جو اسے بتائے کہ فلاں آدمی مستحق ہے، فلاں غیر مستحق۔

''آگے پیچھے کے حالات جاننے'' کا یہ مفہوم بھی ہوسکتا ہے کہ ان کے پیدا ہونے سے پہلے اور پیدا ہونے کے بعد کے تمام حالات و واقعات حق تعالیٰ کے علم میں ہیں، اور یہ مفہوم بھی ہوسکتا ہے کہ آگے سے

---

(۱) سورۃ سبا (۳۴): آیت (۴۰-۴۱)

مراد وہ حالات ہیں جو انسان کے لیے ظاہر اور کھلے ہوئے ہیں، اور پیچھے سے مراد وہ واقعات و حالات ہیں، جو اس سے چھپے ہوئے ہوتے ہیں۔ آیت کے معنی یہ ہوں گے کہ انسان کا علم تو بعض چیزوں پر ہے، اور بعض پر نہیں ہے، کچھ چیزیں اس کے سامنے کھلی ہوئی ہیں کچھ چھپی ہوئی، مگر اللہ جل شانہ کے سامنے یہ سب چیزیں برابر ہیں، اس کا علم ان سب چیزوں کو یکساں محیط ہے۔ ان دونوں مفہوموں میں کوئی تعارض نہیں، آیت کی وسعت میں یہ دونوں داخل ہیں۔

• اللہ تعالیٰ کے علم کی حقیقت تک کوئی نہیں پہنچ سکتا

ایک طرف تو اللہ تعالیٰ کا علم ایسا ہے کہ اللہ تعالیٰ تمام انسانوں کے آگے پیچھے کے تمام حالات کو خوب جانتا ہے۔ اور دوسری طرف ﴿وَلَا يُحِيطُونَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهِ إِلَّا بِمَا شَاءَ﴾ ''اور لوگ اللہ تعالیٰ کے علم کی کوئی بات اپنے علم کے دائرے میں نہیں لاسکتے، سوائے اس بات کے جسے اللہ تعالیٰ خود چاہے،'' یعنی اللہ تعالیٰ تو تمام مخلوقات کی ہر ہر بات سے واقف ہے، لیکن کوئی مخلوق یا کوئی انسان یا جن اس بات کا دعویٰ نہیں کرسکتا کہ وہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے علم سے واقف ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے علم کا کوئی احاطہ نہیں کرسکتا، سوائے اس بات کے کہ جتنا علم اللہ تعالیٰ کسی کو دینا چاہتا ہے اتنا وہ عطا فرمادیتا ہے۔

اس سے ایک طرف تو یہ بات ثابت ہوئی کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی بھی مخلوق عبادت کے لائق نہیں ہے، اور دوسری طرف اس بات کی نفی ہوئی کہ بعض لوگ انسانوں کی طرف ایسے علم کی نسبت کردیتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی خاص صفت ہے۔ مثلاً ''علمِ غیب'' جو اللہ تعالیٰ کی خاص صفت ہے، اسے لوگ انسانوں کی طرف منسوب کردیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہ غیب کا علم کسی کو نہیں ہوسکتا، کوئی مخلوق اللہ تعالیٰ کے علم کا احاطہ نہیں کرسکتی۔ ﴿إِلَّا بِمَا شَاءَ﴾ ہاں اللہ تعالیٰ غیب کا جتنا علم کسی کو عطا فرمانا چاہتا ہے، عطا فرمادیتا ہے۔ مثلاً انبیائے کرام علیہم السلام کو جتنا دینا چاہتا ہے، دے دیتا ہے۔ اور ہمارے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو سب سے زیادہ عطا فرمایا گیا، کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پوری دنیا کے لیے اور قیامِ قیامت تک کے لیے رسول بنا کر بھیجے گئے تھے۔ اللہ تعالیٰ ایک جگہ فرماتے ہیں:

ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ (۱)

---

(۱) سورۃ آلِ عمران (۳): آیت (۴۴)

یہ سب غیب کی خبریں ہیں جو ہم آپ کو وحی کے ذریعہ بتا رہے ہیں۔

حضورِ کریم سرورِ دو عالم ﷺ کو ایسی بے شمار خبریں عطا فرمائی گئیں اور اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے جتنا علم چاہا وہ نبیِ کریم ﷺ کو عطا فرمایا، لیکن یہ بات واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ کے علم کے مقابل میں کسی بھی مخلوق کا علم کوئی نسبت نہیں رکھتا، اللہ تعالیٰ ہی جس کو چاہتا ہے، جتنا چاہتا ہے علم عطا فرماتا ہے۔اور تمام کائنات کے ذرہ ذرہ کا علمِ محیط صرف اللہ جل شانہ کی خصوصی صفت ہے، انسان یا کوئی مخلوق اس میں شریک نہیں ہوسکتی۔

• اللہ تعالیٰ کی کرسی کی حقیقت

پھر فرمایا: ﴿وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ﴾ ''اللہ تعالیٰ کی کرسی آسمانوں اور زمین کی وسعت رکھتی ہے،'' یعنی سارے آسمان اور ساری زمین کو اس نے گھیرا ہوا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی صفتِ قدرت کا بیان ہے۔ یہ کرسی کیا چیز ہے؟ اس کی حقیقت تو اللہ تبارک وتعالیٰ ہی بہتر جانتے ہیں، یہاں پر صرف اتنی بات ارشاد فرمائی گئی ہے کہ اس کرسی نے سارے آسمانوں اور زمین کو گھیرا ہوا ہے۔چونکہ اللہ تبارک وتعالیٰ اٹھنے، بیٹھنے جیسی ان تمام صفات سے بے نیاز ہے جو مخلوق کی صفات ہوتی ہیں، وہ نہ کسی جگہ کا محتاج ہے نہ بیٹھنے کے کسی آلہ کا محتاج ہے، لہٰذا اس کرسی کے وہ معنیٰ تو نہیں ہو سکتے جو ہم دنیا میں کرسی بول کر مراد لیتے ہیں، یعنی ایسی چیز جس کے اوپر آدمی بیٹھتا ہے۔

جب وہ کرسی مراد نہیں ہے تو پھر اس کی حقیقی کیفیت کیا ہے؟ اس کی کنہ کیا ہے؟ اس کا ادارک درحقیقت انسانی عقل سے بالاتر ہے۔ اس لیے ہم اس کے بارے میں کوئی تفصیل نہ جان سکتے ہیں، نہ بیان کرسکتے ہیں۔ البتہ مستند روایاتِ حدیث [1] سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ عرش اور کرسی دونوں بہت عظیم الشان جسم ہیں جو تمام آسمان اور زمین سے بدرجہا بڑے ہیں۔ اب ان کی کیفیت کیا ہے؟ اور ان کی شکل اور ہیئت کیا ہے؟ یہ جاننے کا ہمارے پاس کوئی راستہ نہیں ہے۔بعض حضرات نے یہاں کرسی سے باری تعالیٰ کا اقتدار بھی مراد لیا ہے [2] اور مطلب یہ ہے کہ اس کا اقتدار تمام آسمان اور زمین کو محیط اور اس کو اپنی وسعت میں لیے ہوئے

---

(۱) دیکھیے: تفسیر ابن کثیر (۱/۶۸۰) الناشر: دار طیبة للنشر والتوزیع

(۲) دیکھیے: تفسیر القرطبي (۳/۲۷۷) الناشر: دار الکتب المصریة - القاهرة

ہے، یہ معنیٰ بھی کچھ بعید نہیں ہیں، لیکن روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح عرشِ الٰہی ایک جسم ہے اسی طرح کرسی بھی ایک جسم ہے اور اس کی کیفیت اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتے ہیں۔

حقیقت یہ معلوم ہوتی ہے۔واللہ اعلم۔کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی حقیقی صفات انسان کے محدود ذہن کے تصوّر اور اِدراک سے بہت بلند ہیں، لیکن جب اللہ تبارک وتعالیٰ اپنی ان صفات کا ذکر فرماتے ہیں، تو ہماری سمجھ سے قریب کرنے کے لیے وہ ایسی چیزوں کا حوالہ دیتے ہیں جو کسی صاحبِ اقتدار بادشاہ کا لازمہ سمجھی جاتی ہیں۔ چنانچہ عرش یعنی تخت اور کرسی دونوں چیزیں وہ ہیں جو عموماً بادشاہوں کے لیے خصوصی طور پر بنائی جاتی ہیں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے لیے یہ چیزیں اس لیے نہیں بنائیں کہ اُسے ان کی ضرورت ہے، بلکہ اس لیے بنائی ہیں، تاکہ محدود عقل رکھنے والا انسان بھی ان کو سمجھ سکے کہ اللہ تعالیٰ کا تخت بھی ہے، اور کرسی بھی، لیکن وہ تخت اور کرسی دنیا کے تخت اور کرسی کی طرح نہیں ہے، بلکہ ان کی وسعت تمام آسمانوں اور زمین کو اپنے گھیرے میں لیے ہوئے ہے۔

اور فرمایا: ﴿وَلَا يَـُٔوْدُهٗ حِفْظُهُمَا﴾ ''اور ان دونوں کی نگہبانی سے اسے ذرا بھی بوجھ نہیں ہے۔'' ''لَا يَـُٔوْدُهٗ'' اَدَ، يَئُوْدُ، اَوْدًا کے معنیٰ ہوتے ہیں کسی کو بوجھل بنادینا، مطلب یہ ہے کہ آسمان اور زمین کی نگہبانی اللہ تعالیٰ کو ذرا برابر بھی بوجھل نہیں بناتی، یعنی اس کی حفاظت اور نگرانی سے اللہ تعالیٰ کو کوئی تھکاوٹ یا تعب نہیں ہوتا۔

آگے فرمایا: ﴿وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ ﴿۲۵۵﴾﴾ ''اور وہ بڑا عالی مقام، صاحبِ عظمت ہے۔'' آیت الکرسی کا آغاز اللہ تعالیٰ کی دو صفات سے ہوا تھا، یعنی ''الحيّ القيّوم'' (جو سدا زندہ ہے، جو پوری کائنات سنبھالے ہوئے ہے) اب آیت کا اختتام ان دو صفات پر ہوا ہے، ''الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ''۔ ''العليّ'' کے لغوی معنیٰ ہیں ''نہایت اونچا'' اور ''العظیم'' کے لفظی معنیٰ ہیں ''بہت بڑا''۔

مذکورہ بالا تمام صفات کو بیان کرنے کے بعد آخر میں یہ دو صفتیں لاکر اللہ تعالیٰ نے بظاہر اس طرف اشارہ فرمایا ہے کہ ہم نے اس آیت میں اپنی بعض صفات بیان تو کردی ہیں، لیکن حقیقت میں وہ تمہاری سمجھ سے اتنی اونچی اور اتنی عظمت والی ہیں کہ تمہیں ان کی ایک معمولی سی جھلک ہی دکھائی جاسکتی ہے، ان کی ٹھیک ٹھیک ماہیت کو تم پوری طرح سمجھنے سے قاصر ہو، کیونکہ ان صفات کے بلند مقام اور اس کی عظمت کا تم حقیقی اِدراک نہیں کرپاتے، اس لیے اُسے اپنے اوپر قیاس کرکے اس کے مددگار، سفارشی اور ساتھی تلاش کرتے ہو، اور اس

صاحبِ عظمت کو چھوڑ کر ان خود ساختہ دیوتاؤں کی عبادت شروع کر دیتے ہو۔

اس طرح کل دس جملوں میں انتہائی فصاحت وبلاغت اور نہایت پُر شوکت انداز میں اللہ تعالیٰ کی صفاتِ کمال کے حوالے سے اس کی توحید کا مضمون پوری وضاحت اور تفصیل کے ساتھ بیان فرمایا گیا ہے۔

آیت نمبر ۲۵۶ تا ۲۵۷

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ۙ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ۚ فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى ۗ لَا انْفِصَامَ لَهَا ۭ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝۲۵۶ اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۙ يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۭ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَوْلِيٰۗـــُٔهُمُ الطَّاغُوْتُ ۙ يُخْرِجُوْنَهُمْ مِّنَ النُّوْرِ اِلَى الظُّلُمٰتِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝۲۵۷ ع ۳۴/۴/۲

دین کے معاملے میں کوئی زبردستی نہیں ہے، ہدایت کا راستہ گمراہی سے ممتاز ہو کر واضح ہو چکا، اس کے بعد جو شخص طاغوت کا انکار کر کے اللہ پر ایمان لے آئے گا، اس نے ایک مضبوط کنڈا تھام لیا جس کے ٹوٹنے کا کوئی امکان نہیں، اور اللہ خوب سننے والا، سب کچھ جاننے والا ہے۔ (۲۵۶) اللہ ایمان والوں کا رکھوالا ہے، وہ انہیں اندھیریوں سے نکال کر روشنی میں لاتا ہے، اور جن لوگوں نے کفر اپنا لیا ہے، ان کے رکھوالے وہ شیطان ہیں جو انہیں روشنی سے نکال کر اندھیریوں میں لے جاتے ہیں، وہ سب آگ کے باسی ہیں، وہ ہمیشہ اسی میں رہیں گے۔ (۲۵۷)

دین کے معاملات میں کوئی زبردستی نہیں ہے

پیچھے یہ بات ذکر کی گئی تھی کہ اللہ تبارک وتعالیٰ اگر چاہتا تو سارے انسانوں کو ایک ہی دین پر زبردستی آمادہ کر لیتا، یعنی اللہ تبارک وتعالیٰ خود اپنی قدرت کا مظاہرہ کر کے سب کے دلوں کو ایمان ہی کی طرف پھیر دیتا، لیکن اللہ تبارک وتعالیٰ نے ایسا نہیں کیا، بلکہ انسانوں کو اس بات کا موقع فراہم کیا کہ وہ زبردستی نہیں

بلکہ دلائل کی روشنی میں اپنی عقل سے ایمان کو قبول کریں۔ اسی بات کو اللہ تبارک وتعالیٰ یہاں زیادہ واضح اصول کے طور پر بیان فرمارہے ہیں کہ یہ معاملہ صرف اللہ تعالیٰ ہی کے ساتھ نہیں ہے کہ وہ دین کے معاملے میں کسی پر زبردستی نہیں کرتا، بلکہ انسانوں کو بھی یہی تعلیم دیتا ہے کہ تمام مذاہب کے لوگوں کو حق بات کی طرف دلائل سے دعوت تو دیتے رہو، لیکن تمہیں کسی غیر مسلم پر زبردستی کرکے اُسے مسلمان بنانا جائز نہیں ہے، چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ﴾ ''دین کے معاملے میں کوئی زبردستی نہیں ہے۔''

کسی بھی انسان کو اسلام لانے پر مجبور نہیں کیا جاسکتا

یہ بات اللہ تعالیٰ نے کئی جگہ واضح فرمائی ہے کہ ہم نے ہدایت اور گمراہی کے نشانات اور اس کے دلائل تفصیل کے ساتھ کھول کھول کر لوگوں کے سامنے واضح کر دیے ہیں، اب یہ انسان کا اپنا کام ہے کہ وہ ان دلائل پر غور کرکے اور ان نشانیوں کو سمجھ کر اللہ تعالیٰ پر ایمان لائے، لیکن اگر وہ پھر بھی گمراہی کا راستہ ہی چاہتا ہے تو بہرحال گمراہی کا راستہ بھی اس کے لیے دنیا میں کھلا ہوا ہے۔ ایک جگہ ارشادِ ربانی ہے:

وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ ۫ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ (۱)

اور کہہ دو کہ حق تو تمہاری رب کی طرف سے آچکا ہے، اب جو شخص چاہے ایمان لائے اور جو شخص چاہے کفر اختیار کرے۔

غرض ربِ کریم کی طرف سے حق آچکا ہے، لہٰذا حق واضح ہونے کے بعد کسی کو اسلام لانے پر مجبور نہیں کیا جاسکتا۔ حضور نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے ہمیشہ اسی اصول پر عمل فرمایا کہ کسی کو زور زبردستی سے مسلمان نہ بنایا جائے، بلکہ اس کے برخلاف ایسے واقعات بھی ہوئے ہیں جن میں مسلم حکمران کو اطلاع ملی کہ کچھ لوگوں کو زبردستی مسلمان بنایا گیا ہے، تو حکومت نے ان کے مسلمان ہونے کو تسلیم نہیں کیا۔ ۶۸۰ھ میں ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ کسی حاکم نے کچھ لوگوں کو دھمکیاں دے کر زبردستی مسلمان بنا لیا تھا، چنانچہ اس وقت کے مفتی حضرات نے فتویٰ دیا کہ چونکہ انہیں زبردستی مسلمان بنایا گیا ہے، اس لیے ان کا ایمان معتبر نہیں اور انہیں اپنے پچھلے دین پر واپس جانے کا حق حاصل ہے۔ جب قاضی کے سامنے زبردستی کا ثبوت پیش ہوا تو قاضی نے فیصلہ دیا کہ انہیں اپنے سابق دین کی طرف واپس جانے اور اس پر عمل کرنے کا موقع دیا جائے،

---

(۱) سورۃ الکہف (۱۸): آیت (۲۹)

چنانچہ ان میں سے اکثر لوگ اپنے دین کی طرف واپس چلے گئے۔ (۱)

اسلام میں جو جہاد وقتال مشروع کیا گیا ہے تو اس کا مطلب بھی تلوار کے زور پر مسلمان بنانا نہیں ہے، بلکہ اس کا اصل مقصد یہ ہے کہ ظلم کے خلاف تلوار اٹھا کر دنیا میں اللہ تبارک وتعالیٰ کا نظامِ عدل قائم کیا جائے، چنانچہ یہی وجہ ہے کہ اگر کوئی غیر مسلم حکومت یا غیر مسلم ملک مُعاند (عناد رکھنے والا/دشمن) نہیں ہے، تو اس کے ساتھ صلح کا تعلق بھی باقی رکھا جاسکتا ہے، جیسا کہ قرآنِ کریم میں فرمایا گیا کہ:

وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا (۲)

اگر وہ صلح کی طرف مائل ہوں تو تم بھی صلح کی طرف مائل ہوجاؤ۔

لہٰذا وہ اگر کوئی معاندانہ رویہ اختیار نہیں کرتے تو ان کے ساتھ مصالحانہ تعلقات برقرار رکھے جا سکتے ہیں۔ اگر جہاد کا موقع آجائے تو اس میں بھی اسلام نے اخلاقیات کے بہترین احکام عطا فرمائے ہیں۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل کرتے ہیں کہ:

نَهٰى رَسُوْلُ اللهِ ﷺ عَنْ قَتْلِ النِّسَاءِ وَالصِّبْيَانِ (۳)

نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ میں خواتین اور بچوں کو قتل کرنے سے منع فرمایا۔

اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بوڑھوں اور جو لوگ اپنی عبادت گاہوں میں عبادت کے اندر مصروف ہوں انہیں بھی قتل کرنے سے منع فرمایا۔ (۴) اگر لوگوں کو اسلام لانے پر مجبور کرنا ہوتا تو انہیں بھی قتل کرنے کا حکم دیا جاتا، لیکن چونکہ اسلام کا مقصود یہ نہیں ہے اس لیے انہیں مارنے اور ان کے ساتھ جہاد کرنے سے منع کیا گیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ قتال یا لڑائی درحقیقت انہی لوگوں سے ہے جو جنگ کی اہلیت رکھتے ہوں، اور جو جنگ

---

(۱) البداية والنهاية (۲۹۶/۱۳) الناشر: دار الفكر، (اسلام اور سیاسی نظریات؛ صفحہ ۳۴۴)

(۲) سورة الأنفال (۸): آیت (۶۱)

(۳) صحيح البخاري (۶۱/٤) (۳۰۱۵) كتاب الجهاد والسير، باب قتل النساء في الحرب.

(۴) في صحيح مسلم (۱۳۷۵/۳) (۱۷۳۱): "لا تغلوا، ولا تغدروا، ولا تمثلوا، ولا تقتلوا وليدا.." باب تأمير الإمام الأمراء على البعوث، ووصيته إياهم بآداب الغزو وغيرها. وفي مسند أحمد (۲۱۸/۳) (۲۷۲۸): "ولا أصحاب الصَوامع..."

کی اہلیت نہیں رکھتے ان کے ساتھ لڑائی کا حکم نہیں ہے۔

پس معلوم ہوا کہ یہ جہاد و قتال لوگوں کو زبردستی مسلمان بنانے کے لیے نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کی زمین پر نظامِ عدل کے قیام اور ظلم کے خاتمہ کے لیے مشروع کیا گیا ہے۔ جہاں اسلامی حکومت کی مصلحت اور اس کے حالات کے لحاظ سے یہ مناسب ہو کہ غیر مُعاند، غیر مسلم طاقتوں سے صلح کا معاملہ کیا جائے تو یہ صلح کا معاملہ بھی کیا جاسکتا ہے، حالانکہ اگر اس تلوار اٹھانے سے لوگوں کو زبردستی مسلمان کرنا مقصود ہوتا تو پھر کسی صورت بھی اس صلح صفائی کی اجازت نہ ہونی چاہیے تھی، اس حوالے سے مزید تفصیل ان شاء اللہ کسی اور موقع پر عرض کی جائے گی۔

اسلام کا حق ہونا دلائل سے ثابت شدہ ہے

بہرحال! اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتے ہیں کہ ''دین میں کوئی زبردستی نہیں ہے۔'' آگے اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے فرمایا: ﴿قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ﴾ ''ہدایت کا راستہ گمراہی سے ممتاز ہو کر واضح ہو چکا۔'' ''تَّبَيَّنَ'' کے معنیٰ ہیں واضح ہوگیا اور ''الرُّشْدُ'' کے معنیٰ ہیں ہدایت، اور ''الْغَيِّ'' کہتے ہیں گمراہی کو۔ تو مطلب یہ ہوا کہ ہدایت کا راستہ گمراہی سے الگ اور ممتاز ہو کر واضح ہو چکا۔ اب لوگوں کے سامنے دونوں راستے کھلے ہوئے ہیں اور آدمی اپنی سمجھ سے جو راستہ بھی اختیار کرے گا، اسی کے مطابق اس کے ساتھ معاملہ ہوگا۔

جب اسلام کی خوبی یقیناً ثابت شدہ ہے تو ﴿فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ﴾ جو شخص طاغوت کا انکار کرے گا ﴿وَ يُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ﴾ اور اللہ پر ایمان لائے گا ﴿فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى﴾ تو اس نے ایک مضبوط کنڈا تھام لیا ﴿لَا انْفِصَامَ لَهَا﴾ ''جس کے ٹوٹنے کا کوئی امکان نہیں۔''

طاغوت کے لفظ کا مفہوم اور اس کے مصداقات

یہاں پر ﴿فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ﴾ میں ''طاغوت'' کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ یہ لفظ قرآنِ کریم میں متعدّد مقامات پر اور مختلف معنیٰ کے لیے آیا ہے۔ اصل میں طاغوت طغیان سے نکلا ہے، جس کے معنیٰ ہوتے ہیں کسی بھی معاملے میں حد سے آگے بڑھ جانا یا تجاوز کر جانا۔[1] کسی بھی عمل کی جو مناسب حد ہے جب آدمی اس سے آگے بڑھ جائے تو کہتے ہیں ''طَغٰی''۔ اسی لیے جب فرعون کی سرکشی بڑھی اور وہ حد سے

---

(۱) المفردات في غريب القرآن للأصبهاني (۱/۵۲۰)

تجاوز کرنے لگا تو اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا کہ:

اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى (۱)

فرعون کے پاس جاؤ، وہ سرکشی میں حد سے نکل گیا ہے۔

یہاں پر بھی ''طَغٰی'' کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ طاغوت اِسی سے مبالغے کا صیغہ ہے، یعنی وہ شخص یا وہ ذات جو حد سے بے انتہا گزری ہوئی ہو۔ اسی لیے اس کا ترجمہ بعض اوقات سرکش سے بھی کیا جاتا ہے، لہٰذا طاغوت کے معنی ہوئے حد سے بہت زیادہ گزرا ہوا۔ حد سے بہت زیادہ گزرا ہوا کون ہوسکتا ہے؟ اس کے مختلف مصداق ہیں:

۱۔ طاغوت کا ایک مصداق تو وہ بُت یا وہ خود ساختہ دیوتا ہیں جو بُت پرستوں نے بنا رکھے تھے اور انہیں اپنا کارساز اور مشکل کُشا بلکہ خدا تک قرار دے رکھا تھا، قرآنِ کریم میں انہیں بھی طاغوت سے تعبیر کیا گیا ہے، کیونکہ درحقیقت حد سے گزرے ہوئے لوگوں نے ان طاغوتوں کو اپنا خدا بنا کر پیش کیا۔ اس لحاظ سے طاغوت کے پہلے معنیٰ ہوئے: وہ بُت اور وہ جھوٹے دیوتا یا جھوٹے خدا جن کو لوگوں نے اپنی طرف سے خدا بنا رکھا ہے۔

۲۔ اسی طرح طاغوت کا اطلاق بعض اوقات شیطان پر بھی ہوتا ہے کیونکہ وہ بھی حد سے گزرا ہوا ہے، اس کا ذکر قرآنِ مجید میں بعض جگہ شیطان کے معنیٰ میں بھی آیا ہے۔ (۲)

۳۔ اور تیسرے معنیٰ طاغوت کے مطلق کفر کے بھی ہوتے ہیں، یعنی ہر وہ عقیدہ جو حد سے نکلا ہوا ہو جس میں کفر کے تمام پہلو شامل ہیں، وہ بھی بعض اوقات طاغوت کے معنیٰ میں استعمال ہوا ہے۔

یہاں پر جو فرمایا گیا ہے کہ جو شخص طاغوت کا انکار کرے گا، اور اللہ پر ایمان لائے گا تو اس نے ایک مضبوط کنڈا تھام لیا۔ اس میں تینوں معنیٰ بیک وقت موجود ہیں، ان بتوں کا انکار بھی شامل ہے جن کو خواہ مخواہ خدا بنا لیا گیا تھا، شیطان کا انکار بھی شامل ہے کہ آدمی شیطان کی گمراہی کی باتوں کو تسلیم نہ کرکے اس کا انکار کرے اور اسی طرح کفر کا انکار بھی مراد ہے۔

---

(۱) سورۃ طٰہٰ (۲۰): آیت (۲۴)

(۲) جیسا کہ اگلی آیت ﴿وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَوْلِيٰٓـُٔهُمُ الطَّاغُوْتُ﴾ میں طاغوت سے شیطان سے مراد ہے۔

ایمان کا کنڈا تھامے رکھنے کی تلقین

مذکورہ بالا تینوں معنی کے لحاظ سے یہاں پر ﴿فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ﴾ کا مطلب یہ ہوا کہ جو شخص خود ساختہ دیوتاؤں کا، شیطان کا، اور کفر کا انکار کرے ﴿وَ يُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ﴾ اور اللہ پر ایمان لے آئے ﴿فَقَدِ اسْتَمْسَكَ﴾ تو اس نے مضبوطی سے تھام لیا ﴿بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى﴾ ''ایک مضبوط کنڈا۔''

''عُرْوَة'' کے معنیٰ کنڈا، اور ''الْوُثْقٰی'' کے معنیٰ مضبوط۔ معنیٰ یہ ہوئے کہ جو شخص طاغوت کا انکار کر کے اللہ پر ایمان لے آئے گا، تو وہ ایسا ہو گیا جیسے کوئی شخص کوئی مضبوط کنڈا تھامے ہوئے ہو تو اس کے گرنے کا احتمال نہیں رہتا، اسی وقت گرے گا جب وہ اس کنڈے کو چھوڑ دے گا۔ اسی طرح جو شخص ایمان کا کنڈا تھام لے تو پھر اس کے گرنے کا بھی احتمال نہیں رہتا، اِلاّ یہ کہ وہ خود ہی اس کنڈے کو چھوڑ بیٹھے، کیونکہ وہ کنڈا ایسا ہے کہ ﴿لَا انْفِصَامَ لَهَا﴾ ''اس کے ٹوٹنے کا کوئی امکان نہیں۔''

''انْفِصَامَ'' کے معنیٰ ہوتے ہیں ٹوٹ جانا ﴿لَا انْفِصَامَ لَهَا﴾ کا مطلب ہوا کہ وہ اتنا مضبوط کنڈا ہے کہ خود سے ٹوٹ نہیں سکتا۔ جب خود سے ٹوٹ نہیں سکتا تو جب تک انسان نے اسے تھاما ہوا ہے اس وقت تک انسان گر بھی نہیں سکتا، کیونکہ ٹوٹ کر گرنے کا کوئی احتمال نہیں، گرنے کا ایک ہی راستہ ہے کہ آدمی اس کنڈے کو چھوڑ دے، جونہی چھوڑے گا تو گر جائے گا۔

اس سے بتلانا یہ مقصود ہے کہ جس طرح کوئی شخص کسی مضبوط رسی یا زنجیر کا حلقہ یا کوئی کنڈا ہاتھ میں مضبوطی سے تھام لے تو وہ گرنے سے محفوظ و مامون رہتا ہے، اسی طرح اسلام و ایمان کو مضبوطی سے تھامنے والا بھی آخرت کے نقصان و خسران سے محفوظ رہے گا۔ نیز یہ بھی بتلانا مقصود ہے کہ جب ایمان لائے ہو تو ایمان لا کر اس کے اوپر مضبوطی سے قائم رہنا اور مضبوطی سے اسے پکڑے رکھنا ضروری ہے، ایمان تو ٹوٹنے والی چیز نہیں ہے، لیکن تمہارے ہاتھ سے اگر ایمان کا کنڈا چھوٹ گیا تو اس صورت میں تمہارا انجام خراب ہو جائے گا ﴿وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝۲۵۶﴾ ''اور اللہ سب کچھ سننے والا اور سب کچھ جاننے والا ہے۔'' اللہ تعالیٰ خوب سننے والا ہے ہمارے تمام ظاہری اقوال کو، اور خوب جاننے والا ہے ہمارے تمام باطنی احوال کو، لہٰذا اگر کوئی صرف زبان سے ایمان لائے اور دل میں کفر رکھے تو یہ اللہ تعالیٰ سے چھپ نہیں سکتا۔

اللہ تعالیٰ ایمان والوں کا ولی ہے

پھر آگے ارشاد فرمایا: ﴿اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ ''اللہ ایمان والوں کا ولی ہے۔'' ''ولی'' کا لفظ بھی بڑا ہمہ گیر لفظ ہے، اور اس کے بھی متعدّد معنیٰ ہوسکتے ہیں۔ ولی کا یہ لفظ سرپرست کے معنیٰ میں بھی آتا ہے، رکھوالے کے معنیٰ میں بھی آتا ہے اور دوست کے معنیٰ میں بھی آتا ہے۔ یہاں پر مراد یہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ ایمان والوں کا رکھوالا ہے۔ رکھوالا ہونے کے معنیٰ یہ ہیں کہ جب تک وہ سیدھے راستے پر رہیں اللہ تبارک وتعالیٰ ان کی حفاظت کرتا ہے۔ اس میں پیچھے کہی گئی بات کی طرف بھی اشارہ ہے کہ اصل بات یہی ہے کہ دین میں کوئی زور زبردستی نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کسی شخص کو زبردستی ایمان لانے پر مجبور نہیں فرماتا اور نہ اپنی قدرتِ کاملہ سے لوگوں کا دل پھیر کر انہیں مومن بناتا ہے، لیکن جب کوئی بندہ اپنے اختیار، اپنی سمجھ اور اپنی عقل سے کام لے کر ایمان لے آتا ہے، تو اب اللہ تبارک وتعالیٰ اس کا رکھوالا بن جاتا ہے۔

جب اللہ تعالیٰ کسی کا رکھوالا بن جاتا ہے تو اس کے بعد ﴿يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ﴾ ''وہ ایسے ایمان والوں کو اندھیریوں سے روشنی کی طرف نکال کر لاتا ہے،'' یعنی جب کوئی شخص ایمان لے آیا تو اب اللہ تبارک وتعالیٰ اس کی نگہبانی فرماتے ہیں اور اسے کفر کی، گمراہی کی اور بدعملی کی اندھیریوں سے نکال کر نور کی طرف لے آتے ہیں۔ یہ آدمی کے لیے ایمان لانے کا صلہ ہوتا ہے۔ ہاں البتہ اگر کوئی شخص خدانخواستہ ایمان لانے کے باوجود اللہ تعالیٰ سے مدد نہ مانگے اور اللہ تعالیٰ کی اس حفاظت کو قبول نہ کرے یا نافرمانی پر کمر بستہ رہے، تو ظاہر ہے کہ اس پر یہ بات صادق نہیں آتی، لیکن جو شخص صدقِ دل سے ایمان لاتا ہے اور ایمان کے تقاضوں پر چلنے کی کوشش بھی کرتا ہے، اگر کہیں گر پڑتا ہے تو پھر اٹھ جاتا ہے اور پھر چلنا شروع کردیتا ہے، تو اللہ تعالیٰ اس کا رکھوالا بن جاتا ہے اور پھر اسے منزل تک پہنچادیتا ہے۔

یہ تو اہلِ ایمان کی بات تھی، دوسری طرف اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ﴿وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَوْلِيٰٓـُٔهُمُ الطَّاغُوْتُ﴾ اور جن لوگوں نے کفر اپنا لیا ہے، ان کے رکھوالے وہ شیطان ہیں جو ﴿يُخْرِجُوْنَهُمْ مِّنَ النُّوْرِ اِلَى الظُّلُمٰتِ﴾ ''انہیں روشنی سے نکال کر اندھیریوں میں لے جاتے ہیں۔'' یہاں پر طاغوت شیطان کے معنیٰ میں آیا ہے، یعنی ایمان کو چھوڑ کر کفر کو اپنانے والے لوگوں کے اولیاء اور ان کے رکھوالے وہ شیطان ہیں جو انہیں ان اندھیریوں کی طرف لے جاتے ہیں۔ ﴿اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ﴾ ''یہ سب آگ کے باسی ہیں،'' یعنی جہنم کی آگ میں انہیں رہنا ہے، ﴿هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۵۷﴾﴾ ''یہ لوگ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔''

آیت نمبر ۲۵۸

وقف لازم

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِیْ حَآجَّ اِبْرٰهٖمَ فِیْ رَبِّهٖۤ اَنْ اٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ ۘ اِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّیَ الَّذِیْ یُحْیٖ وَیُمِیْتُ ۙ قَالَ اَنَا اُحْیٖ وَاُمِیْتُ ؕ قَالَ اِبْرٰهٖمُ فَاِنَّ اللّٰهَ یَاْتِیْ بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَاْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ فَبُهِتَ الَّذِیْ كَفَرَ ؕ وَاللّٰهُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ ۚ﴿۲۵۸﴾

کیا تم نے اس شخص (کے حال) پر غور کیا جس کو اللہ نے سلطنت کیا دے دی تھی کہ وہ اپنے پروردگار (کے وجود ہی) کے بارے میں ابراہیم سے بحث کرنے لگا؟ جب ابراہیم نے کہا کہ میرا پروردگار وہ ہے جو زندگی بھی دیتا ہے اور موت بھی، تو وہ کہنے لگا کہ میں بھی زندگی دیتا ہوں اور موت دیتا ہوں۔ ابراہیم نے کہا: ''اچھا اللہ تو سورج کو مشرق سے نکالتا ہے، تم ذرا اسے مغرب سے تو نکال کر لاؤ'' اس پر وہ کافر مبہوت ہو کر رہ گیا۔ اور اللہ ایسے ظالموں کو ہدایت نہیں دیا کرتا۔ ﴿۲۵۸﴾

ایمان والوں کی رکھوالی اور مدد کے تین واقعات

یہاں سے اللہ تبارک و تعالیٰ کچھ ایسے واقعات ذکر فرما رہے ہیں جن کا تعلق ایک طرف تو اس مضمون سے ہے جو پیچھے گزرا تھا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کو مُردوں کو زندہ کرنے کی پوری قدرت ہے اور اس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے، اور دوسری طرف اس کا تعلق اس بات سے بھی ہے جو ابھی فرمائی گئی کہ اللہ تبارک وتعالیٰ ایمان والوں کی یہ مدد کرتا ہے کہ انہیں اندھیریوں سے نکال کر روشنی کی طرف لاتا ہے، اور جو لوگ اندھیریوں ہی کو پسند کرتے ہیں انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیتا ہے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس کی کچھ مثالیں بھی آگے آنے والے واقعات میں بیان فرمائی ہیں، جو لوگ ایمان والے تھے انہیں اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے فضل وکرم سے اطمینان ویقین کا نور عطا فرمایا اور جو لوگ اللہ تبارک وتعالیٰ کی ہدایت سے منہ موڑے ہوئے تھے انہیں ان کی اندھیریوں میں ہی بھٹکتے رہنے دیا، اس طرح کے تین واقعات اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہاں پر ذکر فرمائے ہیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا نمرود کے ساتھ مباحثہ

ایمان والوں کی مدد کے تین واقعات میں سے پہلا واقعہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے نمرود کے ساتھ ایک مباحثے کا ہے۔ نمرود عراق کا بادشاہ تھا، اور عراق اس زمانے میں دنیا کی بڑی طاقتوں میں شمار ہوتا تھا، اسی وجہ سے نمرود کو بھی بہت بڑا بادشاہ سمجھا جاتا تھا۔ اس وقت کے یہ طاقتور بادشاہ اپنے آپ کو نہ صرف یہ کہ دنیاوی امور میں بادشاہ سمجھتے تھے، بلکہ وہ خود کو کسی نہ کسی دیوتا کا مظہر بھی قرار دیتے تھے، اور کہتے تھے کہ ہم فلاں دیوتا کا مظہر ہیں، یعنی فلاں خدا کا پرتَو یا اس کی علامت ہیں اور ہم خود بھی قابلِ عبادت ہیں، لہٰذا ہماری عبادت و پرستش اور پوجا کی جانی چاہیے۔ نمرود بھی اسی قسم کا ایک بادشاہ تھا اور وہ بادشاہ ہونے کے ساتھ ساتھ اسی معنیٰ میں خدائی کا بھی دعویدار تھا جس کی تفصیل ابھی ذکر کی گئی۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے جب پیغمبر بنا کر بھیجا تو انہوں نے نمرود کو جا کر دعوت دی کہ تم اپنی خدائی کا دعویٰ کر رہے ہو، حالانکہ تم تو ایک انسان ہو، لہٰذا تمہیں اللہ تبارک وتعالیٰ پر ایمان لانا چاہیے، وہی تمہارا اور ہمارا پروردگار ہے۔ نمرود ایمان کی اس دعوت پر بڑا غضبناک ہوا اور کہنے لگا کہ کون ہے تمہارا رب؟ اس پر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ فرمایا کہ ”میرا رب وہ ہے جو زندہ بھی کرتا ہے اور موت بھی دیتا ہے۔“ نمرود کہنے لگا کہ ”موت اور زندگی تو میں بھی دیتا ہوں،“ یعنی جس کو چاہتا ہوں اپنا حکم دے کر اس کا سر قلم کروا دیتا ہوں اور جس کے بارے میں سزائے موت کا فیصلہ ہو چکا ہو، اگر میں چاہوں تو اسے زندگی بخش دیتا ہوں۔ چنانچہ نمرود نے دو قیدی منگوا کر ایک کو مار ڈالا اور دوسرے کو چھوڑ دیا اور کہا کہ دیکھا! میں جس کو مارنا چاہتا ہوں مار دیتا ہوں اور جس کو نہ چاہوں نہیں مارتا۔

ظاہر ہے کہ اس کا جواب قطعی طور پر غیر متعلق تھا، اس لیے کہ گفتگو زندگی اور موت کے اسباب سے نہیں، ان کی تخلیق سے متعلق ہو رہی تھی؛ لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب دیکھا کہ وہ یا تو موت اور حیات کی تخلیق کا مطلب ہی نہیں سمجھتا، یا کٹ حجتی پر اتر آیا ہے، تو انہوں نے ایک ایسی بات فرمائی جس کا اس کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ اس کے اس احمقانہ استدلال پر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ایک دوسرے انداز سے دلیل دیتے ہوئے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ تو سورج کو مشرق سے نکالتا ہے، تم اگر اپنی خدائی کے دعویدار ہو تو تم سورج کو ذرا مغرب سے نکال کر دکھاؤ، اس کے پاس اس بات کا کوئی جواب نہ بن پڑا اور وہ مبہوت اور ہکا بکا ہو کے رہ گیا اور لاجواب ہو گیا۔ لاجواب ہو کر حق کو قبول کرنے کے بجائے اس نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو قید کیا، پھر

آگ میں ڈالنے کا حکم دیا، جس کا ذکر قرآنِ کریم نے سورۂ انبیاء (آیت ۶۸ تا ۷۱) سورۂ عنکبوت (آیت ۲۴) اور سورۂ صافات (آیت ۹۷) میں فرمایا ہے۔

عہدہ ومنصب ملنے پر اترانا کم ظرفی کی بات ہے

اللہ تعالیٰ اسی واقعے کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ﴿اَلَمْ تَرَ﴾ ''کیا تم نے نہیں دیکھا؟'' دیکھنے سے بعض اوقات غور کرنا مراد ہوتا ہے کہ کیا تم نے غور نہیں کیا؟ ﴿اِلَى الَّذِیْ﴾ اس شخص کے حال پر ﴿حَآجَّ اِبْرٰهٖمَ﴾ جس نے ابراہیم سے بحث کی تھی ﴿فِیْ رَبِّهٖۤ﴾ ''اپنے پروردگار کے معاملہ میں،'' یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام کہہ رہے تھے کہ میرا پروردگار کوئی اور ہے اور وہ کہہ رہا تھا کہ میں ہی ہوں۔ وہ مباحثہ اس لیے کررہا تھا کہ ﴿اَنْ اٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ﴾ ''اسے اللہ نے سلطنت دے رکھی تھی۔'' بحث کرنے کی وجہ یہ نہیں تھی کہ وہ واقعۃً کوئی ما فوق الفطرت وجود تھا، بلکہ وجہ یہ تھی کہ اللہ نے اسے سلطنت عطا کردی تھی، اب سلطنت کیا عطا کردی تھی کہ اس کا دماغ آسمان پر چڑھ گیا اور غرور وتکبر کے نتیجے میں اس نے خدائی کا دعویٰ کردیا۔

یہاں پر ﴿اَنْ اٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ﴾ کے ذریعے اللہ تعالیٰ اس طرف اشارہ فرمارہے ہیں کہ اگر اللہ تبارک وتعالیٰ کسی کو کوئی اعزاز یا کوئی بڑا منصب عطا فرمائے، تو اس منصب پر اتراتے ہوئے نافرمانی کرنا، شرافت کے بالکل خلاف بات ہے، انسان کو چاہیے کہ جب اسے کوئی بلند منصب ملے تو جتنا بلند منصب ہو، اتنا ہی وہ اللہ تعالیٰ کے حضور جھک جائے اور لوگوں کے ساتھ بھی انکساری اور تواضع کا معاملہ اختیار کرے۔ ایسا نہ ہو کہ کوئی شخص کوئی عہدہ، منصب یا سلطنت ملنے پر پھول جائے اور اِترا کر دوسروں کے ساتھ غرور اور گھمنڈ کا برتاؤ کرنے لگے، یہ بڑی کم ظرفی کی بات ہے۔ نمرود کا یہ بحث ومباحثہ کرنا درحقیقت اپنی سلطنت کے گھمنڈ میں تھا۔ اسی لیے یہاں پر یہ بات خاص طور پر ذکر کی گئی کہ نمرود کو سلطنت و بادشاہت اللہ تعالیٰ نے ہی عطا کی اور پھر وہ اپنے پروردگار کے وجود ہی کے بارے میں ابراہیم سے بحث کرنے لگا۔

نمرود کی کج فہمی اور ابراہیم علیہ السلام کی مضبوط دلیل

پھر آگے واقعہ بیان کرتے ہوئے فرمایا: ﴿اِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ﴾ جب ابراہیم نے کہا ﴿رَبِّیَ الَّذِیْ یُحْیٖ وَیُمِیْتُ﴾ میرا پروردگار تو وہ ہے جو زندگی بھی دیتا ہے اور موت بھی دیتا ہے، تو ﴿قَالَ﴾ نمرود نے کہا ﴿اَنَا اُحْیٖ وَاُمِیْتُ﴾ ''میں بھی زندگی دیتا ہوں اور موت دیتا ہوں۔'' نمرود کی طرف سے یہ بڑا احمقانہ جواب تھا

اور اس کی وجہ اوپر عرض کردی گئی ہے۔ قتل کردینے کے لیے اللہ تعالیٰ نے ہر ایک کو ہاتھ بھی دیے ہیں اور قوت بھی دی ہے، وہ اگر اپنے ہاتھ کو اور اپنی قوت کو غلط استعمال کرنا چاہے تو دوسرے کو قتل کردیتا ہے، یہ صرف نمرود کی خصوصیت نہیں تھی، یہ کام تو ہر بندہ کرسکتا ہے۔

اور جہاں تک زندہ کرنے کا تعلق ہے تو کسی کی سزا کو ختم کردینا، زندہ کرنا تھوڑا ہی کہلاتا ہے؟ زندہ تو وہ شخص پہلے سے ہی تھا، نمرود نے صرف موت کی سزا ختم کی، موت آنے کا جو ایک اندیشہ تھا، محض وہ دور کردیا۔ غرض نمرود کا یہ جواب انتہائی احمقانہ سوچ کا آئینہ دار تھا۔ پیغمبروں کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ وہ بحث و مباحثہ میں الجھنے سے حتی الامکان گریز کرتے ہیں، خاص طور سے وہ لوگ جن کا مقصد ہی بحث برائے بحث ہو، وہ ان سے براہِ راست بحث میں الجھنے کے بجائے کوئی سیدھا راستہ اختیار فرما لیتے ہیں۔

جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے محسوس کیا کہ اس نے اپنی احمقانہ سوچ سے کٹ حجتی شروع کردی ہے تو اس جواب کی تردید کی فکر میں پڑنے کے بجائے ابراہیم علیہ السلام نے دوسرا استدلال پیش فرمایا، چنانچہ ﴿قَالَ اِبْرٰهٖمُ﴾ ابراہیم نے کہا: ﴿فَاِنَّ اللّٰهَ يَاْتِيْ بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ﴾ اچھا اللہ تو سورج کو مشرق سے نکالتا ہے ﴿فَاْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ﴾ تم ذرا اسے مغرب سے تو نکال لاؤ ﴿فَبُهِتَ الَّذِيْ كَفَرَ﴾ ''اس پر وہ کافر مبہوت ہوکر رہ گیا،'' اور اس سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔ ایک طرف خدائی کا دعویٰ اور دوسری طرف جب یہ کہا جارہا ہے کہ ''سورج کو تم مغرب سے نکال لاؤ'' تو اس کے اوپر کوئی قدرت نہیں، جب قدرت نہیں تو اس کے نتیجے میں سوائے مبہوت (حیران و پریشان) ہونے کے اور کر بھی کیا سکتا تھا، اس کی ساری دلیلیں اور ساری ڈینگیں خاک میں مل گئیں۔ ﴿وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۝۲۵۸﴾ ''اور اللہ ایسے ظالموں کو ہدایت نہیں دیا کرتا۔''

آیت نمبر ۲۵۹ تا ۲۶۰

اَوْ كَالَّذِيْ مَرَّ عَلٰى قَرْيَةٍ وَّهِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا ۚ قَالَ اَنّٰى يُحْيٖ هٰذِهِ اللّٰهُ بَعْدَ مَوْتِهَا ۚ فَاَمَاتَهُ اللّٰهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهٗ ۭ قَالَ كَمْ لَبِثْتَ ۭ قَالَ لَبِثْتُ يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ ۭ قَالَ بَلْ لَّبِثْتَ مِائَةَ عَامٍ فَانْظُرْ اِلٰى طَعَامِكَ وَشَرَابِكَ لَمْ يَتَسَنَّهْ ۚ وَانْظُرْ اِلٰى حِمَارِكَ وَلِنَجْعَلَكَ اٰيَةً

لِّلنَّاسِ وَانْظُرْ اِلَى الْعِظَامِ كَيْفَ نُنْشِزُهَا ثُمَّ نَكْسُوْهَا لَحْمًا ؕ فَلَمَّا تَبَيَّنَ
لَهٗ ۙ قَالَ اَعْلَمُ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۲۵۹﴾ وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ
اَرِنِيْ كَيْفَ تُحْيِ الْمَوْتٰى ؕ قَالَ اَوَلَمْ تُؤْمِنْ ؕ قَالَ بَلٰى وَلٰكِنْ لِّيَطْمَئِنَّ
قَلْبِيْ ؕ قَالَ فَخُذْ اَرْبَعَةً مِّنَ الطَّيْرِ فَصُرْهُنَّ اِلَيْكَ ثُمَّ اجْعَلْ عَلٰى كُلِّ
جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا ثُمَّ ادْعُهُنَّ يَاْتِيْنَكَ سَعْيًا ؕ وَاعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ
حَكِيْمٌ ﴿۲۶۰﴾ ع

ع ۳۵ ۳

یا (تم نے) اس جیسے شخص (کے واقعے) پر (غور کیا) جس کا ایک بستی پر ایسے وقت گزر ہوا جب وہ چھتوں کے بل گری پڑی تھی؟ اس نے کہا کہ ''اللہ اس بستی کو اس کے مرنے کے بعد کیسے زندہ کرے گا؟'' پھر اللہ نے اس شخص کو سو سال تک کے لیے موت دی، اور اس کے بعد زندہ کر دیا۔ (اور پھر) پوچھا کہ تم کتنے عرصے تک (اس حالت میں) رہے ہو؟ اس نے کہا: ''ایک دن یا ایک دن کا کچھ حصہ''۔ اللہ نے کہا: ''نہیں بلکہ تم سو سال اسی طرح رہے ہو۔ اب اپنے کھانے پینے کی چیزوں کو دیکھو کہ وہ ذرا نہیں سڑیں۔ اور (دوسری طرف) اپنے گدھے کو دیکھو (کہ گل سڑ کر اس کا کیا حال ہو گیا ہے) اور یہ ہم نے اس لیے کیا تاکہ ہم تمہیں لوگوں کے لیے (اپنی قدرت کا) ایک نشان بنا دیں، اور (اب اپنے گدھے کی) ہڈیوں کو دیکھو کہ ہم کس طرح انہیں اٹھاتے ہیں، پھر انہیں گوشت کا لباس پہناتے ہیں، چنانچہ جب حقیقت کھل کر اس کے سامنے آ گئی تو وہ بول اٹھا کہ: ''مجھے یقین ہے اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔'' ﴿۲۵۹﴾

اور (اس وقت کا تذکرہ سنو) جب ابراہیم نے کہا تھا کہ میرے پروردگار مجھے دکھایئے کہ آپ مردوں کو کیسے زندہ کرتے ہیں؟ اللہ نے کہا: ''کیا تمہیں یقین نہیں؟'' کہنے لگے: ''یقین کیوں نہ ہوتا؟'' مگر (یہ خواہش اس لیے کی ہے) تاکہ میرے دل کو پورا اطمینان حاصل ہو جائے۔ اللہ نے کہا: ''اچھا تو چار پرندے لو اور انہیں اپنے سے مانوس کر لو، پھر (ان کو ذبح کر کے) ان کا ایک ایک حصہ ہر پہاڑ پر رکھ دو، پھر انہیں

بلاؤ، وہ چاروں تمہارے پاس دوڑے چلے آئیں گے۔'' اور جان رکھو کہ اللہ پوری طرح صاحب اقتدار بھی ہے، اعلیٰ درجے کی حکمت والا بھی۔ (۲۶۰)

دنیا میں مُردوں کو زندہ کرنے کا مشاہدہ

ایمان والوں کی مدد اور رکھوالی کے تین واقعات میں سے باقی دو واقعات، ان آیات میں ذکر کیے گئے ہیں، اور ان میں بتایا گیا ہے کہ کس طرح اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے خاص بندوں کو اس دنیا میں ہی مُردوں کو زندہ کرنے کا مشاہدہ کرایا۔ پہلے واقعہ میں ایک ایسی بستی کا ذکر ہے جو مکمل طور پر تباہ ہوچکی تھی، اس کے تمام باشندے مرکھپ چکے تھے اور مکانات چھتوں سمیت گر کر مٹی میں مل گئے تھے۔ ایک صاحب کا وہاں سے گزر ہوا، تو انہوں نے دل میں سوچا کہ اللہ تعالیٰ اس ساری بستی کو کس طرح دوبارہ زندہ کرے گا؟ اس سوچ کا منشأ خدانخواستہ کوئی شک کرنا نہیں تھا، بلکہ حیرت کا اظہار مقصود تھا۔

اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنی قدرت کا مشاہدہ اس طرح کرایا کہ خود انہی کے اوپر موت طاری کردی اور وہ سو سال تک موت کی حالت میں رہے۔ پھر اللہ تبارک وتعالیٰ نے انہیں دوبارہ زندہ کیا اور اپنی عجیب قدرت کا یہ نظارہ بھی انہیں دکھایا کہ ان کا کھانا تو بغیر گلے سڑے، جوں کا توں موجود تھا، لیکن ان کا گدھا گل سڑ چکا تھا اور اس کی ہڈی پسلی بھی ختم ہونے لگی تھی۔ انہی ہڈیوں اور پسلیوں کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس طرح جوڑ کر ان کے سامنے زندہ کرکے دکھا دیا کہ وہ پھر ایک زندہ گدھے کی صورت میں کھڑا ہوگیا۔ یہ واقعہ یہاں پر اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنی قدرت کے مظاہرے کے طور پر ذکر فرمایا ہے۔

چنانچہ فرمایا: ﴿اَوْ كَالَّذِیْ﴾ ''یا تم نے اس جیسے شخص کے واقعہ پر غور کیا؟'' اس جملے کا تعلق پیچھے والی بات سے ہے۔ اس سے پچھلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا کہ ''اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِیْ حَآجَّ اِبْرٰهٖمَ فِیْ رَبِّهٖۤ اَنْ اٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ'' ''کیا تم نے اس شخص (کے حال) پر غور کیا جس کو اللہ نے سلطنت کیا دے دی تھی کہ وہ اپنے پروردگار (کے وجود ہی) کے بارے میں ابراہیم سے بحث کرنے لگا؟''

اب یہاں پر یہ اسی کے اوپر عطف ہو رہا ہے کہ ﴿اَوْ كَالَّذِیْ﴾ یا کیا تم نے اس جیسے شخص کے حال پر غور کیا کہ جو ﴿مَرَّ عَلٰى قَرْیَةٍ﴾ ایک بستی کے پاس سے گزرا تھا ﴿وَّهِیَ خَاوِیَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا﴾ ''جب

کہ وہ چھتوں کے بل گری پڑی تھی،'' یعنی یہ بستی اس طرح نیست و نابود ہوئی پڑی تھی کہ چھتیں اور دیواریں وغیرہ گر گئی تھیں اور وہاں کے لوگ مرکھپ چکے تھے، ایسی حالت میں وہاں سے ان صاحب کا گزر ہوا۔

مذکورہ واقعہ میں شخصیت اور بستی کی تعیین

اب یہ بستی کون سی تھی اور یہ صاحب کون تھے؟ اس کی تعیین قرآنِ کریم نے نہیں کی۔ بعض حضرات نے یہ کہا ہے کہ یہ بستی بیت المقدس تھی اور یہ اس وقت کا واقعہ ہے جب بختِ نصر نے بیت المقدس پر حملہ کر کے اسے تباہ کر ڈالا تھا، اور یہ صاحب جو گزر رہے تھے یہ حضرت عزیر یا حضرت ارمیا علیہما السلام تھے، لیکن یہ بات یقین سے نہیں کہی جاسکتی کہ یہ صاحب کون تھے اور بستی کون سی تھی؟ کیونکہ قرآنِ کریم نے واضح طور پر تعیین نہیں فرمائی، لہٰذا اس کھوج میں پڑنے کی ضرورت بھی نہیں، کیونکہ قرآنِ کریم کا مقصد اس کے بغیر بھی واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ ہم نے اپنے بعض بندوں کو اپنی قدرت کا مظاہرہ دنیا میں بھی کر کے دکھایا، جس میں ہم نے ان کے سامنے مُردوں کو زندہ کیا۔

مُردوں کو زندہ کرنے والی یہ بات جو کہ اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ کا ایک عملی مظاہرہ تھا، وہ بات اس تعیین کے بغیر بھی واضح ہے کہ یہ کون صاحب تھے اور بستی کون سی تھی؟ البتہ یہ بات تقریباً یقینی معلوم ہوتی ہے کہ یہ صاحب کوئی نبی تھے، کیونکہ اوّل تو اس آیت میں صراحت ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سے بذاتِ خود ہم کلام ہوئے، نیز اس طرح کے واقعات انبیائے کرام ہی کے ساتھ پیش آتے ہیں جیسا کہ ان شاء اللہ آگے بھی عرض کیا جائے گا۔

ان صاحب نے جو بستی کے پاس سے گزر رہے تھے ﴿قَالَ﴾ کہا ﴿اَنّٰى﴾ کہ کس طرح ﴿يُحْيٖ﴾ زندہ کرے گا ﴿هٰذِهِ اللّٰهُ بَعْدَ مَوْتِهَا﴾ ''اللہ تعالیٰ اس بستی کو اس کے مرنے کے بعد؟'' زندہ کرنے کا یقین تو تھا، لیکن ان کی حالت کو دیکھ کر ایک حیرت سی دل پر غالب ہوگئی۔ ﴿فَاَمَاتَهُ اللّٰهُ﴾ تو اللہ نے انہیں موت دے دی ﴿مِائَةَ عَامٍ﴾ ایک سو سال تک ﴿ثُمَّ بَعَثَهٗ﴾'' پھر انہیں اٹھادیا،'' یعنی دوبارہ زندہ کردیا۔

برزخ کی زندگی بہت تیزی سے گزرنے والی ہے

جب وہ زندہ ہوئے تو اس وقت ﴿قَالَ﴾ اللہ تعالیٰ نے ان سے کہا، یعنی ان سے پوچھا کہ ﴿كَمْ

﴿لَبِثْتَ﴾ تم اس حالت میں یعنی موت کی حالت میں کتنا عرصہ رہے ہو؟ تو اس کے جواب میں ﴿قَالَ﴾ انہوں نے کہا: ﴿لَبِثْتُ يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ﴾ ''میں یا تو ایک دن رہا ہوں یا دن کا کچھ حصہ رہا ہوں،'' یعنی سو سال کا عرصہ جو موت کی حالت میں گزرا تھا وہ سارا کا سارا انہیں ایسے لگ رہا تھا کہ گویا ایک دن یا دن کا کچھ حصہ، حالانکہ حقیقت میں وہ سو سال مردہ رہے تھے، تو اس پر ﴿قَالَ﴾ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ﴿بَلْ لَّبِثْتَ مِائَةَ عَامٍ﴾ ''بلکہ تم سو سال اسی حالت میں رہے ہو۔''

اس سوال و جواب کے بیان کرنے سے اللہ تبارک و تعالیٰ درحقیقت ہمیں اور آپ کو اس بات پر مطلع فرمارہے ہیں کہ انسان کے مرنے کے بعد جو زندگی آنے والی ہے جیسے عالمِ برزخ، تو وہ بھی بہت تیزی کے ساتھ انسان سے گزر جائے گا۔ ورنہ بعض اوقات انسان کے دل میں خیال پیدا ہوتا ہے کہ ابھی تو ہم زندہ ہیں، پھر موت آئے گی، پھر عالمِ برزخ ہوگا، جو قیامت تک جاری رہے گا، پھر قیامت آئے گی، پھر حساب و کتاب ہوگا، پھر حشر ونشر ہوگا اور اس کے بعد پھر کہیں جا کے جنت یا دوزخ کا معاملہ آئے گا، تو اس طرح یہ جنت اور دوزخ کا معاملہ بعض اوقات انسان کو بہت دور محسوس ہونے لگتا ہے اور وہ اس طرح دنیاوی زندگی کی لذتوں میں مگن ہو کر غفلت کا شکار ہو جاتا ہے۔

یہاں پر اللہ تبارک وتعالیٰ یہ فرمارہے ہیں کہ دیکھو جس طرح اس شخص کو سو سال کی موت کا پتہ ہی نہیں چلا، ایسے لگا جیسے کہ ایک دن یا اس سے بھی کم وقت گزرا ہو، اسی طرح مرنے کے بعد انسان کو عالمِ برزخ کی زندگی بہت مختصر معلوم ہوگی، بلکہ دنیا کی زندگی بھی مختصر معلوم ہوگی، جیسا کہ قرآنِ کریم میں دوسری جگہ فرمایا کہ:

> ''جس دن یہ لوگ قیامت کو دیکھ لیں گے، اس دن انہیں ایسا معلوم ہوگا جیسے وہ (دنیا میں یا قبر) میں ایک شام یا ایک صبح سے زیادہ نہیں رہے۔''(۱)

اس وقت انسان کو وہ سارا وقت بہت تیزی سے گزرتا ہوا معلوم ہوگا، اور اس کے نتیجے میں وہ بڑی سے بڑی مدّت کو بھی مختصر مدت سمجھے گا۔

زندگی اور موت سے متعلق قدرتِ الٰہی کی نشانیوں کا مظاہرہ

اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنی قدرت کا ایک عظیم مظاہرہ دکھایا کہ ان کے اوپر سو سال تک موت طاری رہی،

---

(۱) ﴿كَاَنَّهُمْ يَوْمَ يَرَوْنَهَا لَمْ يَلْبَثُوْٓا اِلَّا عَشِيَّةً اَوْ ضُحٰهَا﴾ [النازعات:۴۶].

لیکن ان کی اشیائے خورد و نوش ویسی کی ویسی رہیں، چنانچہ اسی بات کی طرف متوجہ کرتے ہوئے فرمایا: ﴿فَانْظُرْ﴾ دیکھو ﴿اِلٰى طَعَامِكَ وَ شَرَابِكَ﴾ اپنے کھانے کو اور اپنے پانی کو ﴿لَمْ يَتَسَنَّهْ﴾ ''وہ بالکل بھی خراب نہیں ہوا'' کھانا اور پانی کو اللہ تعالیٰ نے اس طرح جوں کا توں محفوظ رکھا کہ ان کے اندر کوئی تغیر واقع نہیں ہوا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ایک قدرت تو ہماری یہ ہوئی اور اب دوسری قدرت دیکھیے: ﴿وَانْظُرْ اِلٰى حِمَارِكَ﴾ ''ذرا اپنے (سواری والے) گدھے کو دیکھو'' کہ کس طرح گل سڑ چکا ہے!

اللہ تعالیٰ نے انہیں دونوں چیزوں کا مشاہدہ کرادیا؛ ایک مشاہدہ یہ کرادیا کہ کسی چیز کا گلنا سڑنا بھی ہمارے حکم سے ہے، اور کسی چیز کا اپنی حالت پر باقی رہنا بھی ہمارے حکم سے ہے، یہ دونوں ہماری قدرت کی نشانیاں ہیں جو ہم نے تمہیں دکھا دی ہیں۔ کھانا جو کہ جلدی گلا سڑا کرتا ہے، اسے تو ہم نے سو سال تک اس طرح محفوظ رکھا کہ اس میں نہ کسی قسم کی سڑاند (بدبو) پیدا ہوئی اور نہ وہ خراب ہوا، بلکہ بالکل اپنی اصلی حالت میں باقی رہا، اسی طرح پانی بھی جیسا تھا ویسا ہی باقی ہے، لیکن دوسری طرف گدھا گل سڑ چکا ہے، حالانکہ گدھے کو بوسیدہ ہونے میں اور گلنے سڑنے میں کچھ وقت لگتا ہے، لیکن اس کے باوجود کھانے اور پانی کو تو ہم نے باقی رکھا اور گدھے کو گلا سڑا دیا۔ یہ سب کچھ ہم نے اس لیے کیا ﴿وَ لِنَجْعَلَكَ اٰيَةً لِّلنَّاسِ﴾ ''اور تاکہ ہم تمہیں لوگوں کے لیے اپنی قدرت کا ایک نشان بنادیں،'' یعنی ہم تمہیں لوگوں کے لیے اپنی قدرت کی ایک نظیر بنادیں اور لوگ اس نظیر سے بھی ہماری قدرت اور قیامت کے روز دوبارہ زندہ ہونے پر استدلال کرسکیں۔

﴿وَانْظُرْ اِلَى الْعِظَامِ﴾ ''اور دیکھو ذرا ہڈیوں کو'' یعنی اپنی سواری کے گدھے کو دیکھو جو گل سڑ کر ریزہ ریزہ ہوچکا ہے اور اس کی ہڈیاں بھی نہایت بوسیدہ ہوچکی ہیں، ﴿كَيْفَ نُنْشِزُهَا﴾ ہم کس طرح انہیں اٹھاتے ہیں ﴿ثُمَّ نَكْسُوْهَا لَحْمًا﴾ ''پھر انہیں گوشت کا لباس پہناتے ہیں،'' تاکہ تم ہماری قدرتِ کاملہ کا نظارہ اور مرنے کے بعد زندہ ہونے کا مشاہدہ اپنی آنکھوں سے کرلو، چنانچہ ایسا ہی ہوا، انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ وہ بوسیدہ ہڈیاں کس طرح تر و تازہ ہوگئیں اور پھر ان پر کس طرح گوشت چڑھ گیا، اور یہ گدھا کس طرح اپنی اصلی حالت میں زندہ ہوکر کھڑا ہوگیا۔ یہ سارے مناظر انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھے ﴿فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗ﴾ چنانچہ جب حقیقت ان کے سامنے کھل کر آگئی تو ﴿قَالَ﴾ وہ بول اٹھے: ﴿اَعْلَمُ﴾ ''مجھے یقین ہے'' ﴿اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِيْرٌ ۝۲۵۹﴾ ''بے شک اللہ تعالیٰ کو ہر چیز پر قدرت حاصل ہے،'' یعنی ایمان تو تھا ہی، لیکن اب عین الیقین حاصل ہوگیا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا مُردوں کے زندہ ہونے کی کیفیت دیکھنے کا سوال

اپنی قدرتِ کاملہ کے مظاہرے کے لیے اللہ تعالیٰ نے مُردوں کو زندہ کرنے کا ایک دوسرا واقعہ آگے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذکر فرمایا ہے جس کی تفصیل یہ ہے کہ ایک مرتبہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے یہ کہا تھا کہ ﴿رَبِّ اَرِنِیْ﴾ اے میرے پروردگار! ذرا مجھے دکھایئے ﴿كَيْفَ تُحْيِ الْمَوْتٰى﴾ ''کہ آپ مردوں کو کیسے زندہ کرتے ہیں؟'' یہ سوال بھی مردوں کو زندہ کرنے کی کیفیت سے متعلق ہے، یعنی یقین تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کو پکا تھا کہ اللہ تعالیٰ یقیناً مردوں کو زندہ کرنے پر قادر ہیں، لیکن جو چیز آنکھوں سے دیکھی ہوئی نہیں ہوتی، اس کا مکمل یقین ہونے کے باوجود بعض اوقات انسان اس کی صحیح کیفیت کا اندازہ نہیں لگا سکتا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام چاہتے تھے کہ وہ یہ پتہ لگائیں کہ وہ کیفیت کیا ہوگی اور اللہ تعالیٰ کس کیفیت میں دوبارہ زندہ کریں گے؟ تو اس بات پر ﴿قَالَ﴾ اللہ تعالیٰ نے ان سے فرمایا کہ ﴿اَوَ لَمْ تُؤْمِنْ﴾ کیا تمہیں یقین نہیں ہے؟ ﴿قَالَ بَلٰى﴾ ''تو ابراہیم علیہ السلام نے کہا یقین کیوں نہ ہوتا؟'' یعنی مجھے مکمل یقین حاصل ہے ﴿وَ لٰكِنْ﴾ لیکن میں نے یہ خواہش اس لیے کی ہے ﴿لِّيَطْمَىِٕنَّ قَلْبِيْ﴾ ''تاکہ میرا دل مطمئن ہو جائے۔''

اس سوال و جواب کے ذریعے اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہ بات صاف کردی کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی یہ فرمائش خدانخواستہ کسی شک کی وجہ سے نہیں تھی، انہیں اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ پر پورا یقین تھا، لیکن آنکھوں سے دیکھنے کی بات ہی کچھ اور ہوتی ہے، اس سے نہ صرف مزید اطمینان حاصل ہوتا ہے، بلکہ اس کے بعد انسان دوسروں سے بھی یہ کہہ سکتا ہے کہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں صرف دلائل سے اس کا علم حاصل کرنے کی بنیاد پر نہیں، بلکہ آنکھوں سے دیکھ کر کہہ رہا ہوں۔ اور جیسا کہ میں نے عرض کیا، بعض اوقات کسی چیز کی کیفیت دیکھے بغیر پوری طرح سمجھ میں نہیں آرہی ہوتی، اور آنکھوں سے مشاہدہ کرلینے کے بعد سمجھ میں آجاتی ہے، اس لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس خواہش کا اظہار کیا۔ ایک روایت میں نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد منقول ہے:

لَيْسَ الْخَبَرُ كَالْمُعَايَنَةِ....(۱)

---

(۱) مسند أحمد (٢٦٠/٤) (٢٤٤٧) ومسند البزار (٢٧٢/١١) (٥٠٦٢) والمعجم الكبير للطبراني (١٥٤/١٢) (١٢٤٥١) والمعجم الاوسط (١٢/١) (٢٥) وأورده الهيثمي في "المجمع"(١/ ٣٨٣) (٦٨٧) وقال: "رواه أحمد والبزار والطبراني في الكبير والأوسط ورجاله رجال الصحيح، وصحَّحه ابن حبان." والمستدرك للحاكم (٣٥١/٢)(٣٢٥٠) وقال: "هذا حديث صحيح على شرط الشيخين ولم يخرجاه." ووافقه الذهبي في "التلخيص."

خبر دیکھنے کی طرح نہیں ہے (یعنی انسان آنکھوں سے مشاہدہ کرنے سے جتنا متاثر ہوتا ہے، خبر سے اتنا متاثر نہیں ہوتا۔)

اللہ تعالیٰ تو جانتے ہی تھے کہ ابراہیم علیہ السلام کا ایمان کیسا ہے، اور ان کا یہ سوال کرنے کا مقصد کیا ہے؟ کیونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کئی آزمائشوں میں پورے اتر چکے تھے، اور احکامِ الٰہی کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے میں اپنی مثال آپ تھے، لیکن اللہ تعالیٰ نے یہ سوال اس لیے کیا تاکہ ان کے جواب سے سننے والوں کو تعلیم دی جاسکے۔ (۱)

بعث بعد الموت کی کیفیت کا عملی مظاہرہ

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے جواب میں ﴿قَالَ﴾ ''فرمایا'' کہ چونکہ تم یہ کیفیت دیکھنا چاہتے ہو تو ﴿فَخُذْ اَرْبَعَةً مِّنَ الطَّيْرِ﴾ چلو اب تم چار پرندے لو ﴿فَصُرْهُنَّ اِلَيْكَ﴾ ''اور انہیں اپنے سے مانوس کرلو'' جیسے آدمی کوئی جانور پالتا ہے تو وہ اس سے مانوس ہوجاتا ہے، جانور آدمی کو پہچاننے لگتا ہے، اور آدمی اس جانور کو پہچاننے لگتا ہے۔ ابراہیم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ تم بھی ان جانوروں کو اپنے ساتھ مانوس کرلو۔ مانوس ہونے کا فائدہ یہ ہوگا کہ جب ہم انہیں مرنے کے بعد زندہ کرکے بلائیں گے تو اس وقت تم پہچان سکو گے کہ واقعی یہ وہی پرندے ہیں جن کو میں نے ذبح کیا تھا۔ ﴿ثُمَّ اجْعَلْ عَلٰى كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا﴾ ''پھر ہر پہاڑ پر ان کا ایک ایک حصہ رکھ دو،'' یعنی پہلے انہیں ذبح کرو، اور پھر ہڈیوں پروں سمیت ان کا قیمہ سا کرکے اس کے کئی حصے کرو، اور کئی پہاڑ اپنی مرضی سے منتخب کرکے ہر پہاڑ پر ان میں سے ایک حصہ رکھ دو۔

پہاڑوں پر ان پرندوں کے مختلف حصے رکھنے کے بعد ﴿ثُمَّ ادْعُهُنَّ﴾ پھر انہیں بلاؤ تو ﴿يَاْتِيْنَكَ سَعْيًا﴾ ''وہ چاروں تمہارے پاس دوڑے چلے آئیں گے،'' چنانچہ ایسا ہی ہوا، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ تبارک وتعالیٰ کے حکم کے مطابق چار پرندے لیے اور انہیں ذبح کرکے ان کے مختلف حصے چار پہاڑوں کے اوپر رکھ دیے، پھر انہیں پکارا تو تفسیر روح المعانی (۲) میں بروایت حضرت حسن بصری رحمہ اللہ نقل کیا گیا ہے فوراً

---

(۱) التفسير المظهري (۱/۳۷۰).

(۲) تفسير الألوسي = روح المعاني (۲/۲۹).

ہڈی سے ہڈی، پَر سے پَر، خون سے خون، گوشت سے گوشت مل ملا کر سب اپنی اپنی اصلی حالت میں زندہ ہوکر دوڑتے ہوئے ابراہیم علیہ السلام کی طرف آگئے، اس وقت اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اے ابراہیم! قیامت کے روز اسی طرح سب اجزاء اور سارے جسموں کو جمع کر کے ہم ایک دم سے ان میں جان ڈال دیں گے۔

پرندوں کے دوڑتے ہوئے آنے میں حکمت

یہاں پر ایک بات یہ بھی قابلِ غور ہے کہ قرآنِ کریم نے ان پرندوں کے بارے میں یہ فرمایا کہ ﴿يَأْتِينَكَ سَعْيًا﴾ ''وہ تمہارے پاس دوڑتے ہوئے آئیں گے۔'' یہ نہیں فرمایا کہ وہ پرندے اڑتے ہوئے آئیں گے، حالانکہ پرندے عموماً اڑ کر آتے ہیں۔ اس طرح فرمانے کی بظاہر وجہ یہ ہے کہ اگر وہ آسمان میں اُڑ کر آرہے ہوں تو اس میں نظروں سے اوجھل ہونے یا دوسرے پرندوں کے ساتھ خلط ملط ہونے کا بھی امکان ہے، نیز کوئی شبہ ہوسکتا ہے کہ پتہ نہیں، یہ وہی پرندے ہیں جن کو میں نے کاٹ کر پہاڑ پر رکھا تھا یا کوئی اور پرندے آگئے ہیں؟ جبکہ اس کے برخلاف جب زمین پر چل کر آئیں گے تو سامنے رہیں گے، اور اس میں کسی قسم کے اشتباہ کی کوئی گنجائش نہیں ہوگی، اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو یہ مشاہدہ کرادیا۔

انبیائے کرام علیہم السلام کو بعض غیبی حقائق کا مشاہدہ

اس آیت کے آخر میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَاعْلَمْ أَنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ﴿٢٦٠﴾﴾ ''اور یہ بات اچھی طرح جان رکھو کہ اللہ تعالیٰ بہت اعلیٰ درجے کا صاحبِ اقتدار بھی ہے اور اعلیٰ درجے کی حکمت والا بھی ہے۔'' اس کے اقتدار کا مظاہرہ تو تم نے ابھی دیکھ لیا کہ اللہ تعالیٰ نے کس طرح مُردوں کو زندہ فرمایا، لیکن ساتھ ہی حکمت والا بھی ہے، اس لیے اپنی اس حکمت سے جس کو وہ چاہتا ہے، جس وقت چاہتا ہے اپنی قدرت کا مشاہدہ آنکھوں سے کرادیتا ہے اور جس کو نہیں چاہتا اسے نہیں کراتا، یعنی اس کی حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ ہر ایک کو یہ مشاہدہ نہ کرایا جائے۔

بات دراصل یہ ہے کہ یہ دنیا چونکہ امتحان کی جگہ ہے اس لیے یہاں اصل قیمت ''ایمان بالغیب'' کی ہے اور انسان سے مطلوب یہ ہے کہ وہ ان تمام حقائق پر آنکھوں سے دیکھے بغیر دلائل کی بنیاد پر ایمان لائے، البتہ انبیائے کرام کا معاملہ عام لوگوں سے مختلف ہوتا ہے، وہ جب غیب کے حقائق پر غیر متزلزل ایمان لاکر یہ ثابت کرچکے ہوتے ہیں کہ ان کا ایمان نہ کسی شک کی گنجائش رکھتا ہے اور نہ وہ آنکھ کے کسی مشاہدے پر

موقوف ہے، تو ان کے ایمان بالغیب کا امتحان اسی دنیا میں پورا ہوجاتا ہے۔

انبیائے کرام علیہم السلام کے ایمان بالغیب کی تحقیق و تصدیق کے بعد پھر حکمتِ خداوندی کے تحت انہیں دنیا میں بھی بعض غیبی حقائق آنکھوں سے بھی دکھا دیے جاتے ہیں، تاکہ ان کے علم و اطمینان کا معیار عام لوگوں سے زیادہ ہو اور وہ ڈنکے کی چوٹ پر یہ کہہ سکیں کہ وہ جس بات کی دعوت دے رہے ہیں، اس کی حقانیت انہوں نے آنکھوں سے بھی دیکھ رکھی ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے یہ منظر دکھا تو دیا، لیکن ساتھ ہی فرمادیا کہ ہمیں یہ اقتدار اور قدرت تو حاصل ہے، لیکن ہماری حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ ہم یہ مشاہدہ ہر ایک آدمی کو نہ کرائیں، البتہ تمہیں خاص طور پر کرا دیا گیا۔

خلافِ عادت باتوں کے منکرین کی دور از کار تاویل

یہ اس آیت کی بہت واضح تفصیل تھی جو قرآنِ کریم کے اسلوب اور عربی زبان کے محاورات کے عین مطابق ہے۔ بعض وہ لوگ جو خلافِ عادت باتوں کا اعتراف کرتے ہوئے ہچکچاتے ہیں، انہوں نے اس آیت کی تفسیر میں کھینچ تان سے کام لیتے ہوئے ایسی تشریح کی ہے جس میں یہ نہ ماننا پڑے کہ وہ پرندے واقعۃً مرکر زندہ ہوگئے تھے، چنانچہ انہوں نے کہا کہ قرآنِ کریم میں یہ کہا گیا ہے کہ ان پرندوں کو اپنے سے مانوس کرلو اور پہاڑوں پر رکھ دو، پھر جب تم بلاؤ گے تو وہ چلے آئیں گے۔ جس طرح تم نے ان پرندوں کو مانوس کرکے اب بلایا تو وہ چلے آئے، اسی طرح ساری روحیں بھی ہم نے اپنے آپ سے مانوس کر رکھی ہیں، لہٰذا جب چاہیں گے انہیں بلالیں گے۔

اس طرح کی تفصیل ذکر کرنے سے ان لوگوں کے پیشِ نظر یہ بات تھی کہ یہاں پر ''مرکر زندہ ہونے'' کی خلافِ عادت بات ماننا لازم نہ آئے، لیکن قرآنِ کریم کے الفاظ سے یہ تفصیل و تشریح بالکل بعید ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا مطالبہ یا ان کی فرمائش یہ تھی کہ یا اللہ! مردوں کو زندہ کرنے کی جو کیفیت ہے، میں وہ دیکھنا چاہتا ہوں، تو اگر اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا ہوتا کہ ان مانوس پرندوں کو پہاڑوں پر بٹھا دو اور پھر ان کو بلالینا تو وہ پرندے دوڑتے ہوئے تمہارے پاس آجائیں گے تو اس میں ابراہیم علیہ السلام کی کیا خصوصیت ہوئی؟ انہیں کیا مشاہدہ کرایا گیا؟ یہ کام تو ہر شخص بذاتِ خود بھی کرسکتا ہے، اور یہ مشاہدہ ہر آدمی کو ہوسکتا ہے۔

دوسری بات یہ کہ قرآنِ کریم نے کہا کہ ﴿ثُمَّ اجْعَلْ عَلٰى كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا﴾ ''پھر ہر پہاڑ پر ان کا ایک ایک حصہ رکھ دو،'' یہ نہیں کہا کہ ایک ایک پرندہ پہاڑ پر رکھ دو، بلکہ یہ کہا گیا کہ ایک ایک حصہ پہاڑ پر رکھ دو، یعنی انہیں کاٹ کر ان کا ایک ایک حصہ وہاں پر رکھ دو، پھر ہم اسے اکٹھا جمع کر کے لے آئیں گے، لہٰذا جو شخص بھی عربی زبان کے محاورات، اسالیب اور اس کے مزاج سے واقف ہو، وہ اس قسم کی بے جا تاویلات کو قبول نہیں کرسکتا۔ قرآنِ کریم کا پورا سیاق اور اس واقعے کے حوالے سے استعمال کیے گئے الفاظ ایسی تاویلات کی واضح طور پر تردید کرتے ہیں۔

ماقبل سے ربط اور آئندہ آیات کے مضامین

یہاں تک سورۂ بقرہ کے ۳۵ رکوع مکمل ہوگئے ہیں، اور اب یہاں چھتیسویں رکوع سے یعنی آیت نمبر ۲۶۱ سے ۲۸۳ تک کل ۳۳ آیات میں اللہ تعالیٰ نے انسان کے کچھ مالی معاملات بیان فرمائے ہیں اور ان آیات میں اسلام کے معاشی نظام کے ایک اہم پہلو کا بیان ہے جس کے دو حصے ہیں:

۱۔ اپنی ضرورت سے زائد مال کو اللہ کی رضا کے لیے حاجت مند مفلس لوگوں پر خرچ کرنے کی ترغیب جس کو صدقہ وخیرات کہا جاتا ہے۔

۲۔ سود کے لین دین کو حرام قرار دے کر اس سے بچنے کی ہدایات اور سود کے بغیر قرض کی جائز شکلیں۔

ان میں سے پہلے دو رکوع صدقہ وخیرات کے فضائل، اس کی ترغیب، قبولیت کی شرائط اور اس کے متعلقہ احکام و ہدایات پر مشتمل ہیں اور آخری دو رکوع سودی کاروبار کی حرمت وممانعت اور قرض اور ادھار کے جائز طریقوں کے بیان میں ہیں۔

انفاق فی سبیل اللہ کی فضیلت، قبولیت کی شرائط اور قبولیت سے مانع اُمور

آیت نمبر ۲۶۱ تا ۲۶۶

مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ ؕ وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۶۱﴾ اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ لَا يُتْبِعُوْنَ

مَآ اَنْفَقُوْا مَنًّا وَّلَآ اَذًى ۙ لَّهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ
وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۲۶۲﴾ قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ وَّمَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ يَّتْبَعُهَآ
اَذًى ۗ وَاللّٰهُ غَنِيٌّ حَلِيْمٌ ﴿۲۶۳﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ
بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى ۙ كَالَّذِيْ يُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ
وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۗ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَيْهِ تُرَابٌ فَاَصَابَهٗ وَابِلٌ
فَتَرَكَهٗ صَلْدًا ۗ لَا يَقْدِرُوْنَ عَلٰى شَيْءٍ مِّمَّا كَسَبُوْا ۗ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي
الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۶۴﴾ وَمَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ
وَتَثْبِيْتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ كَمَثَلِ جَنَّةٍ بِرَبْوَةٍ اَصَابَهَا وَابِلٌ فَاٰتَتْ اُكُلَهَا
ضِعْفَيْنِ ۚ فَاِنْ لَّمْ يُصِبْهَا وَابِلٌ فَطَلٌّ ۗ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۲۶۵﴾ اَيَوَدُّ
اَحَدُكُمْ اَنْ تَكُوْنَ لَهٗ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّاَعْنَابٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا
الْاَنْهٰرُ ۙ لَهٗ فِيْهَا مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ ۙ وَاَصَابَهُ الْكِبَرُ وَلَهٗ ذُرِّيَّةٌ ضُعَفَآءُ ۖ
فَاَصَابَهَآ اِعْصَارٌ فِيْهِ نَارٌ فَاحْتَرَقَتْ ۗ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ
لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ ﴿۲۶۶﴾ ع ۳۶/۶/۴

جو لوگ اللہ کے راستے میں اپنے مال خرچ کرتے ہیں، ان کی مثال ایسی ہے جیسے ایک دانہ سات بالیں اگائے (اور) ہر بال میں سَو دانے ہوں اور اللہ جس کے لیے چاہتا ہے (ثواب میں) کئی گنا اضافہ کردیتا ہے، اللہ بہت وسعت والا (اور) بڑے علم والا ہے۔ ﴿۲۶۱﴾ جو لوگ اپنے مال اللہ کے راستے میں خرچ کرتے ہیں، پھر خرچ کرنے کے بعد نہ احسان جتلاتے ہیں، اور نہ کوئی تکلیف پہنچاتے ہیں، وہ اپنے پروردگار کے پاس اپنا ثواب پائیں گے، نہ انہیں کوئی خوف لاحق ہوگا اور نہ کوئی غم پہنچے گا۔ ﴿۲۶۲﴾ بھلی بات

کہہ دینا اور درگزر کرنا اُس صدقے سے بہتر ہے جس کے بعد کوئی تکلیف پہنچائی جائے اور اللہ بڑا بے نیاز، بہت بردبار ہے۔ ﴿۲۶۳﴾ اے ایمان والو! اپنے صدقات کو احسان جتلا کر اور تکلیف پہنچا کر اس شخص کی طرح ضائع مت کرو جو اپنا مال لوگوں کو دکھانے کے لیے خرچ کرتا ہے، اور اللہ اور یومِ آخرت پر ایمان نہیں رکھتا، چنانچہ اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک چکنی چٹان پر مٹی جمی ہو، پھر اس پر زور کی بارش پڑے اور اس (مٹی کو بہا کر چٹان) کو (دوبارہ) چکنی بنا چھوڑے۔ ایسے لوگوں نے جو کمائی کی ہوتی ہے، وہ ذرا بھی ان کے ہاتھ نہیں لگتی، اور اللہ کافروں کو ہدایت تک نہیں پہنچاتا۔ ﴿۲۶۴﴾ اور جو لوگ اپنے مال اللہ کی خوشنودی طلب کرنے کے لیے اور اپنے آپ میں پختگی پیدا کرنے کے لیے خرچ کرتے ہیں، ان کی مثال ایسی ہے جیسے ایک باغ کسی ٹیلے پر واقع ہو، اُس پر زور کی بارش برسے تو وہ دگنا پھل لے کر آئے۔ اور اگر اس پر زور کی بارش نہ بھی برسے، تو ہلکی پھوار بھی اس کے لیے کافی ہے، اور تم جو عمل بھی کرتے ہو اللہ اسے خوب اچھی طرح دیکھتا ہے۔ ﴿۲۶۵﴾ کیا تم میں سے کوئی یہ پسند کرے گا کہ اس کا کھجوروں اور انگوروں کا ایک باغ ہو جس کے نیچے نہریں بہتی ہوں (اور) اسے اس باغ میں اور بھی ہر طرح کے پھل حاصل ہوں، اور بڑھاپے نے اسے آ پکڑا ہو، اور اس کے بچے ابھی کمزور ہوں، اتنے میں ایک آگ سے بھرا بگولا آ کر اسے اپنی زد میں لے لے، اور پورا باغ جل کر رہ جائے؟ اسی طرح اللہ تمہارے لیے اپنی آیتیں کھول کھول کر بیان کرتا ہے تاکہ تم غور کرو۔ ﴿۲۶۶﴾

• انفاق سے متعلق مضامین کا خلاصہ اور اس کے مصداقات

- مذکورہ بالا آیات میں پہلے تو اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کرنے کے فضائل بیان کیے گئے ہیں۔
- اس کے بعد ایسی شرائط بیان کی گئی ہیں جن کے ذریعے صدقہ و خیرات اللہ تبارک وتعالیٰ کے نزدیک قابلِ قبول اور موجبِ اجر وثواب بن جاتا ہے۔
- پھر اس کے بعد ایسی چیزوں کا بیان ہے جو انسان کے صدقہ و خیرات کو برباد کرکے ''نیکی برباد گناہ لازم'' کا مصداق بنا دیتی ہیں۔

- اس کے بعد دو مثالیں بیان کی گئی ہیں؛ ایک ان نفقات وصدقات کی جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک مقبول ہوں۔ اور دوسرے ان نفقات وصدقات کی جو اللہ تعالیٰ کے ہاں غیر مقبول اور فاسد ہوں۔

یہ کل پانچ مضامین اس رکوع میں بیان کیے گئے ہیں، جن کی تفصیل آگے آرہی ہے۔ یہاں ان مضامین کے سلسلے میں یہ بھی جان لینا ضروری ہے کہ قرآن کریم نے اللہ کے راستے میں مال خرچ کرنے کو کہیں ''انفاق'' کے لفظ سے تعبیر کیا ہے، کہیں اس کے لیے ''اطعام'' کا لفظ آیا ہے، کہیں ''صدقہ'' کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، اور کہیں ''ایتاء الزکوٰۃ'' کہا گیا ہے۔ ان الفاظ اور ان کے جگہ جگہ استعمال پر نظر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ لفظ انفاق، اطعام اور صدقہ عام ہیں جو ہر قسم کے صدقہ وخیرات اور رضائے الٰہی کی خاطر کئے گئے ہر قسم کے خرچ کو شامل ہیں، وہ خرچ خواہ فرض وواجب ہوں یا نفلی اور مستحب، جبکہ قرآنِ کریم نے فرض زکوٰۃ کے لیے ''ایتاء الزکوٰۃ'' کا ایک ممتاز لفظ استعمال فرمایا ہے۔

بہرحال انفاق کہیں یا صدقہ، اس کے اندر بھلائی کے سارے کے کام آگئے ہیں، مثلاً یتیموں، بیواؤں کی یا کسی غریب کی مدد کرنا، کسی مسکین کو کھانا کھلا دینا، کوئی مسجد بنا دینا، کوئی شفا خانہ بنا دینا، لوگوں کے لیے پانی کے حصول کا کوئی انتظام کر دینا، مثلاً کوئی کنواں کھود دینا یا کوئی ایسا صدقۂ جاریہ بنا دینا جس کے نتیجے میں لوگوں کو فائدہ حاصل ہوتا رہے، یہ سب جتنے بھی بھلائی کے کام ہیں اگر ان سب میں اللہ تعالیٰ کی رضا مقصود ہو، تو وہ انفاق فی سبیل اللہ یعنی اللہ کے راستے میں مال خرچ کرنے میں داخل ہیں۔

• اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کرنے والوں کی فضیلت اور مثال

اللہ تبارک وتعالیٰ کے راستے میں مال خرچ کرنے کی فضیلت بیان کرتے ہوئے فرمایا: ﴿مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ﴾ جو لوگ اللہ کے راستے میں اپنے مال خرچ کرتے ہیں ان کی مثال ایسی ہے ﴿كَمَثَلِ حَبَّةٍ﴾ جیسے ایک دانہ ﴿اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ﴾ جس نے سات بالیں اگائیں اور ﴿فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ﴾ ہر بالی میں یا ہر خوشے میں ﴿مِّائَةُ حَبَّةٍ﴾ ''سو دانے ہیں،'' یعنی اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کرنے والوں کی مثال ایسی ہے کہ جیسے ایک کاشتکار زمین میں ایک دانہ ڈالتا ہے، پھر اس سے پودا نکلتا ہے۔ جب پودا نکلے تو اس میں سات بالیں ہوں، یعنی سات خوشے ہوں اور ہر ہر خوشے میں سو دانے ہوں۔ اس نے کاشت تو ایک دانہ کیا تھا، لیکن اس ایک دانے سے اللہ تعالیٰ نے سات سو دانے پیدا کر دیے۔ اسی طرح اگر کوئی شخص اللہ تعالیٰ کے راستے میں ایک روپیہ خرچ کرتا ہے، تو اس کا ثواب بھی سات سو گنا زیادہ تک بڑھا

کر دیا جاتا ہے۔

آگے فرمایا: ﴿وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ﴾ ''اور اللہ تعالیٰ جس کے لیے چاہتا ہے ثواب میں کئی گنا اضافہ کر دیتا ہے۔'' اشارہ اس طرف ہے کہ یہ ایک روپیہ خرچ کرنے پر سات سو گنا ثواب ملنا تو ایک معمول کی بات ہے، لیکن اللہ تبارک و تعالیٰ جس کے لیے چاہے اس کے لیے اس سے بھی کئی گنا زیادہ اضافہ کر سکتا ہے، ﴿وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۶۱﴾﴾ ''اور اللہ تعالیٰ بہت وسعت والا، بڑے علم والا ہے۔'' چونکہ وسعت والا ہے، اس لیے اسے دو گنا، چار گنا، چھ گنا، دس گنا، سات سو گنا، ہزار گنا کرنے میں کوئی رکاوٹ پیدا نہیں ہوتی، وہ جتنا بڑھانا چاہے بڑھا سکتا ہے، اور چونکہ وہ علم رکھتا ہے کہ کس کا مال، کتنے اخلاص کے ساتھ، کن آداب کے ساتھ خرچ ہوا ہے، لہٰذا وہ اسی حساب سے اسے اجر بھی عطا فرماتا ہے۔

• انفاق فی سبیل اللہ کی قبولیت کی شرائط

جو مال اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کیا جاتا ہے، اس میں اصل یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں قبول ہو جائے، اللہ تعالیٰ کے ہاں قبول ہونے کی کیا شرائط ہیں؟ اس سلسلے میں قرآنِ کریم میں جو گندم کے دانے کی مثال دی گئی ہے، اس سے کچھ شرائط نکل رہی ہیں جن کی تفصیل میرے والدِ ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ''معارف القرآن'' میں اس مقام پر بیان فرمائی ہے۔[1]

مثلاً یہ کہ جس طرح کاشتکار ایک گندم کے دانے سے سات سو دانے اُسی وقت حاصل کر سکتا ہے جب کہ ڈالا ہوا یہ دانہ عمدہ ہو، خراب نہ ہو، دانہ ڈالنے والا کاشتکار بھی کاشتکاری کے فن سے پوری طرح واقف ہو، اور جس زمین میں دانہ ڈالے وہ بھی عمدہ زمین ہو، کیونکہ ان میں سے اگر ایک چیز بھی کم ہوگئی، تو یا تو ایک دانہ بھی نہ نکلے گا یا پھر ایسا بار آور نہ ہوگا کہ ایک دانے سے سات سو دانے بن جائیں۔ اسی طرح عام نیک کاموں یا خاص طور سے اللہ کے راستے میں خرچ کرنے کی مقبولیت اور اس پر زیادہ اجر کے حصول کے لیے بھی یہی تین شرطیں ہیں، جن کی تفصیل حسبِ ذیل ہے:

۱۔ **صحیح مال خرچ کیا جائے:** ایک شرط یہ ہے کہ جو مال اللہ کے راستے میں خرچ کیا جائے، وہ پاک اور حلال ہو، کیونکہ حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ پاک اور حلال مال کے سوا کسی چیز کو قبول نہیں

---

(۱) دیکھیے: معارف القرآن، جلد:۱ صفحہ ۶۳۱

فرماتے۔[1] اگر مال حلال ہے تو اس کی مثال اسی دانے کی سی ہے، جس سے سات سو دانے نکلیں، لیکن اگر کوئی شخص حرام مال صدقہ کر رہا ہو، تو حرام مال کو صدقہ کرنے کی مثال ایسی ہے جیسے کہ ایک خراب بیج زمین میں بویا جائے، جب بیج ہی خراب ہے تو اس سے کوئی پودا نہیں اُگ سکتا۔ اسی طریقے سے حرام مال سے صدقہ کرنا ایسا ہی ہے جیسا کہ خراب بیج ڈالنا، اس سے کوئی فائدہ نہیں حاصل ہوسکتا۔

۲۔ **صحیح نیت سے خرچ کیا جائے:** دوسرا اشارہ اس آیت سے یہ ملا کہ کہ خرچ کرنے والا بھی نیک نیت اور صالح ہو، بد نیتی یا نام ونمود کے لیے خرچ کرنے والا ایسا ہے جیسا کہ کاشت کار کے پاس زمین میں ڈالنے کے لیے بیج تو اچھا ہے، لیکن اسے کاشت کاری کا فن نہیں آتا، تو اس صورت میں اگر وہ بیج ڈالے گا بھی تو اس سے کچھ نکلے گا نہیں، یا اس کی ناواقفیت کی وجہ سے اس سے بجائے سات سو دانے نکلنے کے، پانچ دس دانے نکلیں گے، کیونکہ وہ ناواقف اور اناڑی تھا۔

۳۔ **صحیح مصرف پر خرچ کیا جائے:** اس آیت سے تیسرا اشارہ یہ ملا کہ غلط جگہ پر خرچ نہ کیا جائے، بلکہ جس پر خرچ کیا جائے وہ صدقے کا مستحق بھی ہو، کسی نا اہل پر خرچ نہ کیا جائے، ورنہ ضائع ہوجائے گا۔ جیسے کہ بیج تو اچھا ہے، اور کاشت کار بھی ماہر ہے، لیکن اگر وہ ایسی زمین میں بیج ڈالتا ہے جو بنجر یا شور زمین ہے، یعنی وہ اُگانے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتی، تو اس سے کچھ بھی پیدا نہیں ہوگا۔ اسی طرح اگر صدقہ جانتے بوجھتے کسی نا اہل کو دے دیا جائے جو مستحق نہ ہو، اور وہ اسے فضول اڑا کر ختم کردے، تو اس صورت میں بھی یہ ثواب حاصل نہیں ہوسکتا۔

• مالِ حرام کی صورتیں اور اسے صدقہ کرنے کا حکم

صدقہ کرنے کے بارے میں اوپر جو سب سے پہلی شرط ذکر کی گئی تھی کہ صدقہ حلال مال سے کیا جائے، حرام مال نہ ہو، اس حوالے سے مزید سمجھ لینا چاہیے کہ مال کی صاحبِ حق کے اعتبار سے دو قسمیں ہوتی ہیں:

- ایک حرام مال تو وہ ہوتا ہے جو حرام طریقے سے حاصل کیا گیا، لیکن اصل حق دار یا مالک معلوم ہو، یعنی حقیقت میں تو وہ کسی اور کا حق تھا، لیکن کسی آدمی نے وہ حق دبا رکھا ہے، اور جس کا حق دبایا گیا

---

(۱) صحيح البخاري (۲/۱۰۸) (۱٤۱۰) "من تصدق بعدل تمرة من كسب طيب، ولا يقبل الله إلا الطيب..." - كتاب الزكاة - باب الصدقة من كسب طيب.

ہے وہ شخص بھی معلوم ہے، تو ایسی صورت میں جب تک اُس کو حق واپس نہ پہنچایا جائے، اس وقت تک اس حق دبانے والے شخص کے لیے یہ مال حرام ہے۔ اگر وہ اس مال سے صدقہ کرے گا تو ادنیٰ ثواب بھی نہیں ملے گا، بلکہ الٹا گناہ ہوگا، کیونکہ جس کا حق تھا، اسے پہنچانا واجب تھا، لیکن اس نے حق ادا کرنے کے بجائے صدقہ کرنا شروع کردیا، جو بالکل ناجائز ہے۔

- دوسری قسم کا مالِ حرام وہ ہوتا ہے جو حرام طریقے سے حاصل کیا گیا، لیکن اب اس کا اصل حق دار یا مالک معلوم نہ ہو، یا اس تک پہنچانا ممکن نہ ہو، تو ایسے مال کے بارے میں شریعت نے یہ حکم دیا ہے کہ اسے بغیر نیتِ ثواب صدقہ کردینا چاہیے، یعنی حلال مال صدقہ کرنے پر ملنے والے ثواب کی نیت کے بجائے یہ نیت ہونی چاہیے کہ حرام مال کی صورت میں میرے پاس ایک نجاست اور گندگی آگئی تھی، اس گندگی اور نجاست سے اپنی جان چھڑانے کے لیے میں اسے صدقہ کرتا ہوں، تو یہ صدقہ جائز ہے۔ اس کا قاعدہ یہ ہے کہ اس میں صدقہ کرنے والے کو صدقہ کرنے کا ثواب تو نہیں ملے گا، البتہ چونکہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی بنا پر اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں صدقہ کیا گیا ہے اور خود خرچ کرنے کے بجائے دوسرے کو دے دیا گیا ہے، تو اللہ تعالیٰ کی رحمت سے اس اطاعت کا ثواب ملنا بھی کچھ بعید نہیں۔ (۱)

• سود کی رقم صدقہ کرنے اور غریب کے لیے لینے کا حکم

اس تفصیل سے یہ بات بھی سمجھی جاسکتی ہے کہ فرض کریں کسی کے پاس سود کی رقم ہے، اور جس سے سود لیا گیا ہے اس تک پہنچانا ممکن نہیں، تو اب اس سود کی رقم میں ایک صورت تو یہ ہے کہ انسان کھا پی کر خرچ کرڈالے، ظاہر ہے کہ یہ تو حرام و گناہ ہوگا، اور یہ عمل آگ کے انگارے کھانے کے مترادف ہوگا، لیکن اگر وہ شخص یہ چاہتا ہے کہ میں اس سے اپنی جان چھڑاؤں، تو کسی غریب کو صدقہ کردے، غریب کو صدقہ کرنے سے اس مال سے جان چھوٹ جائے گی۔ اب ظاہر سی بات ہے کہ غریب کو صدقہ کرنا گناہ سے بچنے کے لیے ہے، اس لیے اس پر اِس لحاظ سے اطاعتِ خداوندی کا ثواب ملنے کی توقع رکھنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ ہاں! صدقے کی نیت نہیں کی جاسکتی اور صدقے کا ثواب بھی نہیں ملے گا۔

---

(۱) مالِ حرام اور اس کی صورتوں سے متعلق مفصّل احکام کے لیے ملاحظہ کیجیے حضرت والا (حضرت مفتی محمد تقی عثمانی صاحب) دامت برکاتہم کی تصنیف: فقه البيوع، جلد دوم، صفحہ: ۱۰۰۳، عنوان: المبحث العاشر في احكام المال الحرام۔ (راشد)

جس شخص کو ایسا مال صدقہ کے طور پر دیا گیا ہو، اگر وہ غریب آدمی ہے، تو اس کے لیے وہ حلال وطیب ہے۔ پہلے شخص کے لیے تو وہ مال سود کا پیسہ ہونے کی وجہ سے حرام تھا، لیکن جب اس نے اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق کسی غریب کو صدقہ کیا، تو غریب کے لیے اس کا لینا بھی جائز ہے اور اس کا کھانا بھی جائز، اور اب وہ اس کے لیے مکمل طور پر حلال وطیب ہوگیا۔ اب اسے اس میں کوئی پریشانی لاحق نہیں ہونی چاہیے، کیونکہ یہ جو صدقہ ہو رہا ہے یہ درحقیقت اس مال کے اصل مالک کی طرف سے ہو رہا ہے۔ وہ اصل مالک کا حق تھا جو اسے نہیں پہنچایا گیا، تو اب یہ اس کی طرف سے صدقہ ہوگیا اور ان شاء اللہ اس اصل مالک کو صدقے کا ثواب پہنچے گا، یہ ساری تفصیل حلال مال سے صدقہ کرنے کی شرط کی مناسبت سے ذکر کردی گئی ہے۔

• صدقہ کی قبولیت سے مانع امور

ذکر کردہ آیت میں اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کیے جانے والے مال کی مثبت قسم کی شرائط ذکر کی گئی تھیں، اب آگے اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس کی منفی شرائط بیان فرمائی ہیں یعنی ایسے امور بیان فرمائے ہیں جن سے صدقہ کا خالی ہونا ضروری ہے، چنانچہ اس کی کچھ تفصیل حسبِ ذیل ہے:

(۱) - **پہلی شرط: صدقہ دے کر احسان نہ جتلایا جائے:** صدقہ کے قبول ہونے کے لیے یہ ضروری ہے کہ جس کو صدقہ کیا جارہا ہے، اس پر اپنا احسان نہ جتایا جائے۔ اگر ایک شخص نے کسی غریب آدمی پر صدقہ تو کردیا، لیکن اب صبح وشام اس پر احسان جتلاتا رہے کہ میں نے تمہاری مدد کی ہے، یا میں نے تمہیں اتنا کچھ دیا ہے، تو اس عمل سے جہاں اس کی عزتِ نفس مجروح ہوگی، وہیں خود یہ بات واقعے کے بھی خلاف ہے۔

کسی کو صدقہ دے کر اس پر احسان جتلانا واقعہ اور حقیقت کے خلاف اس لحاظ سے ہے کہ ایک تو جو مال تمہارے پاس ہے، وہ اللہ تعالیٰ کی عطا ہے، تم اس کے حقیقی مالک نہیں ہو، لہٰذا اگر تم نے کسی غریب کو اللہ تعالیٰ کے حکم سے وہ مال دیا ہے، تو یہ اس پر تمہارا کوئی احسان نہیں ہے، بلکہ یہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے حکم کی تعمیل ہے جو تمہیں کرنی ہی چاہیے۔ پیچھے تیسرے پارے کے شروع میں آیت نمبر ۲۵۴ کی تشریح میں تفصیل سے گزر چکا ہے کہ وہاں پر اللہ تعالیٰ نے اپنے راستے میں خرچ کرنے کا حکم دیتے ہوئے فرمایا: ''اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ'' ''جو کچھ ہم نے تمہیں دیا ہے، اس میں سے خرچ کرو۔'' اس طرح یہ بتادیا کہ تم جو کچھ خرچ کرو گے وہ ہمارا ہی دیا ہوا ہے، اس میں تمہارا کوئی ذاتی کمال نہیں، لہٰذا اللہ تعالیٰ کے دیے ہوئے مال میں سے اسی

کے راستے میں خرچ کر کے احسان جتلانے سے، سوائے نقصان کے کچھ حاصل نہ ہوگا۔

دوسری بات یہ کہ آدمی کے مال میں اللہ تعالیٰ نے غریب لوگوں کا بھی حق رکھا ہے، قرآنِ کریم یہ فرماتا ہے کہ یہ کوئی تمہارا احسان نہیں ہے کہ تم کسی کو زکوٰۃ یا صدقہ دے رہے ہو، بلکہ یہ درحقیقت تمہارے مال میں ان کا وہ حق تھا جو تم انہیں پہنچا رہے ہو اور اپنا ایک فریضہ ادا کر رہے ہو۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

وَفِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ ﴿۱۹﴾ (۱)

اور ان کے مالوں میں حق ہے ایسے لوگوں کا جو ضرورت مند اور محروم ہیں۔

لہٰذا جب یہ غریبوں اور مسکینوں کا حق ہے تو اس پر احسان جتانے کے کیا معنیٰ؟ اگر احسان جتاؤ گے تو اس سے صدقے کا ثواب جاتا رہے گا۔

(۲)۔ **دوسری شرط: صدقہ دے کر تکلیف نہ پہنچائی جائے:** صدقے کی منفی شرائط میں سے دوسری شرط یہ ہے کہ صدقہ دے کر کسی کو تکلیف نہ پہنچائی جائے۔ تکلیف پہنچانے کے معنیٰ یہ ہیں کہ آپ نے صدقہ تو دے دیا، لیکن اب اس سے بدلے میں بیگار اور خدمت لے رہے ہیں، یا کسی طرح سے زبان سے ہی تکلیف پہنچا رہے ہیں، اسے برا بھلا کہہ رہے ہیں یا ڈانٹ ڈپٹ کر رہے ہیں، یہ ساری باتیں ایذاء کے اندر داخل ہیں۔ خلاصۂ کلام یہ کہ اگر صدقہ کے ساتھ احسان جتلانا یا ایذاء پہنچانا پایا جائے تو یہ چیزیں صدقہ کو خراب کر دیتی ہیں اور صدقے کا جو فائدہ اور اجر حاصل ہونا تھا، وہ حاصل نہیں ہوتا۔

(۳)۔ **تیسری شرط: ریا اور دکھلاوے سے پرہیز کیا جائے:** صدقہ کی تیسری منفی شرط یہ ہے کہ وہ ریا اور دکھلاوے کے لیے نہ ہو، اس کی تفصیل آگے آیت نمبر: ۲۶۴ کے ذیل میں آ رہی ہے۔

صدقہ کی انہی شرائط کو بیان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ﴿اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ﴾ جو لوگ اپنے مال اللہ کے راستے میں خرچ کرتے ہیں ﴿ثُمَّ لَا يُتْبِعُوْنَ مَآ اَنْفَقُوْا مَنًّا﴾ پھر خرچ کرنے کے بعد نہ احسان جتلاتے ہیں ﴿وَّلَآ اَذًى﴾ اور نہ کوئی تکلیف پہنچاتے ہیں، ﴿لَّهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ﴾ ''تو ایسے لوگ اپنے پروردگار کے پاس اپنا ثواب پائیں گے،'' اور وہ ثواب یہ ہوگا کہ ﴿وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۲۶۲﴾﴾ ''نہ انہیں کوئی خوف ہوگا اور نہ انہیں کوئی غم پہنچے گا۔''

---

(۱) سورۃ الذاریات (۵۱): آیت (۱۹)

- **صدقہ دے کر برا طرزِ عمل اپنانے سے بھلی بات بہتر ہے**

پھر آگے اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہ جو تم دل میں احسان جتلانے کا یا لوگوں کو تکلیف پہنچانے کا جذبہ پیدا کر لیتے ہو، اس سے تو بہتر یہ ہے کہ تم صدقہ نہ دو اور ان سے کوئی بھلی بات کہہ دو۔ ﴿قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ﴾ کوئی بھلی بات کہہ دینا ﴿وَّ مَغْفِرَةٌ﴾ اور درگزر کرنا، یہ ﴿خَيْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ﴾ اس صدقہ سے بہتر ہے ﴿يَّتْبَعُهَآ اَذًى﴾ ''جس کے بعد کوئی تکلیف پہنچائی جائے،'' یعنی تم نے اگر کسی غریب کو کوئی صدقہ دیا لیکن بعد میں اسے برا بھلا کہنا شروع کر دیا یا اسے دل آزاری کا کوئی کلمہ کہہ دیا یا اپنا احسان جتلا دیا، تو ایسا کرنے سے بہتر تھا کہ تم اسے کچھ نہ دیتے اور کوئی بھلی بات کہہ دیتے۔ مثلاً یہ کہہ دیتے کہ بھائی میں معذرت خواہ ہوں، میں اس وقت دے نہیں سکتا وغیرہ۔

یہاں پر اس آیت میں ''مَغْفِرَةٌ'' یعنی درگزر کرنا، اس سے مراد یہ ہے کہ اگر کوئی فقیر مانگنے میں اصرار سے کام لے رہا ہو، تو بعض مرتبہ آدمی کو غصہ آجاتا ہے، اس غصہ پر عمل کرنے کے بجائے درگزر سے کام لینے کا حکم دیا جارہا ہے۔ اسے ڈانٹنے ڈپٹنے یا جھڑکنے کے بجائے کوئی اچھی بات کہہ کر رخصت کر دینا بہتر ہے۔ مثلاً کہہ دیا جائے کہ معاف کردو، یا یہ کہا جائے کہ اس وقت میرا کچھ دینے کا ارادہ نہیں ہے وغیرہ، اس طرح کی بات کہہ کر اسے واپس کر دینا، اسے پیسے دے کر احسان جتلانے یا اسے تکلیف پہنچانے سے بہتر ہے۔

اس آیت کے آخر میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ﴿وَاللّٰهُ غَنِيٌّ حَلِيْمٌ ۝۲۶۳﴾ ''اور اللہ بڑا بے نیاز بہت بردبار ہے۔'' ''غَنِيٌّ'' کہہ کر یہ بتایا جارہا ہے کہ اللہ تعالیٰ جو تمہیں اپنے راستے میں مال خرچ کرنے کا، صدقہ کرنے کا یا اچھی بات کہنے کا حکم دے رہے، تو یہ اس وجہ سے نہیں کہ۔ معاذ اللہ۔ اللہ تعالیٰ کو ان صدقات کی کوئی ضرورت پیش آگئی ہے۔ وہ تو تمہارے صدقہ اور انفاق سے بے نیاز ہے، اور وہ ﴿حَلِيْمٌ﴾ یعنی بردبار بھی ہے۔ چونکہ بردبار ہے، لہٰذا تم جو بعض اوقات صدقات کو برباد کرنے کے لیے احسان جتلانے یا تکلیف پہنچانے والی نامناسب باتیں اختیار کرتے ہو، تو وہ تمہاری ان حرکتوں پر تمہیں فوری طور پر سزا نہیں دے رہا، لیکن آخرت میں تمہیں اپنے اچھے اور برے سارے اعمال کا جوابدہ ہونا ہوگا۔ ﴿وَاللّٰهُ غَنِيٌّ حَلِيْمٌ﴾ کے ان الفاظ میں اس طرف بھی اشارہ ہوسکتا ہے کہ اگر صدقہ دینے کے بعد لوگوں کی طرف سے کوئی ناشکری بھی محسوس ہو تو اخلاقِ الٰہیہ کے تابع ہو کر عفو و درگذر سے کام لینا چاہیے۔

• صدقات کو خراب کرنے والی چیزوں سے بچنے کی تاکیدِ مزید

پھر آگے اللہ تبارک وتعالیٰ نے مسلمانوں سے خطاب کرتے ہوئے اسی بات کو مزید تاکید کے ساتھ زیادہ واضح لفظوں میں بیان فرمایا: ﴿يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ﴾ اے ایمان والو! اپنے صدقات کو باطل یا ضائع مت کرو ﴿بِالْمَنِّ وَ الْاَذٰى﴾ ''احسان جتلا کر اور تکلیف پہنچا کر'' اور پھر ساتھ فرمایا: ﴿كَالَّذِيْ يُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ﴾ اس شخص کی طرح نہ بنو جو اپنا مال لوگوں کے دکھاوے کی وجہ سے خرچ کرتا ہے ﴿وَ لَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ﴾ ''اور اللہ اور یوم آخرت پر ایمان نہیں رکھتا۔''

• نام ونمود کی خاطر مال خرچ کرنے کا وبال

یہاں صدقے کو باطل اور اس کے ثواب کو ضائع کرنے والی ایک تیسری چیز بتادی ہے کہ جس طرح احسان جتلانا اور تکلیف پہنچانا صدقہ کے ثواب کو ضائع کردیتا ہے اسی طرح نام ونمود اور دکھلاوا بھی صدقے کو باطل کرنے والی چیز ہے۔ جس شخص کا صدقہ محض نام ونمود اور دکھاوے کے لیے ہو، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس کا صدقہ بجائے فائدہ اور ثواب ملنے کے الٹا اس کے لیے نقصان اور گناہ کا سبب بن جاتا ہے۔ مسلم شریف کی ایک حدیث میں شہید، عالم اور مالدار کا انجام ذکر کیا گیا ہے جنہوں نے نام ونمود کے لیے سارے کام کیے تھے، چنانچہ اللہ کے راستے میں اپنا مال خرچ کرنے والے سے متعلق ذکر کیا گیا ہے کہ:

> ''قیامت کے دن اس مالدار شخص کو لایا جائے گا جسے اللہ تعالیٰ نے دنیا میں بھرپور دولت دی ہوگی اور ہر قسم کا مال عطا فرمایا ہوگا، اللہ تعالیٰ اسے اپنی نعمتیں بتلائیں گے، تو وہ ان کا اقرار کرے گا، پھر اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ تو نے ان نعمتوں سے کیا کام لیا؟ وہ عرض کرے گا: جن مصارف میں خرچ کرنا تجھے پسند تھا، میں نے ان تمام مصارف میں تیرے لیے خرچ کیا۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے تو جھوٹ بولتا ہے، تو نے مال اس لیے خرچ کیا تھا کہ لوگ تجھے سخی کہیں، اور وہ تو کہہ دیا گیا۔ پھر اس کے بارے میں حکم سنادیا جائے گا اور اسے چہرے کے بل گھسیٹ کر جہنم میں پھینک دیا جائے گا۔''(۱)

---

(۱) صحيح مسلم (۳/۱۵۱۳) (۱۹۰۵) كتاب الإمارة، باب من قاتل للرياء والسمعة استحق النار.

• تحفہ وہدیہ دیتے ہوئے اپنا جائزہ لینے کی ضرورت

قرآنِ کریم بار بار تاکید کے ساتھ صدقے کو خراب کرنے والی چیزوں کا ذکر فرما رہا ہے۔ اب ہم سب کو اپنے گریبانوں میں جھانک کر دیکھنا چاہیے کہ ہماری صبح وشام کی زندگی میں کتنے ہی مقامات ایسے ہوتے ہیں جہاں پر ہم نام ونمود اور دکھاوے کی وجہ سے کام انجام دے رہے ہوتے ہیں۔ خاص طور پر ایک دوسرے کو ہدیہ دینے کے سلسلے میں، ایک دوسرے کی مدد کرنے کے سلسلے میں، ایک دوسرے سے ہمدردی اور غمخواری کے سلسلے میں بکثرت یہ بات دل میں آجاتی ہے کہ اگر میں یہ کام نہ کروں گا تو میری معاشرے میں ناک کٹ جائے گی یا لوگ کیا کہیں گے۔ اسی طرح یہ بات بھی بکثرت دل میں آتی ہے کہ چونکہ دوسرے نے میری تقریب میں مجھے اتنا دیا تھا، تو مجھے بھی اس سے بڑھ کر کرنا چاہیے، ورنہ میری ساکھ پر برا اثر پڑے گا اور لوگوں کے اندر میری شہرت خراب ہو جائے گی۔

یہ سب تصوّرات دکھاوے اور نام ونمود کے ہیں، جس سے اس ہدیے یا تحفے کا ثواب جاتا رہتا ہے، اور کچھ بعید نہیں کہ گناہ بھی ہوتا ہو، لہٰذا اپنے طرزِ عمل کو اس طرح سنوارنے کی ضرورت ہے کہ ہم جو کام بھی کریں، وہ نام ونمود اور دکھاوے سے بچتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر کریں۔

• احسان، تکلیف یا دکھاوے کے لیے صدقہ دینے کی مثال

آگے اللہ تعالیٰ اس شخص کے صدقے کی مثال دے رہے ہیں جس نے اللہ تعالیٰ کے راستے میں مال بھی خرچ کیا، لیکن ''بِالْمَنِّ وَالْاَذٰی'' کے ذریعے، یعنی یا تو احسان جتا کر اور تکلیف پہنچا کر اسے باطل کر دیا یا نام ونمود اور دکھلاوے کی وجہ سے اس کا ثواب جاتا رہا۔ اللہ تعالیٰ فرما رہے ہیں کہ جس طرح ایک چکنی چٹان کے اوپر کوئی بیج ڈالا جائے، تو وہاں پر کبھی کوئی نباتات پیدا نہیں ہوسکتیں، اسی طرح اس قسم کے صدقے کا کوئی فائدہ نہیں ہوسکتا، چنانچہ فرمایا: ﴿فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ﴾ اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک چکنی چٹان ہو اور ﴿عَلَيْهِ تُرَابٌ﴾ اس کے اوپر مٹی جمی ہوئی ہو ﴿فَاَصَابَهٗ وَابِلٌ﴾ پھر اس پر زور کی بارش پڑے اور ﴿فَتَرَكَهٗ صَلْدًا﴾ ''وہ بارش اس مٹی کو بہا کر چٹان کو دوبارہ چکنی بنا کے چھوڑ دے،'' یعنی بارش کی وجہ سے وہ مٹی ہٹ گئی اور نیچے سے وہی چکنی چٹان نکل آئی۔

اب اگر کوئی شخص ایسی چٹان کے اوپر بیج ڈال دے، جس پر کچھ مٹی بھی پڑی ہوئی ہو اور پھر اس کے

اوپر بارش برس جائے، تو بارش برسنے کے نتیجے میں جو مٹی پڑی ہوئی تھی، وہ مٹی بہہ جائے گی اور اس کے ساتھ اگر بیج ڈالا ہے تو وہ بھی بہہ جائے گا، اور جو چکنی چٹان ہے اس کے اوپر کوئی تغیّر واقع نہیں ہوگا، نہ اس پر کوئی بُوٹی اگ سکے گی اور نہ کوئی فائدہ حاصل ہوگا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جو صدقہ نام ونمود کے لیے کیا گیا تو یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ ایک چکنی چٹان پر بیج ڈال دیا گیا ہو اور پھر اس کے اوپر احسان جتانے اور تکلیف پہنچانے کے نتیجے میں یا ریاکاری کی وجہ سے بارش برسی اور وہ اس بیج کو بھی بہا کر لے گئی، اس کا کوئی فائدہ ظاہر نہیں ہوگا۔ ﴿لَا يَقْدِرُوْنَ عَلٰى شَيْءٍ مِّمَّا كَسَبُوْا﴾ ''ایسے لوگوں نے جو کمائی کی ہوتی ہے، وہ ذرا بھی ان کے ہاتھ نہیں لگتی،'' یعنی جو کمائی صدقے اور انفاق فی سبیل اللہ کے ذریعہ کی تھی، انہیں اس کا کچھ فائدہ نہیں ہوا۔ ﴿وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿٢٦٤﴾﴾ ''اور اللہ ایسے کافروں کو ہدایت تک نہیں پہنچاتا۔''

• رضائے الٰہی کے لیے مال خرچ کرنے والوں کی مثال

مذکورہ بالا صورت کے برعکس اللہ تعالیٰ آگے ان لوگوں کی مثال بیان فرماتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کی خاطر اللہ تعالیٰ کے راستے میں مال خرچ کرتے ہیں، نام ونمود اور دکھاوا مقصود نہیں ہوتا، احسان بھی نہیں جتاتے اور کسی کو کوئی تکلیف بھی نہیں پہنچاتے۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ان کی مثال ایسی ہے جیسے کسی ایسے ٹیلے پر بارش برسے، جس میں اگانے والی مٹی موجود ہو، اس ٹیلے پر اگر زور کی بارش برسے تو دگنا پھل آئے گا اور اگر زور کی بارش نہ برسے، تھوڑی تھوڑی سی پھوار ہی پڑ جائے، تو بھی وہ باغ اپنا پھل دینے سے پیچھے نہیں رہے گا، کیونکہ اس کی زمین اور محلِ وقوع اچھا ہے۔ اسی طرح اگر اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے صدقہ کیا جائے گا تو صدقے کے نتیجے میں اسے ہر حالت میں فائدہ پہنچے گا اور اللہ تبارک وتعالیٰ اس کا ثواب عطا فرمائیں گے۔

اسی بات کو بیان کرتے ہوئے فرمایا: ﴿وَمَثَلُ الَّذِيْنَ﴾ اور مثال ان لوگوں کی ﴿يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ﴾ جو اپنا مال خرچ کرتے ہیں اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کی خاطر ﴿وَتَثْبِيْتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ﴾ ''اور اپنے آپ میں پختگی پیدا کرنے کے لیے،'' یعنی جب ان کے دل میں یہ بات جمی ہوئی ہوگی کہ وہ یہ عمل خالص اللہ تبارک وتعالیٰ کی رضا کے لیے کر رہے ہیں، تو اس طرح ان کی عادت میں پختگی پیدا ہوجائے گی۔

اللہ تبارک وتعالیٰ ان لوگوں کے بارے میں فرماتے ہیں کہ ان کی مثال ایسی ہے ﴿كَمَثَلِ جَنَّةٍ بِرَبْوَةٍ﴾ جیسے ایک ٹیلے پر ایک باغ ہو، ﴿اَصَابَهَا وَابِلٌ﴾ جس کے اوپر زور کی بارش برسی ﴿فَاٰتَتْ اُكُلَهَا ضِعْفَيْنِ﴾ اس نے اپنا پھل دوگنا دیا ﴿فَاِنْ لَّمْ يُصِبْهَا وَابِلٌ فَطَلٌّ﴾ ''اور اگر زور کی بارش نہ بھی برسے اور ہلکی پھوار ہی پڑ جائے،'' تو وہ بھی پیداوار اگانے کی صلاحیت پیدا کرنے کے لیے کافی ہوجاتی ہے۔ ﴿وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝۲۶۵﴾ ''اور اللہ تعالیٰ جو کچھ تم کرتے ہو، اسے خوب دیکھ رہا ہے۔''

• خلافِ شرائط مال خرچ کرنے کا نقصان

پھر آگے اللہ تبارک وتعالیٰ صدقہ کرنے والوں کو بہت ہی مؤثر انداز میں یہ نصیحت فرمارہے ہیں کہ تم اللہ کے راستے میں مال تو خرچ کررہے ہو، لیکن اس بات کا اہتمام کرو کہ اس کے ساتھ ایسی کوئی چیز نہ لگے جو صدقہ کو خراب کرنے والی ہو، اس لیے کہ اگر تم ان شرائط[1] کو مدِّنظر رکھے بغیر خرچ کرتے چلے گئے، یہاں تک کہ اسی حالت میں تمہارے اس دنیا سے رخصت ہونے کا وقت آگیا، تو جب تم اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پہنچو گے تو یہ امید لگائے بیٹھے ہو گے کہ وہاں پہنچ کر ہمیں اجر وثواب ملے گا، لیکن کہیں ایسا نہ ہو کہ وہاں جا کر پتہ چلے کہ جو کچھ خرچ کیا تھا، اس کا تو کچھ فائدہ ہی حاصل نہ ہوا، جو کچھ صدقہ کیا تھا وہ سب احسان جتلا کر، تکلیف پہنچا کر اور ریا کاری سے خراب اور بیکار ہوگیا تھا۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿اَيَوَدُّ اَحَدُكُمْ﴾ کیا تم میں سے کوئی شخص یہ بات پسند کرے گا؟ ﴿اَنْ تَكُوْنَ لَهٗ جَنَّةٌ﴾ کہ اس کا ایک باغ ہو ﴿مِّنْ نَّخِيْلٍ﴾ کھجور کا باغ ﴿وَّ اَعْنَابٍ﴾ اور انگوروں کا باغ ﴿تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ﴾ ''جس کے نیچے سے نہریں بہتی ہوں،'' یعنی ایسا شاندار باغ بنایا ہے کہ اس میں کھجوریں بھی ہیں، انگور بھی ہیں اور اس کے نیچے سے نہریں بھی بہہ رہی ہیں اور اس کے پاس اس باغ میں صرف کھجور اور انگور ہی نہیں، بلکہ ﴿لَهٗ فِيْهَا مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ﴾ ہر طرح کے دوسرے پھل بھی موجود ہیں ﴿وَ اَصَابَهُ الْكِبَرُ﴾ ''اور اسے بڑھاپا آپہنچا،'' زندگی بھر وہ باغ لگایا، باغ لگا کر اس پر محنت کی اور شاندار باغ تیار کیا، ذہن میں یہ خیال تھا کہ یہ باغ بڑھاپے میں مجھے کام دے گا ﴿وَ لَهٗ ذُرِّيَّةٌ ضُعَفَآءُ﴾ ''اور اس کے بچے ابھی کمزور ہوں،'' یعنی وہ خود ابھی کمانے کی صلاحیت نہ رکھتے ہوں۔

---

(۱) صدقہ کی مثبت اور منفی شرائط کے لیے پیچھے آیت ۲۶۱ اور ۲۶۲ کی تفسیر وتشریح دیکھیے۔

اتنا شاندار باغ محنت سے تیار کرنے، خود بوڑھا اور عیال دار ہونے اور اولاد کے چھوٹے ہونے والی اس ساری صورتِ حال کے پیشِ نظر اُس شخص کو باغ کی شدید ضرورت ہے، اور اب اس نے یہ امید رکھی ہوئی تھی کہ میری اولاد تو کمانے کی صلاحیت نہیں رکھتی، لیکن میں نے باغ لگایا تھا، لہٰذا اس باغ کی پیداوار ہی میرے بڑھاپے کا سارا سامان ہوگی، اور مجھے کچھ ہاتھ پاؤں ہلائے بغیر پیداوار فائدہ پہنچائے گی، لیکن ﴿فَاَصَابَهَآ اِعْصَارٌ فِيْهِ نَارٌ﴾ اتنے میں ایک آگ سے بھرا بگولا آکر اسے اپنی زد میں لے لے ﴿فَاحْتَرَقَتْ﴾ ''جس کے نتیجے میں وہ پورا جل کر رہ جائے۔''

جب باغ جل گیا تو جس چیز کے اوپر وہ امیدیں باندھے بیٹھا ہوا تھا کہ بڑھاپے میں یہ چیزیں میرے لیے سہارا بنیں گی، وہ سب چیزیں تباہ ہوگئیں۔ ایسے ہی وہ شخص جو ان شرائط کے بغیر، نام ونمود اور دکھاوے کی خاطر یا ریاکاری کی خاطر مال خرچ کرتا ہے، اور پھر امید باندھے بیٹھا ہے کہ مجھے صدقے کا ثواب ملے گا، لیکن ان چیزوں کے نتیجے میں اس کا معاملہ ایسا ہی ہوگیا جس طرح ہرے بھرے باغ کو ایک آتشی بگولے نے آکر بھسم کرڈالا تھا۔ جس طرح وہ باغ آگ سے جل گیا اسی طرح اس کا صدقہ بھی نام ونمود، احسان جتلانے اور تکلیف پہنچانے کی وجہ سے جل کر خاک ہوگیا۔

یہاں پر اللہ تعالیٰ نے بڑے پیار سے خطاب فرمایا ہے کہ ﴿اَيَوَدُّ اَحَدُكُمْ﴾ یعنی کیا تم میں سے کوئی شخص پسند کرے گا کہ اس کا یہ انجام ہو؟ ظاہر ہے کہ کوئی بھی پسند نہیں کرے گا، لہٰذا تم ان چیزوں سے بچو جو تمہارے صدقات کو ضائع کرنے والی ہوں۔ یہ مثال دینے کا مقصد یہ ہے کہ خلافِ شرائط صدقہ کرنے کی مثال ایسی ہی ہے کہ بظاہر وہ صدقہ کرکے آخرت کے لیے بہت سا ذخیرہ جمع کر رہا ہے لیکن اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہ ذخیرہ کچھ بھی کام آنے والا نہیں، اس لیے ان چیزوں سے بچنا ضروری ہے۔ ﴿كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ﴾ اسی طرح اللہ تعالیٰ تمہارے لیے اپنی آیتیں کھول کھول کر بیان کرتا ہے ﴿لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ ﴿٢٦٦﴾﴾ ''تاکہ تم غور سے کام لو۔''

صدقہ کے آداب واحکام اور چند اہم مسائل

آیت نمبر ۲۶۷ تا ۲۷۴

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّآ اَخْرَجْنَا لَكُمْ

مِّنَ الْاَرْضِ ۖ وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيْثَ مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ وَلَسْتُمْ بِاٰخِذِيْهِ اِلَّآ
اَنْ تُغْمِضُوْا فِيْهِ ۭ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ ﴿۲۶۷﴾ اَلشَّيْطٰنُ يَعِدُكُمُ
الْفَقْرَ وَيَاْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَاۗءِ ۚ وَاللّٰهُ يَعِدُكُمْ مَّغْفِرَةً مِّنْهُ وَفَضْلًا ۭ وَاللّٰهُ
وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۶۸﴾ يُّؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَّشَاۗءُ ۚ وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ
اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا ۭ وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ ﴿۲۶۹﴾ وَمَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ
نَّفَقَةٍ اَوْ نَذَرْتُمْ مِّنْ نَّذْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُهٗ ۭ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ﴿۲۷۰﴾
اِنْ تُبْدُوا الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا هِيَ ۚ وَاِنْ تُخْفُوْهَا وَتُؤْتُوْهَا الْفُقَرَاۗءَ فَهُوَ خَيْرٌ
لَّكُمْ ۭ وَيُكَفِّرُ عَنْكُمْ مِّنْ سَيِّاٰتِكُمْ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿۲۷۱﴾ لَيْسَ
عَلَيْكَ هُدٰىهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ
فَلِاَنْفُسِكُمْ ۭ وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَاۗءَ وَجْهِ اللّٰهِ ۭ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ
يُّوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ ﴿۲۷۲﴾ لِلْفُقَرَاۗءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ
اللّٰهِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا فِي الْاَرْضِ ۣ يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِيَاۗءَ مِنَ
التَّعَفُّفِ ۚ تَعْرِفُهُمْ بِسِيْمٰهُمْ ۚ لَا يَسْــَٔـلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا ۭ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ
خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ﴿۲۷۳﴾ اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ سِرًّا
وَّعَلَانِيَةً فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ
يَحْزَنُوْنَ ﴿۲۷۴﴾

ع ۳۷ ۵

وقف منزل

اے ایمان والو! جو کچھ تم نے کمایا ہو اور جو پیداوار ہم نے تمہارے لیے زمین سے نکالی ہو، اس کی اچھی چیزوں کا ایک حصہ (اللہ کے راستے میں) خرچ کیا کرو، اور یہ

نیت نہ رکھو کہ بس ایسی خراب قسم کی چیزیں (اللہ کے نام پر) دیا کرو گے جو (اگر کوئی دوسرا تمہیں دے تو نفرت کے مارے) تم اسے آنکھیں میچے بغیر نہ لے سکو۔ اور یاد رکھو کہ اللہ ایسا بے نیاز ہے کہ ہر قسم کی تعریف اسی کی طرف لوٹتی ہے۔ ﴿۲۶۷﴾ شیطان تمہیں مفلسی سے ڈراتا ہے، اور تمہیں بے حیائی کا حکم دیتا ہے، اور اللہ تم سے اپنی مغفرت اور فضل کا وعدہ کرتا ہے۔ اللہ بڑی وسعت والا، ہر بات جاننے والا ہے۔ ﴿۲۶۸﴾ وہ جس کو چاہتا ہے دانائی عطا کر دیتا ہے، اور جسے دانائی عطا ہوگئی اسے وافر مقدار میں بھلائی مل گئی۔ اور نصیحت وہی لوگ حاصل کرتے ہیں جو سمجھ کے مالک ہیں۔ ﴿۲۶۹﴾ اور تم جو کوئی خرچ کرو یا کوئی منت مانو اللہ اسے جانتا ہے۔ اور ظالموں کو کسی طرح کے مددگار میسر نہیں آئیں گے۔ ﴿۲۷۰﴾ اگر تم صدقات ظاہر کر کے دو تب بھی اچھا ہے، اور اگر انہیں چھپا کر فقراء کو دو تو یہ تمہارے حق میں کہیں بہتر ہے اور اللہ تمہاری برائیوں کا کفّارہ کر دے گا اور اللہ تمہارے تمام کاموں سے پوری طرح باخبر ہے۔ ﴿۲۷۱﴾ (اے پیغمبر!) ان (کافروں) کو راہِ راست پر لے آنا آپ کی ذمہ داری نہیں ہے، لیکن اللہ جس کو چاہتا ہے راہِ راست پر لے آتا ہے۔ اور جو مال بھی تم خرچ کرتے ہو، وہ خود تمہارے فائدے کے لیے ہوتا ہے جبکہ تم اللہ کی خوشنودی طلب کرنے کے سوا کسی اور غرض سے خرچ نہیں کرتے۔ اور جو مال بھی تم خرچ کرو گے تمہیں پورا پورا دیا جائے گا اور تم پر ذرا بھی ظلم نہیں ہوگا۔ ﴿۲۷۲﴾ (مالی امداد کے بطورِ خاص) مستحق وہ فقراء ہیں جنہوں نے اپنے آپ کو اللہ کی راہ میں اس طرح مقیّد کر رکھا ہے کہ وہ (معاش کی تلاش کے لیے) زمین میں چل پھر نہیں سکتے۔ چونکہ وہ اتنے پاک دامن ہیں کہ کسی سے سوال نہیں کرتے، اس لیے ناواقف آدمی انہیں مال دار سمجھتا ہے، تم ان کے چہروں کی علامتوں سے ان (کی اندرونی حالت) کو پہچان سکتے ہو (مگر) وہ لوگوں سے لگ لپٹ کر سوال نہیں کرتے۔ اور تم جو مال بھی خرچ کرتے ہو اللہ اسے خوب جانتا ہے۔ ﴿۲۷۳﴾ جو لوگ اپنے مال دن رات خاموشی سے بھی اور علانیہ بھی خرچ کرتے ہیں وہ اپنے پروردگار کے پاس اپنا ثواب پائیں گے، اور نہ انہیں کوئی خوف لاحق ہوگا، نہ کوئی غم پہنچے گا۔ ﴿۲۷۴﴾

• رضائے الٰہی کے لیے مال خرچ کرنے کے مزید فضائل و احکام

ان آیاتِ کریمہ میں بھی اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کی خاطر مال کو خرچ کرنے کے کچھ احکام اور کچھ مزید فضائل بیان فرمائے گئے ہیں۔ سب سے پہلی آیت میں تو حکم دیا ہے کہ ﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا ﴾ اے ایمان والو! ﴿ اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ ﴾ جو کچھ تم نے کمایا ہو اس کی اچھی چیزوں کا ایک حصہ اللہ کے راستے میں خرچ کیا کرو ﴿ وَمِمَّآ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ ﴾ ''اور زمین سے ہم نے تمہارے لیے جو پیداوار نکالی ہے،'' اس پیداوار میں سے بھی کچھ عمدہ چیز اللہ کے راستے میں خرچ کیا کرو۔ ﴿ وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيْثَ مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ ﴾ اور یہ نیت نہ رکھو کہ بس ایسی خراب قسم کی چیزیں اللہ کے نام پر دیا کرو گے ﴿ وَلَسْتُمْ بِاٰخِذِيْهِ اِلَّآ اَنْ تُغْمِضُوْا فِيْهِ ﴾ ''جو اگر کوئی دوسرا تمہیں دے تو نفرت کے مارے تم اسے آنکھیں میچے بغیر نہ لے سکو۔''

اس آیت میں خرچ کرنے کا جو حکم دیا جارہا ہے اس میں کئی اہم باتوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، جس کی تفصیل الگ الگ نکات کی صورت میں ذکر کی جاتی ہے۔

• اپنی ساری کمائی میں سے کچھ راہِ خدا میں خرچ کرنے کا حکم

(۱).....پہلی قابلِ توجہ بات تو یہ ہے کہ یہاں پر اللہ تعالیٰ نے ﴿ اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ ﴾ فرمایا ہے اور یہاں پر ﴿ مِنْ ﴾ کے معنیٰ ''بعض'' یا ''کچھ'' کے ہوں گے اور مطلب یہ بنے گا کہ جو کچھ تم نے کمایا ہے یا جو کچھ ہم نے تمہارے لیے زمین سے تمہاری پیداوار نکالی ہے اس میں سے بعض حصہ یا کچھ اللہ کے راستے میں خرچ کرو۔ ''کچھ خرچ'' کرنے کا حکم دے کر یہ بتا دیا کہ تم سے سارا کا سارا خرچ کرنے کا مطالبہ نہیں ہے، بلکہ جو کچھ تمہارے پاس ہے اس کا کچھ حصہ خرچ کرنے کا حکم دیا جارہا ہے۔ اسی لیے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ:

خَيْرُ الصَّدَقَةِ مَا كَانَ عَنْ ظَهْرِ غِنًى (۱)

بہترین صدقہ وہ ہے جو اپنے پیچھے بھی غنا چھوڑ کر جائے۔

---

(۱) صحيح البخاري (۲/۱۱۲) (۱٤۲٦) كتاب الزكاة، باب لا صدقة إلا عن ظهر غنى.

یعنی صدقہ دینے کے بعد بھی اور اللہ تعالیٰ کے راستے میں مال خرچ کرنے کے بعد بھی انسان کے پاس اتنا باقی رہ جائے جو اس کی اپنی اور اپنے بیوی بچوں کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے مناسب طور پر کافی ہو۔ زکوٰۃ جو ایک فریضہ ہے، اس میں بھی اللہ تعالیٰ نے یہ رعایت رکھی ہے کہ صرف اڑھائی فیصد یعنی چالیسواں حصہ غریبوں پر خرچ کرنا فرض قرار دیا گیا ہے اور باقی ساڑھے ستانوے فیصد ہمارے لیے چھوڑ دیے گئے ہیں، اس لیے نفلی صدقات میں بھی اعتدال اور حکمت کے ساتھ خرچ کرنا چاہیے، تاکہ انسان خود دوسروں کا محتاج نہ ہو جائے۔

• صدقاتِ واجبہ و نافلہ؛ دونوں کی ادائیگی اپنی جگہ اہم ہے

(۲).....دوسری قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ یہاں پر ﴿مَا كَسَبْتُمْ﴾ کا لفظ فرمایا گیا ہے، یعنی ''جو کچھ تم نے کمائی کی ہو اس میں سے خرچ کرو۔'' کمائی کے اندر کسبِ معاش کے تمام ذرائع آجاتے ہیں۔ اس میں تجارت بھی آجاتی ہے، ملازمت بھی اور کمائی کے دوسرے ذرائع بھی آجاتے ہیں۔ انسان کو جو کچھ آمدنی حاصل ہوتی ہے اس میں سے خرچ کرنے کے دو درجے ہیں:

۱۔ اپنی کمائی یا آمدنی میں سے کچھ حصہ تو ایسا ہے جو اللہ تعالیٰ کے راستے میں نکالنا فرض ہے، جس کو ''زکوٰۃ'' کہا جاتا ہے اور جس کی قرآنِ کریم میں متعدّد مقامات پر تاکید کی گئی ہے۔ نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے زکوٰۃ کی تو ایک معیّن مقدار مقرر فرمائی جو مخصوص شرائط کے ساتھ سال میں ایک مرتبہ فرض ہوتی ہے۔ اگر کسی انسان کے پاس اپنا سرمایہ، چاہے وہ نقد کی شکل میں ہو یا مالِ تجارت کی شکل میں ہو، ساڑھے باون تولہ چاندی کی مالیت کے برابر ہو جائے تو پھر اس کے اوپر زکوٰۃ فرض ہو جاتی ہے اور اس کا ڈھائی فیصد یعنی چالیسواں حصہ زکوٰۃ میں نکالنا فرض ہوتا ہے۔

۲۔ دوسرا درجہ نفلی صدقات کا ہے، انسان جس ذریعے سے بھی کماتا ہو، اسے اپنی پاکیزہ اور حلال کمائی میں سے کچھ نہ کچھ مال اللہ تعالیٰ کے راستے میں بطور نفلی صدقے کے بھی خرچ کرتے رہنا چاہیے۔

• پیداوار میں عشر یا نصفِ عشر کی ادائیگی کا حکم

(۳).....اس آیت میں تیسری اہم بات: ﴿وَ مِمَّآ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ﴾ ہے، جس میں اللہ تعالیٰ فرما رہے ہیں کہ ''ہم نے تمہارے لیے زمین سے جو پیداوار نکالی ہے،'' یعنی زرعی پیداوار، اس کا

کچھ حصہ اللہ کے راستے میں خرچ کرو۔ جس طرح انسان کی دیگر آمدنی پر زکوٰۃ فرض کی گئی ہے اسی طرح زمین سے حاصل شدہ پیداوار میں عشر واجب کیا گیا ہے، لہٰذا اس آیت کے ذریعے کہا جارہا ہے کہ اپنی پیداوار کا عشر بھی ادا کیا کرو۔ اس میں یہ سمجھ لینا چاہیے کہ زرعی پیداوار کے لحاظ سے زمینوں کی دو قسمیں ہوتی ہیں:

۱- عشری زمینیں (جن پر عشر یا نصفِ عشر واجب ہوتا ہے۔)

۲- خراجی زمینیں (جن زمینوں پر خراج واجب ہوتا ہے۔)(۱)

عشری زمینوں میں سے ایسی بارانی زمینیں جن کے اندر آب پاشی کے لیے کوئی خاص انتظام کرنے کی ضرورت نہ ہوتی ہو، بلکہ بارش سے سیراب ہوجاتی ہوں تو ان میں پیداوار کا دسواں حصہ نکالنا ہوتا ہے جسے ''عشر'' کہا جاتا ہے، اور اگر وہ زمینیں بارانی نہ ہوں نہر سے یا کنویں سے سیراب ہوتی ہوں تو اس کا بیسواں حصہ نکالنا ہوتا ہے، اس کو ''نصفِ عشر'' کہا جاتا ہے۔ اس عشر کا حکم زکوٰۃ جیسا ہے، لہٰذا اسے مصارفِ زکوٰۃ میں ہی خرچ کیا جائے گا۔

مال کی زکوٰۃ اور پیداوار کے عشر کی بیان کردہ یہ مقدار فرض ہے، لیکن فرض مقدار کے علاوہ بھی اپنی آمدنی کا کچھ حصہ نکال کر اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنے کا بڑا اجر وثواب ہے اور مستحب یہ ہے کہ آدمی صرف اپنی زکوٰۃ اور عشر نکالنے پر ہی اکتفا نہ کرے، بلکہ زکوٰۃ اور عشر کے علاوہ بھی اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کرنے کا اہتمام کرتا رہے۔

• پاکیزہ کمائی کا مفہوم اور اس میں سے صدقہ کرنے کا حکم

(۴).....چوتھی بات جو اس آیت میں قابلِ غور ہے وہ ﴿مِنْ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ﴾ کے الفاظ ہیں، یعنی اپنی کمائی میں سے طَیِّبٰت (پاکیزہ اور اچھی چیزیں) اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کیا کرو۔ اب پاکیزہ کے دو مفہوم ہیں؛

۱- وہ حلال ہو، حرام چیز کا صدقہ کرنے کا کوئی ثواب نہیں ملتا، جیسا کہ پیچھے تفصیل سے عرض کیا جاچکا

---

(۱) جس زمین کو مسلمان فتح کرنے کے بعد صلح کے ذریعے، ان کے اصل مالکان کے حوالے کرکے اس کی پیداوار کا ایک مخصوص حصہ ان سے لیں یا اس زمین پر مخصوص ٹیکس عائد کردیں تو اس کو اصطلاح شریعت میں ''خراج'' کہتے ہیں اور ایسی زمینوں کو خراجی زمینیں کہا جاتا ہے۔ (مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: ''اسلام کا نظامِ اراضی'' صفحہ: ۱۵۵۔ از: مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ۔)

ہے۔ (۱)

۲-وہ چیز اچھی ہو، بیکار اور نکمی نہ ہو، ایسی چیز ہو جو لینے والے کے لیے کار آمد ہو۔ اس دوسرے مفہوم کو اللہ تعالیٰ نے اگلے جملے میں اور زیادہ واضح کر کے بیان کر دیا ہے۔

چنانچہ فرمایا: ﴿وَ لَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيْثَ مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ﴾ ''اور یہ نیت نہ رکھو کہ بس ایسی خراب قسم کی چیزیں ہی اللہ کے نام پر دیا کرو گے،'' یعنی جو گھٹیا اور خراب چیزیں ہیں اسی میں سے اللہ کے نام پر دینے کا قصد نہ کرو، بلکہ اللہ تعالیٰ کے راستے میں خوب اچھی چیز دیا کرو۔ ایسا نہ ہو کہ اپنے پاس اعلیٰ درجے کی چیزیں اور اچھا مال موجود ہو، لیکن جب اللہ تعالیٰ کے راستے میں دینے کا وقت آئے یا کسی غریب کی مدد کرنے کا وقت آئے تو اسے گلی سڑی، نکمی اور بے کار قسم کی چیزیں دی جائیں، جیسے اردو میں مثل مشہور ہے کہ ''مری ہوئی بھیڑ اللہ کے نام کی'' یعنی سب سے کمتر چیز اللہ کے نام پر دے دی جاتی ہے، اللہ تعالیٰ فرما رہے ہیں کہ یہ طریقہ درست نہیں ہے۔

یہاں پر ﴿وَ لَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيْثَ مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ﴾ میں ''مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ'' کے جو الفاظ ہیں، عربی زبان کے قواعد کے لحاظ سے ان کے معنیٰ یہ ہیں کہ ''اسی میں سے تم خرچ کرو۔'' جس سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ خرچ کرنے والے نے دل میں یہ نیت رکھی ہوئی ہے کہ جب بھی خرچ کروں گا تو گھٹیا چیز ہی دوں گا، اس طرزِ عمل کی ممانعت ہے، البتہ اگر کسی شخص کے پاس اعلیٰ درجے کی بھی چیزیں موجود ہیں، درمیانی درجے کی بھی موجود ہیں، اور گھٹیا بھی موجود ہیں، تو اگر وہ ہر قسم میں سے کچھ کچھ دیتا ہے تو پھر اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔ اسی طرح اگر کسی کے پاس صرف گھٹیا ہی گھٹیا چیزیں ہیں، بڑھیا ہے ہی نہیں، تو بے شک اگر وہ اس میں سے ہی دیتا ہے، تو ان شاء اللہ اس پر بھی اسے اجر و ثواب ملے گا، کیونکہ اس کے پاس ہے ہی یہی، اس لیے اس کے اس عمل پر کوئی گرفت نہیں۔

• راہِ خدا میں گھٹیا چیز دینے سے بچنے کی تلقین

(۵).....اس آیت میں پانچواں اہم نکتہ ﴿وَ لَسْتُمْ بِاٰخِذِيْهِ اِلَّاۤ اَنْ تُغْمِضُوْا فِيْهِ﴾ کے ذریعے

(۱) دیکھیے آیت نمبر ۲۶۱ کی تفسیر و تشریح

بیان کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے پہلے اپنے راستے میں اچھی چیز خرچ کرنے کی ترغیب دینے کے بعد بری اور گھٹیا چیز دینے کی برائی کو بڑے حکیمانہ انداز میں انسان کی نفسیات سے قریب تر کرکے سمجھاتے ہوئے فرمایا کہ اگر تم یہ چاہتے ہو کہ میں خراب، گلی سڑی اور نکمی چیزیں ہی صدقے میں دیا کروں، تو ذرا یہ سوچو کہ اگر تمہیں کوئی شخص ہدیہ دینا چاہے، اور وہ گلی سڑی، نکمی اور خراب چیزیں لاکر تمہیں ہدیہ میں دے دے تو کیا تم اسے لینا پسند کرو گے؟

ظاہر ہے کہ ﴿لَسْتُمْ بِاٰخِذِيْهِ﴾ تم اسے لینا پسند نہیں کرو گے ﴿اِلَّآ اَنْ تُغْمِضُوْا فِيْهِ﴾ ''اِلّا یہ کہ تم اس سے آنکھیں میچ لو،'' یعنی اگر کوئی دوسرا تمہیں کوئی ایسی گھٹیا چیز تمہارے واجب حق کے عوض یا ویسے ہی تحفہ میں دینے لگے تو تم نفرت کے مارے اس سے آنکھیں میچ لو گے۔ ایسی خراب چیزیں جن کو تم خود لینا پسند نہ کرو اور اگر لینا بھی پڑ جائے تو ان سے آنکھیں میچ لو، ایسی چیزیں دوسروں کو صدقے میں دینے سے کیا فائدہ؟

﴿وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ ۝۲۶۷﴾ ''اور یاد رکھو کہ اللہ ایسا بے نیاز ہے کہ ہر قسم کی تعریف اسی کی طرف لوٹتی ہے۔'' اللہ تعالیٰ چونکہ ''غَنِيٌّ'' یعنی بے نیاز ہے، اس لیے تمہیں وہ صدقہ کرنے کا یا صدقہ میں اچھی چیزیں دینے کا جو حکم دے رہا ہے، یہ کوئی اپنی احتیاج اور ضرورت کی وجہ سے نہیں دے رہا، بلکہ وہ یہ حکم تمہارے ہی فائدے کے لیے دے رہا ہے، لہٰذا تم اسے اپنے ہی مفاد میں سمجھو اور اسی کے مطابق عمل کرو، اور چونکہ باری تعالیٰ ''حَمِيْدٌ'' ہے، یعنی ذات و صفات کے اعتبار سے قابلِ تعریف اور کامل و اکمل ہے، لہٰذا اس کے دربار میں پیش کی جانے والی چیز بھی کامل اور قابلِ تعریف ہونی چاہیے۔

• مال خرچ کرنے میں شیطان کا ڈراوا اور اللہ تعالیٰ کا وعدہ

اللہ تعالیٰ کے راستے میں مال خرچ کرنے میں ایک بڑی رکاوٹ فقر و فاقے کا احساس ہوتا ہے۔ بعض اوقات آدمی یہ سوچتا ہے کہ اگر میں نے صدقہ دے دیا یا خیر کے کسی کام میں مال صرف کر دیا تو میں فقیر اور دوسروں کا محتاج ہو جاؤں گا، اور اس کی وجہ سے بعض اوقات وہ اچھے مصرف میں خرچ کرنے سے بھی محروم رہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ انسان کی اس بنیادی نفسیاتی کمزوری کو دور کرنے کے لیے فرماتے ہیں: ﴿اَلشَّيْطٰنُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ﴾ ''شیطان تمہیں مفلسی سے ڈراتا ہے،'' یعنی تمہارے دل میں یہ خوف پیدا کرتا ہے کہ اگر تم نے خرچ کر دیا تو تمہارے مال میں کمی واقع ہو جائے گی اور کل کو تمہارے پاس کچھ بھی نہیں بچے گا۔ فقر کا خوف دلانے کے ساتھ ساتھ ﴿وَيَاْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَآءِ﴾ ''اور شیطان تمہیں بے حیائی کے کاموں کا حکم بھی

دیتا ہے،'' یعنی ایک طرف صدقہ کرنے کی صورت میں مفلسی کا خوف دلا کر نیک کام میں رکاوٹ بنتا ہے، اور دوسری طرف بے حیائی کے کاموں میں خوب بڑھ چڑھ کر خرچ کرنے کی ترغیب دیتا اور گناہوں پر ابھارتا ہے۔

اس کے برخلاف ﴿وَاللّٰهُ يَعِدُكُمْ مَّغْفِرَةً مِّنْهُ وَفَضْلًا﴾ ''اور اللہ تم سے اپنی مغفرت اور فضل کا وعدہ کرتا ہے۔'' شیطان تو تمہیں فقر اور مفلسی سے ڈرا رہا ہے، لیکن اللہ تبارک وتعالیٰ تم سے یہ وعدہ کر رہے ہیں کہ اگر تم میری خوشنودی کے لیے مال خرچ کرو گے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ میں تمہارے گناہوں کی مغفرت کر دوں گا، اور صرف مغفرت ہی نہیں کروں گا بلکہ میں تمہیں اپنے فضل سے بھی نوازوں گا۔

• خرچ کرنے پر مغفرت کے ساتھ ساتھ فضل کا وعدہ

یہاں پر ﴿وَاللّٰهُ يَعِدُكُمْ مَّغْفِرَةً مِّنْهُ وَفَضْلًا﴾ میں ''فضل'' کا لفظ فرمایا گیا ہے۔ ''فضل'' کے اصل معنیٰ ''زیادتی'' کے ہوتے ہیں، یعنی کوئی بھی چیز جو دوسری چیز سے زیادہ ہو، اسے فضل کہا جاتا ہے۔ اگر آخرت میں انسان کی مغفرت ہوجائے اور اس کے سارے گناہ معاف ہوجائیں، تو یہ بھی اس کے لیے بڑی نعمت ہے، لیکن اللہ تبارک وتعالیٰ صرف مغفرت پر ہی اکتفا نہ فرمائیں گے، بلکہ اس کے ساتھ ساتھ اپنی طرف سے مزید انعام واکرام سے بھی نوازیں گے، یہ اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں پر فضل وکرم ہوگا۔ اس فضل میں بہت سی چیزیں شامل ہیں، مثلاً اس میں جنت شامل ہے، اللہ تعالیٰ کی رضا مندی شامل ہے اور اللہ تعالیٰ کا دیدار بھی شامل ہے، لہٰذا اپنے راستے میں خرچ کرنے کے صلے کے طور پر اللہ تعالیٰ تم سے ان ساری چیزوں کا وعدہ فرما رہے ہیں۔

﴿وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿٢٦٨﴾﴾ ''اور اللہ بڑی وسعت والا، (اور) خوب جاننے والا ہے۔'' وسعت والا ہے، لہٰذا اس کے دینے میں کبھی کمی نہیں ہوسکتی، جب دے گا تو بے حساب دے گا۔ اور چونکہ باری تعالیٰ ''عَلِيْم'' ہے، لہٰذا وہ یہ بھی جانتا ہے کہ کس نے دیا ہے؟ کس نیت سے دیا ہے؟ واقعتاً اللہ کی رضا مندی کے لیے دیا ہے یا ریا کاری کے لیے دیا ہے؟ یہ ساری باتیں اللہ تعالیٰ خوب اچھی طرح جانتا ہے، لہٰذا اگر تم اخلاص کے ساتھ کوئی چیز دو گے تو اپنی وسعت کے حساب سے وہ تمہیں اپنے انعام وکرم سے نوازے گا۔

• حکمت و دانائی کی خصوصی نعمت اور اس کے فوائد

خرچ کرنے کے فضائل و آداب سے متعلق پیچھے جتنی باتیں کہی گئی ہیں، انہیں وہی سمجھ سکتا ہے جسے حکمت و دانائی اور دین کا فہم عطا کر دیا گیا ہو، چنانچہ فرمایا: ﴿يُؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَّشَآءُ﴾ ''اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے حکمت و دانائی عطا کر دیتا ہے،'' اور سچ تو یہ ہے کہ ﴿وَ مَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ﴾ اور جس کو حکمت دانائی عطا کر دی گئی ﴿فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا﴾ ''تو اسے بہت ساری بھلائی عطا ہوگئی،'' دنیا کی کوئی نعمت اس کے برابر نفع بخش نہیں ہوسکتی۔ جس چیز کو باری تعالیٰ خود ''خیرِ کثیر'' فرما رہے ہوں، اس کے نعمتِ عظمیٰ ہونے میں کیا شک ہوسکتا ہے؟

یہاں پر جو'' حکمت'' کا لفظ استعمال کیا گیا ہے یہ بڑا عام لفظ ہے، اگر ایک لفظ میں اس کا ترجمہ کرنا چاہیں تو ''دانائی کی باتیں'' سے کر سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ حکمت بڑی بھلائی کی چیز ہے اور وہ جسے چاہتے ہیں عطا فرما دیتے ہیں۔ حکمت میں دانائی کی ساری باتیں آگئیں، دانائی کی سمجھ بھی، اس کی پہچان بھی کہ کون سا کام اچھا ہے اور کون سا کام برا ہے اور پھر اس دانائی کی بات پر عمل کرنے کا طریقہ بھی، یہ ساری باتیں حکمت کے مفہوم میں داخل ہیں۔ اگر کسی بندے کو حکمت عطا ہو جاتی ہے، تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ شیطان کی باتوں میں نہیں آتا، وہ شیطان جو اسے اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کرنے سے روکنے کے لیے مفلسی سے ڈرا رہا ہے اور دوسری طرف اسے بے حیائی کے کاموں پر آمادہ کر کے وہاں خرچ کرنے کا حکم دے رہا ہے، تو ایسا شخص اس کی چالبازیوں میں نہیں آئے گا۔

جب حکمت عطا ہو جاتی ہے تو پھر آدمی یہ سمجھتا ہے کہ جو کچھ میں اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کر رہا ہوں یہ میرے مال میں کمی نہیں لا رہا، بلکہ یہ میرے لیے ایک طرف تو آخرت میں ذخیرہ بن رہا ہے، وہاں جا کر مجھے اس کا سینکڑوں گنا اجر ملنے والا ہے اور دوسری طرف دنیا کے اندر بھی اللہ تبارک وتعالیٰ اپنی راہ میں خرچ کرنے والوں کو کبھی فقر وفاقے کا شکار نہیں بناتے، بلکہ ان کے مال میں وسعت و برکت عطا فرماتے ہیں، چنانچہ اس حکمت کے نتیجے میں وہ اللہ تعالیٰ کے راستے میں دل کھول کر خرچ کرتا ہے۔

﴿وَ مَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ ﴿۲۶۹﴾﴾ ''اور نصیحت وہی لوگ حاصل کرتے ہیں جو سمجھ کے مالک ہیں،'' اور جو سمجھ کے مالک نہیں ہیں، وہ تو گنتی کے پیچھے ہی پڑے رہتے ہیں کہ گنتی کتنی زیادہ ہوئی، کتنی کم ہوئی، لیکن جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے حکمت عطا فرمائی ہے اور حکمت کے نتیجے میں وہ سمجھ اور دانائی کے مالک

ہیں، وہ گنتی کے پیچھے پڑنے کے بجائے یہ سوچتے ہیں کہ گنتی میں اگرچہ کمی واقع ہوجائے، لیکن اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے ہمارے اجر میں ضرور اضافہ ہوگا اور دنیا کے اندر ہمارے کام میں برکت بھی ہوگی۔

• صدقہ ونذر کی ہر صورت سے باری تعالیٰ واقف ہیں

پھر آگے فرمایا: ﴿وَمَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ نَّفَقَةٍ﴾ اورتم جو کچھ خرچ کرو ﴿اَوْ نَذَرْتُمْ مِّنْ نَّذْرٍ﴾ یا کوئی مَنّت مانو ﴿فَاِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُهٗ﴾ ''اللہ اسے جانتا ہے۔'' صدقہ خواہ فرض ہو یا نفل، تھوڑا ہو یا زیادہ، دکھلاوے کے لیے ہو یا اخلاص سے، پاکیزہ مال سے ہو یا حرام مال سے، اس سب سے اللہ تعالیٰ واقف ہے، اسی طرح نذر خواہ اللہ کے لیے مانی ہو یا غیر اللہ کے لیے، بدنی عبادت کی مانی ہو یا مالی عبادت کی، سب چیزیں اللہ تعالیٰ کو معلوم ہیں اور وہ اس کے مطابق بدلہ عطا فرمائے گا۔ ﴿وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ۝۲۷۰﴾ ''اور جو لوگ ظلم کرنے والے ہیں ان کا کوئی مددگار نہیں ہوگا'' یعنی جو لوگ صدقہ کرنے کے بجائے لوگوں پر ظلم کرتے ہیں، لوگوں کے حقوق مارتے ہیں، تو آخرت میں جب وہ پہنچیں گے تو انہیں کسی قسم کے مددگار میسر نہیں آئیں گے۔

• صدقہ مخفی انداز میں کرنا بہتر ہے

اگلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے صدقہ علی الاعلان یا خفیہ طریقے سے کرنے سے متعلق ایک اہم مسئلہ بیان کرتے ہوئے فرمایا: ﴿اِنْ تُبْدُوا الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا هِيَ﴾ ''اگر تم صدقات کو ظاہر کرکے دو تب بھی اچھا ہے،'' یعنی بذاتِ خود ظاہر کرکے دینے میں کوئی گناہ نہیں ہے، ﴿وَاِنْ تُخْفُوْهَا وَتُؤْتُوْهَا الْفُقَرَآءَ﴾ اور اگر تم ان صدقات کو چھپا کر فقراء کو دو تو ﴿فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ﴾ ''وہ تمہارے لیے زیادہ بہتر ہے۔'' مطلب یہ ہے کہ اگرچہ جائز تو دونوں باتیں ہیں، علانیہ دینے میں بھی کوئی گناہ نہیں ہے اور چھپا کر دینے میں بھی کوئی گناہ نہیں ہے، لیکن چھپا کر دینے میں فضیلت زیادہ ہے۔

صدقہ چھپا کر دینے میں اس لیے زیادہ فضیلت ہے کہ اس میں نہ تو ریا کاری یا نام ونمود کا کوئی احتمال ہوتا ہے، اور نہ لینے والے کے لیے سبکی یا شرمندگی کا سبب بنتا ہے۔ اگر آپ کسی آدمی کو علی الاعلان، مجمعِ عام کے سامنے صدقہ دیں تو اس میں ایک تو اس بات کا احتمال ہے کہ آپ یہ کام نام ونمود اور شہرت کی خاطر انجام

رہے ہوں اور دوسرے یہ کہ جس آدمی کو مجمعِ عام کے سامنے صدقہ دیا جائے گا، اس میں اس کی سبکی ہوگی اور وہ صدقہ لیتے ہوئے شرم محسوس کرے گا، یہ دونوں باتیں صدقے کے اس عمل کو نامناسب یا ناجائز بنا سکتی ہیں۔ اگر بالکل کھلم کھلا ریا کاری کی نیت ہو تو بالکل ہی ناجائز اور حرام ہوگا اور اگر ریا کاری کی نیت تو نہ ہو، لیکن جس کو دیا جارہا ہے وہ اس میں اپنی سبکی محسوس کررہا ہے، تو یہ کم از کم کراہت سے خالی نہیں ہوگا۔

ہاں! اگر یہ دونوں باتیں نہ ہوں، تو بوقتِ ضرورت مناسب طریقے سے اعلانیہ انداز میں صدقہ دینے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں ہے، لیکن اس کے باوجود ہر حالت میں بہتر یہی ہے کہ چھپا کر دیا جائے، تاکہ ہر قسم کا خدشہ اس سے نکل جائے۔ اسی لیے ایک حدیث شریف میں، جن سات آدمیوں کا بتایا گیا کہ قیامت کے دن جب سوائے عرشِ الٰہی کے کوئی اور سایہ نہ ہوگا تو وہ لوگ عرش کے سایے میں ہوں گے، ان میں سے ایک خفیہ صدقہ کرنے والا بھی ہوگا:

وَرَجُلٌ تَصَدَّقَ بِصَدَقَةٍ فَأَخْفَاهَا حَتَّى لاَ تَعْلَمَ شِمَالُهُ مَا تُنْفِقُ يَمِيْنُه. (۱)

وہ شخص جو اللہ تعالیٰ کے راستے میں اس طرح خرچ کرتا ہے کہ اس کا دایاں ہاتھ جو کچھ خرچ کرتا ہے تو بائیں ہاتھ کو بھی پتا نہیں چلتا کہ اس نے کیا خرچ کیا ہے؟

اس حدیث سے بھی معلوم ہوا کہ چھپ کر صدقہ کرنے میں زیادہ فائدہ ہے۔ آگے فرمایا: ﴿وَيُكَفِّرُ عَنْكُمْ مِّنْ سَيِّاٰتِكُمْ﴾ ''اور اللہ تمہاری برائیوں کا کفارہ کردے گا'' یعنی جب تم اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کروگے تو اس کی برکت سے اللہ تبارک وتعالیٰ تمہارے جو چھوٹے موٹے گناہ ہیں، اللہ تبارک وتعالیٰ ان گناہوں کو خود بخود معاف فرمادیں گے، کیونکہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے صدقے میں خاص طور پر گناہوں کی معافی کی خاصیت اور صلاحیت رکھی ہے، چنانچہ حدیث میں فرمایا:

وَالصَّدَقَةُ تُطْفِئُ الخَطِيئَةَ كَمَا يُطْفِئُ المَاءُ النَّارَ (۲)

---

(۱) صحيح البخاري (۲/۱۱۱) (۱۴۲۳) كتاب الزكاة - باب الصدقة باليمين.

(۲) أخرجه الترمذي في "سننه" (۲/۵۱۴) (۶۱۴) وقال: "هذا حديث حسن غريب من هذا الوجه." باب ما ذكر في فضل الصلاة. وأحمد في "مسنده" (۲۳/۴۲۵) (۱۵۲۸۴) وقال الهيثمي في "المجمع" (۵/۲۴۷) بعد نقل هذا الحديث: "رواه أحمد والبزار وزاد: لا يدخل الجنة لحم نبت من سحت، النار أولى به، ورجالهما رجال الصحيح."

صدقہ گناہ کو ایسے بجھا دیتا ہے جیسے پانی آگ کو بجھا دیتا ہے۔

﴿وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿٢٧١﴾﴾ ''اور اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال سے باخبر ہے۔'' اللہ تبارک وتعالیٰ بکثرت اپنے احکام و ہدایات کے آگے پیچھے یہ بات ارشاد فرماتے رہتے ہیں کہ جو کچھ تم کر رہے ہو، اللہ تعالیٰ سب سے باخبر ہے، اس سے اس طرف متوجہ کرنا مقصود ہوتا ہے کہ جو کام بھی کرو، اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے اور اسی طریقہ سے کرو جس طریقے سے اللہ تعالیٰ نے تمہیں حکم دیا ہے، نیز اس میں خفیہ انداز میں صدقہ کرنے کی ترغیب بھی ہے کہ تم جو کچھ کسی کو دو گے اللہ تعالیٰ اس سے واقف ہے۔

• غیر مسلموں کو نفلی صدقہ دینے کی اجازت

آگے آنے والی آیت میں فرمایا گیا ہے کہ ﴿لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰىهُمْ﴾ ''ان (کافروں) کو راہِ راست پر لے آنا آپ کی ذمہ داری نہیں ہے۔'' اس آیت کا شانِ نزول مفسرینِ کرام[1] نے یہ بیان فرمایا ہے کہ بعض انصاری صحابہ کے کچھ غریب رشتے دار تھے، مگر چونکہ وہ کافر تھے اس لیے وہ ان کی مدد نہیں کرتے تھے، اور اسی انتظار میں رہتے تھے کہ وہ اسلام لے آئیں تو ان کی مدد کریں، اس لیے اس آیت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اور آپ کے واسطہ سے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ ﴿لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰىهُمْ﴾ ''اے پیغمبر! ان (کافروں) کو راہِ راست پر لانا آپ کی ذمے داری نہیں ہے۔'' اس میں مسلمانوں کو بتادیا گیا کہ آپ پر ان کے اسلام لانے کی کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی، لہٰذا وہ اسلام لائیں یا نہ لائیں اگر آپ ان غریب کافروں پر اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنے کی نیت سے کچھ خرچ کریں گے تو اس کا بھی پورا پورا ثواب مل جائے گا۔

﴿وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ﴾ ''لیکن اللہ جسے چاہتا ہے راہِ راست پر لے آتا ہے،'' آپ کا کام صرف ہدایت پہنچا دینا ہے۔ ﴿وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلِاَنْفُسِكُمْ﴾ ''اور جو مال بھی تم خرچ کرتے ہو وہ خود تمہارے فائدے کے لیے ہوتا ہے۔'' تمہیں اس سے کیا غرض کہ وہ کافر ہے یا مسلمان ہے؟ دینے کی حد

---

(۱) أخرجه الطبري في تفسيره (۵/۵۸۷) والنسائي في السنن الكبرى (۱۰/۳۸) (۱۰۹۸۶) كتاب التفسير، باب قوله تعالى: ﴿لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰىهُمْ﴾. وقال الحاكم في "المستدرك" (۲/۳۱۳) (۳۱۲۸) "هذا حديث صحيح الإسناد ولم يخرجاه".

تک تمہیں دونوں صورتوں میں ثواب ملے گا، ﴿وَ مَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ اللّٰهِ﴾ ''جبکہ تم اللہ کی خوشنودی طلب کرنے کے سوا کسی اور غرض سے خرچ نہیں کرتے۔'' جب تم اللہ تعالیٰ کی رضا مندی حاصل کرنے ہی کے لیے خرچ کر رہے ہو، کسی اور مقصد کے لیے خرچ نہیں کر رہے، تو چاہے وہ غیر مسلم ہوں، لیکن وہ ہیں تو غریب، ان غریبوں کی مدد کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے، اس پر تمہیں اجر ضرور ملے گا۔

یہاں یہ بات واضح رہے کہ یہ نفلی صدقے کی بات ہو رہی ہے، زکوٰۃ جو صدقاتِ واجبہ میں سے ہے، وہ غیر مسلم کو نہیں دی جا سکتی۔ حدیث میں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تشریح فرمادی کہ زکوٰۃ مسلمانوں سے ہی وصول کی جائے گی اور مسلمانوں پر ہی خرچ کی جائے گی۔(۱) لیکن زکوٰۃ کے علاوہ جو صدقات ہیں اور جن کی ترغیب ان آیاتِ کریمہ میں دی جا رہی ہے، اس میں مسلمان اور غیر مسلم کی کوئی تفریق نہیں ہے، جس طرح مسلمان کو دینے کی وجہ سے ثواب حاصل ہوتا ہے، اسی طرح غیر مسلم کو دینے سے بھی ثواب حاصل ہوتا ہے، بشرطیکہ مقصود اللہ کی رضا کی ہو۔ ﴿وَ مَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ يُّوَفَّ اِلَيْكُمْ﴾ ''اور جو مال بھی تم خرچ کرو گے وہ تمہیں پورا پورا دیا جائے گا،'' یعنی آخرت میں اس کا پورا پورا اجر ملے گا۔ ﴿وَ اَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ ۝۲۷۲﴾ ''اور تم پر کوئی ظلم نہیں ہوگا۔'' پس تمہیں اپنے ثواب سے مطلب رکھنا چاہیے، چاہے کافر کو صدقہ دو یا مسلمان کو، ان شاء اللہ ثواب ہر حال میں ملے گا۔

• اصحابِ صفہ اور ان کی خود داری کی چند صفات

پھر اللہ تبارک وتعالیٰ نے اگلی آیت میں صدقات کا ایک خصوصی مصرف بیان فرمایا ہے، اور حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت(۲) ہے کہ یہ آیت اصحابِ صفہ کے بارے میں نازل ہوئی۔ اصحابِ صفہ وہ صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین تھے جنہوں نے اپنی زندگی علمِ دین حاصل کرنے کے لیے وقف کردی تھی، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس مسجدِ نبوی سے متصل ایک چبوترے پر آپڑے تھے جسے صُفّہ کہا جاتا تھا۔ طلبِ علم کی وجہ سے وہ کوئی معاشی مشغلہ اختیار نہیں کر سکتے تھے، تاہم مفلسی کی سختیاں ہنسی خوشی برداشت کرتے تھے، اور کسی سے مانگنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس آیت نے یہ بتایا کہ ایسے لوگ امداد کے زیادہ مستحق ہیں،

---

(۱) صحيح البخاري (۲/۱۵۲) (۱۴۹۶) كتاب الزكاة، باب أخذ الصدقة من الأغنياء وترد في الفقراء حيث كانوا.

(۲) قال القاضي ثناء الله في تفسيره (۱/۳۹۲): "اخرج ابن المنذر عن ابن عباس هم اهل الصفة كانوا نحوا من اربعمائة رجل من فقراء المهاجرين..." أخرجه مقاتل بن سليمان في تفسيره (۲/۲۴۲). وذكره الحافظ ابن حجر في "العجاب" (۱/۶۳۳) طبع دار ابن الجوزي.

جو ایک نیک مقصد سے پوری امت کے فائدے کے لیے مقید ہوکر رہ گئے ہیں اور سختیاں جھیلنے کے باوجود اپنی ضرورت کسی کے سامنے ظاہر نہیں کرتے۔

چنانچہ فرمایا: ﴿لِلْفُقَرَآءِ﴾ یعنی مالی امداد کے بطورِ خاص مستحق وہ فقراء ہیں ﴿الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ﴾ جنہوں نے اپنے آپ کو اللہ کی راہ میں اس طرح مقید کر رکھا ہے کہ ﴿لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا فِي الْاَرْضِ﴾ ''وہ (معاش کی تلاش کے لیے) زمین میں چل پھر نہیں سکتے۔'' اس کے لفظی معنیٰ تو یہ بنتے ہیں کہ وہ زمین میں چل پھر نہیں سکتے، لیکن ہم نے یہاں ''معاش کی تلاش کے لیے'' کے تشریحی الفاظ بڑھائے ہیں، اور اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں یہ مراد نہیں ہے کہ انہیں زمین پر چلنے پھرنے سے کوئی جسمانی رکاوٹ ہے، جس کی وجہ سے وہ چل پھر نہیں سکتے، بلکہ مراد یہ ہے کہ چونکہ وہ علمِ دین حاصل کرنے کے لیے اپنے آپ کو وقف کر چکے ہیں اور اسی مقصد کے تحت نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں آپڑے ہیں، تو اب معاش کی تلاش کے لیے زمین میں چلنا پھرنا ان کے لیے ممکن نہیں رہا۔

﴿يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِيَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ﴾ ''چونکہ وہ اتنے پاک دامن ہیں کہ کسی سے سوال نہیں کرتے، اس لیے ناواقف آدمی انہیں مال دار سمجھتا ہے،'' یعنی وہ اپنی حالت اس طرح رکھے ہوئے ہیں کہ کسی کو ان کی حاجت کا پتہ نہ چلے، وہ اتنے خوددار اور اتنے غیرت مند ہیں کہ کسی کے سامنے دستِ سوال کیا دراز کرتے؟ وہ تو اپنے آپ کو رکھتے بھی اس طرح ہیں کہ دیکھنے والا انہیں مالدار سمجھے، اور انہوں نے اپنی جو ہیئت بنائی ہوئی ہے اس کی وجہ سے وہ دیکھنے میں لوگوں کو مالدار نظر آتے ہیں، یہ ''مِنَ التَّعَفُّفِ'' یعنی اپنی پاک دامنی یا سوال سے بچنے کی وجہ سے ہے، یعنی ان کے دل اتنے صاف ستھرے اور پاکیزہ ہیں اور وہ خود اتنے پاکدامن اور اتنے غیرت مند ہیں کہ انہوں نے اپنے آپ کو ظاہری اعتبار سے بھی ایسا رکھا ہوا ہے جیسے مالدار ہوں، تاکہ ان کی حالت کسی پر ظاہر نہ ہو۔

پھر فرمایا: ﴿تَعْرِفُهُمْ بِسِيْمٰهُمْ﴾ ''البتہ تم انہیں چہرے کی علامتوں سے پہچان سکتے ہو،'' یعنی انہوں نے اپنی ظاہری حالت تو مالداروں جیسی بنا رکھی ہے، لیکن بعض اوقات بھوک کی شدت کے اثرات ان کے چہرے سے نظر آجاتے ہیں جس سے لوگ ان کی کیفیت کا اندازہ لگا لیتے ہیں۔ فقر و فاقہ کے سبب چہرے اور بدن میں کچھ نہ کچھ کمزوری ضرور ظاہر ہوجاتی ہے جس سے ان کی حالت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے، ورنہ ان کی ظاہری حالت اور ان کے انداز و ادا سے کہیں یہ محسوس نہیں ہوتا کہ وہ کچھ مانگنا چاہتے ہیں، یا حاجت مند ہیں۔

﴿تَعْرِفُهُمْ بِسِيْمٰهُمْ﴾ کے معنیٰ یہ بھی ہوسکتے ہیں[1] کہ تم ان کی علامتوں سے انہیں پہچان سکتے ہو، یعنی اللہ تعالیٰ نے ان کے چہروں پر اپنے خوف وخشیت کا ایسا نور رکھا ہے، کہ اس سے تم پہچان لوگے کہ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنی زندگی اللہ تعالیٰ کا دین حاصل کرنے کے لیے وقف کردی ہے۔

• حاجت کے باوجود نہ مانگنا پسندیدہ ہے

ایک تو یہ لوگ اپنی ظاہری حالت سے اپنی کیفیت کا اندازہ نہیں ہونے دیتے اور پھر دوسرے یہ کہ ﴿لَا يَسْـَٔلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا﴾ ''یہ لوگوں سے لگ لپٹ کر بھی سوال نہیں کرتے،'' کہ جس سے انہیں کوئی حاجت مند سمجھے، ورنہ اکثر لوگ جو مانگنے کے عادی ہوتے ہیں وہ لپٹ کر مانگتے ہیں۔ اس میں بتادیا کہ یہ بڑا اچھا وصف ہے کہ آدمی باوجود حاجت کے اپنا ہاتھ کسی اور کے سامنے نہ پھیلائے۔

یہاں پر ان کا جو ایک وصف ''لپٹ کر سوال نہ کرنا'' بیان کیا گیا ہے، اس کے معنیٰ یہ نہیں کہ وہ لوگوں سے بغیر لپٹے سوال کرلیتے ہیں، بلکہ یہ بات ایک محاورہ کے طور پر کہی گئی ہے، جیسے عام طور پر فقیروں یا بھیک مانگنے والوں کی عادت ہوتی ہے کہ وہ لگ لپٹ کر سوال کرتے ہیں، یہ لوگ اس قسم کے نہیں ہیں، یہ سوال کرتے ہی نہیں ہیں، لہٰذا ﴿وَ مَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ﴾ تم جو کچھ بھی مال خرچ کروگے ﴿فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ۝۲۷۳﴾ ''تو اللہ تعالیٰ اسے جانتا ہے،'' یعنی ان لوگوں کی خدمت کرنے کے لیے تم جو کچھ مال بھی خرچ کروگے تو بے شک اللہ تعالیٰ کو اس کی خوب اطلاع ہے اور وہ دوسروں کو دینے کے مقابلے میں انہیں دینے سے اور ان پر خرچ کرنے سے، تمہیں زیادہ ثواب عطا فرمائے گا۔

• معیشت کے ظاہری اسباب کو چھوڑ کر دینی کام میں لگنے کی شرائط

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے صدقات وخیرات کا ایک خاص مصرف بتاتے ہوئے اصحابِ صفہ کا نام لیے بغیر ان کی چند صفات بیان فرمادی ہیں، جس سے بتلانا یہ مقصود ہے کہ یہ صفات آئندہ بھی جن لوگوں کے اندر پائی جائیں گی وہ تمہارے صدقات وزکوٰۃ کے زیادہ مستحق ہوں گے، اصحابِ صفہ کی بیان کردہ صفات کی ذیل میں کچھ تفصیل ذکر کی جاتی ہے:

---

(۱) تفسیر الطبری = جامع البیان (۵۹۷/۵) ''وقد یجوز أن تکون تلك السیما کانت تخشعاً منهم''

(۱).....پہلی بات تو یہ ہے کہ ان کا تذکرہ کرتے ہوئے باری تعالیٰ نے فرمایا: ﴿الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ﴾ ''انہوں نے اپنے آپ کو اللہ کے راستے میں مقید کررکھا ہے،'' یعنی کسی دینی کام کی وجہ سے انہوں نے اپنے آپ کو اس طرح مقید کرلیا ہے کہ اپنے معاش کی تلاش کا ان کے پاس وقت ہی نہیں ہے۔ یہاں یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ آدمی کے لیے اپنی معاشی سرگرمی سے کنارہ کش ہوکر اپنے آپ کو کسی دین کے کام کے لیے وقف کرنے کی یہ صورت اسی وقت جائز ہوتی ہے جبکہ:

- ایک تو خود اس کے اندر اتنا توکّل اور اتنی طاقت ہو کہ اگر اس حالت میں فقر و فاقہ بھی پیش آجائے، تو وہ اسے خندہ پیشانی سے برداشت کرلے، لیکن کسی کے سامنے دستِ سوال دراز کرنا اسے برداشت نہ ہو، جیسی بھی حالت گزرے، وہ صبر وشکر کے ساتھ اسے گزارنے پر قادر ہو۔
- اور دوسرے یہ کہ اس کے کوئی بیوی بچے بھی نہ ہوں، جن کی ذمہ داری اس کے سر ہو، یا ہوں تو عاقل بالغ ہوں اور ان کے جذبات بھی ایسے ہی ہوں کہ وہ بخوشی فقروفاقہ کے لیے تیار ہوں۔

ایسا شخص اگر اپنے آپ کو معاشی مشغلے سے فارغ کرکے کسی دینی کام، تعلیم وتبلیغ یا دعوت و جہاد میں لگ جائے، تو بے شک اس کے لیے ایسا کرنا نہ صرف جائز ہے، بلکہ قابلِ تعریف، بہتر اور بہت زیادہ اجروثواب کا مُوجب ہے، لیکن جس شخص کے پیچھے بیوی بچے ہیں، ان کی کفالت اس کی ذمے داری ہے، تو اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ پہلے ان کے لیے معیشت کا بندوبست کرے۔ اسی طرح اگر کسی کے بیوی بچے تو نہ ہوں، لیکن اس میں خود فقر و فاقہ سہنے کی طاقت نہ ہو اور اسے اندیشہ ہو کہ اگر میں معیشت کو تلاش کرنے سے ہٹ کر اپنے آپ کو دینی کام میں مصروف کروں گا تو کسی وقت مجھے لوگوں سے سوال کرنے کی ضرورت پیش آجائے گی، تو دونوں صورتوں میں کسی کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ معیشت کے ظاہری ذرائع کو چھوڑ کر اپنے آپ کو دین کے کسی کام کے لیے وقف کرے۔

اصحابِ صفہ وہ حضرات تھے جن کے ذمہ نہ کسی دوسرے کی کفالت تھی اور نہ انہیں یہ اندیشہ تھا کہ ہمیں بھوک ستائے گی تو ہم کہیں جاکر ہاتھ پھیلایا کریں گے۔ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہر صورتِ حال پر راضی تھے، اس لیے اللہ تبارک وتعالیٰ ان کی حاجات بھی غیب سے پوری فرمادیا کرتے تھے، لیکن ہر انسان اپنے آپ کو اُن پر قیاس کرکے ایسا نہیں کرسکتا۔ اللہ تعالیٰ نے دنیا میں زندگی گزارنے کے جو ظاہری اسباب مقرر فرمائے ہیں، ان میں سے یہ بھی ہے کہ:

طَلَبُ كَسْبِ الْحَلَالِ فَرِيضَةٌ بَعْدَ الْفَرِيضَةِ (۱)

یعنی رزقِ حلال کمانے کی کوشش کرنا، یہ بھی فرائضِ عبادات کے بعد دوسرے نمبر کا فریضہ ہے۔

انسان کے ذمے لازم ہے کہ وہ اپنے لیے، اپنے بیوی بچوں کے لیے، اپنے زیرِ کفالت افراد کے لیے حلال کمائے۔ اس لیے اصحابِ صُفہ کے واقعے سے کوئی غلط نتیجہ نہ نکالنا چاہیے، اور یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ یہ بات ہر شخص کے لیے ہر حالت میں پسندیدہ ہے کہ اپنا روزگار چھوڑ کر اپنے آپ کو دین کے کام کے لیے وقف کرلے۔

• دوسروں کے سامنے اپنی ضرورت ظاہر نہ کرنا ہی اولیٰ ہے

(۲).....دوسری بات یہ کہ اصحابِ صفہ کی جس بات کی تعریف کی گئی ہے، وہ ان کا دوسروں کے سامنے اپنی احتیاج و ضرورت کا ظاہر نہ کرنا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِيَآءَ﴾ ''ناواقف آدمی انہیں مال دار سمجھتا ہے۔'' یہ بڑی فضیلت کی بات ہے کہ انسان دوسروں کے سامنے اپنی احتیاج ظاہر نہ کرے، اور ان کے سامنے اپنے آپ کو مالداروں جیسا رکھے، چاہے کسی کی آمدنی کتنی ہی کم کیوں نہ ہو، البتہ اس کے ساتھ ساتھ دینے والوں کو بھی چاہیے کہ زکوۃ اور صدقات میں اس قسم کے سفید پوش لوگوں کو ترجیح دیں جو کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلاتے اور ان کی ظاہری حالت سے بھی ان کی احتیاج کا پتہ نہیں چلتا۔ دینے والوں کے لیے انہیں ترجیح دینا زیادہ بہتر ہے، جیسا کہ یہاں پر بھی آیت کے آخر میں اصحابِ صفہ پر خرچ کرنے کی ترغیب دیتے ہوئے فرمایا گیا کہ ''تم جو کچھ بھی بھلائی کی چیز خرچ کرتے ہو، اللہ اسے خوب جانتا ہے۔''

قرآنِ کریم کی زبان سے اصحابِ صفہ کی تعریف میں ہم سب کے لیے خود داری کا سبق ہے کہ کیسے بھی حالات ہوں، ان میں اپنے آپ کو دوسروں کے سامنے ہاتھ پھیلا کر ذلیل نہ کیا جائے، نیز اسی آیت سے یہ

---

(۱) أخرجه البيهقي في شعب الإيمان (۱۱/۱۷۶) (۸۳۶۷)باب حقوق الأولاد والأهلين، وفي السنن الكبرى (۶/۲۱۱) (۱۱۶۹۵) كتاب الإجارة، باب كسب الرجل وعمله بيديه. والحديث ذكره السخاوي في المقاصد الحسنة (ص۲۱۶) (۸۰۱) بطرق، وقال في آخر البحث: "وبعضها يؤكد بعضاً، لا سيما وشواهدها كثيرة."

بھی معلوم ہو رہا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ ایسے لوگوں کی مدد کرنے کو زیادہ پسند فرماتے ہیں جنہوں نے اپنے آپ کو اللہ کے دین کے لیے مقید کر دیا ہو۔ اگرچہ وہ خود تو سوال نہ کرتے ہوں، لیکن تمہاری طرف سے وہ لوگ اس بات کے زیادہ مستحق ہیں کہ ان کی امداد کی جائے۔

• کسی کو صدقہ دیتے ہوئے بتانا ضروری نہیں

یہاں یہ مسئلہ بھی بتلا دینا مناسب ہے کہ جب سفید پوش لوگوں کو صدقہ وغیرہ دیا جا رہا ہو تو چاہے زکوٰۃ ہی کیوں نہ دی جا رہی ہو تو انہیں زبان سے یا کسی بھی طریقے سے یہ بتانا ضروری نہیں کہ ہم تمہیں جو کچھ دے رہے ہیں وہ زکوٰۃ ہے۔ زکوٰۃ؛ ہدیہ وتحفہ یا تعاون کچھ بھی کہہ کر دی جا سکتی ہے، اس کے لیے زکوٰۃ کا لفظ استعمال کرنے کی ضرورت نہیں ہے، بشرطیکہ وہ مستحقِ زکوٰۃ ہوں، صاحبِ نصاب نہ ہوں، اور یہ اس لیے تاکہ ضرورت مند اور سفید پوش لوگوں کی عزتِ نفس مجروح نہ ہو اور رقم لیتے ہوئے وہ شرمندگی محسوس نہ کریں۔

• اللہ کی راہ میں خرچ کرنے والوں کے لیے اجرِ عظیم کا وعدہ

پچھلی آیت کے آخر میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا کہ ﴿وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ﴿۲۷۳﴾﴾ ''اور تم جو کچھ بھی بھلائی کی چیز خرچ کرتے ہو، اللہ اسے خوب جانتا ہے۔'' بھلائی کی چیز سے مراد مال ہے، یعنی تم جو کچھ مال بھی نیک کام میں خرچ کرو گے تو اس سے اللہ تعالیٰ واقف ہے لہٰذا تم کو اس کا اجر آخرت میں ضرور ملے گا، چنانچہ اب اگلی آیت میں اللہ تبارک وتعالیٰ اسی اجر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ﴿اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ﴾ جو لوگ اپنے مال خرچ کرتے ہیں ﴿بِالَّيْلِ﴾ رات کے وقت ﴿وَالنَّهَارِ﴾ اور دن کے وقت، یعنی دن رات خرچ کرتے ہیں ﴿سِرًّا وَّعَلَانِيَةً﴾ خاموشی سے بھی اور اعلانیہ بھی ﴿فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ﴾ تو وہ اپنے پروردگار کے پاس اپنا ثواب پائیں گے ﴿وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۲۷۴﴾﴾ ''اور انہیں نہ کوئی خوف لاحق ہوگا، اور نہ کوئی غم لگے گا۔'' خوف وغم کی تشریح پیچھے گزر چکی ہے۔ اس آیت میں یہ بھی بتلا دیا گیا ہے کہ صدقہ وخیرات کے لیے کوئی وقت مقرر نہیں، رات اور دن کی کوئی تعیین نہیں، اسی طرح خفیہ اور علانیہ دونوں طرح سے اللہ کی راہ میں خرچ کرنا ثواب ہے بشرطیکہ اخلاص کے ساتھ خرچ کیا جائے، نام ونمود مقصود نہ ہو۔

آیت نمبر ۲۷۵ تا ۲۸۱

اَلَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا يَقُوْمُوْنَ اِلَّا كَمَا يَقُوْمُ الَّذِيْ يَتَخَبَّطُهُ
الشَّيْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْٓا اِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا ۘ وَاَحَلَّ
اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا ؕ فَمَنْ جَآءَهٗ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ فَانْتَهٰى فَلَهٗ مَا
سَلَفَ ؕ وَاَمْرُهٗٓ اِلَى اللّٰهِ ؕ وَمَنْ عَادَ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا
خٰلِدُوْنَ ﴿۲۷۵﴾ يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَيُرْبِي الصَّدَقٰتِ ؕ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ
كَفَّارٍ اَثِيْمٍ ﴿۲۷۶﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا
الزَّكٰوةَ لَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۲۷۷﴾
يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰٓوا اِنْ كُنْتُمْ
مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۲۷۸﴾ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ۚ وَاِنْ
تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ ۚ لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ ﴿۲۷۹﴾ وَاِنْ كَانَ
ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيْسَرَةٍ ؕ وَاَنْ تَصَدَّقُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ
تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۸۰﴾ وَاتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ اِلَى اللّٰهِ ۗ ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا
كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۲۸۱﴾ ع

وقف لازم

ع ۳۸ ۴ ۲

جو لوگ سود کھاتے ہیں وہ (قیامت میں) اٹھیں گے تو اس شخص کی طرح اٹھیں گے جسے شیطان نے چھوکر پاگل بنا دیا ہو، یہ اس لیے ہوگا کہ انہوں نے کہا تھا کہ: ''بیع بھی تو سود ہی کی طرح ہوتی ہے۔'' حالانکہ اللہ نے بیع کو حلال کیا ہے اور سود کو حرام قرار دیا ہے، لہٰذا جس شخص کے پاس اس کے پروردگار کی طرف سے نصیحت آگئی اور وہ (سودی معاملات سے) باز آگیا، تو ماضی میں جو کچھ ہوا وہ اسی کا ہے، اور اس (کی

باطنی کیفیت) کا معاملہ اللہ کے حوالے ہے، اور جس شخص نے لوٹ کر پھر وہی کام کیا تو ایسے لوگ دوزخی ہیں، وہ ہمیشہ اسی میں رہیں گے۔ ﴿۲۷۵﴾ اللہ سود کو مٹاتا ہے اور صدقات کو بڑھاتا ہے، اور اللہ ہر اس شخص کو ناپسند کرتا ہے جو ناشکرا گنہگار ہو۔ ﴿۲۷۶﴾ (ہاں) وہ لوگ جو ایمان لائیں، نیک عمل کریں، نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں وہ اپنے رب کے پاس اپنے اجر کے مستحق ہوں گے؛ نہ انہیں کوئی خوف لاحق ہوگا نہ کوئی غم پہنچے گا۔ ﴿۲۷۷﴾ اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو، اور اگر تم واقعی مومن ہو تو سود کا جو حصہ بھی (کسی کے ذمے) باقی رہ گیا ہو اسے چھوڑ دو۔ ﴿۲۷۸﴾ پھر بھی اگر تم ایسا نہ کرو گے، تو اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے اعلانِ جنگ سن لو۔ اور اگر تم (سود سے) توبہ کرو تو تمہارا اصل سرمایہ تمہارا حق ہے، نہ تم کسی پر ظلم کرو نہ تم پر ظلم کیا جائے۔ ﴿۲۷۹﴾ اور اگر کوئی (قرض دار) تنگدست ہو تو اس کا ہاتھ کھلنے تک مہلت دینی ہے، اور صدقہ ہی کردو تو یہ تمہارے حق میں کہیں زیادہ بہتر ہے، بشرطیکہ تم کو سمجھ ہو۔ ﴿۲۸۰﴾ اور ڈرو اس دن سے جب تم سب اللہ کے پاس لوٹ کر جاؤ گے، پھر ہر ہر شخص کو جو کچھ اس نے کمایا ہے، پورا پورا دیا جائے گا، اور ان پر کوئی ظلم نہیں ہوگا۔ ﴿۲۸۱﴾

سود کی حرمت وحقیقت اور خرابیوں سے متعلق چند اہم مباحث

ان آیاتِ کریمہ میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے سود کی حرمت اور اس کی خرابیوں کا بیان فرمایا ہے۔ اس سے پہلے ایک طویل سلسلۂ کلام اللہ تعالیٰ کے راستے میں مال خرچ کرنے کی اہمیت وفضیلت اور اس کے احکام سے متعلق تھا، اب یہاں سے اس کی بالکل ضد یعنی سود کا تذکرہ شروع ہو رہا ہے۔ صدقے میں انسان اپنے پاس سے کسی معاوضے کے بغیر کسی کو پیسے دیتا ہے جو انسان کی فیاضی اور سخاوت کا ایک مظہر ہوتا ہے، اور سود میں انسان بغیر کسی معاوضے کے لوگوں سے پیسے وصول کرتا ہے جو اس کے بخل اور کنجوسی کی ایک انتہائی قبیح علامت ہے۔ اس لیے اللہ تبارک وتعالیٰ صدقات کا تفصیل سے ذکر فرمانے کے بعد اب اُس کی ضد یعنی سودخوری کا خاص طور پر مفصّل انداز میں تذکرہ فرما رہے ہیں۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے سب سے پہلے سودخوروں کے انجامِ بد، محشر میں ان کی ذلت ورسوائی اور بدحواسی کا ذکر فرمایا ہے کہ سودخور محشر کے دن کس حالت میں اُٹھیں گے؟ چنانچہ فرمایا: ﴿اَلَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا﴾

وہ لوگ جو سود کھاتے ہیں یعنی سود لیتے ہیں ﴿لَا يَقُوْمُوْنَ اِلَّا كَمَا يَقُوْمُ الَّذِيْ يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ﴾ ''وہ (جب قیامت کے دن) اٹھیں گے تو اس شخص کی طرح اٹھیں گے جسے شیطان نے چھوکر پاگل بنا دیا ہو۔''

ان آیات میں ہمارے لیے کئی باتیں قابلِ توجہ اور نہایت سبق آموز ہیں جو ذیل میں تفصیل سے بیان کی جاتی ہیں:

۱- ربا کی تعریف اور حقیقت

پہلی بات یہ ہے کہ ربا کی حقیقت جو زمانۂ جاہلیت سے لوگوں میں مشہور ومعروف تھی اور آج بھی ہر شخص کو معلوم ہے۔ وہ یہ ہے کہ ''ربا'' اس زیادہ رقم کو کہا جاتا ہے جو کسی قرض پر طے کر کے وصول کی جائے۔ مثلاً کسی کو کچھ قرضہ دیتے ہوئے یہ بات طے کر لی جائے کہ ہم تمہیں سو (۱۰۰) روپے قرض دے رہے ہیں اور جب واپس لیں گے تو ایک سو پانچ (۱۰۵) روپے لیں گے، تو یہ پانچ روپے سود شمار ہوں گے اور اسی کو ''ربا'' کہا گیا ہے۔ یہ بات بالکل واضح طریقہ پر قرآنِ کریم سے بھی معلوم ہوتی ہے، اور رسول اللہ ﷺ کی احادیث سے بھی۔ قرآنِ کریم میں ''ربا'' ہی کے بارے میں آگے آنے والا ہے کہ:

وَاِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ

اور اگر تم ربا سے توبہ کرلو، تو جو اصل مال تم نے قرض دیا تھا، وہ تمہارا حق ہے۔

اس سے صاف واضح ہے کہ جتنی مقدار قرض دی گئی تھی، قرض دینے والے کو صرف اتنی ہی مقدار واپس لینے کا حق ہے، اس سے زیادہ کچھ لینا ربا اور سود ہے۔

نیز ایک حدیث میں نبیِ کریم ﷺ کا یہ ارشاد منقول ہے:

''ہر وہ قرض جو نفع کھینچ کر لائے وہ سود ہے۔'' (۱)

---

(۱) الفتح الكبير في ضم الزيادة إلى الجامع الصغير (۳۰۷/۲) قال العزيزي في السراج المنير شرح الجامع الصغير في حديث البشير النذير (۲۰/٤) "قال الشيخ حديث حسن لغيره." بغية الباحث في زوائد مسند الحارث (۵۰۰/۱) (٤۳۷) طبع الجامعة الاسلاميه، وأورده البوصيري في "الإتحاف" (۳۸۰/۳) (۲۹۳۷)، طبع دار الوطن، وقال: "هذا إسناد ضعيف، لضعف سوار بن مصعب الهمداني."

یعنی سود ہر اس زائد رقم کو کہتے ہیں جو قرض دیتے وقت باقاعدہ طے کر کے وصول کی جائے۔ البتہ اگر قرض دیتے وقت تو اس کی کوئی شرط طے نہیں کی گئی تھی، بلکہ طے یہ ہوا تھا کہ جتنی رقم دی جارہی ہے، اتنی ہی واپس کی جائے گی، لیکن جب ادائیگی کا وقت آیا تو کسی پیشگی طے شدہ شرط کے بغیر اور قرض خواہ کی طرف سے کسی قسم کے اضافے کے مطالبے کے بغیر، اگر مقروض اپنی خوشی سے کچھ زیادہ دے دے، تو یہ سود نہیں ہے، بلکہ لینے والے کے لیے اس کا لینا بھی جائز ہے اور مقروض کے لیے بھی مُوجبِ ثواب ہے۔ اسے ''حسنِ قضا'' سے تعبیر کیا جاتا ہے،[1] یعنی اچھے طریقے سے قرض کی ادائیگی کرنا۔

یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنا بھی معمول تھا کہ جب آپ کے ذمے کسی کا قرض ہوتا اور ادائیگی کا وقت آتا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اسے کچھ بڑھا کر دیتے تھے،[2] لیکن یہ بڑھا کر دینا نہ تو قرض کے معاہدے میں طے ہوتا تھا، نہ قرض خواہ کی طرف سے کوئی مطالبہ ہوتا تھا، اور نہ کوئی ایسا رواج تھا کہ جس کو یہ سمجھا جائے کہ یہ بھی گویا مشروط کے حکم میں ہے۔ آج بھی اگر کوئی شخص یہ کرنا چاہے تو بہت اچھی بات ہے، لیکن قرض میں طے کر کے یا کوئی ایسی صورت بنا کر جس سے وہ مشروط جیسا ہوجائے تو اس طرح جو زیادہ پیسہ لیا دیا جائے گا وہ سود ہی ہوگا۔

یہاں ایک قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ آیت میں ''سود کھانے'' کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، لیکن اس سے مراد مطلقاً سود لے کر اس کا استعمال کرنا ہے، خواہ اُسے کھانے میں استعمال کیا جائے یا لباس میں یا مکان اور اس کے فرنیچر میں۔ اسے کھانے کے لفظ سے اس لیے تعبیر کیا گیا ہے کہ جو چیز کھائی جائے، اس کی واپسی کا کوئی امکان نہیں رہتا، بخلاف دوسری ضرورتوں کے استعمال کے، کہ اس چیز کو واپس لیا دیا جاسکتا ہے، اس لیے مکمل قبضے اور تصرف کو محاورے میں ''کھا جانے'' کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے، اور نہ صرف عربی زبان میں بلکہ اردو فارسی وغیرہ میں بھی اکثر زبانوں کا یہی محاورہ ہے، لہٰذا سود کی رقم سے کوئی بھی فائدہ اٹھایا جائے، وہ کھانے ہی کے حکم میں ہے۔

---

(۱) صحيح البخاري (۳/ ۱۱۷) (۲۳۹۳): "قال النبي ﷺ: "إن خياركم أحسنكم قضاء، كتاب في الاستقراض وأداء الديون والحجر والتفليس، باب حسن القضاء.

(۲) صحيح مسلم (۳/ ۱۲۲٤) (۱۷۹۸) باب من استسلف شيئا فقضى خيرا منه، وخيركم أحسنكم قضاء.

۲- آخرت میں سود خور کا انجام

دوسری بات یہ ہے کہ یہاں اللہ تعالیٰ نے سود خور کا یہ انجام بتایا ہے کہ وہ آخرت میں جب اٹھے گا، تو اس طرح اٹھے گا جیسے کسی کے اوپر کوئی شیطان یا جن مسلّط ہوگیا ہو، اور اس کی وجہ سے وہ اپنے ہوش وحواس کھو بیٹھا ہو اور چیختا چلاتا پھرتا ہو۔ اس خاص انجام کی وجہ بظاہر یہ معلوم ہوتی ہے کہ سود خور شخص جب دنیا میں لوگوں سے سود لے لے کر اپنی آمدنی میں اضافہ کرتا تھا، تو اس میں اسے غریب لوگوں کی غربت کی کوئی پروا نہیں ہوتی تھی۔ اس کے سامنے لوگ اگر فقر وفاقہ کا بھی شکار ہوں، تب بھی وہ ان سے کوئی ہمدردی کرنے کے بجائے اپنے سود کے مطالبے پر ڈٹا رہتا تھا۔ اس لحاظ سے گویا اس نے اپنی دولت کو جمع کرنے کی ہوس میں اپنے ہوش کھوئے ہوئے تھے، لہٰذا جس طرح دنیا میں اس کی یہ کیفیت تھی تو اللہ تبارک وتعالیٰ اسے آخرت میں بھی اسی حالت میں اٹھائیں گے کہ اس کے ہوش وحواس گم ہوں گے۔

ایک پاگل تو وہ ہوتا ہے جس کا دماغ کسی طبّی وجہ سے درست نہ رہا ہو، اور ایک وہ ہوتا ہے جسے شیطان نے چھو کر پاگل بنادیا ہو۔ سود خور کو پہلی طرح کا طبعی بیمار بنا کر نہیں اٹھایا جائے گا، بلکہ اسے ایسے شخص کی طرح قبر سے اٹھایا جائے گا جس کو کسی شیطان جن نے چھو کر پاگل اور خبطی بنادیا ہو۔ یہاں شیطان سے مراد وہ سرکش جنات ہیں جو تکلیف پہنچانے کے لیے کسی انسان کو چھوتے یا اس پر مسلّط ہوتے ہیں، اور جب ان کا اثر ہوتا ہے تو اس شخص کی کیفیت بالکل پاگلوں جیسی بلکہ پاگلوں سے بھی بدتر ہو جاتی ہے، جو آدمی مجنون یا طبّی طور پر بالکل پاگل ہو اور اس کے دماغ کی صلاحیتیں ختم ہو جائیں، تو وہ بے چارہ دوسروں کے لیے تو پریشانی کا سبب بنتا ہے اور اپنے جنون کی وجہ سے لوگوں کو تکلیف بھی پہنچاتا ہے، لیکن خود اسے کسی تکلیف یا بیماری کا احساس نہیں ہوتا، بلکہ بعض اوقات وہ چپ چاپ بھی پڑا رہتا ہے، لیکن اس کے برخلاف وہ شخص جس پر کسی جن یا شیطان نے حملہ کردیا ہو، اپنے ہوش وحواس بھی کھو بیٹھتا ہے اور ساتھ ساتھ اس بات کی تکلیف بھی محسوس کرتا ہے کہ وہ اپنی معمول کی زندگی میں نہیں ہے۔

۳- عذرِ گناہ بدتر از گناہ

تیسری بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے اس انجامِ بد کی وجہ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ﴿ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْٓا اِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا﴾ ''یہ اس لیے ہوگا کہ انہوں نے کہا تھا: بیع بھی تو سود ہی کی طرح ہوتی ہے۔'' یعنی ان کا جرم صرف اتنا نہیں تھا کہ وہ سود کھاتے تھے، بلکہ وہ اس گناہ کو گناہ سمجھنے سے ہی انکار

کرتے تھے، اور جب انہیں اللہ تعالیٰ کے اس حکم کی اطلاع دی جاتی تھی کہ اللہ تعالیٰ نے سود کھانے سے منع کیا ہے، تو اس کے جواب میں شرمندگی کا اظہار کرنے یا اپنے گناہ کا اعتراف کرنے کے بجائے سینہ زوری سے کہتے تھے کہ سود میں کوئی بری بات نہیں ہے، بلکہ سود بھی تو تجارت ہی کی ایک ایسی شکل ہے۔ جیسے بیع ہوتی ہے ویسے ہی سود بھی ہے، لہٰذا اگر بیع جائز ہے، تو سود بھی جائز ہونا چاہیے، اس طرح وہ بڑی ہٹ دھرمی سے سود کو حلال کرنے کا مطالبہ کیا کرتے تھے۔ ﴿وَ اَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَ حَرَّمَ الرِّبٰوا﴾ ''حالانکہ اللہ تعالیٰ نے بیع کو حلال قرار دیا ہے، اور سود کو حرام کیا ہے۔''

اس سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی شخص اپنی کمزوری کی وجہ سے کسی گناہ میں مبتلا ہو جائے، لیکن ساتھ ہی اپنے اس عمل پر شرمندہ بھی ہو، تو وہ گناہ گار ہونے کے باوجود اُس شخص سے کہیں زیادہ بہتر ہے جو گناہ کو گناہ ہی نہ سمجھتا ہو، بلکہ اس بات پر مصر ہو کہ اس میں کوئی خرابی کی بات نہیں ہے۔ یہاں مشرکین کے اسی طرزِ عمل کا ذکر کیا گیا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا حکم ماننے کے بجائے یہ بحث کرتے تھے کہ بیع اور سود میں کیا فرق ہے؟ وہ حلال ہے تو یہ بھی حلال ہونا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ کا حکم آجانے کے بعد اس قسم کا بحث مباحثہ انتہائی سرکشی کی بات ہے۔

۴۔ حکمت بتانے کے بجائے حاکمانہ جواب

چوتھی بات یہ ہے کہ جب سود خوروں نے یہ دلیل پیش کی کہ سود بھی تو بیع ہی کی ایک شکل ہے، تو اُس کے جواب میں اللہ تعالیٰ یہ بھی فرما سکتے تھے کہ بیع اور سود ایک چیز نہیں ہیں، دونوں میں فلاں فلاں فرق ہیں، اور سود کے فلاں فلاں نقصانات ہیں۔ لیکن اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس حکم کی حکمتیں بتانے کے بجائے صرف یہ فرمایا ہے کہ ﴿اَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَ حَرَّمَ الرِّبٰوا﴾ ''اللہ نے بیع کو حلال کیا ہے، اور سود کو حرام۔''

اس حاکمانہ جواب سے درحقیقت یہ جتلانا مقصود ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے بیع کو حلال اور سود کو حرام قرار دے دیا ہے، تو ایک بندے کا کام یہ نہیں ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے حکم کی حکمت اور اس کا فلسفہ پوچھتا پھرے اور عملاً یہ کہے کہ جب تک اس کا فلسفہ میری سمجھ میں نہیں آجائے گا، میں اس حکم پر عمل نہیں کروں گا۔ اگرچہ واقعہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہر حکم میں یقیناً کوئی نہ کوئی حکمت ضرور ہوتی ہے، لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ حکمت ہر شخص کی سمجھ میں آ بھی جائے، لہٰذا اگر اللہ تعالیٰ پر ایمان ہے تو پہلے اس کے ہر حکم پر سرِ تسلیم خم کرنا

ہوگا، اس کے بعد اگر کوئی شخص اپنے مزید اطمینان کے لیے اس حکم کی حکمت اور اس کا فلسفہ سمجھنے کی کوشش کرے تو پھر کوئی حرج نہیں، لیکن اس پر اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل کو موقوف رکھنا ایک مومن کا کام نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ سے کسی حکم کی حکمت پوچھنا ایسا ہی ہے جیسے آپ نے گھر کی خدمت کے لیے کوئی نوکر رکھا ہو اور آپ اس نوکر کو حکم دیں کہ تم میرے لیے دس کلو گوشت لے کے آجاؤ، تو جواب میں وہ نوکر یہ پوچھے کہ پہلے مجھے یہ بتایئے کہ آپ دس کلو گوشت کیوں منگوا رہے ہیں؟ جب کہ آپ کے یہاں گھر میں اتنے آدمی نہیں ہیں کہ دس کلو گوشت ان کے لیے ضروری ہو۔ جو نوکر تعمیلِ حکم کے بجائے یہ سوال کرے کہ آپ نے حکم کیوں دیا؟ اور ہر چیز کی حکمت اور علت پوچھنے کی کوشش کرے تو آپ اس نوکر کو رکھنے کے روادار نہیں ہوں گے اور اسے نوکری سے برخاست کردیں گے، کیونکہ اسے وہ کام کرنا چاہیے جو اسے حکم دیا جارہا ہے نہ کہ وہ اس حکم کی وجہ پوچھنا شروع کردے۔

جب ایسا نوکر آپ سے برداشت نہیں ہوتا، تو اگر بندہ اپنے رب سے یہ کہے کہ میں اس وقت تک آپ کے حکم پر عمل نہیں کروں گا جب تک مجھے آپ کے حکم کی حکمت معلوم نہ ہو، اس سے بڑی حماقت اور بے عقلی کیا ہوگی؟ حالانکہ وہ نوکر بھی انسان ہے اور حکم دینے والا بھی انسان ہے، جبکہ یہاں پر حکم دینے والے اللہ تبارک وتعالیٰ ہیں، اور سارے کے سارے انسان اس کے بندے ہیں۔ نوکر سے بھی بہت نیچے درجے کی چیز، غلام بھی نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے بندے ہیں اور دونوں میں کوئی مناسبت ہی نہیں ہے۔ اللہ کا علم غیر متناہی، بندے کا علم اور سمجھ متناہی، اللہ تعالیٰ قادرِ مطلق جبکہ بندہ عاجز و ناتواں۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اُن کے اِس عقلی اعتراض کا عقلی جواب دینے کے بجائے اُن سے حاکمانہ طور پر فرمایا: ﴿ اَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَ حَرَّمَ الرِّبٰوا ﴾ ''اللہ نے بیع حلال کی ہے، ربا حرام کیا ہے،'' ماننا ہے تو مان لو ورنہ تمہارا انجام خراب ہوگا۔

۵۔ بیع اور رِبا میں فرق اور اس کی بنیادی وجہ

پانچویں بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا حکم ماننے کو اس کی حکمت سمجھنے پر موقوف رکھنا تو ایک بندے کا کام نہیں ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کا حکم پوری طرح ماننے کے بعد اگر کوئی شخص اپنے ذاتی علم اور اطمینان کے لیے اس کی حکمت جاننا چاہتا ہو، تو چونکہ حکمت کی یہ تلاش سرکشی کی بنا پر نہیں ہے، تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اس نقطۂ نظر سے بیع اور سود کا فرق سمجھ لینا مناسب ہے۔

درحقیقت اسلامی شریعت میں سامانِ تجارت اور نقدی میں زمین وآسمان کا فرق ہے۔ نقد روپیہ بذاتِ خود سامانِ تجارت نہیں ہے، بلکہ وہ تبادلے کا ایک ذریعہ (medium of exchange) ہے۔ دنیا کی کوئی بھی چیز جو سامانِ تجارت میں شمار ہوتی ہو، اس میں اپنی ذاتی حیثیت سے کوئی نہ کوئی فائدہ ہوتا ہے۔ مثلاً کھانے کی چیزیں، کپڑا، فرنیچر، گاڑی یا دیگر چیزیں ہیں، ان کی اپنی ذات میں ایک منفعت (utility) ہوتی ہے، وہ ذاتی طور پر فائدہ مند ہوتی ہیں، اور ان کی ذات ہی سے نفع اٹھایا جا سکتا ہے، جبکہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے نقدی کو سامانِ تجارت نہیں بنایا، نقدی صرف تبادلے کے ایک ذریعہ کے طور پر پیدا کی گئی ہے۔

مالِ تجارت سے بذاتِ خود نفع حاصل کیا جا سکتا ہے، مثلاً کپڑے پہن کر ان سے نفع اٹھایا جا سکتا ہے، گندم کی روٹی بنا کر اس سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے، لیکن نقدی بذاتِ خود نفع بخش نہیں ہے اور اس سے اس قسم کا فائدہ اٹھانا ممکن نہیں، چنانچہ پیسے کھا کر اگر کوئی اپنی بھوک مٹانا چاہے تو نہیں مٹا سکتا، پیاس بجھانا چاہے تو نہیں مٹا سکتا، کوئی پیسوں کو اپنے لباس کے طور پر استعمال نہیں کرسکتا۔ ہاں! پیسے دے کر کوئی ایسی چیز حاصل کی جاسکتی ہے جس سے نفع ہو، لہٰذا اس طرح دونوں کے درمیان فرق واضح ہے۔

''بیع'' میں نقدی کے ذریعے کوئی نفع بخش سامان خریدا جاتا ہے، اور نفع بخش سامان کا تبادلہ نقدی سے ہوتا ہے۔ اس میں بیچنے والا نفع کمائے تو جائز ہے، لیکن نقدی کا تبادلہ نقدی سے ہو، تو چونکہ نقدی بذاتِ خود نفع بخش نہیں ہے اور ایک جنس کی ایک نقدی اُسی جنس کی دوسری نقدی کے بالکل برابر ہے، مثلاً سو روپے کا سکہ یا نوٹ دوسرے سو روپے کے سکے کے بالکل برابر ہے، اس لیے اُس پر نفع کمانا سود ہے جو کہ ناجائز و حرام ہے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان دونوں چیزوں یعنی بیع اور ربا میں احکام کے اعتبار سے بھی فرق رکھا ہے۔ آپ سامانِ تجارت پر تو نفع وصول کرسکتے ہیں، لیکن نقدی کا تبادلہ اسی جنس کی نقدی سے ہو، تو نفع لینا کسی بھی صورت جائز نہیں ہے، نہ ہاتھ در ہاتھ، یعنی نقد معاملہ میں اور نہ ادھار کے معاملہ میں، البتہ جو اشیائے ضرورت ہیں یا جن کو سامانِ تجارت کہا جاتا ہے، تو ان میں نقد سودے پر بھی اور ادھار سودے پر بھی نفع لینا جائز ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ جب کوئی سامان اصل لاگت پر اپنا کچھ نفع رکھ کر بیچا جاتا ہے، تو شریعت میں یہ جائز ہے، بلکہ اس سے آگے بڑھ کر یہ صورت بھی جائز ہے کہ اگر کسی شخص نے کوئی سامان بیچا، اور خریدار نے رقم کی ادائیگی کے لیے کچھ مدت، عقدِ بیع کے اندر ہی طے کرلی کہ میں اس کے پیسے چھ مہینے کے بعد ادا کروں گا، تو

اس صورت میں بیع کی جو قیمت مقرر کی جاتی ہے، وہ بعض اوقات نقد قیمت سے کچھ زیادہ بھی ہوتی ہے، لیکن اس کے باوجود بھی یہ صورت جائز ہے، اور ایسا رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک میں بھی ہوتا تھا،[1] کیونکہ تبادلہ سامان اور نقدی کے درمیان ہو رہا تھا۔ گویا بیع کے اندر چاہے قیمت نقد دی جارہی ہو یا ادھار فروخت کیا جارہا ہو، دونوں صورتوں میں نفع لیا جاسکتا ہے، لیکن جب تبادلہ میں دونوں طرف ایک ہی جنس کی نقدی ہو، تو اس میں نفع لینا سود اور ناجائز ہے۔

یہ ایک تفصیلی بحث ہے کہ نقدی کو بذاتِ خود سامانِ تجارت قرار دینے سے پورے نظام تجارت میں کیسا گھپلا واقع ہوتا ہے اور موجودہ نظامِ معیشت میں اس کے کتنے بھیانک نقصانات ہوئے ہیں۔ یہاں اس تفصیل میں جانے کا موقع نہیں ہے، البتہ میں نے اپنی متعدّد تحریروں میں اسے واضح کرنے کی کوشش کی ہے، جو حضرات اس بارے میں مزید تفصیل پڑھنا چاہیں تو میں نے سپریم کورٹ آف پاکستان میں سود کے بارے میں جو فیصلہ لکھا تھا، اس میں اس پہلو کو بہت تفصیل کے ساتھ زیرِ بحث لایا گیا ہے، وہ فیصلہ اگرچہ انگریزی زبان میں تھا، تاہم اس کا اردو ترجمہ ''سود پر تاریخی فیصلہ'' کے نام سے شائع ہوچکا ہے، اس میں اس موضوع کی تفصیل دیکھی جاسکتی ہے[2] نیز ۲۰۰۸ء کے عالمی معاشی بحران کے دوران، میں نے اس معاشی بحران کے اسباب اور علاج سے متعلق ایک مقالہ Causes and Remedies of the Financial Crisis کے نام سے لکھا تھا، اس میں بھی اس پہلو کو نہایت تفصیل کے ساتھ واضح کیا ہے، جو حضرات دلچسپی رکھتے ہوں اس سے رجوع کرسکتے ہیں۔ اس کا اردو اور عربی ترجمہ بھی شائع ہوچکا ہے۔[3]

---

(۱) مزید تفصیل کے لیے دیکھیے حضرت والا (حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب) دامت برکاتہم کی کتاب: غیر سودی بنکاری، ص ۷۶۔ عنوان: ''ادھار بیع میں قیمت زیادہ کرنا عہدِ رسالت میں''۔ (راشد)

(۲) سود اور اس سے متعلقہ مباحث کے حوالے سے حضرت والا (حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب) دامت برکاتہم کے کئی مقالات و مضامین اور کتابیں ہیں۔ مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تصنیف ''مسئلہ سود'' کے حصہ دوم میں ''تجارتی سود؛ عقل اور شرع کی روشنی میں'' کے عنوان سے حضرت والا دامت برکاتہم نے تجارتی سود پر مفصل کلام کیا ہے۔ علاوہ ازیں ''ہمارا معاشی نظام''، ''سود پر تاریخی فیصلہ'' اور ''عالمی معاشی بحران؛ اسباب و علاج'' میں بھی سود پر تفصیلی کلام کیا گیا ہے۔ (راشد)

(۳) یہ مقالہ عربی زبان میں ''أسباب الأزمة المالية وعلاجها في ضوء الشريعة الإسلامية'' کے نام سے دار القلم دمشق سے، جبکہ اردو میں ''عالمی معاشی بحران: اسباب و علاج'' کے نام سے مکتبہ معارف القرآن کراچی سے شائع ہوچکا ہے۔ (راشد)

۶-تجارتی اور صرفی قرضوں میں فرق کرنا

چھٹی بات یہ ہے کہ آج کل موجودہ بینکنگ کا نظام تمام تر سود پر مبنی ہے اور پوری دنیا پر مسلط ہے۔ بعض حضرات اس نظام کو سود سے پاک کرنے کے بجائے اسی قسم کا طرزِ عمل اختیار کرتے ہیں جو قرآن کریم کے مطابق جاہلیت کے لوگوں کا طرزِ عمل تھا، چنانچہ وہ اس نظام کو جائز اور درست قرار دینے کے لیے مختلف قسم کی تاویلیں اختیار کرتے ہیں۔ مثلاً ایک تاویل جو بکثرت پیش کی جاتی ہے، وہ یہ ہے کہ زمانۂ جاہلیت میں قرض لینے والے غریب لوگ ہوتے تھے جو اپنی بھوک مٹانے یا دوسری ذاتی ضروریات کے لیے قرض لیتے تھے،[1] ان سے زیادہ پیسے وصول کرنا ظلم تھا۔ اس لیے قرآن کریم نے اُسے حرام قرار دیا، اور اللہ اور اس کے رسول کے خلاف جنگ سے تعبیر فرمایا، لیکن موجودہ بینکنگ کے نظام میں بینک سے قرض لینے والے مال دار لوگ ہوتے ہیں، اور قرض کی رقم کو کاروبار میں لگا کر نفع کماتے ہیں، اس لیے اگر اُن سے اصل رقم سے کچھ زیادہ وصول کرلیا جائے، تو اس میں کوئی حرج نہیں۔

اس تاویل میں پہلی اصولی غلطی تو یہ ہے کہ یہ تاویل اس حقیقت کو نظر انداز کیے ہوئے ہے کہ کسی تجارتی معاملے کے جائز یا ناجائز ہونے کا فیصلہ اس بنیاد پر دنیا میں کہیں نہیں ہوتا کہ اس کا کوئی فریق غریب ہے یا امیر؟ مثلاً بیع میں نفع لینا اس شرط کے ساتھ مشروط نہیں ہوتا کہ خریدار امیر ہو۔ اگر ایک شخص روٹی بیچنے کے لیے بیٹھا ہے، تو خریدار غریب ہو یا امیر، وہ دونوں سے ایسی قیمت وصول کرسکتا ہے جو اس کی لاگت پر اسے کچھ نفع بھی دے دے۔ اگر وہ کسی غریب کے ساتھ رعایت کرکے اس سے پیسے نہ لے یا کم پیسے لے، تو یقیناً یہ اس کے لیے ایک فضیلت کا سبب ہے، لیکن دنیا کا کوئی قانون یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس پر قانوناً لازم ہے کہ وہ غریبوں کو روٹی مفت دیا کرے اور صرف امیروں سے قیمت وصول کرے۔ اور اگر وہ غریبوں کو مفت روٹی نہ دے تو اس کے خلاف اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی جنگ ہے۔ اگر اس پر یہ شرط عائد کی جائے گی تو وہ خود اپنے بیوی بچوں کا پیٹ نہیں پال سکے گا۔

اسی طرح اگر کوئی معاملہ ناجائز ہے، مثلاً جُوا کھیلنا، تو یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ غریبوں کے ساتھ تو ناجائز

---

(۱) درحقیقت یہ دعویٰ بھی درست نہیں ہے کہ عہدِ جاہلیت اور عہدِ رسالت میں صرف غریب لوگ قرض لیا کرتے تھے اور تجارتی اغراض کے لیے قرض لینے کا رواج نہیں تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ اس دور میں بھی دونوں قسم کے قرضے رائج تھے، تجارتی قرضوں کی بہت سی مثالوں کے لیے ملاحظہ ہو "مسئلۂ سود" از حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ۔ (محمد تقی عثمانی)

ہے، مگر امیروں کے ساتھ جائز ہے، لہٰذا سوال یہ نہیں ہے کہ سود کا معاملہ غریبوں کے ساتھ ہو رہا ہے یا مال داروں کے ساتھ۔ سوال یہ ہے کہ یہ معاملہ بذاتِ خود جائز ہے یا نہیں؟ اگر جائز ہے تو دونوں کے ساتھ اسی طرح جائز ہوگا جیسے روٹی بیچنے کا معاملہ دونوں کے ساتھ جائز تھا، اور اگر ناجائز ہے تو دونوں کے لیے ناجائز ہوگا، جیسے جُوا کھیلنے کا معاملہ دونوں کے لیے ناجائز ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ اگر غریبوں کے ساتھ سود کو ناجائز اور امیروں کے ساتھ جائز قرار دیا جائے، تو غریب کس کو کہیں گے اور امیر کس کو؟ اس کا کوئی معیار تاویل کرنے والے نہیں بتاتے۔

تیسرے یہ جو کہا جارہا ہے کہ امیر لوگ بینک سے قرض لے کر تجارت میں لگاتے ہیں اور اس پر نفع کماتے ہیں، اس لیے انہیں قرض سے کچھ زائد رقم قرض خواہ کو دینی چاہیے، اس میں یہ فرض کرلیا گیا ہے کہ تاجر بینک سے قرض لے کر ہمیشہ نفع ہی کمائے گا، حالانکہ ایسے واقعات کم نہیں ہوتے کہ بینک سے قرض لے کر کسی نے تجارت میں لگایا اور اسے نقصان ہوگیا پھر سود کا مطالبہ کیسے جائز ہوگا؟

شریعت کا اصول یہ ہے کہ جب تم کسی کو قرض دے رہے ہو، تو پہلے یہ فیصلہ کرو کہ اس قرض کے ذریعے تم مقروض کی مدد کرنا چاہتے ہو یا اس کی تجارت میں شریک ہونا چاہتے ہو؟ اگر صرف مدد کرنا چاہتے ہو، تو پھر اس پر کوئی نفع کا مطالبہ کسی طرح معقول نہیں ہے، اور اگر اس کی تجارت میں حصہ دار بننا چاہتے ہو، تو پھر قرض کے بجائے اس سے کاروبار میں حصہ داری کا معاملہ کرو، چنانچہ اگر کاروبار میں نفع ہوا، تو اس نفع میں تم شریک ہوگے اور اگر نقصان ہوا، تو اپنے حصے کی حد تک نقصان اٹھانے کی ذمہ داری بھی تمہیں لینی پڑے گی، لہٰذا یہ تاویل کسی بھی اعتبار سے قابلِ قبول نہیں ہے۔

• سود حرام ہونے سے پہلے کے معاملات کا حکم

پھر اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿فَمَنْ جَآءَهٗ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ﴾ ''لہٰذا اب جس شخص کے پاس اس کے پروردگار کی طرف سے نصیحت آگئی،'' یعنی پروردگار نے کہا کہ سود کا معاملہ چھوڑ دو ﴿فَانْتَهٰى﴾ ''پھر وہ باز آگیا،'' یعنی اس نے سود کے معاملات ترک کردیے ﴿فَلَهٗ مَا سَلَفَ﴾ ''تو ماضی میں جو کچھ ہوا، وہ اسی کا ہے۔'' مطلب یہ ہے کہ سود کے حرام ہونے کے اعلان سے پہلے بہت سے لوگوں نے سودی معاملات کر رکھے تھے، وہ سود کھا پی کر ختم بھی کر چکے تھے، تو جب سود حرام ہوا، تو کسی کے دل میں یہ خیال ہوسکتا تھا کہ

سالہا سال سے ہم جو سود کھاتے چلے آ رہے ہیں، وہ تو حرام ثابت ہو گیا، تو کیا ہمیں وہ سارا واپس کرنا ہوگا؟

اس سوال کے جواب میں اللہ تعالیٰ فرما رہے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے نصیحت آئی اور اس کے بعد آدمی باز آ گیا، تو پچھلے زمانے میں اس نے جو سودی معاملات کیے تھے، اور اب وہ سود کھا پی کر ختم کر چکا ہے، تو اس پر اس کی گرفت نہیں ہوگی، اور نہ وہ سود واپس لوٹانا اس کے ذمے لازم ہے۔ ہاں البتہ جس وقت ربا کی حرمت کا اعلان ہوا، اُس وقت اگر کسی کے ذمے کوئی سود کی رقم باقی تھی، تو اسے چھوڑنا لازم ہے، جیسا کہ آگے آنے والا ہے۔

• گناہ سے توبہ کے بعد بندے کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے

جس شخص کے پاس اس کے پروردگار کی طرف سے نصیحت آ گئی اور وہ (سودی معاملات سے) باز آ گیا، تو ماضی میں جو کچھ ہوا وہ اسی کا ہے، ﴿وَ اَمْرُهٗۤ اِلَى اللّٰهِ﴾ ''اور اس (کی باطنی کیفیت) کا معاملہ اللہ کے حوالے ہے،'' یعنی جس نے سود چھوڑا ہے، تو آیا اخلاص کے ساتھ اللہ کے حکم کی تعمیل میں چھوڑا ہے، یا سود کو سمجھتا تو برحق تھا، اور کسی دباؤ میں آ کر وقتی طور پر چھوڑ دیا ہے، آئندہ اس کا ارادہ ہے کہ جب کبھی موقع ملے گا تو سود کا کاروبار کروں گا۔ ظاہر ہے کہ اس شخص کا انجام اس شخص سے مختلف ہوگا جو اخلاص کے ساتھ سود چھوڑ رہا ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ظاہری دنیا کے اندر تو آدمی کے ظاہری اعمال کے مطابق فیصلہ کیا جاتا ہے، لیکن جو اس کی باطنی کیفیت ہے وہ اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتے ہیں، اس لیے وہ معاملہ اللہ کے حوالے ہے۔ عام لوگوں کو یہ بدگمانی کرنے کا حق نہیں ہے کہ اس نے دل سے سود نہیں چھوڑا۔

• ممانعت کے باوجود سود کا ارتکاب کرنے والوں کی سزا

پھر مذکورہ نصیحت سن کر بھی دوبارہ اسی سود خوری کی طرف لوٹ جانے والوں کو ان کے انجام سے باخبر کرتے ہوئے باری تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿وَ مَنْ عَادَ﴾ ''اور جس شخص نے لوٹ کر پھر وہی کام کیا،'' یعنی اسی طرح سود لینا شروع کیا تو ﴿فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ﴾ ایسے لوگ دوزخ کے باسی ہیں ﴿هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۷۵﴾﴾ ''وہ اسی میں رہیں گے۔''

مطلب یہ ہے کہ جن لوگوں نے حرمتِ سود کو تسلیم نہیں کیا، اور وہی اعتراض کرتے رہے کہ بیع اور سود میں کوئی فرق نہیں، وہ کافر ہونے کی وجہ سے ابدی عذاب کے مستحق ہوں گے، کیونکہ انہوں نے قرآن کے حکم

کو نہیں مانا، اس لیے وہ کافر ہیں، مسلمان ہیں ہی نہیں، لہٰذا وہ دوزخ کے باسی ہیں اور اس میں ہمیشہ رہیں گے۔

• سود کو مٹانے اور صدقات کو بڑھانے کی حقیقت

آگے اللہ تعالیٰ نے سود اور صدقے کے انجام میں فرق بیان کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ ﴿يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا﴾ ''اللہ سود کو مٹاتا ہے،'' یعنی اگرچہ ایسا ہوسکتا ہے کہ سود کے ذریعے کسی آدمی کے مال میں ظاہری طور پر کچھ اضافہ ہوجائے، لیکن وہ اضافہ حقیقت میں نقصان ہی ہے۔ اس کے مقابلے میں صدقات کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَيُرْبِي الصَّدَقٰتِ﴾ ''اور اللہ صدقات کو بڑھاتا ہے،'' یعنی صدقہ کرنے سے اگرچہ ظاہری اعتبار سے مال میں کچھ کمی واقع ہو جاتی ہے، لیکن حقیقت میں اس سے مال بڑھ گیا۔ اللہ تعالیٰ سود کو کس طرح مٹاتے ہیں اور صدقے کو کس طرح بڑھاتے ہیں؟ اس کی تشریح کئی طریقے سے ہوسکتی ہے۔

(۱)..... اس کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ آخرت میں اللہ تبارک وتعالیٰ سود خور کو عذاب میں مبتلا کریں گے، تو وہ سود جو اس نے دنیا میں لیا تھا، وہ اس کے لیے بڑھوتری کے بجائے گھاٹے کا سبب بنے گا۔ دوسری طرف جس شخص نے اللہ کی رضا کی خاطر صدقہ دیا ہو، تو اللہ تعالیٰ اپنی راہ میں خرچ کرنے پر اسے اپنی شان کے مطابق ثواب عطا فرمائیں گے۔ حدیث میں آتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

> ''جو شخص حلال کمائی سے ایک کھجور کے برابر صدقہ کرے۔ اور اللہ تعالیٰ صرف حلال کمائی کے صدقے کو ہی قبول فرماتا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ اسے اپنے داہنے ہاتھ سے قبول کرتا ہے، پھر صدقہ کرنے والے کے فائدے کے لیے اس میں بالکل اسی طرح زیادتی کرتا ہے جیسے کوئی اپنے جانور کے بچے کو کھلا پلا کر بڑھاتا ہے یہاں تک کہ اس کا صدقہ پہاڑ کے برابر ہو جاتا ہے۔''(۱)

اور ایک روایت کے مطابق اس صدقہ کا ثواب اُحد پہاڑ کے برابر ہوجاتا ہے۔(۲)

---

(۱) صحيح البخاري (۲/۱۰۸) (۱٤۱۰) كتاب الزكاة، باب الصدقة من كسب طيب لقوله: ﴿وَ يُرْبِي الصَّدَقٰتِ... ...الخ﴾

(۲) صحيح البخاري (۹/۱۲٦) (۷٤۳۰) كتاب التوحيد، باب قول الله تعالى: ﴿تَعْرُجُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَ الرُّوْحُ﴾ وسنن الدارمي (۲/۱۰٤۲) (۱۷۱۷) باب في فضل الصدقة.

اس تفصیل کے مطابق سود کا مٹنا اور صدقہ کا بڑھنا آخرت کے اعتبار سے ہے، آخرت میں جب تمام تر حقائق سامنے آئیں گے، تو اس وقت معلوم ہوگا کہ سود کے ذریعے بڑھائے ہوئے مال کی کوئی قیمت وحیثیت نہیں تھی، بلکہ وہ اپنے کمانے والے کے لیے عذاب اور وبال بنا ہوا ہے۔ جبکہ صدقہ میں دیا ہوا مال اگرچہ تھوڑا تھا لیکن وہ بڑھ چڑھ کر اس کے حساب میں زیادہ ہوگیا ہے۔

(۲)..... اس کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ آخرت کے ساتھ دنیا کے اعتبار سے بھی ''ربا'' یعنی سود کو اللہ تعالیٰ مٹاتے ہیں اور صدقہ کو بڑھاتے ہیں۔ یہ مٹانا اس معنیٰ میں بھی ہوسکتا ہے کہ جو شخص سود کے ذریعے اپنا کاروبار چمکانے کی کوشش کرتا ہے، تو انجامِ کار کبھی نہ کبھی اسے بدترین خسارے اور شدید ترین نقصان کا سامنا کرنا پڑتا ہے، جیسا کہ آج کل کے سرمایہ دارانہ نظام میں معروف ہے کہ ہر تھوڑے تھوڑے عرصے کے بعد بازار پر جھٹکے پڑتے ہیں یا مارکیٹ بیٹھ جاتی ہے اور وہ سود کھانے والا جو کروڑوں اور اربوں روپے کا مالک ہوتا ہے، وہ دیکھتے ہی دیکھتے بالکل نادار ہوکر رہ جاتا ہے۔ تجارتی چکر آنے یا کساد بازاری کے دورے پڑنے کے نتیجے میں سود کی بنیاد پر کام کرنے والوں کو اپنے کاروبار میں شدید گھاٹے اور نقصان کا سامنا کرنا پڑتا ہے، جبکہ اس کے مقابلے میں اللہ تعالیٰ صدقہ کرنے سے مال کو بڑھا دیتے ہیں۔ خود ہمارے زمانے میں ۲۰۰۸ء میں جو مالیاتی بحران دنیا کے اوپر مسلط ہوا اس کی بنیادی وجہ بھی یہی سود تھا۔

(۳)..... سود کے مٹنے اور صدقہ کے بڑھنے کی ایک تیسری صورت یہ ہوتی ہے کہ اگرچہ سود سے گنتی کے اعتبار سے مال میں کچھ اضافہ ہوجاتا ہو، یعنی آدمی یہ دیکھ کر خوش ہوسکتا ہے کہ میرا بینک بیلنس بڑھ گیا اور مال کی گنتی میں اضافہ ہوگیا، لیکن مآلِ کار اور برکت کے اعتبار سے اس گنتی کا کوئی فائدہ بندے کو نہیں پہنچتا۔ ایک بہت واضح حقیقت جو اکثر و بیشتر نگاہوں سے پوشیدہ رہ جاتی ہے، وہ یہ ہے کہ روپیہ پیسہ یا سامانِ عیش بذاتِ خود کوئی مقصد نہیں ہیں، ان سب وسائل کا اصل مقصد یہ ہے کہ ان سے راحت و آرام پہنچے اور فائدہ حاصل ہو، لیکن اگر کسی شخص کی کوٹھی بڑی شاندار ہے، بنگلہ بڑا عالیشان ہے، فرنیچر بہت اعلیٰ درجے کا رکھا ہوا ہے، نوکر چاکر اور حشم و خدم بھی ہیں، آرائش و زیبائش کے سارے سامان موجود ہیں، لیکن صحت اچھی نہیں ہے، تو یہ سارے اسباب و وسائل جو عیش و آرام کے اسباب و وسائل سمجھے جاتے ہیں، اس کے حق میں بیکار ہوگئے۔

اسی طرح فرض کریں کسی کو اگر یہ سارے اسباب و وسائل میسر ہیں، لیکن اس کے پاس سر کھجانے کی مہلت نہیں ہے۔ اس کے پاس آرام دہ مسہری ہے، نرم و ملائم بستر ہے، ایئر کنڈیشنڈ کمرہ ہے، لیکن اس کے

پاس سونے کی یا اس سے لطف اٹھانے کی فرصت ہی نہیں ہے، تو نتیجہ یہ نکلا کہ وہ اس گنتی کو بڑھانے میں اتنا منہمک ہے کہ اپنے آرام و راحت کو بھی بھول بیٹھا ہے اور یہ مال و دولت اس کے لیے عذاب بن گیا ہے۔ اسی کو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ:

اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ بِهَا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا (۱)

اللہ تو یہ چاہتا ہے کہ انہی چیزوں سے انہیں دنیوی زندگی میں عذاب دے۔

ایسے لوگوں کے لیے دنیاوی زندگی میں یہ مال بذاتِ خود ایک عذاب بن جاتا ہے۔ اسی طرح اگرچہ کوئی ان تمام وسائل و اسباب میں اتنا منہمک نہ بھی ہو، لیکن اگر اسے نیند نہیں آتی، راحت حاصل نہیں ہوتی، تو ایسے مال و اسباب کا کیا فائدہ؟ ربا کے مٹنے کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ ربا کے ذریعہ جو آمدنی حاصل ہوتی ہے اس میں برکت نہیں ہوتی، جبکہ صدقہ کرنے سے مال میں برکت اور زندگی میں سکون و اطمینان کی دولت حاصل ہوتی ہے۔

- سود خور اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا بدترین ناشکرا ہے

آگے فرمایا: ﴿وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ اَثِيْمٍ ﴿۲۷۶﴾﴾ ''اور اللہ ہر اس شخص کو ناپسند کرتا ہے جو ناشکرا گنہگار ہو۔'' ''كَفَّار'' کفر سے مبالغہ کا صیغہ ہے، اور کفر کے معنیٰ جہاں کافر ہونے کے ہوتے ہیں، وہیں اس کے معنیٰ ناشکری کے بھی ہوتے ہیں، بلکہ اس کے اصلی معنیٰ ہی ناشکری کے ہیں، چونکہ کفر بھی اللہ تعالیٰ کی ناشکری پر مشتمل ہوتا ہے، اس لیے اسے کفر کہا جاتا ہے، اور اس کے اختیار کرنے والے کو کافر کہا جاتا ہے۔ ''كَفَّار'' مبالغہ کا صیغہ ہے جس کے معنیٰ ہوئے: ''پرلے درجے کا ناشکرا۔'' اور ''اَثِيْم'' کے معنیٰ ہیں: گناہگار یا اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرنے والا۔ آیت کے معنی یہ ہوئے کہ'' اللہ تعالیٰ ناشکرے گناہ گار لوگوں کو پسند نہیں فرماتے۔''

یہاں پر اللہ تعالیٰ نے سود خور کے لیے خاص طور پر یہ دو لفظ استعمال فرمائے ہیں، اس کی وجہ بظاہر یہ معلوم ہوتی ہے - واللہ سبحانہ واعلم - کہ جو شخص سود کھاتا ہے یا سود پر اپنا پیسہ چلاتا ہے، وہ درحقیقت اللہ تعالیٰ کی ایک بہت بڑی نعمت کی ناشکری کر رہا ہے۔ وہ اس طرح کہ انسان کو جو کچھ مال بھی ملتا ہے وہ اللہ تبارک

(۱) سورۃ التوبۃ (۹): آیت (۵۵)

وتعالیٰ کی عطا اور اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے ایک نعمت ہے، اور نعمت کا حقِ شکر یہ ہوتا ہے کہ اسے صحیح مصرف میں استعمال کیا جائے۔ اگر کسی نے کوئی چیز آپ کو محبت سے بطورِ ہدیہ دی ہے، تو اس کا شکریہ یہ ہے کہ اسے صحیح مصرف میں استعمال کیا جائے، اگر آپ اسے غلط کاموں میں استعمال کرنے لگیں گے، تو یہ اس کی ناشکری ہوگی۔

فرض کیجیے کسی نے آپ کو گاڑی دے دی اور آپ اسے صحیح اور جائز مقصد میں استعمال کرتے ہیں تو یہ اچھی بات ہے، لیکن اگر آپ اس گاڑی کو چوری کرنے اور ڈاکہ ڈالنے کے لیے استعمال کرنا شروع کردیں، تو یہ اس شخص کی ناشکری ہوگی۔ اسی طرح اللہ تبارک وتعالیٰ نے انسان کو جو کچھ بھی مال عطا فرمایا، وہ اللہ تعالیٰ کی نعمت اور اس کا احسان وانعام ہے۔ اس کے شکر کا طریقہ یہ تھا کہ زبان سے بھی اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا جائے اور عملی طور پر بھی اس روپیہ پیسہ کو اللہ تعالیٰ کی جائز کی ہوئی چیزوں میں استعمال کیا جائے اور ناجائز چیزوں میں استعمال کرنے سے بچا جائے۔ جو بندہ اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا روپیہ حاصل کرنے کے بعد اسے سود پر چلاتا ہے، اس کے ذریعہ سود کی آمدنی کمانے کی کوشش کرتا ہے تو وہ ''پرلے درجے کا ناشکرا ہے۔''

''کفّار'' (ناشکرے) کے ساتھ ''اثیم'' (گنہگار) دونوں لفظ ایک جگہ ذکر کرکے اشارہ فرمادیا ہے کہ ناشکری کی بدترین قسم یہ ہے کہ آدمی گناہ کا ارتکاب کرنے لگے، کیونکہ جب کوئی شخص تبارک و اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو اس کی نافرمانی میں استعمال کررہا ہے تو یہ بہت بڑی ناشکری ہے، اس لیے وہ شخص ''اثیم'' یعنی گناہ گار بھی ہے۔

یہاں تک سود کی حرمت اور اس کی خرابیوں کو بیان کیا گیا جس کی مفصّل تشریح عرض کی جاچکی ہے۔ سود کی حقیقت، قرضِ حسن کی اہمیت اور ہمارے پاس موجود مال ومتاع کے اللہ تبارک وتعالیٰ کی امانت ہونے کو علامہ محمد اقبال رحمہ اللہ نے اپنے چند اشعار[1] میں بڑے بصیرت افروز انداز میں بیان کیا ہے، وہ فرماتے ہیں۔

از رِبا آخر چہ می زاید؟ فتن
کس نداند لذّتِ قرضِ حسن

---

(۱) جاوید نامہ: ''پیغام افغانی باملّتِ روسیہ'' صفحہ نمبر ۶۶۶، مطبع: شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور

از رِبا جاں تیرہ، دل چوں خشت و سنگ
آدمی درّندہ، بے دندان و چنگ

رزقِ خود را از زمین بُردن رواست
این متاعِ بندہ و مِلکِ خداست

بندۂ مؤمن امیں، حق مالک است
غیرِ حق ہر شے کہ بینی ہالِک است

- سُود سے آخر کیا پیدا ہوتا ہے؟ فتنے ہی پیدا ہوتے ہیں، (حالانکہ سود کے مقابلے میں قرضِ حسن کتنے ہی زیادہ فوائد پر مشتمل ہے، لیکن آج) کوئی شخص بھی قرضِ حسن کی لذت سے واقف نہیں ہے۔
- سُود سے انسان کا باطن تاریک، دل اینٹ اور پتھر کی مانند سخت ہوجاتا ہے اور انسان خود دانتوں اور پنجوں کے بغیر درندہ بن جاتا ہے۔
- اپنا رزق زمین سے حاصل کرنا بلاشبہ جائز بات ہے، یہ زمین اگرچہ بندے کی متاع شمار ہوتی ہے تاہم یہ اللہ تعالیٰ ہی کی ملکیت ہے۔
- بندۂ مومن کے پاس یہ زمین (اور یہ مال و متاع) تو محض امانت ہیں، اس کے حقیقی مالک تو اللہ تبارک و تعالیٰ ہی ہیں، کیونکہ ذاتِ باری تعالیٰ کے سوا جو کچھ بھی تمہیں نظر آرہا ہے وہ ہلاک اور فنا ہونے والا ہے۔

• جہنم کے بعد جنت کا تذکرہ؛ رحمتِ الٰہی کا عظیم مظہر

اللہ تبارک وتعالیٰ کی رحمت کا ایک مظہر یہ بھی ہے کہ قرآنِ کریم میں جہاں کہیں کافروں کے لیے یا نافرمانوں کے لیے جہنم کے عذاب کی باتیں بتاتے ہیں، تو اس کے ساتھ ہی فوراً ایمان والوں اور نیک عمل کرنے والوں کے اچھے انجام کا بھی ذکر فرمادیتے ہیں، تاکہ بات کبھی یکطرفہ نہ رہے۔

اس سے جہاں ایک طرف یہ بتانا منظور ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے اوپر کوئی ظلم کرنے والا نہیں

ہے، وہیں دوسری طرف اس کا مقصد یہ بھی ہے کہ ان دونوں چیزوں کے ساتھ ملنے سے انسان کے دل کی کیفیت اس اعتبار سے معتدل اور درست ہوجاتی ہے کہ ایک طرف اسے جہنم کے عذاب سے خوف کا احساس ہوتا ہے، اور دوسری طرف جنت کی طلب میں اللہ تعالیٰ کی رحمت سے امید پیدا ہوتی ہے۔ اور فرمایا گیا ہے ''الایمان بین الخوف والرجاء'' کہ ایمان خوف اور امید کے درمیان ہے۔ یعنی نہ اتنا خوف ہونا چاہیے کہ آدمی کوئی کام بھی نہ کرسکے، اور نہ اتنی امید ہونی چاہیے کہ آدمی جہنم کے عذاب اور اللہ تعالیٰ کی ناراضگی سے بالکل ہی بے خوف ہوکر بیٹھ جائے۔ اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دعا تلقین فرمائی کہ:

اَللّٰهُمَّ اقْسِمْ لَنَا مِنْ خَشْيَتِكَ مَا يَحُولُ بَيْنَنَا وَبَيْنَ مَعَاصِيْكَ (۱)

یا اللہ! ہمیں اپنا اتنا ڈر عطا فرما دیجیے جو ہمارے اور آپ کی نافرمانیوں کے درمیان حائل ہوجائے۔

لہٰذا اللہ تعالیٰ کا اتنا ہی ڈر مطلوب ہے جو انسان کو گناہوں سے بچالے، اگر اس سے زیادہ ڈر ہوگا تو آدمی کچھ بھی نہیں کرسکتا۔ اس لیے ''خوف'' بھی معتدل ہونا چاہیے، اور ''رجاء'' (یعنی امید) بھی معتدل ہونی چاہیے، یہ دونوں چیزیں توازن کے ساتھ پیدا کرنے کے لیے اللہ تبارک وتعالیٰ جہاں کہیں عذاب کا ذکر فرماتے ہیں تو ساتھ ثواب کا بھی ذکر فرماتے ہیں، جہنم کی ہولناکیوں کا ذکر فرماتے ہیں تو جنت کی نعمتوں کا تذکرہ بھی فرمادیتے ہیں، نافرمانوں کا ذکر فرماتے ہیں تو ساتھ ساتھ فرمانبرداروں کی تعریف بھی فرما دیتے ہیں، تاکہ مومن بندے اعتدال کے ساتھ ایمان کے تقاضوں پر عمل پیرا رہیں۔

چنانچہ مومنینِ صالحین اور ان کے اجرِ عظیم کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا: ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ﴾ بے شک وہ لوگ جو ایمان لائیں اور نیک عمل کریں ﴿وَ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ﴾ اور نماز قائم کریں ﴿وَ اٰتَوُا الزَّكٰوةَ﴾ اور زکوٰۃ ادا کریں ﴿لَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ﴾ تو وہ اپنے رب کے پاس اپنے اجر کے مستحق ہوں گے ﴿وَ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ﴾ نہ انہیں کوئی خوف ہوگا ﴿وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝۲۷۷﴾ ''اور نہ انہیں کوئی غم پہنچے گا۔''

---

(۱) أخرجه الترمذي (۵/۵۲۸) (۳۵۰۲) وقال "هذا حديث حسن غريب" أبواب الدعوات عن رسول الله ﷺ. ورواه أيضاً الحاكم في "المستدرك" (۱/۵۲۸) وصححه، ووافقه الذهبي في التلخيص.

• سابقہ سودی معاملات کو ختم کر دینے کا حکم

اب آگے جو آیات آرہی ہیں کہ ﴿يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَذَرُوا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبَا﴾ ''اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو، اور سود کا جو حصہ بھی کسی کے ذمے باقی رہ گیا ہو اسے چھوڑ دو'' ان آیات کا ایک خاص پسِ منظر اور شانِ نزول[1] یہ ہے کہ زمانۂ جاہلیت میں لوگوں کے درمیان سودی معاملات کثرت سے چلتے رہتے تھے، بلکہ قبائلی سطح پر ایک قبیلہ اپنی ضرورت کے وقت میں دوسرے قبیلے سے سود پر قرضے لے لیتا تھا۔ اسی طرح کے قبائل میں سے ایک قبیلہ بنوثقیف اور ایک قبیلہ بنومخزوم تھا، ان دونوں کے درمیان بھی سودی معاملات چلتے رہتے تھے۔ بنوثقیف کے لوگوں کا کچھ سودی مطالبہ بنی مخزوم کی طرف تھا، یعنی بنومخزوم نے قرض لے رکھا تھا، اور بنوثقیف نے سودی قرض دیا ہوا تھا۔ اس دوران بنومخزوم مسلمان ہوگئے اور اسلام لانے کے بعد انہوں نے سود کی رقم کو ناجائز سمجھتے ہوئے دینے سے انکار کر دیا۔

ادھر بنوثقیف کے لوگ جو ابھی تک مسلمان نہیں ہوئے تھے، مگر مسلمانوں سے مصالحت کیے ہوئے تھے، انہوں نے بنومخزوم سے اپنے قرض کا مطالبہ شروع کر دیا۔ بنومخزوم کے لوگوں نے کہا کہ اسلام میں داخل ہونے کے بعد ہم اپنی اسلامی کمائی کو سود کی ادائیگی میں خرچ نہیں کریں گے۔ یہ آپس کا تنازعہ مکّہ مکرمہ میں پیش آیا، اس وقت مکہ مکرمہ فتح ہوچکا تھا اور نبی کریم سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے وہاں پر اپنا ایک گورنر حضرت عتاب بن اسید رضی اللہ عنہ کو مقرر کیا ہوا تھا، یہ معاملہ حضرت عتاب بن اسید کے پاس پہنچا۔ بنوثقیف کہتے تھے کہ ہم سود کے حق دار ہیں، ہمیں سود دیا جائے اور بنومخزوم کہتے تھے کہ اسلام لانے کے بعد جب کہ سود حرام ہوچکا تو ہم کیسے سود ادا کریں؟

حضرت عتاب بن اسید نے یہ معاملہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس بھیجا، اور آپ سے پوچھا کہ ایسے میں کیا کرنا چاہیے؟ تو روایت میں آتا ہے کہ اس موقع پر یہ آیتِ کریمہ نازل ہوئی، اور اس میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہ حکم دے دیا کہ اب بنومخزوم کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ بنوثقیف کا سود ادا کریں، بلکہ بنوثقیف کو صرف اپنی اصل رقم واپس ملے گی، چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ﴿يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ﴾ اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو ﴿وَذَرُوا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبَا﴾ ''اور جو سود کی رقمیں باقی رہ گئیں ہیں انہیں چھوڑ

---

(۱) تفسير الطبري = جامع البيان (٦/٢٣).

دو۔'' اس اسلامی قانون کے مسلمان تو پابند تھے ہی، لیکن جو غیر مسلم قبائل بطورِ صلح و معاہدہ اسلامی قانون کو قبول کر چکے تھے، وہ بھی اس کے پابند ہو چکے تھے جیسا کہ بنوثقیف بھی مسلمانوں کے ساتھ مصالحت کر چکے تھے، اس لیے وہ بھی اس پر عمل کرنے کے پابند ہو گئے۔

• سود خور کے خلاف اللہ اور اس کے رسول کا اعلانِ جنگ

آگے فرمایا: ﴿فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا﴾ اگر ایسا نہیں کرو گے تو ﴿فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ﴾ ''اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے اعلان جنگ سن لو۔''

یہ بڑے سنگین الفاظ ہیں جو اللہ تعالیٰ نے کسی اور جرم یا گناہ کے لیے استعمال نہیں فرمائے، لیکن سود کے جرم کے لیے فرمایا کہ اگر تم سود نہیں چھوڑ دو گے تو اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے تمہارے خلاف اعلانِ جنگ ہے، اور پھر فرمایا کہ ﴿وَ اِنْ تُبْتُمْ﴾ ''اور اگر توبہ کرلو'' یعنی سود کے معاملات سے توبہ کرلو ﴿فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ﴾ تو تمہارا اصل سرمایہ تمہارا حق ہے۔ ﴿لَا تَظْلِمُوْنَ وَ لَا تُظْلَمُوْنَ ﴿۲۷۹﴾﴾ ''ایسی صورت میں نہ تم کسی پر ظلم کرو گے نہ کوئی دوسرا تم پر کوئی ظلم کرے گا'' جبکہ تم اصل مال واپس کر دو، یعنی اگر تم اصل مال بھی واپس نہیں کرتے تو یہ قرض دینے والے پر ظلم ہے اور اگر قرض دینے والا تم سے اصل قرضے کی رقم کے اوپر کچھ اور مطالبہ کرتا ہے تو یہ تم پر ظلم ہے۔ اسلام یہ نہیں چاہتا کہ کوئی کسی پر ظلم کرے، لہٰذا نہ تم کسی کا قرضہ دبا کر اس پر ظلم کرو، اور نہ وہ تم سے سود کا مطالبہ کر کے تم پر ظلم کرے۔

• سود کی معمولی شرح کے جائز سمجھنے کا مغالطہ اور اس کی تردید

اس آیتِ کریمہ نے یہ بات واضح فرمادی کہ اگر کوئی شخص سود سے توبہ کرتا ہے، تو اس کا جو اصل سرمایہ یا اس نے اصل قرض دیا تھا، جس کو آپ راسُ المال (Principal Amount) کہہ سکتے ہیں، وہ لینے کا اسے حق ہوتا ہے، اس سے زیادہ لینے کا حق نہیں، اگر اس سے زیادہ کچھ بھی لے گا وہ ظلم میں داخل ہے اور حرام ہے۔ اس سے ان حضرات کے خیال کی بالکل واضح تردید ہوجاتی ہے جو یہ سمجھتے یا کہتے ہیں کہ اگر سود کی معمولی شرح ہو، تب تو وہ جائز ہے اور اگر سود کی شرح زیادہ ہو تو وہ حرام ہونی چاہیے۔ بعض اوقات دوسرے الفاظ میں یہ کہا جاتا ہے کہ ''سودِ مفرد'' تو جائز ہے، لیکن ''سودِ مرکّب'' ناجائز ہے۔ بعض لوگ اپنے اس

موقف پر سورۂ آلِ عمران کی اس آیت سے بھی استدلال کرتے ہیں جس کی تشریح ان شاء اللہ اپنے مقام پر آئے گی:

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوا الرِّبٰوٓا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً (۱)

اے ایمان والو! کئی گنا بڑھا چڑھا کر سود مت کھاؤ۔

اس کی وجہ سے بعض حضرات سمجھتے ہیں یا کہتے ہیں کہ یہاں اللہ تعالیٰ نے ''دوگنا چوگنا'' کرکے کھانے سے منع کیا ہے، لہٰذا اگر تھوڑی شرح کے ساتھ تھوڑا بہت سود یعنی ''سودِ مفرد'' ہو تو پھر اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔ قرآنِ کریم کی اس آیت نے یہ بات بالکل صاف کردی کہ اگر توبہ کررہے ہو تو ﴿فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ﴾ ''تمہیں صرف تمہارا سرمایہ واپس ملے گا،'' جس کے معنیٰ یہ ہیں کہ سرمائے پر کوئی بھی اضافہ اگر کروگے تو وہ سود ہوگا۔

جہاں تک اس آیت کا تعلق ہے جس میں فرمایا گیا کہ ''کئی گنا کرکے سود مت کھاؤ'' تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اگر چار گنا کرکے کھا رہے ہو تو وہ حرام ہے اور ایک گنا کرکے کھاؤ گے تو وہ حلال ہوجائے گا، بلکہ یہ بات ایک محاورے کے طور پر کہی گئی ہے۔ چونکہ عام طور پر ہوتا یہ تھا کہ جب سود کے اوپر کوئی رقم دی جاتی تھی، تو سود بڑھ چڑھ کر اصل رقم سے کئی گنا تک بڑھ جایا کرتا تھا، تو اسی واقعاتی صورتِ حال کو بیان کرتے ہوئے کہا گیا کہ سود کئی کئی گنا بڑھا چڑھا کر مت کھاؤ۔ اس کی مثال یوں سمجھیے کہ جیسے قرآنِ کریم نے فرمایا کہ:

وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا (۲)

میری آیتوں کو تھوڑی سی قیمت لے کر مت بیچو۔

اب اس کا مطلب کوئی شخص یوں سمجھنے لگے کہ تھوڑی قیمت سے بیچنا تو حرام ہے، لیکن اگر کوئی بڑی قیمت حاصل کرلی جائے، کوئی بڑا سودا کرلیا جائے تو جائز ہے۔ جس طرح یہ بات بدیہی طور پر بالکل غلط ہوگی، اسی طرح یہاں جو سورۂ آلِ عمران میں فرمایا گیا ہے کہ سود ''دوگنا، چوگنا'' کرکے مت کھاؤ اس کا بھی یہ مطلب

---

(۱) سورۃ آلِ عمران (۳): آیت (۱۳۰)

(۲) سورۃ البقرۃ (۲): آیت (۴۴)، سورۃ المائدہ (۵): آیت (۴۱)

نہیں ہے کہ اگر اس سے کم ہوگا تو جائز ہو جائے گا، کیونکہ سورۂ بقرہ کی اس آیت نے بالکل صاف واضح طور پر کہہ دیا کہ تمہارا حق صرف وہ ہے وہ اصل سرمایہ ہے، اور پھر ﴿لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ﴾ کہہ کر یہ بتادیا کہ ''اس صورت میں نہ تم کسی پر ظلم کروگے نہ کوئی دوسرا تم پر ظلم کرے گا۔'' جبکہ اس کے خلاف جو عمل بھی ہوگا، وہ ظلم ہوگا۔

• سود نہ چھوڑنے پر اعلانِ جنگ

اوپر آپ نے دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے سود نہ چھوڑنے پر اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے جنگ کا اعلان فرمایا ہے۔ قرآنِ کریم نے بہت سی چیزوں کو حرام قرار دیا ہے، مثلاً شراب نوشی، زنا، چوری، ڈاکہ، جوا وغیرہ، لیکن کسی اور گناہ کے لیے اتنے سخت الفاظ استعمال نہیں فرمائے کہ ''اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے اعلانِ جنگ سُن لو،'' لیکن سود کے بارے میں اتنے سنگین الفاظ استعمال فرمائے ہیں۔ اس کی وجہ بظاہر یہ ہے کہ سود کے نقصانات صرف ایک دو افراد کی حد تک محدود نہیں رہتے، بلکہ اس کے نتیجے میں پوری معیشت کا نظام تلپٹ ہوکر رہ جاتا ہے، اور پورا معاشرہ اس کی تباہ کاریوں سے متاثر ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے معاش کے لیے جو فطری نظام قائم فرمایا ہے، سود اسے بگاڑ کر ایسا نظام وجود میں لاتا ہے جس کے ذریعے دولت چند ہاتھوں میں سکڑ کر رہ جاتی ہے۔ اور آج کی صورتِ حال نے تو یہ بات بالکل واضح کردی ہے کہ پہلے زمانے میں جو انفرادی قسم کے سودی معاملات ہوتے تھے، ان کا نقصان اتنا تباہ کن نہیں ہوتا تھا جتنا آج کے دور میں عالمی سطح پر سود کے چلن نے پوری دنیا کو نقصان سے دوچار کیا ہے۔ یہ پہلو بھی میں نے اپنی بعض تحریروں کے اندر واضح کیا ہے جن کا حوالہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے۔ (۱)

• مقروض مفلس کو مہلت دینے کا حکم

پھر آگے فرمایا: ﴿وَاِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ﴾ اور اگر وہ شخص جس کو تم نے قرض دیا ہے وہ تنگدست ہو ﴿فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيْسَرَةٍ﴾ ''تو پھر تمہیں اس وقت تک مہلت دینی ہوگی جب تک کہ اسے کشادگی حاصل ہوجائے۔''

---

(۱) دیکھیے: Historic Judgment On Interest اور Causes and Remedies of Financial Crisis شائع کردہ مکتبہ معارف القرآن احاطہ دارالعلوم کراچی۔ ان دونوں مقالوں کا اردو ترجمہ بھی یہیں سے شائع ہوا ہے۔

یہاں ایک قابلِ غور بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ فرمارہے ہیں کہ وہ مقروض ''اگر تنگ دست ہے تو پھر اسے مہلت دے دو۔'' یہاں ''اگر تنگ دست ہے'' کے یہ الفاظ خود بتارہے ہیں کہ ایسی صورت بھی ہوسکتی ہے کہ مقروض تنگ دست نہ ہو، بلکہ پیسوں والا ہو۔ اس صورت میں مہلت دینے کی ضرورت نہیں، بلکہ اصل رقم کا مطالبہ کرنا چاہیے، لہٰذا یہ سمجھنا کہ ربا کی آیت صرف غریبوں کو قرض دینے سے متعلق ہے، امیروں کو قرض دینے سے تعلق نہیں رکھتی، یہ بالکل غلط بات ہے کیونکہ اگر یہ بات ہوتی تو آگے یہ کیوں کہا جاتا کہ ﴿وَ اِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ﴾ ''اگر وہ تنگدست ہو تو پھر تم اسے مہلت دو،'' اس سے پتہ چلا کہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ مقروض تنگدست ہو اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ تنگدست نہ ہو۔ اگر تنگدست ہے تو تم اسے مہلت دو، لیکن اگر تنگدست نہ ہو تو اس سے اصل رقم کا مطالبہ جائز ہے، مگر سود لینا جائز نہیں۔

﴿وَ اَنْ تَصَدَّقُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ﴾ ''اور اگر صدقہ ہی کردو، تو یہ تمہارے لیے کہیں بہتر ہے۔'' صدقہ کر دینے سے مراد معاف کر دینا ہے۔ اگر مقروض بے چارہ تنگدست ہے، تو ایک شکل تو یہ ہے کہ اسے مہلت دے کر کہا جائے کہ جب تمہیں تنگ دستی سے نجات مل جائے اور تمہارے پاس فراخی آجائے تو پھر میرا قرض واپس کر دینا، اور دوسری صورت یہ ہے کہ آدمی یہ سوچے کہ مقروض بے چارہ تنگدست ہے، اور مجھے اللہ تعالیٰ نے بہت کچھ دیا ہوا ہے، لہٰذا میں اسے معاف ہی کر دیتا ہوں۔ اگر ایسا کرلیا جائے تو یہ زیادہ بہتر ہے اور اس میں معاف کرنے والے کو آخرت کے لحاظ سے ان شاء اللہ تعالیٰ زیادہ بڑا اجر ملے گا۔ ﴿اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۲۸۰﴾ ''اگر تم صحیح معنیٰ میں جانتے ہو،'' یعنی اگر علم کی صحیح سمجھ تمہارے اندر ہو تو تمہیں پتہ چل جائے گا کہ یہ طریقہ زیادہ بہتر تھا اور اسی میں زیادہ فائدہ تھا۔

• سود کی حرمت بیان کرنے کے بعد ناصحانہ ترغیب

قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ کا خاص اسلوب ہے کہ جہاں کوئی قانون یا حکم بیان فرماتے ہیں تو محض حاکمانہ انداز سے قانون بیان کرنے کے بجائے ناصحانہ انداز بھی اختیار فرماتے ہیں، تاکہ صرف ایک حکم سنانے کے بجائے بندوں کو ترغیب و ترہیب کے ذریعے بھی اس بات پر مائل کریں کہ وہ اپنے دل سے ان احکام کو تسلیم کریں اور خوش دلی سے ان احکام پر عمل پیرا ہوں۔

اسی لیے ربا کے احکام بیان کرنے اور اس کی سنگینی کا اعلان کرنے کے بعد آیاتِ ربا کے آخر میں اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتے ہیں کہ ﴿وَ اتَّقُوْا يَوْمًا﴾ اور اس دن سے ڈرو ﴿تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ اِلَى اللّٰهِ﴾ جس میں تم

سب کو اللہ کے پاس لوٹا کر لے جایا جائے گا ﴿ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ﴾ ''پھر ہر انسان کو جو کچھ اس نے کمایا ہے، پورا پورا دیا جائے گا۔'' ''جو کچھ کمایا ہے'' کے معنیٰ یہ ہیں کہ دنیا میں اعمال کے ذریعہ جو کمائی کی ہے، جنت کی کمائی یا دوزخ کی کمائی، اس کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا ﴿وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۲۸۱﴾﴾ ''اور ان پر کوئی ظلم نہیں ہوگا۔''

آیت نمبر ۲۸۲ تا ۲۸۳

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوْهُ ؕ
وَلْيَكْتُبْ بَّيْنَكُمْ كَاتِبٌۢ بِالْعَدْلِ ۠ وَلَا يَاْبَ كَاتِبٌ اَنْ يَّكْتُبَ كَمَا عَلَّمَهُ
اللّٰهُ فَلْيَكْتُبْ ۚ وَلْيُمْلِلِ الَّذِيْ عَلَيْهِ الْحَقُّ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ وَلَا
يَبْخَسْ مِنْهُ شَيْـًٔا ؕ فَاِنْ كَانَ الَّذِيْ عَلَيْهِ الْحَقُّ سَفِيْهًا اَوْ ضَعِيْفًا اَوْ لَا
يَسْتَطِيْعُ اَنْ يُّمِلَّ هُوَ فَلْيُمْلِلْ وَلِيُّهٗ بِالْعَدْلِ ؕ وَاسْتَشْهِدُوْا شَهِيْدَيْنِ
مِنْ رِّجَالِكُمْ ۚ فَاِنْ لَّمْ يَكُوْنَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَّامْرَاَتٰنِ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ
مِنَ الشُّهَدَآءِ اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰىهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحْدٰىهُمَا الْاُخْرٰى ؕ وَلَا
يَاْبَ الشُّهَدَآءُ اِذَا مَا دُعُوْا ؕ وَلَا تَسْـَٔمُوْٓا اَنْ تَكْتُبُوْهُ صَغِيْرًا اَوْ كَبِيْرًا
اِلٰٓى اَجَلِهٖ ؕ ذٰلِكُمْ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ وَاَقْوَمُ لِلشَّهَادَةِ وَاَدْنٰٓى اَلَّا تَرْتَابُوْٓا
اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً حَاضِرَةً تُدِيْرُوْنَهَا بَيْنَكُمْ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ
اَلَّا تَكْتُبُوْهَا ؕ وَاَشْهِدُوْٓا اِذَا تَبَايَعْتُمْ ۠ وَلَا يُضَآرَّ كَاتِبٌ وَّلَا
شَهِيْدٌ ؕ وَاِنْ تَفْعَلُوْا فَاِنَّهٗ فُسُوْقٌۢ بِكُمْ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ وَيُعَلِّمُكُمُ اللّٰهُ ؕ
وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۲۸۲﴾ وَاِنْ كُنْتُمْ عَلٰى سَفَرٍ وَّلَمْ تَجِدُوْا كَاتِبًا فَرِهٰنٌ

مَّقْبُوْضَةٌ ؕ فَاِنْ اَمِنَ بَعْضُكُمْ بَعْضًا فَلْيُؤَدِّ الَّذِى اؤْتُمِنَ اَمَانَتَهٗ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ ؕ وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ ؕ وَمَنْ يَّكْتُمْهَا فَاِنَّهٗۤ اٰثِمٌ قَلْبُهٗ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ ﴿۲۸۳﴾ ع ۳۹ ۲ ۷

اے ایمان والو! جب تم کسی معین میعاد کے لیے اُدھار کا کوئی معاملہ کرو تو اسے لکھ لیا کرو، اور تم میں سے جو شخص لکھنا جانتا ہو، انصاف کے ساتھ تحریر لکھے اور جو شخص لکھنا جانتا ہو، لکھنے سے انکار نہ کرے۔ جب اللہ نے اسے یہ علم دیا ہے تو اسے لکھنا چاہیے۔ اور تحریر وہ شخص لکھوائے جس کے ذمے حق واجب ہو رہا ہو اور اسے چاہیے کہ وہ اللہ سے ڈرے جو اس کا پروردگار ہے، اور اس (حق) میں کوئی کمی نہ کرے۔ ہاں اگر وہ شخص جس کے ذمے حق واجب ہو رہا ہے، ناسمجھ یا کمزور ہو یا (کسی اور وجہ سے) تحریر نہ لکھوا سکتا ہو، تو اس کا سرپرست انصاف کے ساتھ لکھوائے۔ اور اپنے میں سے دو مردوں کو گواہ بنا لو، ہاں اگر دو مرد موجود نہ ہوں، تو ایک مرد اور دو عورتیں ان گواہوں میں سے ہو جائیں جنہیں تم پسند کرتے ہو، تاکہ اگر ان دو عورتوں میں سے ایک بھول جائے تو دوسری اسے یاد دلا دے، اور جب گواہوں کو (گواہی دینے کے لیے) بلایا جائے، تو وہ انکار نہ کریں، اور جو معاملہ اپنی میعاد سے وابستہ ہو، چاہے وہ چھوٹا ہو یا بڑا، اسے لکھنے سے اکتاؤ نہیں۔ یہ بات اللہ کے نزدیک زیادہ قرینِ انصاف اور گواہی کو درست رکھنے کا بہتر ذریعہ ہے، اور اس بات کی قریبی ضمانت ہے کہ تم آئندہ شک میں نہیں پڑو گے۔ ہاں اگر تمہارے درمیان کوئی نقد لین دین کا سودا ہو تو اسے نہ لکھنے میں تمہارے لیے کچھ حرج نہیں ہے۔ اور جب خرید و فروخت کرو تو گواہ بنا لیا کرو۔ اور نہ لکھنے والے کو کوئی تکلیف پہنچائی جائے نہ گواہ کو۔ اور اگر ایسا کرو گے تو یہ تمہاری طرف سے نافرمانی ہوگی، اور اللہ کا خوف دل میں رکھو، اللہ تمہیں تعلیم دیتا ہے، اور اللہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔ ﴿۲۸۲﴾ اور اگر تم سفر پر ہو اور

تمہیں کوئی لکھنے والا نہ ملے تو (ادائیگی کی ضمانت کے طور پر) رہن قبضے میں رکھ لیے جائیں۔ ہاں اگر تم ایک دوسرے پر بھروسہ کرو تو جس پر بھروسہ کیا گیا ہے، وہ اپنی امانت ٹھیک ٹھیک ادا کرے، اور اللہ سے ڈرے جو اس کا پروردگار ہے۔ اور گواہی کو مت چھپاؤ، اور جو گواہی کو چھپائے، وہ گنہگار دل کا حامل ہے، اور جو عمل بھی تم کرتے ہو اللہ اس سے خوب واقف ہے۔ (۲۸۳)

ادھار خرید وفروخت اور ادھار کے معاملات سے متعلق مسائل

ربا اور سود کی حرمت کا بیان کرنے کے بعد اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان آیتوں میں ادھار لین دین کے احکام بیان فرمائے ہیں۔ گذشتہ آیات میں ایک طرف سود کی حُرمت کا اعلان فرمادیا اور یہ بتا دیا کہ سود اتنا بڑا گناہ ہے کہ جو نہ چھوڑے وہ اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے اعلانِ جنگ سن لے، لیکن وہاں پر ساتھ ہی یہ بھی فرمادیا تھا کہ بیع تمہارے لیے حلال کردی گئی ہے۔ اب بیع کی مختلف شکلیں ہوسکتی ہیں، مثلاً:

- ان میں سے ایک شکل تو یہ ہوسکتی ہے کہ بیع بالکل ہاتھ در ہاتھ ہو رہی ہو، یعنی بیچنے والا اسی وقت سامان حوالے کررہا ہو اور خریدنے والا فوراً پیسے دے رہا ہو۔ اسے ''نقد بیع'' کہا جاتا ہے۔
- دوسری شکل یہ ہوسکتی ہے کہ بیچنے والے نے سامان تو ابھی دے دیا، لیکن خریدار قیمت کے بارے میں کوئی مدت طے کرلے کہ اتنی مدت کے اندر اندر قیمت ادا کی جائے گی، اسے اصطلاح میں ''بیعِ مؤجل'' یا ''ادھار بیع'' کہتے ہیں۔
- اسی طرح اس کے بالکل برعکس بیع کی ایک شکل یہ بھی ہوسکتی ہے کہ خریداری کرنے والے شخص نے پیسے تو پہلے دے دیے، لیکن جو چیز خریدی جارہی ہے، وہ ابھی بیچنے والے کے پاس مہیّا نہیں ہے، اور یہ طے ہوگیا ہے کہ ایک معین مدت کے بعد بیچنے والا شخص خریدار کو فراہم کرے گا، جیسے عام طور پر کھیتوں اور باغات میں ایسا ہوتا ہے کہ کاشت کار کو بیج اور فصل وغیرہ کی خریداری کے لیے پیسوں کی ضرورت ہوتی ہے، تو اس مقصد کے لیے وہ آئندہ پیدا ہونے والا پھل، اس شرط کے ساتھ پیشگی فروخت کردیتا ہے کہ پیسے ابھی پورے پورے دے دو، اور میں چھ مہینے کے بعد تمہیں فلاں پھل یا فلاں پیداوار اتنی مقدار میں ادا کروں گا، اسے ''بیعِ سلم'' کہتے ہیں جو خاص شرائط کے ساتھ جائز ہے۔

زیرِ نظر آیتِ کریمہ ادھار کے اسی قسم کے معاملات کو بیان کر رہی ہے، اس میں ''بیعِ سلم'' بھی داخل ہے، اور ''بیعِ مؤجل'' بھی، یعنی یہ صورت بھی داخل ہے کہ پیسے ابھی دے دیے گئے اور جو چیز خریدی جارہی ہے، وہ بعد میں ادا کی جائے گی، اور وہ صورت بھی داخل ہے جس میں بیچنے والے نے چیز ابھی دے دی ہے، اور پیسے بعد میں وصول کرے گا۔ اس میں جو ''بیعِ سلم'' والی صورت ہے، یعنی پیسے ابھی دے دیے گئے اور مطلوبہ چیز بعد میں مہیا کی جائے گی، وہ ہر چیز میں ہر وقت ہر حالت میں جائز نہیں ہوتی، یہ پیشگی سودا ہر چیز میں نہیں ہوتا، بلکہ اس کے لیے مفصل شرائط ہیں جو نبیِ کریم سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمائی ہیں[1] اور جن کی تفصیل فقہ کی کتابوں میں موجود ہے۔[2] البتہ جو ''بیعِ مؤجل'' والی شکل ہے یعنی جس میں بیچنے والے نے چیز تو ابھی دے دی، لیکن پیسے وصول کرنے کے لیے کوئی مدت مقرر کرلی کہ اتنے عرصے کے بعد قیمت ادا کی جائے گی، تو یہ صورت اکثر و بیشتر جائز ہوتی ہے اور اس میں جو قیمت بھی آپس میں باہمی رضامندی سے طے ہوجائے، وہ جائز ہے۔

• دَین اور قرض میں فرق

اب اس میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے سب سے پہلے تو یہ بات ارشاد فرمائی کہ اگر کوئی ادھار معاملہ ہو، تو اسے تم آپس میں لکھ لیا کرو، چنانچہ فرمایا: ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا﴾ اے ایمان والو! ﴿اِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ﴾ جب تم کوئی ادھار کا معاملہ کرو ﴿فَاكْتُبُوْهُ﴾ ''تو اسے لکھ لیا کرو۔''

یہاں پر ﴿اِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ﴾ میں ادھار کے لیے ''دَین'' کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ ''دَین'' (Debt) کہتے ہیں کسی بھی ایسے مالی حق کو جو ایک شخص کا دوسرے پر واجب ہوگیا ہو۔ ''دَین'' اور ''قرض'' میں فرق یہ ہے کہ قرض (Loan) تو اس چیز کو کہا جاتا ہے جو کسی شخص کو ادھار دی جائے، مثلاً پیسے یا آٹا، اور کہا جائے کہ ہم تم سے اتنے ہی پیسے یا اتنا ہی آٹا بعد میں وصول کرلیں گے، یہ بھی اگرچہ ایک لحاظ سے دَین ہی ہے، کیونکہ جس شخص نے قرض لیا ہے، اس کے ذمہ وہ قرض کی رقم واجب الاداء ہوگئی ہے، اور واجب الاداء رقم کا نام بھی دَین ہوتا ہے، لیکن دَین کا لفظ قرض کے مقابلے میں زیادہ وسیع اور زیادہ عام ہے۔

---

(۱) صحيح البخاري (۸۵/۳) (۲۲۳۹) كتاب السلم، باب السلم في كيل معلوم.

(۲) تفصیل کے لیے دیکھیے: حضرت والا (حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب) دامت برکاتہم کی کتاب ''اسلامی بینکاری کی بنیادیں''۔ صفحہ: ۱۹۵، عنوان: سلم اور استصناع۔ نیز فقہ البیوع جلد اول صفحہ: ۵۶۰۔ (راشد)

''دَین'' ہر اُس واجب الاداء چیز کو کہتے ہیں جو کسی کے ذمے کسی بھی عقد کے تحت لازم ہوگئی ہو۔ مثلاً میں نے ایک کپڑا کسی کو بیچا، اور یہ طے کیا کہ تم اس کی قیمت مجھے ایک مہینے کے بعد ادا کروگے، تو کپڑے کی قیمت خریدار کے ذمہ ایک مہینے کے بعد واجب ہوگئی، اور یہ رقم جو بیع کے معاملے کے نتیجے میں خریدار کے ذمے لازم ہوئی ہے یہ ''دَین'' ہے، یا اسی طرح ایک کاشتکار نے پیسے پہلے لے لیے اور کہا ہے کہ میں تمہیں تین مہینے کے بعد فلاں پیداوار، مثلاً گندم فلاں تاریخ کو اتنے من فراہم کروں گا، تو یہ گندم بھی ایک ''دَین'' ہے، کیونکہ اس صورت میں کاشتکار کے ذمہ یہ واجب ہوگیا ہے کہ وہ طے شدہ جنس، طے شدہ مقدار کے مطابق، طے شدہ تاریخ پر خریدار کو فراہم کرے۔ اس اعتبار سے ہر قرض کو دین کہا جاسکتا ہے، لیکن ہر دَین کو قرض نہیں کہا جاسکتا۔ زیرِ نظر آیت میں وسیع تر مفہوم رکھنے والا ''دَین'' کا لفظ استعمال فرمایا گیا ہے جو مذکورہ تمام صورتوں کو شامل ہے، لہٰذا یہ حکم ہر دَین کے لیے ہے کہ اس کا معاملہ لکھ لینا چاہیے، چاہے وہ قرض ہو یا ادھار بیع ہو۔

• معاملات کو ضبطِ تحریر میں لانے کی تاکید و اہمیت

یہ حکم اگرچہ وجوب کے لیے نہیں ہے، یعنی شرعاً واجب نہیں ہے کہ جب بھی ادھار کا کوئی معاہدہ ہو تو اسے ضرور لکھا جائے، لیکن اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہ ہدایت عطا فرمائی ہے کہ لکھ لینا بہتر ہے۔ اب ذرا تصوّر فرمایئے کہ یہ آیت اس دور میں نازل ہو رہی ہے جب لکھنے پڑھنے کا اتنا رواج نہیں تھا، کاغذ بھی میسّر نہیں تھے، لوگ اگر کوئی چیز لکھنا چاہتے تو اس کے لیے کھجور کی چھال، ہرن کی جھلّی یا ہڈیاں استعمال کیا کرتے تھے، نیز لکھنا بھی ہر ایک کو نہیں آتا تھا۔ اس زمانے میں بھی اللہ تبارک وتعالیٰ فرمارہے ہیں کہ اگر ادھار کا معاملہ کرو تو لکھ لیا کرو، گویا اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس دور میں بھی جبکہ لکھنا کوئی آسان کام نہیں تھا، لوگوں کو اس بات کی ترغیب دی ہے کہ تم اپنے باہمی معاملات کو ضبطِ تحریر میں لایا کرو، تاکہ جھگڑے کے وقت میں وہ تحریر کام آسکے، اور جھگڑے پیدا ہی نہ ہوں۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ معاملات کو تحریری شکل میں لانے کی کتنی بڑی اہمیت ہے، اسے اگرچہ قرآنِ کریم نے یا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے فرض و واجب قرار نہیں دیا، اگر فرض و واجب قرار دے دیتے تو اس میں لوگوں کے لیے پریشانی اور مشقت ہو جاتی، کیوں کہ بعض اوقات بہت چھوٹے موٹے معاملات ہوتے ہیں، جو آپس کے اعتماد کی وجہ سے انجام پا رہے ہوتے ہیں۔ اگر ہر موقع پر لازم کردیا جاتا کہ تم ضرور

کوئی دستاویز لکھو، تو یہ لوگوں کے لیے مشقت کا سبب بن سکتا تھا، اس لیے واجب اور فرض تو نہیں کیا، لیکن لکھنے کی ترغیب ضرور دے دی کہ ایسے معاملات لکھ لیا کرو۔

آپس کے معاملات لکھنے کی ترغیب دینے سے بتلانا یہ مقصود ہے کہ تمہارے آپس میں جو معاملات ہوتے ہیں، وہ بالکل واضح، شفاف اور صاف ہونے چاہئیں۔ تمہارے پاس ان کا ایک باقاعدہ ثبوت موجود ہونا چاہیے، تاکہ اگر کسی وقت کوئی تنازعہ پیش آجائے تو اس تحریر کی طرف رجوع کیا جاسکے۔ اسی سے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ شریعت نے باہمی معاملات کی صفائی پر کتنا زور دیا ہے! یعنی جب آپس میں لوگ کوئی تجارت کر رہے ہیں یا کوئی ایسا معاملہ کر رہے ہیں کہ جس میں کوئی لین دَین کی ضرورت پیش آنی ہے تو اسے خوب اچھی طرح واضح ہونا چاہیے۔ ہر شخص کو پتہ ہونا چاہیے کہ اس کے ذمے کیا فریضہ ہے اور اس کے کیا حقوق ہیں؟

جو لوگ آپس میں اکٹھے رہتے ہیں، یا مشترک معاملات کرتے ہیں، وہ محض یہ سوچ کر شرماشرمی میں لکھنے سے پرہیز نہ کریں کہ ہم تو آپس میں بھائیوں کی طرح رہتے ہیں، اس لیے ہمیں لکھنے کی کیا ضرورت؟ کیونکہ آگے چل کر جب معاملات پیچیدہ ہوتے ہیں، تو کوئی تحریر نہ ہونے کی وجہ سے بسا اوقات آپس میں اختلافات اور لڑائی جھگڑے پیدا ہوجاتے ہیں۔ آج کل خاندانی کاروبار میں بکثرت یہ صورت پیش آتی ہے کہ شروع میں باہمی محبت اور اعتماد کی بنیاد پر کچھ طے نہیں کیا گیا کہ کس کے کیا حقوق اور کیا فرائض ہیں؟ لیکن جب بچے بڑے ہوئے، ان کی شادیاں ہوئیں، تو ایک دوسرے سے شکایتیں پیدا ہونی شروع ہوگئیں، دلوں میں بال آنا شروع ہوا، پھر کسی وقت وہ لاوا پھوٹا اور محبتیں دشمنیوں میں تبدیل ہوگئیں۔

یہ ساری خرابی معاملات کو صاف وشفاف نہ رکھنے سے پیدا ہوتی ہے۔ اگر قرآنِ کریم کی ہدایت کے مطابق ہر بات لکھت پڑھت کے ذریعے صاف شفاف ہوتی، تو یہ دشمنیاں اور مقدّمہ بازیاں نہ ہوتیں، اس لیے اس قرآنی حکم پر عمل پیرا ہونے کی بھرپور کوشش کرنی چاہیے۔

• دَین کی دستاویز لکھنے والے کاتب کی صفات

پھر آگے ارشاد فرمایا: ﴿وَ لْيَكْتُبْ بَّيْنَكُمْ كَاتِبٌۢ بِالْعَدْلِ﴾ ''اور تمہارے درمیان ایک لکھنے والا انصاف کے ساتھ لکھے۔'' جس زمانے میں قرآن نازل ہو رہا ہے، اس وقت ہر ایک آدمی کو لکھنا نہیں آتا تھا،

اگر کوئی دستاویز لکھنی ہوتی تو کسی کاتب کو بلانا پڑتا تھا۔ اور آج بھی صورتِ حال ایسی ہی ہے کہ ہر لکھے پڑھے شخص کو بھی مالی اور تجارتی دستاویز لکھنے کا سلیقہ نہیں آتا، کیونکہ اس میں ایسی قانونی عبارت لکھنی پڑتی ہے جو معاملے کی تمام تفصیلات پر مشتمل ہو اور اُس میں کوئی ابہام نہ رہے۔ اسی لیے عام طور پر اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ بھی اس قسم کی دستاویز کسی قانون داں سے لکھواتے ہیں، اور اس طرح انہیں بھی کاتب کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس ''کاتب'' کی صفات بیان کرتے ہوئے قرآنِ کریم فرماتا ہے کہ جب تم کسی کاتب کا انتخاب کرو، تو وہ لکھنے والا ایسا غیر جانبدار ہو کہ ﴿بِالْعَدْلِ﴾ وہ انصاف کے ساتھ لکھے، یعنی اس دستاویز میں وہ کسی ایک کی طرف جھک کر کوئی ایسا لفظ نہ لکھ دے جو دوسرے کے مفاد کے خلاف ہو۔

﴿وَلَا يَأْبَ كَاتِبٌ اَنْ يَّكْتُبَ﴾ ''اور کوئی لکھنے والا لکھنے سے انکار نہ کرے،'' یعنی جب کسی کو بلایا جائے کہ ہمارے درمیان ایک معاملہ ہو رہا ہے، لہٰذا تم آ کر کوئی دستاویز لکھ دو، تو کاتب کو لکھنے سے انکار نہیں کرنا چاہیے۔ ﴿كَمَا عَلَّمَهُ اللّٰهُ﴾ ''جیسا کہ اللہ نے اسے یہ علم دیا ہے،'' یعنی اسے لکھنے کا جو فن آتا ہے، یہ بھی اللہ کی طرف سے دیا ہوا ایک علم ہے، تو اس علم کا حق یہ ہے کہ اس سے دوسروں کو فائدہ پہنچایا جائے۔ وہ لوگ جو دستاویز لکھنا نہیں جانتے، وہ تم سے مدد لینا چاہ رہے ہیں تو تمہیں چاہیے کہ انہیں انکار نہ کرو، بلکہ حتی الامکان ان کی مدد کردو، الّا یہ کہ کوئی ایسی مجبوری ہو کہ اس کے لیے لکھنا ممکن نہ ہو رہا ہو، تو وہ الگ بات ہے۔ پھر کسی اور کاتب کو طلب کر لینا چاہیے، لیکن جب تک اسے لکھنے کا علم حاصل ہے اور لکھنے کا موقع بھی ہے تو کاتب کے لیے انکار کرنا درست نہیں، کیونکہ اللہ نے اسے علم دیا ہے تو ﴿فَلْيَكْتُبْ﴾ ''اسے چاہیے کہ وہ لکھے۔''

• ادھار کی دستاویز لکھوانے کی ذمہ داری اور اجرت کس پر ہوگی؟

پھر فرمایا: ﴿وَلْيُمْلِلِ الَّذِيْ عَلَيْهِ الْحَقُّ﴾ ''اور وہ شخص لکھوائے جس کے ذمے کوئی حق واجب ہو رہا ہو۔'' چونکہ بات اس صورت کی ہو رہی ہے جب ایک طرف کوئی چیز بیچنے والا ہے اور دوسری طرف کوئی ادھار خریدنے والا ہے، اور وہ دونوں ایسے ہیں کہ دستاویز نہیں لکھ سکتے، تو انہوں نے ایک تیسرے آدمی کو بلایا ہے کہ وہ دستاویز لکھے، لیکن ظاہر ہے کہ اس دستاویز کا مضمون کسی کو املا کرانا ہوگا کہ کیا کیا بات اور کیا کیا شرائط وغیرہ لکھی جائیں؟ تو یہ املا کرانا، یعنی لکھوانا کس کی ذمے داری ہوگی؟ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں یہ چیزیں وہ شخص

لکھوائے جس کے ذمے حق واجب ہو رہا ہو، مثلاً ادھار پر خریداری ہو رہی ہے، تو بیچنے والا تو فوراً کوئی چیز دے رہا ہے، اور جو خریدار ہے وہ قیمت ایک مہینے کے بعد ادا کرے گا، اس کے ذمے قیمت کی ادائیگی کا حق واجب ہو رہا ہے، تو اب ادھار کی دستاویز لکھوانا بھی اسی کی ذمے داری ہے۔

اس سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ اگر کوئی کاتب مفت میسر نہیں آ رہا، اور ہر کاتب دستاویز لکھنے کی اجرت طلب کرتا ہے، تو اس کی اجرت بھی اسی کے ذمہ واجب ہوگی جس کے ذمہ حق واجب ہو رہا ہو، یعنی جس کو قیمت ادا کرنی ہے۔ چونکہ اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا کہ لکھوانے کی ذمے داری اس کی ہے جس کے ذمے ادھار واجب ہو رہا ہے، تو ایسی صورت میں اگر اجرت دینی پڑے تو اجرت بھی اسی کے ذمے واجب ہونی چاہیے۔

پھر آگے فرمایا: ﴿وَ لْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ﴾ ''جو لکھنے والا ہے وہ اپنے پروردگار سے ڈرے،'' یعنی اس بات سے ڈرے کہ اگر میں نے دستاویز لکھتے ہوئے کچھ آگے پیچھے کر دیا یا اس میں کسی کے حق میں کوئی تبدیلی کر دی یا کسی کے خلاف کوئی ایسا کام کر دیا جو معاہدے کی روح کے خلاف ہے، تو اللہ تعالیٰ کے یہاں میری پکڑ ہوگی ﴿وَ لَا يَبْخَسْ مِنْهُ شَيْـًٔا﴾ ''اور وہ حق جو کسی کا واجب ہو رہا ہے اس میں کچھ بھی کمی نہ کرے،'' بلکہ جیسا معاملہ ہوا ہے، ٹھیک ٹھیک سو فیصد اسی طرح لکھوائے۔

• جو خود نہ لکھوا سکے، اس کا ولی دستاویز لکھوائے گا

پھر فرمایا کہ بعض مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ جن لوگوں کے درمیان معاملہ ہو رہا ہے، وہ نہ تو خود لکھنے کے اہل ہوتے ہیں، اور نہ لکھوانے کے اہل ہوتے ہیں، مثلاً نابالغ بچہ، یا مجنون شخص وغیرہ، تو ایسی صورت میں جو شخص ان کا ولی یا سرپرست ہو وہ لکھوائے، مثلاً نابالغ بچہ ہے اور اس کی کوئی جائیداد فروخت ہو رہی ہے یا اس کے لیے کوئی چیز خریدی جا رہی ہے تو ان تمام صورتوں میں اس کا جو ولی یا سرپرست ہے، وہ اس کے قائم مقام بن کر اس کی نیابت میں وہ عقد کرے گا، اسی طرح اس حکم میں وہ شخص بھی داخل ہے جو عقلی اعتبار سے کمزور ہے، اس کی دستاویز بھی اس کا ولی لکھوائے گا۔

اسی بات کو بیان کرتے ہوئے فرمایا: ﴿فَاِنْ كَانَ الَّذِيْ عَلَيْهِ الْحَقُّ﴾ اگر وہ شخص جس کے ذمہ حق واجب ہو رہا ہے ﴿سَفِيْهًا﴾ وہ ناسمجھ ہو ﴿اَوْ ضَعِيْفًا﴾ یا کمزور ہو ﴿اَوْ لَا يَسْتَطِيْعُ اَنْ يُّمِلَّ هُوَ﴾ ''یا کسی اور وجہ سے وہ طاقت نہیں رکھتا کہ وہ خود املا کرائے،'' مثلاً گونگا ہے، ﴿فَلْيُمْلِلْ وَلِيُّهٗ بِالْعَدْلِ﴾

''تو پھر ایسی صورت میں اس کا جو سرپرست ہے، وہ املا کرائے گا'' یعنی وہ دستاویز لکھوائے گا۔ سرپرست کو دستاویز لکھوانے کا حکم دینے کے ساتھ ساتھ فرمادیا کہ ''بِالْعَدْلِ'' یعنی وہ بھی انصاف ہی کے ساتھ لکھوائے، جیسا کہ پہلے حکم دیا گیا تھا کہ اس میں کمی بیشی کوئی نہ کرے۔

• دستاویزات پر گواہ بنانے کا حکم اور گواہوں کی شرائط

پھر اسی پر بس نہیں کیا کہ دستاویز تیار کرلی گئی، بلکہ آگے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ﴿وَاسْتَشْهِدُوْا شَهِيْدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ﴾ ''(اس دستاویز کے اوپر) اپنے میں سے دو مردوں کو گواہ بنا لو'' یہ اس لیے فرمایا کہ دستاویز تو بے شک لکھ لی گئی اور وقتی طور دونوں نے تحریر کو تسلیم بھی کرلیا ہے، لیکن اگر کبھی تنازعہ پیش آجائے اور جھگڑا ہو جائے، مثلاً ایک شخص یہ کہہ دے کہ میں نے تو یہ تحریر نہیں لکھوائی، یا اس پر میرے جو دستخط ہیں وہ حقیقی نہیں ہیں، بلکہ جعلی ہیں، یا یہ میری تحریر ہی نہیں ہے یا میری مرضی سے نہیں لکھوائی گئی، غرض انکار کی کئی صورتیں ہوسکتی ہیں، تو ایسی صورت میں اس تحریر کو ثابت کرنے کے لیے گواہوں کی ضرورت پیش آئے گی، اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اس تحریر پر دو گواہ بناؤ۔

اس طرح اللہ تعالیٰ نے گواہی کا نصاب بھی بیان فرمادیا کہ کسی چیز کو دوسرے کے ذمے لازم کرنے کے لیے ضروری ہے کہ کم از کم دو گواہ ہوں، کیونکہ ثبوتِ دعویٰ کا مدار شرعاً ان دو گواہوں پر ہی ہے۔ ایسے معاملات میں گواہ بنانے کی وجہ یہ ہے کہ ایک ہوتا ہے کسی بات یا کسی واقعے کا سچا ہونا یا اسے سچا سمجھنا، جس شخص کو بھی قرائن سے، حالات سے یا مشاہدے سے کسی بات کا یقین ہوجائے تو وہ اسے سچا سمجھ سکتا ہے، لیکن ایک ہوتا ہے دوسروں کے ذمے اس سچ کو لازم کرنا یعنی دوسروں کے اوپر حجت قائم کرنا کہ وہ بھی اسے تسلیم کریں۔ یہ بات بغیر گواہوں کے نہیں ہوسکتی اور اس کے لیے شریعت نے یہ فرمایا کہ دو گواہ ہونے چاہئیں ﴿مِنْ رِّجَالِكُمْ﴾ تمہارے مردوں میں سے، یعنی اصل یہ ہے کہ گواہ مرد ہوں، اور ''تمہارے مردوں'' سے اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ وہ گواہ مسلمان ہونے چاہییں۔

﴿فَاِنْ لَّمْ يَكُوْنَا رَجُلَيْنِ﴾ اگر دو مرد میسر نہ ہوں ﴿فَرَجُلٌ وَّامْرَاَتٰنِ﴾ ''تو ایک مرد ہو جائے، اور دو عورتیں ہوجائیں۔'' یہ نصابِ شہادت بیان فرمادیا کہ یا تو دو مرد ہوں یا ایک مرد اور دو عورتیں ہوں۔ پھر یہ فرمایا کہ ﴿مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ﴾ ''وہ گواہ بھی ایسے ہونے چاہئیں کہ جو تمہارے پسندیدہ لوگ

ہوں۔'' پسندیدہ ہونے سے مراد یہ ہے کہ ان کے اخلاق، ان کے کردار، ان کی عادت، ان کا مزاج، بحیثیتِ مجموعی لوگوں میں پسندیدہ ہو۔ اس لیے کہ گواہی تو جھوٹی بھی ہوسکتی ہے، اگر وہ لوگ جھوٹے ہیں، ناقابلِ اعتبار ہیں تو ان کی گواہی بھی قابلِ قبول نہیں ہوسکتی۔ اس لیے ایسے لوگ تلاش کرو جن کو ان کے اخلاق اور ان کے کردار کے اعتبار سے لوگوں میں عام طور سے پسند کیا جاتا ہو۔ اس کا معیار مختلف احوال میں مختلف طریقوں سے مقرر کیا گیا ہے، جس کی تفصیل فقہ کی کتب میں موجود ہے۔

• گواہی میں دو عورتیں مقرر کرنے کی حکمت اور متعلقہ احکام

بہرحال! مقصد یہ ہے کہ گواہ ایسے قابلِ اعتبار ہونے چاہئیں جن کی گواہی پر بھروسہ کیا جا سکے، اور یہ جو فرمایا تھا کہ اگر ایک مرد نہ ہو تو ایک مرد اور دو عورتیں ہوجائیں، تو اس کی وجہ آگے اللہ تعالیٰ نے بیان فرمائی کہ ﴿اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰىهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحْدٰىهُمَا الْاُخْرٰى﴾ ''اگر دو عورتوں میں سے ایک بھول جائے، تو دوسری اسے یاد دلا دے۔'' مطلب کہنے کا یہ ہے بعض اوقات انسان کو کسی واقعے کی تفصیلات پوری طرح یاد نہیں رہتیں، لہٰذا اگر ایک بھول جائے تو دوسری خاتون اسے یاد دلا دے۔

شریعت کی نظر میں اصل بات یہی ہے کہ ایسی دستاویزات لکھتے ہوئے دو مردوں کو گواہ بنایا جائے اور خواتین کو بیچ میں لایا ہی نہ جائے، لیکن اگر کوئی ایسی صورت پیدا ہوگئی یا معاملہ ایسے وقت میں ہو رہا ہے جب دو مرد مہیا نہیں ہیں، تو اس صورت میں یہ فرمایا کہ ایک مرد اور اس کے ساتھ دو عورتیں ہوجائیں۔ دو عورتیں ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اصلاً عورتوں کو اس قسم کے کاروبار کا مکلّف نہیں بنایا گیا، اس لیے اُن کا ذہن عموماً کاروباری معاملات کی طرف پوری طرح نہیں چلتا۔ انسان کی یہ فطرت ہے کہ جو چیزیں اس کے فرائضِ منصبی میں داخل ہوتی ہیں، انہیں تو وہ اچھی طرح یاد رکھتا ہے، لیکن جو چیز انسان کے فرائضِ منصبی میں داخل نہ ہو یا جو اس کے دائرۂ کار سے باہر ہو، تو اس کی تفصیلات بھول جانے کا امکان زیادہ ہوتا ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ فرمارہے ہیں کہ چونکہ اس میں بھول جانے کا امکان ہے، تو ہوسکتا ہے کہ جس وقت معاملہ ہو رہا تھا، اس وقت وہ خواتین گواہ بن گئیں، لیکن بعد میں اس کی بعض تفصیلات ان کے ذہن سے نکل گئیں، کیونکہ ان کا روزمرہ کا یہ کام نہیں ہے، اور نہ ان کے فرائضِ منصبی میں یہ شامل ہے، لہٰذا اگر کوئی بات ایک کے ذہن سے نکل جائے، اور دوسری اسے یاد دلا دے، تو پھر اسے وہ بات یاد آجائے گی، اور پھر وہ گواہی دینے کے قابل ہوجائے گی۔

یہاں یہ سمجھ لینا چاہیے کہ یہ جو فرمایا کہ ''ایک بھول جائے تو دوسری اسے یاد دلا دے،'' یہ گواہی دیتے

وقت کی بات نہیں ہو رہی کہ جس وقت ایک عورت گواہی دے رہی ہے، اس وقت وہ بھول گئی اور دوسری عورت اسے لقمہ دے کر یاد کرادے یا درست کرائے اور کہے کہ بات یوں نہیں، یوں ہے۔ اس قسم کی گواہی معتبر نہیں ہوتی، بلکہ یہ گواہی سے پہلے کے وقت کا ذکر ہو رہا ہے، کہ ہوسکتا ہے ایک خاتون کو واقعات کی تفصیل اس لیے ذہن میں نہ رہی ہو کہ یہ اس کے فرائضِ منصبی یا روز مرّہ کا کام نہیں تھا، اس موقع پر دوسری اسے یاد دلائے گی کہ واقعہ یوں ہوا تھا، تو اس کو یاد آجائے گا، اور جب گواہی دینے کا وقت آئے گا تو وہ صحیح طور پر گواہی دے سکے گی۔

• گواہوں کو گواہی سے انکار نہیں کرنا چاہیے

پھر گواہوں کو حکم دیتے ہوئے فرمایا: ﴿وَلَا يَأْبَ الشُّهَدَآءُ إِذَا مَا دُعُوْا﴾ ''اور جب گواہوں کو (گواہی دینے کے لیے) بلایا جائے تو وہ انکار نہ کریں۔'' اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہمیں ایسا معتدل دین اور ایسے معتدل احکام دیے ہیں کہ جس میں ہر شخص سے اس کے مناسب خطاب کیا گیا ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہاں دو فریق ذکر کیے ہیں، اور دونوں کو ان کے مناسب حکم دیتے ہوئے دونوں کو ان کی ذمہ داریوں کا احساس دلایا ہے۔

گواہوں کو تو یہ حکم دیا ہے کہ جب تمہیں گواہ بننے کے لیے یا گواہی دینے کے لیے بلایا جائے تو انکار نہ کرو، بلکہ چلے آؤ، نیز آگے یہ بھی فرمایا کہ گواہی کو چھپانا ایک بڑا جرم اور گناہ ہے۔ اور جو لوگ گواہوں کو بلا رہے ہوں، چاہے گواہ بننے کے لیے یا گواہی دینے کے لیے، انہیں اسی آیت کے آخر میں یہ حکم دیا گیا کہ ﴿وَلَا يُضَآرَّ كَاتِبٌ وَّلَا شَهِيْدٌ﴾ ''لکھنے والوں کو اور گواہی دینے والوں کو تکلیف ہرگز نہ پہنچائی جائے،'' یعنی جب تم ان سے گواہی کی ایک خدمت لے رہے ہو تو انہیں تکلیف نہ پہنچاؤ، اُن کا کم سے کم وقت خرچ ہو، ان کی کم سے کم محنت خرچ ہو، اور وہ جلدی اپنا فریضہ ادا کرکے چلے جائیں۔ اگر گواہ کو تکلیف نہیں پہنچائی جارہی، اور وہ جانتا ہے کہ میں چند منٹ کے لیے جاؤں گا اور گواہی دے کر آجاؤں گا، تو پھر وہ گواہ بننے سے انکار بھی نہیں کرے گا۔

• گواہوں کا تحفّظ اور موجودہ ابتر صورتحال

آج ہمارے یہاں ہو یہ رہا ہے کہ اگر کوئی شخص کسی مقدّمے میں گواہ بن گیا، تو اس کی آفت آگئی، اسے

بار بار عدالتوں کے چکر کاٹنے پڑتے ہیں، اور گھنٹوں بلکہ بعض مرتبہ کئی کئی دنوں تک عدالتوں میں حاضری دینی پڑتی ہے، پھر گواہی کے نتیجے میں دشمنیاں الگ پیدا ہوجاتی ہیں، اس طرح گواہوں کو ہر طرح کی مشکلات در پیش ہوتی ہیں۔ ان حالات کی وجہ سے اگر کسی کو گواہ بننے کے لیے یا گواہی دینے کے لیے کو بلایا جائے تو وہ اس سے کتراتا ہے یا گواہی دینے سے انکار کرتا ہے، اور جب سچے گواہ، گواہی دینے سے انکار کرتے ہیں، تو مقدّمہ کرنے والوں کو پھر اس بات کی ترغیب ہوتی ہے کہ وہ جھوٹے اور کرائے کے گواہ لائیں، پیسے اور رشوت دے کر گواہیاں حاصل کریں، نتیجہ یہ کہ اس طرح سارا نظامِ عدل تلپٹ ہوجاتا ہے۔

اگر قرآنِ کریم کے یہ دو احکام سامنے رکھے جائیں کہ کاتب اور گواہ کو تکلیف نہ پہنچائی جائے، اور جن کو گواہی دینے کے لیے بلایا جارہا ہے، وہ گواہی دینے سے انکار نہ کریں تو عدل و انصاف کا نظام بڑا صاف شفاف اور آرام دہ ہوسکتا ہے۔

• معاملات کی دستاویزات لکھنے والے کاتبوں کو نصیحت

پھر آگے فرمایا: ﴿وَ لَا تَسْـَٔمُوْٓا اَنْ تَكْتُبُوْهُ صَغِيْرًا اَوْ كَبِيْرًا اِلٰٓى اَجَلِهٖ﴾ ''اور جو معاملہ اپنی میعاد سے وابستہ ہو، چاہے وہ چھوٹا ہو یا بڑا، اسے لکھنے سے اکتاؤ نہیں۔''

یہ کاتبوں سے خطاب ہو رہا ہے کہ جب تمہیں دستاویز لکھوانے کے لیے بلایا جائے تو بعض اوقات تم یہ دیکھو گے کہ دستاویز لمبی چوڑی ہے تو تم لکھنے سے اکتانا یا گھبرانا نہیں، ﴿ذٰلِكُمْ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ﴾ ''یہ عمل اللہ کے یہاں زیادہ انصاف والا ہے،'' اللہ کے نزدیک زیادہ قرینِ انصاف ہے ﴿وَ اَقْوَمُ لِلشَّهَادَةِ﴾ اور گواہی کو درست رکھنے کا بہترین ذریعہ ہے، ﴿وَ اَدْنٰٓى اَلَّا تَرْتَابُوْٓا﴾ ''اور اس بات کی قریبی ضمانت ہے کہ تم آئندہ شک میں نہیں پڑو گے،'' کیونکہ جب تحریر لکھ دی گئی تو شک و شبہ کی گنجائش نہیں رہے گی۔ ﴿اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً حَاضِرَةً تُدِيْرُوْنَهَا بَيْنَكُمْ﴾ ہاں! اگر تمہارے درمیان کوئی نقد لین دین کا سودا ہو ﴿فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَلَّا تَكْتُبُوْهَا﴾ ''تو نہ لکھنے میں تمہارے لیے کوئی حرج نہیں،'' یعنی لکھنے کی ضرورت وہاں پیش آتی ہے جس میں کسی کے ذمہ کوئی حق واجب ہو رہا ہو جو بعد میں ادا کرنا ہوگا، تاکہ وہ دستاویز سند رہے اور بوقتِ ضرورت کام آسکے، لیکن جب ہاتھ در ہاتھ لین دین ہو رہا ہو تو پھر اس صورت میں لکھنے لکھانے کی اتنی ضرورت نہیں ہے۔

• خرید وفروخت کے عام معاملات میں گواہ بنانے کا مشورہ

جب ہاتھ در ہاتھ لین دین ہو رہا ہو تو اگرچہ لکھنے کی ضرورت نہیں ہے، تاہم اس موقع پر بھی گواہ بنا لینا بہتر ہے، اسی کو فرمایا: ﴿وَ اَشْهِدُوْٓا اِذَا تَبَايَعْتُمْ﴾ ''اور جب خرید وفروخت کرو تو گواہ بنا لیا کرو،'' یعنی چاہے وہ بیع بالکل نقد ہو رہی ہو لیکن اس وقت میں بھی گواہ بنالینا بہتر ہے، تاکہ کل کو اگر کبھی ثابت کرنے کی ضرورت پیش آئے، تو گواہ گواہی دے سکے، ﴿وَ لَا يُضَآرَّ كَاتِبٌ وَّ لَا شَهِيْدٌ﴾ اور نہ لکھنے والے کو کوئی تکلیف پہنچائی جائے، اور نہ گواہ کو ﴿وَ اِنْ تَفْعَلُوْا﴾ ''اور اگر ایسا کروگے،'' یعنی کاتب یا گواہ کو تکلیف پہنچاؤ گے ﴿فَاِنَّهٗ فُسُوْقٌۢ بِكُمْ﴾ تو یہ تمہاری طرف سے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ہوگی ﴿وَ اتَّقُوا اللّٰهَ﴾ اور اللہ کا خوف دل میں رکھو ﴿وَ يُعَلِّمُكُمُ اللّٰهُ﴾ ''اور اللہ تمہیں تعلیم دیتا ہے،'' یعنی اللہ کا تمہارے اوپر احسان ہے کہ وہ تم کو مفید احکام کی تعلیم دیتا ہے ﴿وَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۲۸۲﴾﴾ ''اور اللہ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے۔''

• واجبُ الاداء حق کی توثیق کے لیے رہن رکھنے کا حکم

آگے اللہ تعالیٰ مزید تفصیل یہ بیان فرماتے ہیں کہ ﴿وَ اِنْ كُنْتُمْ عَلٰى سَفَرٍ﴾ یعنی اگر جس وقت تمہارے درمیان کوئی ادھار لین دین ہو رہا ہے اور اس وقت تم اپنے وطن میں نہ ہو بلکہ سفر پر ہو ﴿وَّ لَمْ تَجِدُوْا كَاتِبًا﴾ ''اور کوئی لکھنے والا تم نہ پاؤ،'' یعنی کوئی لکھنے والا میسر نہ آئے، تو ظاہر ہے کہ اب کوئی دستاویز تو تیار نہیں ہوسکتی۔ اس لیے اب اطمینان حاصل کرنے کے لیے اس کی متبادل صورت یہ ہوسکتی ہے کہ ﴿فَرِهٰنٌ مَّقْبُوْضَةٌ﴾ ''رہن قبضہ میں رکھ لیا کرو۔''

جب کوئی شخص صاحبِ حق کے پاس اپنے ذمہ واجبُ الاداء حق کی توثیق کے لیے کوئی چیز گروی رکھتا ہے کہ میں وقت پر تمہارا حق ادا کردوں گا، تو اسے عربی میں ''رہن'' کہا جاتا ہے۔[1] مثلاً کسی شخص نے دوسرے کو ایک لاکھ روپے قرض دیا، اور قرض لینے والے نے اپنے ذمے اس واجب الاداحق کی توثیق کے لیے اپنا زیور گروی رکھوادیا کہ جب تک میں قرض ادا نہ کردوں، اس وقت تک یہ زیور تمہارے پاس رہے گا، اور جب میں ادا کردوں گا تو یہ مجھے واپس کردیا جائے گا، اور اگر میں وقت پر ادا نہ کرپاؤں، تو خاص

---

(۱) الهداية في شرح بداية المبتدي (٤/٤١٢) كتاب الرهن، دار إحياء التراث العربي، بيروت

طریقِ کار کے تحت تم اس زیور کو بازار میں بیچ کر اپنا حق حاصل کر سکتے ہو، یہ رہن یا گروی کی صورت ہوگی۔

اس آیت نے یہ بھی بتا دیا کہ رہن رکھنا بھی جائز ہے، اور ساتھ ساتھ اس بات کی طرف بھی اشارہ کر دیا گیا کہ اصل چیز تو دستاویز ہونی چاہیے، دستاویز ہی پر اکتفا کرنا چاہیے، یہ خلافِ مروّت بات ہے کہ آپ کسی کی کوئی چیز اٹھا کر رہن کے طور پر اپنے پاس رکھ لیں۔ قرض کی توثیق کے لیے رہن رکھنے والی یہ صورت اگرچہ جائز تو ہے، لیکن پسندیدہ نہیں۔ پسندیدہ یہ ہے کہ اگر کوئی ادھار کا معاملہ ہے تو دستاویز تیار کر کے رکھ لو، وہ تمہارے لیے توثیق کا کام کرے گی، لیکن جہاں اس کا امکان نہ ہو جیسے کہ سفر میں ہو تو پھر رہن بھی رکھا جا سکتا ہے۔

یہاں اس آیتِ کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ بغیر رہن کے کام چل سکے تو زیادہ بہتر ہے، لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں ہے رہن رکھنا بالکل ہی ناجائز ہے، یا صرف سفر میں جائز ہے اور اپنے شہر میں رہتے ہوئے جائز نہیں۔ کوشش یہی کرنی چاہیے کہ رہن کی صورت اسی وقت اختیار کی جائے جب دستاویز مرتب نہ ہو سکتی ہو، لیکن اگر بعض جگہ دستاویز بھی مرتب کی جائے اور کچھ رہن بھی رکھ دیا جائے، تو اس میں بھی شرعاً کچھ ممانعت نہیں ہے۔ خود رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زرہ رہن رکھ کر ایک یہودی سے کچھ غلہ خریدا تھا،[1] تو اس لیے رہن رکھنا فی نفسہٖ جائز ہے، اور صرف حالتِ سفر میں ہی نہیں بلکہ جب آدمی سفر میں نہ ہو تب بھی جائز ہے۔

• قرض کے معاملے میں امانت کی پاسداری کی تلقین

پھر آگے فرمایا: ﴿فَاِنْ اَمِنَ بَعْضُكُمْ بَعْضًا﴾ ہاں اگر تم ایک دوسرے پر بھروسہ کرو ﴿فَلْيُؤَدِّ الَّذِي اؤْتُمِنَ اَمَانَتَهٗ﴾ ''تو جس کے اوپر بھروسہ کیا گیا ہو، یا جس کے پاس امانت رکھوائی گئی ہو تو وہ اپنی امانت کو ٹھیک ٹھیک ادا کرے۔'' اس جملے کے دو مطلب ہو سکتے ہیں:

- ایک مطلب تو یہ ہو سکتا ہے کہ فرض کرو اگر رہن رکھ لیا گیا ہے، تو قرض خواہ جس نے رہن لیا ہے، وہ رہن اس کے پاس تقریباً امانت کی طرح ہوتا ہے، اسی لیے اس میں کوئی شک و شبہ کی گنجائش نہیں

---

(۱) صحيح البخاري (۳/۱۱۵) (۲۳۸۶) كتاب في الاستقراض وأداء الديون والحجر والتفليس، باب من اشترى بالدين وليس عنده ثمنه، أو ليس بحضرته.

ہے کہ جس شخص نے کوئی چیز رہن رکھی ہے، اس رہن سے فائدہ اٹھانا اس کے لیے ہرگز جائز نہیں، یہ حرام ہے، اور رہن سے نفع اٹھانا سود کے حکم میں داخل ہے۔ جیسا کہ آج کل بعض جگہ پر یہ رواج ہے کہ قرض کے بدلہ میں زمین رہن رکھی جاتی ہے اور رہن پر لینے والا شخص پھر اس میں کاشتکاری کر کے اس سے نفع اٹھاتا ہے، یہ ہرگز جائز نہیں، یہ سود ہے اور حرام ہے، اس کی وجہ وہی ہے جو اوپر بیان ہوئی کہ یہ اس کے پاس امانت ہے، لہٰذا اس سے نفع اٹھانا جائز نہیں، اور جب مقروض ادائیگی کردے گا تو اس کی امانت اسے واپس کرنی ہوگی، ایک معنیٰ تو اس کے یہ ہیں۔

- اس جملے کا دوسرا مطلب یہ ہوسکتا ہے کہ اگر کسی شخص نے رہن رکھنے کا حق حاصل ہونے کے باوجود مقروض پر بھروسہ کرتے ہوئے نہ تو دستاویز لکھوائی اور نہ کوئی رہن رکھا تو ﴿فَلْيُؤَدِّ الَّذِي اؤْتُمِنَ اَمَانَتَهٗ﴾ ''جس پر بھروسہ کیا گیا ہے، وہ اپنی امانت ٹھیک ٹھیک ادا کرے،'' یعنی قرض کی ادائیگی تو اس کے ذمہ لازم تھی ہی، لیکن اب اس میں امانت کا پہلو بھی پیدا ہوگیا۔ امانت کا پہلو یہ پیدا ہوگیا ہے کہ جس نے تمہیں قرض دیا ہے، اس نے تمہارے اوپر بھروسہ کر کے دیا ہے کہ یہ وقت پر ادائیگی کرے گا، اور اسی بھروسے کے سبب اس بے چارے نے تم سے کوئی تحریر یا کوئی رہن بھی نہیں مانگا، تو پھر تمہیں چاہیے کہ اس کے ساتھ کیے گئے معاملے کا اتنا ہی احترام کرو جیسا کہ امانت کا احترام کیا جاتا ہے، لہٰذا اسے وقت پر قرض واپس کرنے کا اہتمام کرو۔

آگے فرمایا: ﴿وَ لْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ﴾ ''اور اسے چاہیے کہ اللہ سے ڈرے جو اس کا پروردگار ہے،'' یعنی اس بات سے ڈرے کہ اب اگر میں نے اس بندے کا حق پامال کیا تو اللہ تعالیٰ مجھے اپنی گرفت میں لے لے گا۔

• شہادت/گواہی کو چھپانے کی ممانعت

﴿وَ لَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ﴾ ''اور گواہی کو مت چھپاؤ۔'' چونکہ پیچھے ذکر آیا تھا کہ ایسے موقع پر گواہ بنا لیا کرو تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جب کوئی گواہ بن گیا ہے تو جب گواہی دینے کا وقت آئے، تو وہ اس گواہی کو چھپائے نہیں۔ ﴿وَ مَنْ يَّكْتُمْهَا﴾ اور جو شخص اس گواہی کو چھپائے گا ﴿فَاِنَّهٗۤ اٰثِمٌ قَلْبُهٗ﴾ ''تو اس کا دل گناہ گار ہوگا،'' یعنی گواہی کو چھپانا کوئی معمولی بات نہیں ہے، بلکہ یہ انسان کے دل کی خرابی پر دلالت کرتا ہے

کہ وہ حق بات کو چھپا کر کسی حق دار کو نقصان پہنچا رہا ہے اور اس کے نتیجے میں فساد پھیل رہا ہے۔

﴿وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ ﴿٢٨٣﴾﴾ ''اور اللہ تعالیٰ ہر اس بات سے واقف ہے جو کچھ تم کرتے ہو۔'' اللہ تعالیٰ بار بار متوجہ فرماتے ہیں کہ یہ نہ سمجھنا کہ تم چپکے سے کوئی کام کر گزرو گے یا گناہ کا ارتکاب کرلو گے اور اس کی سزا سے بچ جاؤ گے، یہ نہیں ہوسکتا، کیونکہ اللہ تعالیٰ ہر چیز سے باخبر ہے۔

آیت نمبر ۲۸۴ تا ۲۸۶

لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ ۭ فَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَاۗءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿٢٨٤﴾ اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ۭ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰۗىِٕكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ ۣ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ ۣ وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ڭ غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ ﴿٢٨٥﴾ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ۭ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ ۭ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ اِنْ نَّسِيْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَآ اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَي الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ ۚ وَاعْفُ عَنَّا ۟ وَاغْفِرْ لَنَا ۟ وَارْحَمْنَا ۟ اَنْتَ مَوْلٰىنَا فَانْصُرْنَا عَلَي الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿٢٨٦﴾ ع ۴۰ ۳ ۸

جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے سب اللہ ہی کا ہے، اور جو باتیں تمہارے دلوں میں ہیں، خواہ تم انہیں ظاہر کرو یا چھپاؤ، اللہ تم سے ان کا حساب لے گا پھر جس کو چاہے گا معاف کردے گا اور جس کو چاہے گا سزا دے گا، اور اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔ ﴿۲۸۴﴾ یہ رسول (یعنی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم) اس چیز پر ایمان لائے ہیں

جو ان کی طرف ان کے رب کی طرف سے نازل کی گئی ہے اور (ان کے ساتھ) تمام مسلمان بھی، یہ سب اللہ پر، اس کے فرشتوں پر، اس کی کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے ہیں (وہ کہتے ہیں کہ) ہم اس کے رسولوں کے درمیان کوئی تفریق نہیں کرتے (کہ کسی پر ایمان لائیں، کسی پر نہ لائیں) اور وہ یہ کہتے ہیں کہ: ''ہم نے (اللہ اور رسول کے احکام کو توجہ سے) سن لیا ہے، اور ہم خوشی سے (ان کی) تعمیل کرتے ہیں۔ اے ہمارے پروردگار! ہم آپ کی مغفرت کے طلبگار ہیں، اور آپ ہی کی طرف ہمیں لوٹ کر جانا ہے۔'' ﴿۲۸۵﴾ اللہ کسی بھی شخص کو اس کی وسعت سے زیادہ ذمہ داری نہیں سونپتا، اسے فائدہ بھی اسی کام سے ہوگا جو وہ اپنے ارادے سے کرے، اور نقصان بھی اسی کام سے ہوگا جو اپنے ارادے سے کرے۔ (مسلمانو! اللہ سے یہ دعا کیا کرو کہ) اے ہمارے پروردگار! اگر ہم سے کوئی بھول چوک ہوجائے تو ہماری گرفت نہ فرمایئے۔ اور اے ہمارے پروردگار! ہم پر اس طرح کا بوجھ نہ ڈالیے جیسا آپ نے ہم سے پہلے لوگوں پر ڈالا تھا۔ اور اے ہمارے پروردگار! ہم سے ایسا بوجھ نہ اٹھوایئے جسے اٹھانے کی ہم میں طاقت نہ ہو، اور ہماری خطاؤں سے درگزر فرمایئے، ہمیں بخش دیجیے اور ہم پر رحم فرمایئے۔ آپ ہی ہمارے حامی و ناصر ہیں، اس لیے کافر لوگوں کے مقابلے میں ہمیں نصرت عطا فرمایئے۔ ﴿۲۸۶﴾

سورۂ بقرہ کے اختتامی مضامین

یہ سورۂ بقرہ کا آخری رکوع اور آخری آیات ہیں، اس لیے ان کی حیثیت پوری سورۂ بقرہ کے خاتمے کی ہے۔ جس طرح ایک طویل مضمون یا طویل کتاب کی تالیف کے بعد مؤلفین عام طور پر آخر میں خلاصۂ کلام کے طور پر کوئی ایسی اصولی بات ذکر کردیتے ہیں جو پوری کتاب پر حاوی ہو، اسے خاتمہ بھی کہا جاتا ہے، اسی طرح سورۂ بقرہ کی یہ آخری تین آیتیں بھی اسی قسم کی ہیں۔

آپ نے دیکھا کہ سورۂ بقرہ میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے بہت تفصیل کے ساتھ ایمان اور کفر کی حقیقت بھی واضح فرمائی ہے، یہودیوں اور بنی اسرائیل کی طرف سے جو بدعنوانیاں چلی آتی تھیں، ان کا تذکرہ بھی

فرمایا ہے، اور دین کی بنیادی تعلیمات بھی عطا فرمائی ہیں جن میں نماز، زکوٰۃ، روزہ، قصاص، حج، جہاد، طہارت، طلاق، عدت، خلع، رضاعت، حرمتِ شراب، ربا، قرض اور لین دین کے جائز و ناجائز طریقے، ان سب کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے سورۂ بقرہ میں بیان فرمایا ہے، اسی لیے حدیث [1] میں اس سورت کا ایک لقب ''سنام القرآن'' بھی آیا ہے، یعنی قرآن کا سب سے اعلیٰ یا بلند حصہ، جیسے اونٹ کا کوہان سب سے بلند ہوتا ہے، اسی طرح اسے قرآنِ کریم کا بلندترین حصہ قرار دیا گیا ہے۔

اس سورت کے آخر میں اللہ تعالیٰ نے ہم بندوں کو اس طرف متوجہ فرمایا ہے کہ دین کی صحیح تشریح تمہارے سامنے پیش کردی گئی ہے، لہٰذا اب تم سے مطالبہ یہ ہے کہ ان پر ٹھیک ٹھیک اخلاص کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لیے اس طرح عمل کرو کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی قدرت اور اس کے علم پر ایمان بھی ہو اور اس کی طرف دھیان بھی، اور اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات کے سامنے جوابدہی کا احساس دل میں ہر وقت تازہ رہے۔

تمام صفاتِ الٰہی کی جامع دو صفات

اللہ تعالیٰ نے اس رکوع کی پہلی آیت میں فرمایا: ﴿لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ﴾ جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے، سب اللہ ہی کا ہے، ﴿وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ﴾ اور جو باتیں تمہارے دلوں میں ہیں، خواہ تم انہیں ظاہر کرو یا چھپاؤ ﴿يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ﴾ اللہ تعالیٰ اس سب کا حساب تم سے لے گا۔ ﴿فَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ﴾ پھر جس کو چاہے گا معاف کردے گا اور جس کو چاہے گا سزا دے گا۔ ﴿وَاللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝۲۸۴﴾ ''اور اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔''

اس آیتِ کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے اپنی دو صفتوں کا خاص طور پر ذکر فرمایا ہے۔ ایک قدرت اور دوسرے علم۔ امام رازی رحمہ اللہ [2] فرماتے ہیں کہ یوں تو اللہ تعالیٰ کی بہت سی صفات ہیں، لیکن تمام کمالات کی جامع یہی دو صفتیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی صفتِ قدرت کو بیان کرنے کے لیے ایک تو یہ فرمایا کہ ''جو کچھ آسمانوں

---

(۱) أخرجه الترمذي في سننه (۵/ ۱۵۷) (۲۸۷۸) من حديث أبي هريرة، باب ما جاء في فضل سورة البقرة وآية الكرسي، وقال: "هذا حديث غريب لا نعرفه إلا من حديث حكيم بن جبير وقد تكلم شعبة في حكيم بن جبير وضعفه." وأخرجه أحمد في مسنده (۳۳/ ۴۱۷) (۲۰۳۰۰) من حديث معقل بن يسار. وقال الهيثمي في "المجمع" (۷/ ۲۱) (۱۰۸۱۶): "فيه راوٍ لم يسم وبقية رجاله رجال الصحيح."

(۲) التفسير الكبير أو مفاتيح الغيب (۷/ ۱۰۲) الناشر: دار إحياء التراث العربي - بيروت

میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے، سب اللہ ہی کا ہے۔'' اور آیت کے آخر میں ''اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔'' اور بیچ میں صفتِ علم کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا: ''اور جو باتیں تمہارے دلوں میں ہیں، خواہ تم انہیں ظاہر کرو یا چھپاؤ، اللہ تعالیٰ اس سب کا حساب تم سے لے گا۔''

اب انسان کو سوچنا چاہیے کہ جس ذات کی بادشاہی آسمان وزمین اور ان میں موجود ہر چیز پر ہے، اُس کی قدرت کتنی بڑی ہوگی؟ اور جو ذات انسان کے دل میں چھپے ہوئے تمام رازوں سے باخبر ہو، اس کا علم کس قدر محیط ہے، اور اس سے انسان کی کوئی نقل وحرکت کیسے چھپ سکتی ہے؟ لہٰذا اُسے اپنی ہر نقل وحرکت اور ہر کام میں اس بات کا لحاظ رکھنا ہوگا کہ کوئی کام اللہ تعالیٰ کی رضا کے خلاف نہ ہو، کیونکہ اپنے علم اور قدرت کے مطابق ﴿فَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ﴾ ''جس کو چاہے گا معاف کردے گا اور جس کو چاہے گا سزا دے گا۔''

دل کے ارادوں کا محاسبہ

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو یہ بڑی سنگین حقیقت بھی بتلادی ہے کہ انسان کے دل میں جو ارادے پیدا ہوتے ہیں، ان ارادوں کا بھی اللہ تبارک وتعالیٰ کی بارگاہ میں حساب دینا ہوگا، چنانچہ اس آیت کو سُن کر صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سہم گئے تھے کہ ہمارے دلوں میں تو نہ جانے کیسے کیسے خیالات آتے ہیں، اگر ہمیں ان سب کا حساب دینا پڑا تو ہمارا بچنا بہت مشکل ہو جائے گا، لیکن قرآنِ کریم ہی کی روشنی میں اور نبیِ کریم سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کے مطابق اس تشویش کو پوری طرح زائل کردیا گیا ہے، چنانچہ ان ارشادات سے واضح ہوتا ہے کہ انسان کے دل میں جو خیالات، وسوسے یا ارادے پیدا ہوتے ہیں وہ دو قسم کے ہیں:

- ایک تو وہ خیالات ہیں جو انسان کے اختیار کے بغیر اس کے دل میں آتے رہتے ہیں، وہ خیال لانے میں اس کے ارادے کو کوئی دخل نہیں ہوتا۔ ایسے خیالات خواہ کتنے ہی بُرے ہوں، چونکہ انسان کے اختیار کے بغیر آرہے ہیں، اس لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان پر کوئی پکڑ نہیں ہوتی، نہ ان کا حساب دینا ہوگا۔ اسی بات کو واضح کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے آگے فرمایا ہے کہ:

لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا

اللہ تعالیٰ کسی بھی انسان کو اس کی وسعت سے زیادہ مکلّف نہیں کرتا۔

- دوسری قسم کے خیالات وہ ہیں جو انسان اپنے قصد اور ارادے سے دل میں لاتا ہے۔ اس کے بھی مختلف درجات ہیں۔ پہلا درجہ یہ ہے کہ دل میں کسی گناہ کرنے کا ارادہ پیدا ہوا، مگر پھر نکل گیا، یا بار بار اسی طرح خیال آتا رہا اور نکلتا رہا، تب بھی اس کے اوپر کوئی مؤاخذہ یا کوئی پکڑ نہیں، لیکن اگر وہ خیال اتنا پختہ ہوجائے کہ انسان دل میں پکا ارادہ کرلے کہ فلاں گناہ ضرور کروں گا، اس ارادے میں کوئی تزلزل نہیں۔ اور اس کی علامت یہ ہے کہ گناہ کی طرف کوئی قدم بھی بڑھا دیا، چاہے وہ چھوٹا سا قدم ہو، پھر چاہے وہ گناہ کیا ہو یا نہ کیا ہو، تب بھی گناہ کا پکا ارادہ کرنے اور اس کی طرف چلنے کا گناہ ہوگا۔

- اسی طریقے سے اس دوسری قسم میں دل کے وہ ناجائز خیالات بھی شامل ہیں جو آدمی سوچ سوچ کر دل میں لائے، کبھی اپنے ذہن میں تصوّر جمائے ہوئے ہے کہ میں فلاں گناہ کررہا ہوں، اور فلاں گناہ کرتے ہوئے مجھے اتنی لذت آرہی ہے، چاہے وہ صرف تصوّر کی حد تک ہی ہو، یہ بھی گناہ ہے اور اس کا بھی محاسبہ ہوگا۔

یہاں اس آیت میں اسی دوسری اور تیسری قسم کے خیالات مراد ہیں۔

پھر حساب لینے کے بعد سوائے کفر و شرک کے ﴿فَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ﴾ ''اللہ تبارک وتعالیٰ جس کو چاہے گا معاف کردے گا اور جس کو چاہے گا سزا دے گا'' یعنی اللہ تبارک وتعالیٰ کسی کام پر مجبور نہیں ہے کہ کسی کو ثواب دینے پر مجبور ہو یا کسی کو سزا دینے پر مجبور ہو، اللہ تعالیٰ کسی کا تابعِ فرمان نہیں بلکہ وہ تو بے نیاز ہے اور سب اسی کے تابعِ فرمان ہیں، لہٰذا اگر وہ کسی کو عذاب دے گا تو وہ اپنی مشیت ہی کے تحت دے گا اور اگر کسی کو معاف کرے گا تو اپنی مشیت سے ہی معاف کرے گا، کوئی اسے مجبور کرنے والا نہیں۔ ﴿وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿٢٨٤﴾﴾ ''اور اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔'' جب وہ ہر چیز پر قادر ہے، تو اس میں یہ بات بھی داخل ہے کہ وہ جسے چاہے سزا دے دے اور جس کو چاہے معاف کردے۔

چونکہ اللہ تعالیٰ کی قدرت بھی کامل ہے اور اس کا علم بھی کامل ہے، اس لیے وہ پوری طرح عبادت کے لائق ہے۔ جب بندہ اس بات کا تصوّر کرے کہ اللہ تعالیٰ کا علم اتنا سیع ہے کہ میری کوئی بات اس سے پوشیدہ نہیں رہ سکتی، یہاں تک کہ دل میں آنے والے خیالات بھی پوشیدہ نہیں رہ سکتے اور اس کی قدرت اتنی بڑی

ہے کہ وہ مجھے جس طرح کا عذاب دینا چاہے دے سکتا ہے، جس طرح پکڑ میں لینا چاہے لے سکتا ہے، تو ان باتوں سے اس کے دل میں خشیت پیدا ہوگی جو گناہوں سے بچنے اور اللہ تبارک وتعالیٰ کے ساتھ تعلق مضبوط کرنے کا ذریعہ بنے گی۔

سورۂ بقرہ کی آخری دو آیتوں کی اہمیت وعظمت اور فضائل

اب آخر میں جو دو آیتیں آرہی ہیں، وہ ایک خاص شان رکھتی ہیں، اور ان کی خصوصی فضیلت متعدّد صحیح احادیث میں بیان فرمائی گئی ہے۔ صحیح بخاری میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسولِ کریم سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

مَنْ قَرَأَ بِالْآيَتَيْنِ مِنْ آخِرِ سُورَةِ البَقَرَةِ فِي لَيْلَةٍ كَفَتَاهُ (۱)

یعنی جو شخص رات میں سورۂ بقرہ کی یہ دو آیتیں پڑھ لے، تو وہ اس (کی بھلائی) کے لیے کافی ہوجائیں گی۔

نیز صحیح مسلم (۲) کی ایک حدیث میں ہے کہ سورۂ بقرہ کی یہ آخری آیتیں نبیِ کریم سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو معراج کی رات میں عطا فرمائی گئی تھیں۔ اور مسندِ احمد وغیرہ میں حضرت ابو ذر غفاری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

أُعْطِيتُ خَوَاتِيمَ سُورَةِ الْبَقَرَةِ مِنْ كَنْزٍ تَحْتَ الْعَرْشِ، وَلَمْ يُعْطَهُنَّ نَبِيٌّ قَبْلِي (۳)

یعنی سورۂ بقرہ کی آخری آیتیں مجھے عرش کے نیچے ایک خزانے سے دی گئی ہیں جو مجھ سے پہلے کسی نبی کو نہیں دی گئیں۔

---

(۱) صحيح البخاري (۱۸۸/٦) (٥٠٠٩) كتاب فضائل القرآن، باب فضل سورة البقرة.

(۲) صحيح مسلم (۱۵۷/۱) (۱۷۳): "فأعطي رسول الله ﷺ ثلاثا: أعطي الصلوات الخمس، وأعطي خواتيم سورة البقرة." كتاب الإيمان، باب في ذكر سدرة المنتهى.

(۳) مسند أحمد (۲۷۳/۳۵) (۲۱۳٤۳-۲۱۳٤٥)، وقال الهيثمي في "المجمع" (۲۲/۷) (۱۰۸۲۲): "رواه كله أحمد بأسانيد، ورجال أحدها رجال الصحيح."

ان آیتوں کا عرش کے نیچے کسی خزانے سے دیا جانا اور بھی متعدّد صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی احادیث میں مذکور ہے۔ (۱)

ان آیتوں کی جو خصوصیات اور فضائل بیان فرمائے گئے ہیں، ان کی حقیقت کا ٹھیک ٹھیک ادراک تو اس دنیا میں ہمارے لیے ممکن نہیں ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا اور اس کی بارگاہ میں کی ہوئی تسبیح وتقدیس یا دعاؤں کے الفاظ اپنے پیچھے معانی اور معارف واسرار کی ایک کائنات رکھتے ہیں جنہیں ہم اپنی محدود سمجھ کی گرفت میں لانے سے قاصر ہیں، اور ان کے انوار و معارف ان شاء اللہ تعالیٰ آخرت میں مومنین پر اس وقت کھلیں گے جب انسان مادّی حجابات سے آزاد ہوکر عقل و اِدراک کے روحانی عالم میں داخل ہوگا، لیکن اس وقت ہم اپنی محدود عقل سے جو کچھ سمجھ سکتے ہیں، ان آیتوں کی مندرجۂ ذیل تشریح سے ان شاء اللہ تعالیٰ ان کی عظمت کا کچھ کچھ اِدراک کرنے میں مدد ملے گی۔ اس لیے آگے ان آیات کی قدرے مفصل تشریح بیان کی جارہی ہے جو بڑی حد تک حضرت امام فخر الدین رازی رحمہ اللہ کی تفسیر سے مأخوذ ہے، اور میرے علم میں جس قدر باریک بینی سے انہوں نے ان آیتوں کی تشریح فرمائی ہے، وہ کسی اور تفسیر میں نظر سے نہیں گزری۔ واللہ سبحانه هو الموفق للصواب۔

• وحیِ الٰہی پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ایمان اور اس کا مقام

سب سے پہلے اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہ بتلایا کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی امت سے جو کچھ مطالبہ کررہے ہیں، وہ کوئی ایسی بات نہیں ہے جو خدانخواستہ کسی غلط فہمی پر مبنی ہو، بلکہ آپ اس کی معجزاتی حیثیت کو آنکھوں سے دیکھ کر سب سے پہلے خود اُس پر ایمان لائے ہیں، یعنی حضرت جبرئیل علیہ السلام آپ کے پاس جو وحی لے کر تشریف لائے، اُس کی معجزاتی کیفیت کو آپ نے کھلی آنکھوں سے دیکھا اور اس بات کا یقین فرما لیا کہ نہ یہ کوئی آنکھ کا دھوکہ ہے، نہ کوئی خیالی پلاؤ ہے، اور نہ کوئی شیطانی تصرف ہے۔ اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے شروع ہی سے کامل عقل، اعلیٰ درجے کی سمجھ اور اچھے برے کی پہچان عطا فرمائی تھی، جس کا اعتراف ان لوگوں کو بھی تھا جو آج آپ کی بات نہیں مان رہے، اس لیے جب حضرت جبرئیل علیہ السلام آپ کے پاس وحی لے کر آئے، تو آپ نے پورے ہوش وحواس اور حق وباطل کی پہچان کے ساتھ ان کے معجزاتی تصرّف کو پہچانا کہ یہ ہرگز کوئی شیطانی تصرف نہیں ہے، اس لیے سب سے پہلے آپ خود اس پر

---

(۱) انظر تفسیر ابن کثیر (۵۷۰/۱) تحت هذه الاية.

ایمان لائے۔

یہ مطلب ہے آیتِ کریمہ کے پہلے جملے یعنی: ﴿اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ﴾ کا کہ ''رسول خود اُس وحی پر ایمان لائے ہیں جو ان پر ان کے پروردگار کی طرف سے اتاری گئی ہے۔'' معاذ اللہ ایسا ہرگز نہیں ہے کہ خود ان کو اس وحی کے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہونے کا یقین نہ ہو، پھر بھی وہ دوسروں کو اس کی طرف دعوت دے رہے ہوں۔

اس کے بعد فرمایا: ﴿وَالْمُؤْمِنُوْنَ﴾ یعنی دوسرے مومنین بھی اُس وحی پر ایمان لائے ہیں۔ یہاں یہ بھی کہا جاسکتا تھا کہ ''آمن الرسول والمؤمنون'' یعنی رسول اور مومن لوگ دونوں ایمان لائے ہیں، لیکن رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایمان کو اصل قرار دے کر پہلے اُس کا زیادہ تفصیل سے ذکر فرمایا۔ پھر فرمایا: ''اور مومنین بھی'' اس سے اشارہ اس طرف ہے کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایمان اور مومنوں کے ایمان میں یہ فرق ہے کہ آپ کا ایمان آنکھوں سے وحی کی معجزاتی حیثیت کو دیکھ کر ہوا ہے، اور دوسرے مومنوں کا ایمان خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی معجزاتی صفات کی وجہ سے ہوا ہے۔

• ان چیزوں کا بیان جن پر ایمان لانا ضروری ہے

پھر فرمایا: ﴿كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ﴾ ''یہ سب اللہ پر اور اس کے فرشتوں پر اور اس کی کتابوں پر اور اس کے تمام رسولوں پر ایمان لائے ہیں۔''

اس مختصر جملے میں ان تمام باتوں کا ایک خاص ترتیب سے ذکر فرمایا گیا ہے جن پر ایمان لانا انسان کی نجات کے لیے ضروری ہے۔ جو عقائد اور احکام انسانوں کے ذمے واجب ہوتے ہیں، انہیں تسلیم کرنے کے لیے سب سے پہلی ضرورت اس بات کی ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھے، اور دل سے سمجھے کہ میرا اور پوری کائنات کا پیدا کرنے والا اور اس کا انتظام کرنے والا وہی ہے، اس کا علم اور قدرت پوری کائنات کو محیط ہے، اور وہی ہر بات کی حکمتوں کو جانتا ہے، اس لیے اُس کے ہر حکم کی تابع داری ضروری ہے۔ جب تک ان ساری باتوں کا یقین دل میں نہ ہو، انسان اس کے احکام پر دل سے کیسے عمل کرسکتا ہے؟ اس لیے سب سے پہلے اللہ تعالیٰ پر ایمان ضروری ہے۔

دوسرے نمبر پر فرشتوں پر ایمان کا ذکر فرمایا گیا ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ فرشتے تو اللہ تعالیٰ کی

مخلوق اور اس کے کارندے ہیں جو اس کی حکمت کے مطابق اپنے فرائض بجا لاتے ہیں۔ اُن پر ایمان رکھنا کیوں اتنا ضروری قرار دیا گیا ہے کہ اس کے بغیر انسان مؤمن نہیں کہلا سکتا؟ اور ان پر ایمان لانے کو اللہ تعالیٰ پر ایمان کے بعد دوسرے نمبر پر یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کی کتابوں اور پیغمبروں پر بھی مقدّم رکھا گیا ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ فرشتے ہی انسانوں تک اللہ تعالیٰ کے پیغامات پہنچانے کا واسطہ ہیں۔ انبیائے کرام پر وہی وحی لے کر آتے ہیں اور جب وحی نازل ہو رہی ہوتی ہے، تو (جیسا کہ سورۂ جن میں بیان کیا گیا ہے)[1] اُس وحی کو شیطانی تصرفات سے بچانے کے لیے ایک حفاظتی حصار فرشتے ہی قائم کرتے ہیں، تاکہ اللہ تعالیٰ کا پیغام ٹھیک ٹھیک پیغمبروں تک پہنچ جائے، اور اس میں کوئی کمی بیشی نہ ہونے پائے۔ اس لیے احکامِ شریعت کے تناظر میں ترتیب کے لحاظ سے فرشتوں کی اہمیت کتابوں اور پیغمبروں سے بھی پہلے ہے، اگر فرشتوں پر ایمان نہ ہو، تو اُس وحی پر ایمان کیسے ہوگا جو وہ لے کر آتے ہیں؟ فرشتے جو وحی لے کر آتے ہیں، وہی کتابِ الٰہی کی صورت اختیار کرتی ہے، اس لیے فرشتوں کے بعد تیسرے نمبر پر اللہ تعالیٰ کی کتابوں کا ذکر ہے، کیونکہ یہ کتابیں فرشتوں ہی کے ذریعے دنیا تک پہنچتی ہیں۔

فرشتے وہ کتابیں جن کے پاس وحی کے ذریعے لے کر جاتے ہیں، وہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے پیغمبر ہیں، اس لیے کتابوں کے بعد ان پر ایمان کا ذکر فرمایا گیا ہے، وجہ یہ ہے کہ جب کسی کو پیغمبر بنایا جاتا ہے، تو اُس پر فرشتے وحی لے کر آتے ہیں۔ اسی وحی کے ذریعے وہ پیغمبر بنتے ہیں، اس لیے وحی کا وجود پہلے اور پیغمبری کا وجود اُس پر مرتّب ہوتا ہے۔ اس لیے کتابوں کے فوراً بعد پیغمبروں کا ذکر فرما کر ان پر ایمان لانا ضروری قرار دیا گیا ہے۔

ایمانیات کی یہ عظیم الشان ترتیب ذکر کر کے امام رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

وَاعْلَمْ أَنَّ فِي تَرْتِيبِ هَذِهِ الْمَرَاتِبِ الْأَرْبَعَةِ عَلَى هَذَا الْوَجْهِ أَسْرَاراً غَامِضَةً، وَحِكَمًا عَظِيمَةً لَا يَحْسُنُ إِيدَاعُهَا فِي الْكُتُبِ وَالْقَدْرُ الَّذِي ذَكَرْنَاهُ كَافٍ فِي التَّشْرِيفِ.[2]

یعنی ان چار مراتب ایمان کو جس طرح ترتیب دیا گیا ہے، اس میں بڑے باریک

---

(۱) ﴿إِلَّا مَنِ ارْتَضَىٰ مِن رَّسُولٍ فَإِنَّهُ يَسْلُكُ مِن بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهِ رَصَدًا﴾ [الجن:۲۷]

(۲) التفسير الكبير أو مفاتيح الغيب (۱۰۸/۷) الناشر: دار إحياء التراث العربي-بيروت.

اسرار اور عظیم حکمتیں ہیں جنہیں کتابوں میں لکھنا مناسب نہیں۔ بس جتنی بات ہم نے ذکر کردی ہے، اس کلام کے شرف کو سمجھنے کے لیے اتنا کافی ہے۔

• اہلِ ایمان کا تمام پیغمبروں پر بلا تفریق ایمان

پھر آگے ارشاد فرمایا: ﴿لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ﴾ (اور وہ ایمان لانے والے یہ کہتے ہیں کہ) ''ہم اس کے رسولوں کے درمیان کوئی تفریق نہیں کرتے،'' یعنی ہم اللہ کے پیغمبروں میں سے کسی کے ساتھ کوئی امتیازی معاملہ اس معنیٰ میں نہیں کرتے کہ کسی پر ایمان لائیں، اور کسی پر ایمان نہ لائیں، بلکہ ہم اللہ کے سارے رسولوں پر ایمان لاتے ہیں۔

درحقیقت بتایا یہ جارہا ہے کہ نبیِ کریم سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جو یہ دینِ برحق لے کر تشریف لائے ہیں، اس میں انبیائے کرام کی بنیاد پر کوئی تعصب یا گروہ بندی نہیں ہے کہ کچھ پیغمبروں کو مانا جائے اور کچھ کو نہ مانا جائے، بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو کتابیں بھی نازل ہوئی ہیں، اُن سب پر اور جتنے پیغمبر اللہ تعالیٰ نے بھیجے ہیں، ان سب پر ایمان لانا ہی اسلام کا تقاضا ہے۔

کسی ایک پیغمبر پر ایمان لانا، دوسرے پر نہ لانا یہ کفار کا شیوہ ہے۔ جیسا کہ یہودی حضرت موسیٰ علیہ السلام پر تو ایمان لاتے تھے، لیکن حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان نہیں لاتے تھے، یا جیسے عیسائی حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لاتے تھے، لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نہیں لاتے تھے۔ اس کے برخلاف مسلمان حضرت موسیٰ علیہ السلام پر بھی ایمان لاتے ہیں، عیسیٰ علیہ السلام پر بھی اور نبی کریم سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر بھی۔ ان کے درمیان کسی تفریق کے قائل نہیں ہیں۔

• مومنین کی طرف سے عملی زندگی میں ایمان کی اتباع

پھر آگے ارشاد ہے کہ ان ایمان والوں کا معاملہ صرف دل سے ماننے تک ہی محدود نہیں ہے، بلکہ وہ اپنی پوری عملی زندگی کو اس ایمان کے تابع کرلیتے ہیں، چنانچہ فرمایا: ﴿وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا﴾ اور وہ کہتے ہیں ہم نے (اللہ اور رسول کے احکام کو توجہ سے) سُن لیا ہے، اور ہم خوشی سے ان کی تعمیل کرتے ہیں۔ ﴿غُفْرَانَكَ رَبَّنَا﴾ اے ہمارے پروردگار! ہم آپ سے بخشش کے طلب گار ہیں ﴿وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ ۝۲۸۵﴾ ''اور آپ ہی کی طرف ہمیں لوٹ کر جانا ہے۔''

ان ارشادات میں بھی ایک لطیف ترتیب ہے۔ انسان کو تین زمانوں کا سامنا ہوتا ہے، ماضی، حال اور مستقبل۔ مومن بندوں کا ماضی تو یہ ہے کہ وہ تمام ضروری عقائد پر ایمان لا چکے ہوتے ہیں، اُسی کا ذکر ﴿اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ﴾ میں فرمایا گیا ہے، اور ان کا حال یہ ہے کہ وہ یہ کہتے ہیں ﴿سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا﴾ یعنی ہم نے سُن لیا اور مان لیا۔ مطلب یہ ہے کہ وہ زمانۂ حال میں اللہ تعالیٰ کے احکام کو سنتے اور ان کی اطاعت کرتے ہیں۔ اور مستقبل کے بارے میں کہتے ہیں کہ ﴿غُفْرَانَكَ رَبَّنَا﴾ اے ہمارے پروردگار! ہم آپ سے بخشش کے طلب گار ہیں ﴿وَ اِلَيْكَ الْمَصِيْرُ ۝۲۸۵﴾ ''اور آپ ہی کی طرف ہمیں لوٹ کر جانا ہے۔'' نتیجہ یہ کہ ان کا ماضی، ان کا حال اور ان کا مستقبل سب کچھ اللہ تعالیٰ ہی سے وابستہ ہے۔

یہاں ایک اور نکتہ قابلِ ذکر ہے، اور وہ یہ کہ ﴿سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا﴾ یعنی ''ہم نے سُن لیا اور مان لیا'' کا جملہ مفعول سے خالی ہے۔ یعنی یہ تو مذکور ہے کہ ہم نے سُن لیا اور مان لیا، لیکن یہ مذکور نہیں ہے کہ کیا سن لیا؟ اور کیا مان لیا؟ اس سے اشارہ اس طرف ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو کچھ آیا، اُس سب کو سن لیا اور مان لیا۔ دوسرے الفاظ میں سُننے اور ماننے کی کوئی اور چیز ہے ہی نہیں جس کا ذکر کیا جائے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اللہ، اس کے فرشتوں، اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں پر ایمان لانا تو ایک اعتقادی چیز تھی، لیکن مومنوں کا کام صرف نظریاتی اعتقاد تک ختم نہیں ہوجاتا، بلکہ وہ اس کے تقاضوں پر عمل کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام احکام پر دل وجان سے عمل کرتے ہیں، پھر بھی انکساری کے ساتھ یہ کہتے ہیں کہ ﴿غُفْرَانَكَ رَبَّنَا﴾ اے ہمارے پروردگار! ہم آپ سے بخشش کے طلب گار ہیں ﴿وَ اِلَيْكَ الْمَصِيْرُ ۝۲۸۵﴾ ''اور آپ ہی کی طرف ہمیں لوٹ کر جانا ہے۔''

• ''غُفْرَانَكَ رَبَّنَا'' میں چند قابلِ توجہ امور

﴿غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَ اِلَيْكَ الْمَصِيْرُ﴾ والے اس جملے میں بھی چند باتیں قابلِ توجہ ہیں:

▪ — ایک بات یہ کہ بخشش یا مغفرت گناہوں سے مانگی جاتی ہے۔ جو لوگ اعتقاد میں بھی پکے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی ہر بات سُن کر اس کی تابع داری میں بھی لگے ہوئے ہیں، انہیں بخشش مانگنے کی کیا ضرورت ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ انسان جوں جوں اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور بندگی میں، اور نتیجتاً اُس کی معرفت میں ترقی کرتا جاتا ہے، اُسی رفتار سے اُس کے دل میں یہ احساس بھی بڑھتا جاتا ہے کہ میں کوئی عبادت یا اطاعت

اللہ تعالیٰ کی عظمتِ شان کے مطابق نہیں کر سکا۔ اپنے سارے نیک کام بھی اُسے اللہ تعالیٰ کے سامنے بے حقیقت لگتے ہیں، اس لیے وہ بے اختیار اللہ تعالیٰ سے مغفرت مانگتا ہے۔

■ — حضور نبی کریم ﷺ سے زیادہ عبادت گزار اور اطاعت شعار کون ہوگا؟ لیکن آپ اللہ تعالیٰ سے جس طرح گڑگڑا کر مغفرت مانگتے تھے، اور اپنے آپ کو "العبد المذنب" (گناہ گار بندہ) کہہ کر پیش کرتے تھے، وہ دعاؤں کی احادیث میں جگہ جگہ نظر آتا ہے۔[1] اس لیے نہیں کہ۔ معاذ اللہ۔ آپ ﷺ سے واقعی گناہ سرزد ہوئے تھے۔ آپ ﷺ کو تو اللہ تعالیٰ نے نہ صرف معصوم بنایا تھا، بلکہ یہ اعلان بھی فرمادیا تھا کہ اگر بالفرض آپ سے کوئی خطا صادر بھی ہوئی ہو، تو اگلی پچھلی سب معاف ہے۔ اس کے باوجود آپ ﷺ کے استغفار کی وجہ یہ تھی کہ آپ اللہ تعالیٰ کی معرفت کے درجات میں روز بروز ترقی فرمارہے تھے، اور ترقی کے ہر مرحلے پر آپ ﷺ اپنی پچھلی حالت پر استغفار فرماتے تھے۔ جب آنحضرت ﷺ کا یہ حال تھا، تو آپ کے بعد کون بڑے سے بڑا ولی اللہ ہے جو اپنے نیک اعمال کو اللہ تعالیٰ کے شایانِ شان سمجھے؟ اس لیے مومن لوگوں کا شیوہ اس آیت نے یہ بیان فرمایا ہے کہ سب کچھ کرنے کے بعد بھی وہ اللہ تعالیٰ سے مغفرت ہی کے طلبگار ہوتے ہیں، اور کہتے ہیں: "غُفْرَانَكَ رَبَّنَا".

■ — دوسری بات یہ ہے کہ استغفار کے لیے یہاں ﴿غُفْرَانَكَ﴾ کا صیغہ استعمال فرمایا گیا ہے۔ عربی محاورے کے مطابق راجح یہ ہے کہ یہ مفعولِ مطلق ہے، اور اللہ تعالیٰ کی طرف مضاف ہے، اصل میں یوں تھا کہ: "اِغْفِرْ غُفْرَانَكَ" مجھے وہ مغفرت عطا فرمایئے جو "آپ کی مغفرت" ہے، یعنی جو مغفرت آپ کے شایانِ شان ہے اور آپ کی وہ صفت ہے جو "غفور" اور "غفار" کے الفاظ سے بیان کی جاتی ہے اور جس کے بارے میں آپ نے خود سورۂ نوح میں فرمایا ہے کہ:

اِنَّهٗ كَانَ غَفَّارًا ۝۱۰[2]

یقین جانو! وہ بہت بخشنے والا ہے

یہ آپ کی ازلی صفت ہے، ہم اسی ازلی صفت کا واسطہ دے کر آپ کی اُسی مغفرت کا سوال کرتے ہیں

---

(۱) صحيح مسلم (۱/۳۵۰) (۳۸٤) كتاب الصلاة، باب القول مثل قول المؤذن لمن سمعه، ثم يصلي على النبي ﷺ ثم يسأل له الوسيلة أن رسول الله ﷺ كان يقول في سجوده اللهم اغفر لي ذنبي كله دقه وجله وأوله وآخره وعلانيته وسره.

(۲) سورۃ نوح (۷۱): آیت (۱۰)

کہ وہ ازلی صفت جب ظہور فرمائے، تو پورے کمال کے ساتھ ظاہر ہو جس سے نہ صرف گناہ، خطائیں اور بے ادبیاں معاف ہو جائیں، بلکہ وہ ہماری بے ادبیوں اور برائیوں کو بھی نیکیوں میں تبدیل فرمادے جیسا کہ آپ نے ارشاد فرمایا ہے کہ:

فَأُولَٰئِكَ يُبَدِّلُ اللَّهُ سَيِّئَاتِهِمْ حَسَنَاتٍ (۱)

یہ وہ ہیں جن کی برائیوں کو بھی اللہ اچھائیوں میں تبدیل کر دیتا ہے۔

▪ ــ ﴿غُفْرَانَكَ﴾ کے بعد جو لفظ ہے، وہ ہے "ربّنا" (اے ہمارے پروردگار!) اس میں "یا اللہ" کہنے کے بجائے "اے ہمارے پروردگار" کہہ کر اس طرف اشارہ ہے کہ آپ ہی نے ہمیں پالا پوسا ہے، آپ ہی نے بچپن سے ہماری تربیت فرمائی ہے، آپ ہی نے ہمیں عدم سے وجود عطا فرمایا ہے۔ اگر اُس وقت آپ نے ہماری تربیت نہ فرمائی ہوتی اور ہمیں وجود عطا نہ کیا ہوتا، تو ہمارا کچھ نہ بگڑتا، کیونکہ ہم دنیا میں آتے ہی نہیں، لہٰذا ثواب یا عذاب کا کوئی سوال ہی نہ ہوتا۔ لیکن جب آپ نے ہمیں عدم سے وجود عطا فرمایا، اور ہمیں پال پوس کر بڑا کر دیا، تو اگر آپ کی شانِ پروردگاری اب ہماری مُشکل کشائی نہیں فرمائے گی، اور ہمیں مغفرت سے محروم رکھے گی، تو ہمارا ناقابلِ تلافی نقصان ہوگا۔ اس لیے ﴿غُفْرَانَكَ رَبَّنَا﴾ اے ہمارے پروردگار ہم آپ سے بخشش کے طلب گار ہیں ﴿وَ اِلَيْكَ الْمَصِيْرُ﴾ "اور آپ ہی کی طرف ہمیں لوٹ کر جانا ہے،" یعنی آخر ہمیں جانا آپ ہی کے پاس ہے، اس لیے ہمیں مغفرت کے ذریعے پاک صاف کر کے اپنے پاس بلائیے۔

• اللہ تعالیٰ بندوں کو وسعت سے زیادہ ذمہ داری نہیں سونپتے

پھر اللہ تعالیٰ نے دعاؤں کے درمیان، بیچ میں جملۂ معترضہ کے طور پر یہ حقیقت واضح فرمادی کہ ﴿لَا يُكَلِّفُ اللَّهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا﴾ "اللہ کسی بھی شخص کو اس کی وسعت سے زیادہ ذمہ داری نہیں سونپتا۔" یہ جملہ اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم کی متعدّد سورتوں میں ذکر فرمایا ہے۔ پیچھے جو بات کہی گئی تھی کہ اللہ تعالیٰ تمہارے دلوں کی ان باتوں کو بھی جانتا ہے جو تم ظاہر کرتے ہو اور انہیں بھی جانتا ہے جو تم چھپاتے ہو، اُس سے یہ شبہ ہوسکتا تھا کہ دل میں جو غیر اختیاری خیالات آجاتے ہیں، ان کا بھی حساب ہوگا، تو یہ شک دور کرنے

---

(۱) سورۃ الفرقان (۲۵): آیت (۷۰)

کے لیے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمادیا کہ اللہ تعالیٰ کسی بھی شخص کو اس کی وسعت سے زیادہ کا مکلف نہیں فرماتے، لہٰذا ایک طرف تو یہ سمجھ لو کہ جو خیالات تمہارے اختیار سے باہر ہیں، ان کی ذمے داری اللہ تعالیٰ تم پر نہیں ڈالتا۔ اس کے علاوہ بھی جب تم سے یہ عہد لیا جارہا ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کے احکام کی اطاعت کروگے تو یہ نہ سمجھنا کہ اس میں تمہیں کوئی ایسی زبردست مشکل پیش آجائے گی جس کا تمہیں برداشت کرنا مشکل ہوگا۔ ایسا ہرگز نہیں ہے، ہم تو تم پر کسی بھی ایسے کام کا بوجھ نہیں ڈالتے جو تمہاری وسعت سے باہر ہو۔

اور یہاں لفظ بھی ''استطاعت'' یا ''قدرت'' استعمال نہیں فرمایا، بلکہ ''وسعت'' کا لفظ ارشاد فرمایا ہے۔ کیونکہ ''استطاعت'' یا ''قدرت'' تو ایسے کام کی بھی ہوسکتی ہے جس میں بہت زیادہ مشقت ہو، مثلاً نمازیں پانچ کے بجائے دس ہوتیں، تو وہ بھی انسان کی قدرت یا استطاعت سے باہر نہ ہوتیں، لیکن ''وسعت'' سے باہر ہوسکتی تھیں، زکوٰۃ اگر ڈھائی فی صد کے بجائے پانچ فی صد مقرر کی جاتی، تو وہ بھی انسان کی قدرت میں تو تھی، لیکن اس میں مشقت زیادہ ہوجاتی، اس لیے اتنی ہی مقرر کی گئی جتنی ادا کرنے میں زیادہ مشقت نہ ہو۔

حج اگر عمر بھر میں ایک مرتبہ کے بجائے دو یا تین مرتبہ یا ہر سال فرض کردیا جاتا، تو مال دار لوگوں کے لیے قدرت سے باہر تو نہ ہوتا، لیکن مشقت زیادہ ہوجاتی، اس لیے وسعت کے ساتھ فرض کیا گیا۔ یہی حال تمام شرعی احکام کا ہے کہ اُن میں صرف استطاعت اور قدرت کا نہیں، بلکہ وسعت کا لحاظ رکھا گیا ہے کہ انسان معتدل محنت سے ادا کرسکے، اور اُسے ناقابلِ برداشت مشقت اٹھانی نہ پڑے۔

• نیکیوں کے ''کسب'' اور گناہوں کے ''اکتساب'' میں ایک لطیف فرق

پھر فرمایا: ﴿لَهَا مَا كَسَبَتْ﴾ ''ہر آدمی کو فائدہ بھی اسی کام سے ہوگا جو اپنے ارادہ سے کرے۔'' کسب کے معنیٰ اصل میں کمانے کے ہیں، اور کمائی چونکہ ارادے سے ہوتی ہے، اس لیے اس کا مطلب ہے کوئی کام اپنے ارادے اور اختیار سے کرنا۔ ﴿وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ﴾ ''اور نقصان بھی اسی کام سے ہوگا جو وہ اپنے ارادے سے کرے۔''

پیچھے جو کہا گیا تھا کہ جو کچھ تمہارے دلوں میں آرہا ہے چاہے وہ ظاہر کرو یا نہ کرو اللہ تعالیٰ اس کا حساب لے گا، یہاں اللہ تعالیٰ نے واضح طور پر بتادیا کہ حساب صرف اسی چیز کا ہوگا جو تم اپنے ارادے اور اختیار سے کررہے ہو، لیکن کوئی کام بغیر ارادے اور بغیر اختیار کے ہورہا ہے، چاہے وہ اعضاء و جوارح سے ہورہا ہو یا دل سے، تو اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی پکڑ نہیں۔

یہاں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ پہلے جملے میں جو نیکیوں کے بارے میں ہے، اس میں لفظِ ''كَسَبَتْ'' استعمال کیا گیا ہے، اور دوسرے جملے میں جہاں گناہوں کا حوالہ ہے، وہاں اللہ تعالیٰ نے لفظِ ''اِكْتَسَبَتْ'' اختیار فرمایا ہے۔ اگرچہ اردو میں دونوں کا ترجمہ ''کمانے'' ہی سے کیا جاتا ہے۔ لیکن عربی کے لحاظ سے دونوں میں یہ فرق ہے کہ ''کسب'' ایسی کمائی کو کہتے ہیں جس کے حاصل کرنے میں تکلّف کی ضرورت نہ ہو، بے تکلف کام ہوجائے، اور ''اکتساب'' اس کمانے کو کہتے ہیں جس میں تکلف یا کچھ غیر معمولی کام کرنا پڑے۔ اشارہ بظاہر اس طرف ہے کہ نیکیوں کا کام بے تکلف انجام دیا جاتا ہے، اور گناہ کے کام میں کچھ تکلّف کرنا پڑتا ہے۔

مثال کے طور پر اگر کوئی شخص حلال کمائی کر رہا ہے، تو اُسے کسی سے پوشیدہ رہنے کی ضرورت نہیں ہے، وہ علی الاعلان مزدوری کرے یا تجارت و کاشتکاری، اسے کسی تکلّف کی ضرورت نہیں ہوتی، نہ اس کا ضمیر اسے ملامت کرتا ہے کہ میں نے یہ کام کیوں کیا؟ بلکہ معمول کے مطابق وہ کسی کھٹکے کے بغیر کام کرتا رہتا ہے، لہٰذا وہ ''کسب'' ہے، چنانچہ نیکیوں کے لیے قرآنِ کریم میں ''کسب'' کا لفظ استعمال فرمایا گیا ہے۔ اس کے برخلاف اگر وہ چوری کا ارتکاب کرے یا دھوکے بازی کرے، تو اس میں اُسے دوسروں سے چھپا رہنے یا حقیقت کو چھپانے کے لیے تکلّف کرنا پڑتا ہے۔ یہ ''اکتساب'' ہے۔ اسی طرح کوئی شخص اپنی بیوی کو محبت کی نگاہ سے دیکھے، تو اس میں اسے کسی تکلف کی ضرورت نہیں ہے، یہ اس کی طبیعت کا حصہ ہے، لیکن اگر کسی نامحرم کو لذت لینے کے لیے دیکھے، تو وہ یہ کام بے تکلّف نہیں کرسکتا، کیونکہ ایک سلیمُ الفطرت انسان یہ گوارا نہیں کرے گا کہ کوئی دوسرا اسے اس حالت میں دیکھے جب وہ بدنظری کر رہا ہو۔ اس لیے دوسروں کی نگاہوں سے بچ کر ہی یہ کام کرسکے گا۔

غرض یہ کہ گناہوں کے جتنے کام ہیں، وہ سادہ طریقے سے بے تکلّف انجام نہیں دیئے جاتے، اگر ان میں لذّت بھی ہو، تب بھی ایک سلیم الفطرت انسان کو ان کی انجام دہی میں کچھ نہ کچھ تکلف کرنا پڑتا ہے۔ اسی لیے قرآن کریم گناہوں کے ارتکاب کو ''کسب'' کے بجائے ''اکتساب'' سے تعبیر فرماتا ہے۔ البتہ - اللہ بچائے - گناہ کرتے کرتے ایک مرحلہ ایسا آجاتا ہے جب انسان گناہ کا اتنا عادی ہوجاتا ہے کہ گناہ کی عادت اس کی طبیعتِ ثانیہ بن جاتی ہے، اور اُسے گناہ کرنے میں کوئی ادنیٰ ہچکچاہٹ یا تکلّف نہیں ہوتا، یہ بڑا خطرناک مرحلہ ہوتا ہے۔ اسی لیے قرآن کریم میں بعض جگہ اللہ تعالیٰ نے گناہ کے لیے ''اکتساب'' کے بجائے

''کسب'' کا لفظ استعمال فرمایا ہے۔ مثلاً سورۂ بقرہ ہی میں وہ آیت گزر چکی ہے جس میں ارشاد ہے:

بَلٰى مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَّ اَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْٓـَٔتُهٗ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۸۱﴾ (۱)

کیوں نہیں؟ جو لوگ بھی بدی کماتے ہیں، اور ان کی بدی ان کو گھیر لیتی ہے، تو ایسے لوگ ہی دوزخ کے باسی ہیں، وہ ہمیشہ اسی میں رہیں گے۔

یہاں چونکہ ان لوگوں کا ذکر ہے جن کو ان کی بدی نے گھیر لیا ہے، یعنی بدی ان کی طبیعتِ ثانیہ بن گئی ہے، اور انہیں اس کے ارتکاب میں کوئی ہچکچاہٹ ہی نہیں ہوتی، اس لیے یہاں بدی کی کمائی کے لیے ''کسب'' کا لفظ استعمال فرمایا گیا ہے۔

• صحابۂ کرام کی صفتِ تسلیم و رضا پر اُن کے لیے خوشخبری

جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا کہ یہ فقرہ ﴿لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ۭ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ﴾ دو دعاؤں کے بیچ میں آیا ہے۔ اس سے پہلے یہ دعا ہے کہ ''سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۭ غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ'' اور اس کے بعد بھی دعا ہے جو آگے آرہی ہے۔ بہت سے مفسرین (۲) نے فرمایا ہے کہ درحقیقت اس سے پہلے کی آیت میں جو بات فرمائی گئی تھی کہ ''تم اور جو باتیں تمہارے دلوں میں ہیں، خواہ تم انہیں ظاہر کرو یا چھپاؤ، اللہ تم سے ان کا حساب لے گا پھر جس کو چاہے گا معاف کردے گا اور جس کو چاہے گا سزا دے گا۔'' اس پر صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو یہ اندیشہ ہوا تھا کہ کہیں ہمارے غیر اختیاری خیالات پر بھی ہماری پکڑ نہ ہو، لیکن انہوں نے اس پر کوئی اعتراض کرنے کے بجائے یہی کہا کہ ''سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۭ غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ ﴿۲۸۵﴾'' یعنی ہم نے یہ بات سُن لی، اور مان لی، لیکن معاملہ بڑا نازک ہے، اس لیے اگر ہم سے غلطی ہوجائے تو ہم آپ کی مغفرت کی پناہ چاہتے ہیں اور ہمیں آپ ہی کی طرف لوٹ کر آنا ہے۔

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی اس تسلیم و رضا کو دیکھتے ہوئے بیچ میں اللہ تعالیٰ نے انہیں یہ خوش خبری سنادی کہ ﴿لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا﴾ یعنی اللہ تعالیٰ تم پر کوئی ایسی ذمہ داری نہیں ڈالے گا جو تمہاری وسعت

---

(۱) سورۃ البقرۃ (۲): آیت (۸۱)

(۲) تفسیر القرطبي (۴۲۷/۳)

سے باہر ہو۔ لیکن تم مجھ سے یہی مانگتے رہو کہ ﴿رَبَّنَا﴾ اے ہمارے پروردگار! ﴿لَا تُؤَاخِذْنَآ اِنْ نَّسِيْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا﴾ کہ ہم سے کوئی بھول چوک ہوجائے تو ہماری گرفت نہ فرمایئے ﴿رَبَّنَا وَ لَا تَحْمِلْ عَلَيْنَآ اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا﴾ اور اے ہمارے پروردگار! ہم پر اس طرح کا بوجھ نہ ڈالیے جیسا آپ نے ہم سے پہلے لوگوں پر ڈالا تھا۔ ﴿رَبَّنَا وَ لَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ﴾ ''اور اے ہمارے پروردگار! ہم سے ایسا بوجھ نہ اٹھوایئے جسے اٹھانے کی ہم میں طاقت نہ ہو۔''

• خطا ونسیان کا فرق اور ان پر معافی کی تلقین

مذکورہ بالا تشریح سے آخری رکوع کی تمام آیتوں کے درمیان جو فطری ترتیب ہے، وہ بفضلہٖ تعالیٰ واضح ہوجاتی ہے۔ اب اس دعا کے بارے میں چند باتیں قابلِ ذکر ہیں:

پہلی بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ﴿رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ اِنْ نَّسِيْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا﴾ والی اس دعا میں دو لفظ ارشاد فرمائے ہیں، ایک نسیان اور ایک خطا۔ ''نسیان'' کے معنیٰ یہ ہیں کہ انسان بھول کر کوئی کام کرلے یا چھوڑ دے، مثلاً نماز پڑھنے کا وقت گزر گیا اور کوئی شخص بھول گیا کہ مجھے نماز پڑھنی تھی، یہ نسیان ہے۔ اور ''خطا'' کے معنیٰ یہ ہیں کہ آدمی کوئی کام کرنا نہیں چاہ رہا تھا، لیکن غلطی سے ہوگیا۔ مثلاً جانے کا ارادہ کسی اور طرف تھا، لیکن بے اختیار رُخ کسی اور طرف ہوگیا، اسے خطا کہا جاتا ہے۔ یہ دونوں صورتیں اللہ تعالیٰ نے معاف کر رکھی ہیں، یعنی ان پر کوئی پکڑ نہیں ہوگی۔ لیکن بندگی کا تقاضا ہے کہ اس کے باوجود انسان اللہ تعالیٰ سے اس پر بھی معافی مانگتا رہے، جیسا کہ آگے معلوم ہوگا۔

لیکن ''نسیان'' اور ''خطا'' کی ایک صورت ایسی بھی ہوتی ہے جس میں انسان کے اختیار کو بھی دخل ہوتا ہے، یعنی اگرچہ انسان شرعی احکام کا پابند ہوتا ہے، لیکن کسی وقت وہ کوئی ارادی غلطی کر بیٹھتا ہے اور قاعدے سے اس پر پکڑ بھی ہوتی ہے۔ اسے نسیان یا بھول اس لیے کہہ دیا جاتا ہے کہ گویا اس وقت وہ یہ بات بھول گیا کہ میں اللہ تعالیٰ کے احکام کا پابند ہوں۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے حضرت آدم علیہ السلام سے جو غلطی ہوئی تھی، وہ ارادی ہی تھی، اسی لیے قرآنِ کریم نے ایک جگہ اسے ''وَعَصٰٓى اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰى''[1] فرمایا ہے، یعنی ''آدم نے اپنے پروردگار کا حکم ٹالا، اور بھٹک گئے،'' لیکن دوسری جگہ اسے نسیان سے تعبیر فرمایا گیا ہے:

---

(۱) سورۃ طٰہٰ (۲۰): آیت (۱۲۱)

وَ لَقَدْ عَهِدْنَآ اِلٰٓى اٰدَمَ مِنْ قَبْلُ فَنَسِيَ وَ لَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا ﴿۱۱۵﴾ (۱)

اور ہم نے اس سے پہلے آدم کو ایک بات کی تاکید کی تھی، پھر ان سے بھول ہوگئی، اور ہم نے اُن میں عزم نہیں پایا۔

یہاں بھول سے مراد غیر اختیاری بھول نہیں، بلکہ ارادی بھول ہے جسے اوپر ''حکم ٹالنے اور بھٹکنے'' سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔ اس قسم کی بھول اور غلطی پر قاعدے سے گرفت ہوتی ہے، اس لیے اس سے معافی مانگنا اپنے حقیقی معنیٰ میں ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو استغفار کا طریقہ سکھایا، اور انہوں نے معافی مانگی۔

لہٰذا اس آیت میں جو دعا ہے، اس میں دونوں قسم کی بھول اور غلطی سے معافی مانگی گئی ہے، کہ ''اے ہمارے پروردگار! ہم سے کسی بھی قسم کی غلطی یا بھول ہوئی ہو، ہمیں اپنی رحمت سے دونوں چیزوں کی معافی عطا فرمادیجیے اور اس کے اوپر ہماری پکڑ نہ فرمایئے گا۔''

• وسعت سے زیادہ بوجھ نہ ڈالنے کی دعا اور ایک اشکال کا جواب

آگے فرمایا: ﴿رَبَّنَا وَ لَا تَحْمِلْ عَلَيْنَآ اِصْرًا﴾ اور اے ہمارے پروردگار! ہم پر اس طرح کا بوجھ نہ ڈالیے ﴿كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا﴾ ''جیسا آپ نے ہم سے پہلے لوگوں پر ڈالا تھا۔'' بظاہر یہ بنی اسرائیل کی طرف اشارہ ہے۔ سورۂ بقرہ ہی میں آپ دیکھ چکے ہیں کہ بنی اسرائیل کی پے درپے نافرمانیوں کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ نے ان پر بعض سخت احکام عائد فرمادیے تھے اور ان سخت احکام کی وجہ سے اُن پر بڑا بوجھ پڑ گیا تھا۔ مسلمانوں کو یہ دعا سکھائی جارہی ہے کہ اے اللہ! اس طرح کا بوجھ ہمارے اوپر نہ ڈالیے۔ نیز فرمایا: ﴿رَبَّنَا وَ لَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ﴾ ''اور اے ہمارے پروردگار! ہم سے ایسا بوجھ نہ اٹھوایئے جسے اٹھانے کی ہم میں طاقت نہ ہو۔''

یہاں سوال پیدا ہوسکتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے خود فرمادیا کہ ہم کسی پر اس کی وسعت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتے، پھر یہ دعا کس لیے کرائی جارہی ہے؟ اس سوال کے دو جواب ہیں اور دونوں صحیح ہیں۔

---

(۱) سورۃ طٰہٰ (۲۰): آیت (۱۱۵)

(۱) جس چیز کا حصول یقینی ہو، وہ بھی اللہ تعالیٰ سے مانگنے کی تلقین: ایک جواب یہ کہ اللہ تعالیٰ کے حضور بندگی اور عاجزی کا ایک تقاضا یہ بھی ہے کہ جس بات کا اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمالیا ہو، اس کو بھی بندہ اللہ تعالیٰ سے مانگے۔ کیونکہ جو وعدہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا، یہ اُس کا فضل وکرم ہے، اس کے ذمے کوئی فرض نہیں تھا کہ وہ یہ وعدہ فرمائے۔ اب بندے کا کام یہ ہے کہ وہ چیز اللہ تعالیٰ سے مانگے، اور زبانِ حال سے یہ کہے کہ میں اس کا مستحق نہیں تھا، اور ایسا نہیں ہے کہ میں آپ کے اس فضل وکرم سے بے نیاز ہوگیا ہوں، بلکہ میں اب بھی اس بات کا محتاج ہوں کہ آپ سے مانگتا رہوں۔ اس کی بہت سی مثالیں قرآنِ کریم اور احادیث میں موجود ہیں۔

قرآنِ کریم میں اس کی ایک مثال حضرت نوح علیہ السلام کی دعا بھی ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام ساڑھے نو سو سال تک اپنی قوم کو اللہ کی طرف بلاتے رہے، لیکن بہت تھوڑے لوگوں کے علاوہ باقی سب لوگ کفر اور شرک میں مبتلا رہے اور آپ علیہ السلام کی تکذیب کرتے رہے۔ ان کے کفر اور تکذیب کے نتیجے میں ان پر طوفان کا عذاب آنا تھا، اس عذاب اور طوفان سے پہلے اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام کو حکم دیا کہ آپ ایک کشتی بنائیں، اور جو لوگ آپ پر ایمان لائے ہیں، انہیں اور زمین پر جتنے جانور موجود ہیں، ان سب کا ایک ایک جوڑا اس کشتی میں سوار کرلیں۔

اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام سے فرمایا کہ جب تم کشتی کے اندر سوار ہوجاؤ تو یہ کہو:

رَّبِّ اَنْزِلْنِیْ مُنْزَلًا مُّبٰرَكًا وَّ اَنْتَ خَیْرُ الْمُنْزِلِیْنَ ﴿۲۹﴾ (۱)

یعنی اے میرے رب! مجھے ایسی جگہ پر اتاریے جو مبارک ہو اور آپ سب سے بہترین اتارنے والے ہیں۔

اس دعا میں قابلِ غور بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ حضرت نوح علیہ السلام کو خود حکم دے رہے ہیں کہ یہ دعا مانگو۔ حالانکہ جب اللہ تعالیٰ نے یہ فیصلہ فرمایا تھا کہ پوری قوم پر طوفان آئے گا اور اس طوفان میں ساری مخلوق ہلاک ہوجائے گی، تو اس کے ساتھ ہی اللہ تعالیٰ نے یہ فیصلہ بھی فرما لیا تھا کہ حضرت نوح اور ان پر ایمان لانے والوں کو نجات ملے گی۔ اللہ تعالیٰ کے ''علمِ ازلی'' میں اور ''تقدیر'' کے فیصلے میں بھی یہ بات بھی طے تھی کہ

---

(۱)　سورۃ المؤمنون (۲۳): آیت (۲۹)

انہیں فلاں جگہ اتارنا ہے اور ظاہر ہے خود حضرت نوح علیہ السلام کو بھی معلوم تھا کہ جب اللہ تعالیٰ نے کشتی بنانے کا اور کشتی میں سوار ہونے کا حکم دیا ہے اور ان طوفانی موجوں کے درمیان حفاظت فرمائی ہوئی ہے تو یقینی بات ہے کہ ہمارے ساتھ اللہ تبارک وتعالیٰ کی خاص نصرت ہے، جس کی وجہ سے ہماری کشتی پہاڑوں جیسی موجوں میں چلی جارہی ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام کو پورا یقین تھا کہ اللہ تبارک تعالیٰ ہمیں جس جگہ پر اتار دیں گے، وہ ہمارے لئے نجات کا ذریعہ اور ہماری بڑھوتری کا سبب بنے گی۔ اس سب کے باوجود اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام کو حکم دیا کہ ''قُلْ''، یعنی آپ یہ دعا مانگیے کہ:

رَّبِّ اَنْزِلْنِیْ مُنْزَلًا مُّبٰرَكًا وَّ اَنْتَ خَیْرُ الْمُنْزِلِیْنَ ﴿۲۹﴾

اے میرے رب! مجھے ایسی جگہ پر اتاریئے جو مبارک ہو اور آپ سب سے بہترین اتارنے والے ہیں۔

اس حکم کے ذریعے ہمیں یہ سبق دیا جا رہا ہے کہ چاہے کسی چیز کے حصول کا کتنا ہی یقین ہو، تب بھی انسان کو وہ چیز اللہ تعالیٰ سے ضرور مانگنی چاہئے اور اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنا چاہئے۔ یہ بندگی کا لازمی تقاضا ہے کہ بندہ ہر وقت اپنے اللہ کو پکارتا رہے، چاہے وہ جس حالت میں بھی ہو۔

چنانچہ یہاں بھی لَا یُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا کے ذریعے جب اللہ تعالیٰ نے اعلان کردیا کہ ''اللہ تم پر ایسی کوئی ذمہ داری نہیں ڈالے گا جو تمہاری وسعت سے زیادہ ہو،'' تو اب اس بات میں ادنیٰ شبہ بھی باقی نہیں رہا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی ایسا حکم نہیں آئے گا جو ہماری برداشت سے باہر ہو، لیکن پھر بھی کہا جارہا ہے کہ یہ دعا کرو کہ ''اور اے ہمارے پروردگار ہم پر اس طرح کا بوجھ نہ ڈالیے جیسا آپ نے ہم سے پہلے لوگوں پر ڈالا تھا۔'' اس کے ذریعہ یہ سکھایا جا رہا ہے کہ تمہارا ہر وقت اللہ سے رابطہ ہونا چاہئے۔ چاہے تمہیں ایک چیز یقینی نظر آرہی ہو کہ یہ ہوگی، تب بھی مانگو کہ یا اللہ! مجھے عطا فرما دیجئے۔ یہ بندگی کا لازمی تقاضا ہے کہ بندہ ہر وقت اپنے رب کو پکارتا رہے، چاہے وہ جس حالت میں بھی ہو۔

یقینی چیز اللہ تعالیٰ سے مانگنے سے متعلق احادیث میں بے شمار مثالیں ملتی ہیں، ان میں سے ایک یہ کہ مثلاً اللہ تعالیٰ نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو واضح لفظوں میں بتادیا کہ آپ کا مقام جنت کے اعلیٰ ترین درجات میں ہے، اور اگر بالفرض کوئی بھول چوک ہوئی بھی ہو، تو وہ بھی معاف ہے، لیکن ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ:

وَقُلْ رَّبِّ اغْفِرْ وَارْحَمْ وَاَنْتَ خَيْرُ الرّٰحِمِيْنَ ﴿۱۱۸﴾ (۱)

اور آپ یہ کہیے کہ اے میرے پروردگار! مغفرت فرمایئے، اور رحم فرمایئے اور آپ سارے رحم کرنے والوں میں سب سے زیادہ رحم کرنے والے ہیں۔

اسی طرح قرآن وحدیث سے یہ بات واضح ہے کہ جو بندے توبہ کرلیتے ہیں، اور سیدھے راستے پر چلتے ہیں، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت بھی فرماتے ہیں، اور انہیں جنت میں داخل فرماتے ہیں، لیکن قرآنِ کریم میں ہے کہ فرشتے یہ دعا مانگتے ہیں کہ:

فَاغْفِرْ لِلَّذِيْنَ تَابُوْا وَاتَّبَعُوْا سَبِيْلَكَ وَقِهِمْ عَذَابَ الْجَحِيْمِ ﴿۷﴾ (۲)

جن لوگوں نے توبہ کرلی ہے، اور آپ کے راستے کی اتباع کی ہے، ان کی مغفرت فرمایئے اور انہیں دوزخ کے عذاب سے بچایئے۔

اس کی اور بھی بہت سی مثالیں موجود ہیں جن سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جس بات کا یقین ہو، بندگی اور عاجزی کا ایک تقاضا یہ ہے کہ وہ بھی اللہ تعالیٰ سے مانگی جائے۔ اس لیے ان آیتوں میں جو دعا سکھائی گئی ہے، وہ اسی قسم کی ہے۔

(۲) پُر مشقّت اور سخت احکام سے بچنے کی دعا مانگنے کی تلقین: اور دوسرا جواب یہ ہے کہ بنی اسرائیل کو جو سخت احکام دیے گئے تھے، وہ بھی ان کی قدرت سے باہر تو نہیں تھے، لیکن ان میں مشقّت زیادہ تھی، اور وہ بنی اسرائیل کی سرکشی کی بنا پر دیے گئے تھے۔ یہاں مسلمانوں کو جو یہ دعا سکھائی جارہی ہے، اس کا منشأ یہ ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہماری بداعمالیوں کی وجہ سے ہم پر بھی اس قسم کے سخت احکام دے دیے جائیں۔

اسی طرح یہ دعا کہ ﴿رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ﴾ ''اور اے ہمارے پروردگار ہم سے ایسا بوجھ نہ اٹھوایئے جسے اٹھانے کی ہم میں طاقت نہ ہو'' صرف مشقّت والے احکام ہی سے متعلق نہیں ہے، بلکہ دنیاوی معاملات سے بھی متعلق ہے، مثلاً اس میں یہ بات بھی شامل ہے کہ ہمیں کسی ایسی بیماری میں یا کسی اور تکلیف میں مبتلا نہ فرمایئے جو ہماری طاقت سے باہر ہو۔

---

(۱) سورۃ المؤمنون (۲۳): آیت (۱۱۸)

(۲) سورۃ المؤمن (۴۰): آیت (۷)

- **گناہوں کی مغفرت؛ رحمتِ الٰہی کا عظیم مظہر**

پھر آخر میں فرمایا: ﴿وَاعْفُ عَنَّا﴾ اور ہماری خطاؤں سے درگذر فرمایئے ﴿وَاغْفِرْ لَنَا﴾ اور ہمیں بخش دیجیے ﴿وَارْحَمْنَا﴾ ''اور ہم پر رحم فرمایئے۔''

''وَاعْفُ عَنَّا'' کے معنیٰ تو یہ ہیں کہ ہم سے کوئی خطا ہوئی ہے، تو اس سے درگذر کرکے معاف فرمادیں، اور اس پر کوئی گرفت نہ فرمائیں، جبکہ ''وَاغْفِرْ لَنَا'' میں ''غفر'' کے لغوی معنیٰ چھپانے کے ہوتے ہیں۔ اس لیے دعا کے معنیٰ یہ ہیں کہ گناہ معاف ہی نہ کریں، بلکہ اُسے بالکل چھپادیں۔ ایک صورت تو یہ ہے کہ نامۂ اعمال میں ایک گناہ لکھا ہوا ہے، اور ساتھ ہی یہ بھی لکھ دیا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے اسے معاف کردیا، لیکن ''وَاغْفِرْ لَنَا'' کے معنیٰ یہ ہیں کہ وہ گناہ نامۂ اعمال ہی سے کاٹ دیا جائے اب وہ نامۂ اعمال میں بھی ظاہر نہ ہو۔

اس کی تشریح یہ ہے کہ انسان کے اعمال کا حساب ایک تو اس طرح رکھا جا سکتا ہے جیسے اکاؤنٹنگ میں آمد وخرچ کا حساب ہوتا ہے، کہ اس میں Credit, Debit ہوتا رہتا ہے۔ یعنی ایک طرف آمدنی لکھی جاتی ہے، اور دوسری طرف خرچ، اور حساب میں دونوں چیزیں نظر آتی رہتی ہیں۔ اسی طرح نامۂ اعمال میں لکھنے کا ایک طریقہ یہ ہوسکتا ہے کہ اس نے اتنی اچھائیاں کیں، اتنی برائیاں کیں، اتنے گناہوں کی معافی مانگی، اور اتنے گناہوں کی معافی نہیں مانگی، اور جتنوں کی معافی مانگی ہے تو وہ معاف تو کر دیے گئے، لیکن حساب میں وہ بھی نظر آرہے ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ کی رحمت یہ ہے کہ جب کوئی بندہ صحیح معنوں میں توبہ کرلیتا ہے، تو پھر وہ گناہ جس سے توبہ کرلی ہے اس کے نامۂ اعمال سے خارج ہی کردیا جاتا ہے، یعنی یہ لکھا ہی نہیں جاتا کہ اس شخص نے گناہ کیا تھا، اور وہ معاف کردیا گیا ہے۔ یہ معنیٰ ہیں ﴿وَاغْفِرْ لَنَا﴾ کے، یعنی یا اللہ! ہمارے گناہوں کو چھپا دیجیے۔ اب وہ کسی کے سامنے بھی ظاہر نہ ہوں، تاکہ آخرت میں ان پر لوگوں کے سامنے شرمندگی بھی نہ ہو۔ یہاں دونوں باتوں کی دعا کی جارہی ہے کہ یا اللہ! ان گناہوں پر ہماری پکڑ بھی نہ کیجیے اور ساتھ میں انہیں چھپا بھی لیجیے کہ وہ گناہ ہمارے نامۂ اعمال میں ظاہر بھی نہ ہوں۔

پھر آگے فرمایا: ﴿وَارْحَمْنَا﴾ ''اور ہم پر رحم فرمایئے،'' پیچھے جو معافی اور مغفرت کی دعا کی گئی، اس میں بھی اگرچہ رحم شامل ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کے رحم وکرم کے بدولت ہی معافی ملے گی، لیکن رحم کی دعا اس لیے الگ سے مانگی گئی کہ رحم کا لفظ اس سے زیادہ وسیع ہے، اور مطلب یہ ہے کہ یا اللہ! گناہوں کو تو معاف کر ہی

دیجیے، پھر اپنی رحمتوں سے بھی ہمیں سرفراز فرمایئے، یعنی معافی کے بعد وہ نعمتیں بھی عطا فرمایئے جو خالص آپ کی رحمت سے ملتی ہیں، ہم دونوں چیزوں کے محتاج ہیں۔

﴿اَنْتَ مَوْلٰنَا﴾ ''آپ ہمارے حامی و ناصر ہیں،'' آپ ہی ہماری بگڑی بنانے والے اور کارساز ہیں۔ ''مولیٰ'' کے معنیٰ اُس شخص کے ہوتے ہیں کہ جب کسی آدمی کو کوئی مشکل پیش آئے تو اس مشکل کو رفع کرنے کے لیے اس کی طرف رجوع کیا جائے۔ ایسے شخص کو مولیٰ کہتے ہیں۔ اسے حامی و ناصر، کارساز یا ملجا و ماویٰ کہہ دیجیے، یہ سارے مفہوم اس میں داخل ہیں کہ یا اللہ! آپ ہماری پناہ گاہ ہیں۔

﴿فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ﴾ ''لہٰذا کافروں کے مقابلے میں ہمیں نصرت عطا فرمایئے۔'' کافروں کے مقابلے میں نصرت کا ایک ظاہری مطلب تو یہ ہے کہ اگر ان سے ہماری جنگ ہو جائے، تو ہمیں فتح و نصرت سے نواز دیجیے۔ دوسرے یہ مفہوم بھی اس میں داخل ہے کہ کافر لوگوں سے اگر دلیل کا مقابلہ ہو، تو اس میں بھی ہمیں غالب فرمایئے۔ اور انسان اس نیت سے بھی یہ دعا مانگ سکتا ہے کہ اس کائنات میں سب سے بڑے کافر؛ شیطان اور اس کے لشکر کے جو لوگ ہیں وہ ہر وقت ہمیں نافرمانی پر آمادہ کرتے رہتے ہیں، یا اللہ! ہمیں ان کے مقابلے کی طاقت بخش کر اُن پر غلبہ عطا فرمایئے۔

یا اللہ! ان سب دعاؤں کو ہم سب کے حق میں قبول فرمالیجیے۔ آمین ثم آمین

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ

الحمد للہ تعالیٰ سورۂ بقرہ کی تفسیر اس کے فضل و کرم سے پوری ہوئی۔

۱۸ شوال المکرم ۱۴۴۱ھ مطابق ۱۰ جون ۲۰۲۰ء

دفتر ریسرچ و رجسٹریشن آفیسر اوقاف حکومت سندھ

فون نمبر 021-99332012

موبائل نمبر 0300-3311811

جامع مسجد آرام باغ کراچی

نشانِ مجاریہ: آر۔آر۔او (اوقاف)

RO- 162-2021

مورخہ 5-7-2021

تصدیق نامہ

مکتبہ معارف القرآن کراچی (احاطۂ جامعہ دارالعلوم کراچی)

کی مطبوعہ "آسان تفسیر قرآن" جلدِ دوم از "حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم" کی اپنی نگرانی میں مولانا مفتی محمد عنایت الرحمٰن صاحب (رجسٹرڈ پروف ریڈر محکمۂ اوقاف سندھ) سے پروف ریڈنگ کرائی گئی ہے اور "آسان تفسیر قرآن" کے متن کو مکمل بغور پڑھا گیا، جو اغلاط تھیں، انہیں درست کرا دیا گیا ہے۔

لہٰذا تصدیق کی جاتی ہے کہ اب یہ "آسان تفسیر قرآن" حتی الامکان لفظی اور اعرابی اغلاط سے ان شاء اللہ پاک ومبرا ہے۔

نوٹ: حکومت پاکستان کے کاپی رائٹس کے قانون کے تحت "آسان تفسیر قرآن" کے جملہ حقوق بحقِ ناشر "مکتبہ معارف القرآن کراچی" محفوظ ہیں۔

MUFTI MUNEER AHMED TARIQ
RESEARCH & REGISTRATION OFFICER
AUQAF DEPARTMENT GOVT OF SINDH

المصدق

مولانا مفتي منير احمد طارق

ریسرچ ورجسٹریشن آفیسر اوقاف سندھ

حکومت سندھ

مولانا مفتی منیر احمد طارق
ریسرچ ورجسٹریشن آفیسر اوقاف سندھ
حکومتِ سندھ

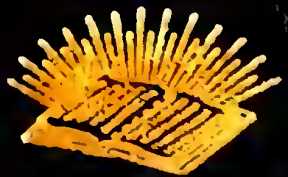

مكتبة معارف القرآن بكراچی
(Quranic Studies Publishers)